ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱- سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲- مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳- ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴- جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	جنوری ۱۹۳۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

زمانے کی رفتار مہینہ اور سال کی پابند نہیں، اور انسانی زندگی کی تحریکوں اور انقلابوں میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک سال دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہو، خصوصاً جب وہ گذر جائے، اور ہم اس سے اتنی دور ہو جائیں کہ ان واقعات کا صحیح مطالعہ کر سکیں جو کہ اس میں پیش آئے اور اگلے پچھلے کا رشتہ جوڑ سکیں ۱۹۳۸ میں بہت کچھ ہوا جس کا ہمیں ایک سال پہلے گمان بھی نہ تھا، لیکن اس وقت غور کیجئے تو جو کچھ ہوا اس کا ہونا لازمی تھا، اور ہمیں کافی علم ہوتا تو شاید ہم ستاروں کے دیکھے بغیر بتا سکتے کہ یہ ہونے والا ہے۔

یورپی سیاست میں اس سال جرمنی کا آسٹریا پر اور اس کے سات مہینے بعد چکوسلواکیا کے جرمن علاقوں پر قبضہ اور اس قبضے کے لئے جو تیاریاں کی گئیں اور چالیں چلی گئیں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، لیکن یہ سب کچھ علامت ہے ایک کہیں زیادہ ہنگامہ خیز تحریک کی جو ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی تھی اور اس سال تکمیل کو پہنچی۔ یہ تحریک ہے ان قوموں کی جنھیں صلح نامہ ورسائی کی دفعات میں گرفتار کیا گیا تھا آہستہ آہستہ اپنے بندھنوں کو توڑنا اور "اجتماعی تحفظ" کے اس گھروندے کو ڈھا دینا جسے انگریزی اور فرانسیسی سیاست نے ۱۹۱۹ء میں بنا کر کھڑا کیا تھا اور بین الاقوامی اتحاد کا نام دیا تھا۔

اصل میں تو یہ بہت پہلے ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ اتحاد محض انگلستان اور فرانس کے اتحاد کا بڑا نام ہے اور ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے بے آبرو اور بے مصرف ہو جانے سے دنیا کے لئے کوئی خاص خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جنگ کے جو امکانات اب ہیں وہ پہلے بھی تھے، اس لئے کہ بین الاقوامی اتحاد کبھی کمزور کو زبردست کے پنجے سے بچا نہیں سکا، اور اگر فرانس اور انگلستان کا اتحاد عمل یورپ کی ڈگمگاتی ناؤ کے لئے سہارا تھا

تو وہ اب بھی موجود ہے۔ جنگ کی جو خاص تیاری اس سال دیکھی گئی ہے اس کا ارادہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا، اس لئے کہ لوگ کچھ اسی سال منطق کے اس پھیر میں نہیں پڑ گئے ہیں کہ جنگ سے بچنے کے لئے لڑنے کی طاقت چاہیئے، ایسی طاقت کہ جسے دیکھ کر دوسرا ہم سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکے مگر ہم اسے ہر وقت مار مٹنے کی دھمکی دے سکیں اور مجبور ہو جائیں تو ایسا کر کے بھی دکھا دیں۔ جنگ کی تیاریوں کے باوجود ۱۹۳۸ء میں اگر کوئی بات ثابت ہوگئی ہے تو یہ کہ یورپ کی کوئی قوم لڑنا نہیں چاہتی، اور جب تک کہ نہ لڑنے میں کسی ایسے نقصان کا اندیشہ نہ ہو کہ جس پر جنگ کی تباہی اور بربادی کو ترجیح دی جا سکے اس وقت تک لڑائی چھڑنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ انگلستان اپنی آبرو، فرانس کی آبرو اور سیاسی تعلقات دونوں اس کی خاطر قربان کر چکا ہے اور ابھی بہت سی قربانیوں کی گنجائش باقی ہے۔

جرمنی | صلح نامہ ورسائی میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی نے اٹھایا تھا اور اس کی تلافی کا مطالبہ کرنے کا حق سب سے زیادہ اسی کو ہے۔ اسی وجہ سے وہ ۱۹۱۹ء کی سیاسی تعمیرات کو مسمار کرنے اور تازہ عمارتوں کی بنیاد رکھنے میں سب سے آگے ہے۔ اس نے اب یہ اصول منوالیا ہے کہ وسطی یورپ کی سیاسی تنظیم میں اس کی خواہش اور ارادے کا خیال کیا جائے گا نہ کہ انگلستان کے معاہدوں اور فرانس کے رسمی تعلقات کا، اور آسٹریا کے پورے ملک اور چکوسلوواکیہ کے سڈٹین علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کر کے اس نے بڑی حد تک اپنی قوم کی ایک پرانی خواہش پوری بھی کر لی ہے کہ یورپ میں جتنے جرمن نسل اور جرمن زبان بولنے والے ہوں وہ سب ایک سیاسی نظام کے ماتحت ہوں۔ ابھی مشرقی فرانس، جنوبی ڈنمارک، شمالی اور مغربی پولینڈ، ہنگری، سوئستان اور شمالی اٹلی میں جرمن زبان بولنے والے موجود ہیں جو جرمن قوم میں شامل ہونے اور نازی حکومت کی رعایا بننے کا شرف حاصل نہیں کر سکے ہیں، لیکن جہاں کہیں موقع ہے اس کی تحریک ابھی سے شروع کر دی گئی ہے، اور نازی سیاست جدھر بھی سینگ سمائے گھس جانے پر تیار بیٹھی ہے۔ ڈنمارک میں سازشیں ہو رہی ہیں، میمل غالباً ۱۹۳۹ء کے شروع میں جرمنی سے ملحق ہو جائے گا، پولینڈ نے جرمنی کی مخالفت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے مغربی علاقوں کا چھین جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہنگری کے جرمن بڑی تیزی کے ساتھ نازی اصولوں کے معتقد اور اس کے طرز عمل کے پیرو بن رہے ہیں، اور مسولینی رات کو کبھی سوچتا ہوگا کہ

جرمنی کے سیاسی فلسفے کی زد میں اٹلی کے چند شمالی ضلع بھی آجاتے ہیں تو اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہوگی۔ سوئستان ابھی خاص خطرے میں نہیں ہے، اور فرانس سے جرمنی نے وعدہ کرلیا ہے کہ اس کی سرحد کو تقدیر کا لکھا سمجھے گا۔ لیکن یہ وعدہ سیاسی وعدہ ہے، اور یہ تقدیر سیاسی مصلحت اور تدبیر۔

معاشیات کے ماہر کچھ کھسیانے پن اور کچھ اعتراض کے شوق میں ہر ہٹلر کی ہر کامیابی کو ایک مغالطہ ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آسٹریا کے شامل ہو جانے سے جرمنی کی تجارتی اور صنعتی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اور اسے کوئی مالی یا صنعتی فائدہ نہیں ہوا۔ سوا اس کے کہ لکڑی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ سڈٹین علاقوں پر قبضہ ہو جانے سے اگرچہ چکوسلواکیا کہیں کا نہیں رہ گیا لیکن جرمنی کو ایسے صنعتی کارخانے اور ذخیرے ملے جن کی خود جرمنی میں افراط ہے اور وہ کانیں اور زرخیز زمینیں جن کی اسے سخت ضرورت ہے چکوسلواکیا کے پاس ہی رہیں۔ یہی اعداد و شمار کے ماہر نقشے بنا کر اور حساب لگا کر دکھا دیتے ہیں کہ جرمنی کی بہت کم ضروریات ہیں جو بلقان میں مہیا ہو سکتی ہیں، لیکن جرمنی کی بلقان کے ملکوں سے تجارت برابر بڑھ رہی ہے، اور ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس کے مجموعی لین دین کا تہائی سے کم حصہ جرمنی سے ہو۔ اس سلسلے میں آخری معاہدہ جرمنی اور رومانیہ کے درمیان وسط دسمبر میں ہوا جس کی رو سے رومانیہ کی درآمد میں جرمنی کا حصہ پچاس فی صدی اور برآمد میں تینتیس فی صدی ہوگا۔ جرمنی اور بلقان کے تعلقات کو ماہروں کی متعصب نظروں سے نہیں بلکہ صاف صاف دیکھئے تو یقین ہو جاتا ہے کہ جرمنی کا بلقان پر تسلط ہو گیا ہے اور بلقان والے چاہیں بھی تو جرمنی سے اپنا تجارتی رشتہ توڑ نہیں سکتے۔ اس کے برعکس ان کی ہر ایسی کوشش انھیں زیادہ الجھا دیتی ہے۔ فرانس اور فرانس سے بھی زیادہ انگلستان کے سرمایہ دار تجارت کو سیاست پر قربان کرکے بلقان میں اپنا سرمایہ لگائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انھیں ایسا مال خریدنا ہوگا جس کی انھیں ضرورت نہیں، اور برطانیہ سے تو اس کی ساری نوآبادیاں بگڑ جائیں گی، اس لئے کہ بلقان میں وہی قدرتی پیداوار حاصل ہوگی جسے برطانیہ نوآبادیوں سے خریدنے کا معاہدہ کر چکا ہے۔

اب سمجھ لینا چاہئے بلقان میں جرمنی کے لئے میدان صاف ہو گیا ہے، دریائے ڈینیوب کی آمد و رفت پر اسے پورا اختیار ہے اور ادھر مغرب میں ٹریئسٹ کی بندرگاہ اور بحر ایڈریاٹک کے ذریعے اسے بحر روم میں

پہنچنے کا ایک رستہ مل گیا ہے جو اس کے تجارتی تسلط کو بہت ہی پائدار کرے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مشرق قریب میں کیا کرتا ہے۔ ترک ابھی تک اس کے لین دین کے جال میں اس طرح نہیں پھنسے ہیں جیسے کہ بلقان کے ملک، لیکن انگریزی سرمایہ داروں کی بے پروائی یا کوتہ اندیشی کا یہی حال رہا جو کہ اب ہے تو ترک کو جرمنی سے تعلقات بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ اس سال کئی مہینوں کی کوشش کے بعد انگلستان کے تجارتی بورڈ نے انہیں ۳ لاکھ پاؤنڈ کا تجارتی قرضہ دینا منظور کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ترک اتنے کا مال تجارتی بورڈ کی ضمانت پر خرید سکتے ہیں، لیکن ترکوں نے اسی کے ساتھ جرمنی سے بھی معاہدہ کیا ہے، اور ان کے یہاں کی پیداوار اور قدرتی ذخیروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا جرمنی کے سوا کوئی خریدار نہیں۔ جرمنی نے ایران سے بھی لین دین شروع کیا ہے، ایران سے جرمنی جانے والی آمد دو فیصدی سے بڑھ کر سنہ ۱۹۳۶ء ہی میں بارہ فی صدی ہو گئی تھی اور جرمنی سے جانے والا مال چھ سے بڑھ کر چودہ فی صدی۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہر ہٹلر نے رضا شاہ کو جرمنی آنے کی دعوت دی ہے اور شاید وہ اس دعوت کو منظور بھی کریں۔

تو اس سال تک سمجھنا چاہئے کہ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کو پوری طرح نیست و نابود کر دیا ہے، اور اسی سلسلے میں تجارت کو بلقان اور مغربی ایشیا کی طرف بڑھانے کے لئے رستہ بالکل صاف کر لیا ہے سیاست میں اب وہ ٹٹول رہا ہے کہ کدھر بڑھنے میں سب سے کم رکاوٹیں ہوں گی، نوآبادیوں کی واپسی کا معاملہ برطانیہ کی وزارت خارجہ تک نہیں پہنچا ہے تو برطانیہ کے ایوان عام میں اور ساری دنیا کے اخباروں میں تو اس کا چرچا ہو ہی گیا ہے، اور اب روس کے جنوب مغربی صوبہ اوکرائن پر جرمنی کے قبضہ کرنے کا ذکر بھی چھڑ گیا ہے آخر ستمبر کی میونخ کانفرنس کے بعد جو امید تھی کہ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان دوستی کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اس کا امکان ہو گیا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی صلح پسندی ہر ہٹلر کے جوش کو تھوڑا بہت ٹھنڈا کر سکے گی اس کا بھی مغالطہ نہیں رہا۔ جرمن اخبار برطانیہ کو ایسی الٹی سیدھی سنا رہے ہیں کہ برطانیہ کانوں میں روئی ڈالے بغیر صلح پسندی کے موجودہ مسلک پر قائم نہیں رہ سکتا۔

اٹلی | یورپ کی سیاست کا محور اٹلی اور جرمنی کا اتحاد ہے، لیکن اب آثار اس کے نظر آ رہے ہیں کہ جرمنی

کی حکمت عملی اس کا محور ہوگی اور اٹلی کی سیاست بس اس پر پالش کر کے کبھی اسے فولادی اور کبھی لکڑی کا بنا ہوا ظاہر کرتی رہے گی۔ روم برلن کا محور ۱۹۳۶ء میں قائم ہوا' اور دیکھنے میں اب بھی بہت مضبوط ہے' لیکن اس میں اٹلی کو برابر نقصان ہوتا رہا ہے اور اب بھی کسی طرح کے فائدے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مسولینی شروع میں جرمنی اور آسٹریا کے مل جانے کا مخالف تھا' اور ۱۹۳۴ء میں جب اس کا اندیشہ ہوا تو اس نے فوراً انگلستان اور فرانس سے وہ اتحاد کیا جو سٹریزا کا محاذ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد جرمنی کے امنڈتے ہوئے حوصلوں کو دبانا تھا۔ حبش کی جنگ ہوئی اور اٹلی کی برطانیہ اور فرانس سے بگڑ گئی تو ہٹلر نے مسولینی کا ساتھ دیا۔ مگر اس دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کو آسٹریا ہٹلر کے حوالہ کرنا پڑا' چکوسلواکیا کا معاملہ بھی اسی کے حق میں طے کرانا پڑا اور اب بحر ایڈریاٹک' بلقان اور مجموعی حیثیت سے مشرقی بحر روم جرمنی کے لئے خالی کرنا پڑا ہے۔ مسولینی کا جو اندازہ تھا کہ وہ جرمنی کی ہمدردی اور مدد حاصل کر کے ہسپانیہ اور مغربی بحر روم کی سیاست اور تجارت پر قبضہ کر سکے گا وہ اگر غلط نہیں تو صحیح بھی نہیں نکلا ہے' جرمنی کو ہسپانیہ کے معاملات سے جو دلچسپی تھی وہ اس سال کے اندر ختم ہوگئی ہے اور اب اٹلی کو وہی مل سکے گا جو وہ اپنے زور بازو سے حاصل کرے۔

دراصل اٹلی کا مفاد نہ جرمنی سے بالکل مل جانے میں ہے نہ برطانیہ اور فرانس سے' اس کا مفاد دونوں فریق سے سودا کرنے اور اپنے جغرافی مقام سے فائدہ اٹھانے میں ہے۔ یعنی اس کا کام صرف دغابازی اور دھونس سے چل سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست جرمنی سے ڈرتا ہے' برطانیہ سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہے اور اس سال اپریل میں کیا بھی ہے' لیکن سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا' اور ابھی اس نے فرانس سے نوآبادیوں کے مسئلے پر جھگڑنا شروع کیا ہے جس میں کوئی تعجب نہیں اگر اس کی نیت فرانس سے دوستی کرنا ہو۔ جرمنی نے نوآبادیوں کے معاملے میں اٹلی کا ساتھ نہیں دیا ہے' مگر فرانس کی حالت ایسی نازک ہے کہ اگر اٹلی اپنے ہی بل بوتے پر فرانس سے بھڑ جانے کی ٹھان لے تو بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔

فرانس | فرانس میں ۱۹۳۶ء میں قومی محاذ کی یعنی سوشلسٹ پارٹیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ انتہا پسندی کا عروج تھا' اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ اعتدال پسندی کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ فرانس کے

ایوان عام میں بہت سی چھوٹی بڑی پارٹیاں ہیں جن کے اصول مبہم ہیں اور نام غلط فہمی پیدا کرتے ہیں سوشلسٹ انتہا پسندی کا ردعمل یہ نہیں ہوا کہ نری سرمایہ داروں کی وزارت بنے، بلکہ جب کبھی ایک وزارت ٹوٹی اور دوسری بنی تو اس میں اعتدال پسند وزیروں کی تعداد بڑھ گئی، اور اس سال کے دوران میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ وزارت سے بالکل خارج کر دئے گئے ہیں۔ قومی محاذ کی وزارتیں اس سبب سے ناکامیاب ہوئیں کہ سرکاری بنک نے ان کی مخالفت کی اور ایوان نے مالی معاملات میں انھیں ضروری اختیارات دینے سے انکار کر دیا۔ اس سال اعتدال پسند وزارتوں کے لئے یہ دشواری رہی کہ مزدور ان کی مخالفت کرتے رہے، اور اس وقت بھی اس سے باز نہ آئے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ ظاہر ہے اس کا فرانس کی خارجی سیاست پر بہت برا اثر پڑا، اور جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد اور چکوسلواکیا کی تقسیم کے موقعوں پر ملک کی حالت ایسی تھی کہ برطانیہ کی خوشامد کرنے، جرمنی کا غصہ اتارنے کے لئے پرانی سیاست کو بغیر ماتم کئے دفن کرنے اور دوستوں کے ساتھ دشمنوں کی طرح پیش آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فرانس کی سیاسی حیثیت اب دوسرے درجے کی ریاستوں کی سی ہوگئی ہے، حیثیت کے ساتھ اس کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی ہے، اور اگر اس سال کی کارگذاری اور کیفیت معیار مانی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب فرانس میں دم نہیں رہا ہے۔

برطانیہ | نقصان برطانیہ نے بھی بہت اٹھایا ہے، مگر آبرو نہیں کھوئی ہے۔ برطانیہ نے ایک طرف مزدوروں میں دل کھول کر گذارے تقسیم کرکے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کرکے ملک کو بے چینی اور فساد سے محفوظ کر لیا ہے اور وہاں کوئی اندرونی مخالفتیں نہیں ہیں کہ جنھیں دیکھ کر غیر لوگ برطانیہ کو کمزور سمجھیں۔ برطانیہ کی دشواری ایک تو سرکاری ملازموں کی بے پروائی، ٹھیکیداروں کی بے ایمانی اور کارخانوں کی سستی ہے، اور دوسرے مسٹر چیمبرلین کا بڑھاپا اور ان کی یہ عادت کہ وہ اپنے ارادوں کو راز بنا کر دل میں رکھتے ہیں اور کسی کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس سے پوری بات کہیں۔ سرکاری ملازموں کی بے پروائی اور ٹھیکیداروں کی بے ایمانی کی قلعی اس وقت کھلی جب زہریلی گیس سے بچانے والے توبڑوں کے کارآمد ہونے پر بحث چھڑی، اور پھر پچھلے ستمبر میں جب جرمنی کا ہوائی حملے کرنے کا خطرہ بہت قریب نظر آرہا تھا

اور یہ راز فاش ہو گیا کہ اگر جرمنی نے حملے کر دئے تو لندن کو بمباری سے بچانے کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکے گا لیکن جمہوری حکومتیں اور خاص طور سے برطانوی حکومت خطروں کی پیش بندی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے، اور یہ کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ کارخانوں کا ناکافی اور سست ہونا، جس کا ثبوت اس سے ملا کہ برطانیہ نے پانچ سو ہوائی جہاز بنانے کا ٹھیکہ امریکہ کی ایک کمپنی کو دیا ذرا تعجب کی بات ہے، اور اس سے اس عام خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابھی تک انگریز ہی نہیں کہ لڑنا نہیں چاہتے بلکہ چاہیں بھی تو لڑ نہیں سکتے۔

یہ بھی کچھ ناممکن نہیں کہ حکومت کے کارکنوں اور سامان جنگ کے کارخانوں کی سستی برطانوی وزارت کی روح رواں مسٹر چیمبرلین کی پالیسی کا عکس ہو۔ مسٹر چیمبرلین کا خیال ہے کہ اس وقت یورپ کی جو قومیں روٹھی ہیں ان کو منانا چاہئے، اور جنگ کی تیاری کا چرچا اس خیال سے نہیں کیا جا رہا ہے کہ برطانیہ جلد سے جلد لڑنے کے لئے تیار ہو جائے بلکہ وہ نتیجہ ہے سرمایہ داروں کو روپیہ، مزدوروں کو کام اور شہریوں کو اطمینان دلانے کی خواہش کا، تاکہ مسٹر چیمبرلین فراغت کے ساتھ روٹھی قوموں کو منانے کی مناسب تدبیریں کر سکیں۔ ابھی تک اس سلسلے میں اتنا کیا جا سکا ہے کہ جرمنی کو مارچ میں آسٹریا اور اکتوبر میں سڈٹین علاقے دلوائے گئے اور اٹلی سے اپریل میں سمجھوتا کر لیا گیا۔ مسٹر چیمبرلین کو پورا یقین ہے کہ جرمنی لڑائی نہیں چاہتا، صلح و آشتی سے پنچوں کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کر کے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ چکوسلوواکیا کے جھگڑے میں پنچ بنے، ہرہٹلر سے دو مرتبہ روبرو گفتگو کرنے کے لئے جرمنی پہنچے اور اگلے سال کے شروع میں مسولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روم جانے والے ہیں۔ مسولینی نے اب تک جب کبھی برطانیہ سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تو تھوڑے ہی دنوں کے اندر گالیاں بھی دیں، جرمن اخبار میونچ کانفرنس کے بعد سے برطانیہ کی عیب جوئی کر رہے ہیں اور کبھی کبھی بے تکلف گالیاں بھی دیتے ہیں لیکن مسٹر چیمبرلین کے نزدیک اس سے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر دونوں مزاج کے ذرا تیز ہیں، مگر دل سے صلح کے خواہشمند ہیں اور ان کے ساتھ سلیقے اور صبر سے بات کی گئی تو دونوں راہ پر آ جائیں گے۔

معلوم نہیں مسٹر چیمبرلین سلیقے سے بات کرنے کے کیسے موقعے نکالنے کی فکر میں ہیں، بظاہر تو انکی

پالیسی اب تک "عزت کے ساتھ پسپائی" کی صورت اختیار کرتی رہی ہے۔ اور اگر ان کا یہ خیال صحیح ہو کہ جرمنی اور اٹلی لڑنا نہیں چاہتے تب بھی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دونوں کا فائدہ جنگ کی دھمکیاں دینے میں ہے، اور وہ یہ دھمکیاں اس خلوص کے ساتھ دیتے ہیں کہ نہ جانے کب ان کا جوش بے قابو ہو جائے اور وہ ایسا کچھ کر گذریں کہ پھر لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ بے شک مسٹر چیمبرلین نے پچھلے ستمبر میں یورپ کو ایک جنگ عظیم کے خطرے سے بچا لیا، لیکن انھوں نے ہر ہٹلر اور مسولینی دونوں کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ جتنا بھی مانگیں انھیں مل جائے گا اگر وہ مسٹر چیمبرلین کے یہ ذہن نشین کر سکے کہ ان کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو جنگ چھڑ جائیگی۔ مسٹر چیمبرلین فرانس کی سرحد کو برطانیہ کی سرحد مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے پیرو مرشد مسٹر بولڈون کہہ گئے ہیں کہ برطانیہ کی سرحد دریائے رہائن پر ہے، اگر وہ یورپ کی کسی اور ریاست کو سلامت رکھنے کی خاطر اپنی نیند خراب کرنا نہیں چاہتے۔ جرمنی مشرقی زیکوسلوواکیا، شمالی اٹلی، شمالی اور مغربی پولینڈ اور جنوب مغربی روس پر قبضہ کر لے تو ان کی بلا سے، جنوبی افریقہ کو جرمنی کی جو نوآبادیاں جنگ عظیم کے بعد ملی تھیں وہ بھی شاید مسٹر چیمبرلین جرمنی کو دلوا دیں۔ مگر ہٹلر کی ہوس اس سے بھی پوری نہ ہوئی تو پھر؟ اور اٹلی نے بحر روم اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں مانگیں تب؟ انگلستان کی طاقت بڑی ہے تو اس کی سرحد بھی ہزاروں میل لمبی ہے، اور روٹھی ہوئی قوموں کو منانے کی پالیسی مورچے کا کام نہیں دے سکتی۔

فلسطین | برطانوی سیاست کا بھانڈا شاید کبھی اس طرح سے نہ پھوٹا ہوگا جیسے کہ فلسطین میں۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے جو متضاد وعدے برطانوی مدبروں نے لڑائی کے زمانہ میں کئے تھے ان کا اب یہ نتیجہ نکلا ہے کہ فلسطین میں کسی فریق سے پوری بات نہیں کہی جا سکتی، اور یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی ہے کہ اصول اور وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر اور جو کچھ ہو چکا تھا یعنی فلسطین میں جتنے یہودی آباد ہو چکے تھے اور ملک پر حقدار ہونے کا جو خیال دنیا بھر کے یہودیوں میں پھیل چکا تھا اسے صحیح اور ضروری تسلیم کر کے سرکاری کمیشنوں کے ذریعے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جائے اور ایک عقلاً درست نظام قائم کیا جائے جسے دونوں فریق منظور کر لیں یا منظور کرنے پر مجبور کئے جا سکیں۔ اس سال جو کمیشن بھیجا گیا تھا اس نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کو رد کر دیا ہے اور اب برطانیہ کا ارادہ ہے کہ ایک گول میز کانفرنس کر کے عربوں اور یہودیوں کو اس نئے

میدان میں لڑائے اور پنچ بن کر ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

گول میز کانفرنس کی تجویز ہندوستانی سیاست کی گتھیاں سلجھانے کے لئے بہت کارآمد نکلی تھی، لیکن عرب اور ہندوستانی میں بڑا فرق ہے۔ عرب غدار ہندوستان کی انگریزی حکومت کے مسلمان خادموں کی طرح نہ تو مذہب کی آڑلے سکتے ہیں نہ نوکریاں دلواکر غداری کو قوم پروری کا رنگ دے سکتے ہیں۔ فلسطین کی بدامنی کو دور کرنے کے لئے بیس پچیس ہزار فوج کی مستقل ضرورت ہے جسے ہر وقت چوکنا رہنا پڑے گا، اور یہ فوج بھی نہ ریلوں کو چلا سکے گی، نہ سڑکوں کو جیسا کہ چاہئے محفوظ رکھ سکے گی، یہ اگر عرب باغیوں کو پکڑنے میں پولیس کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوگی تو عام آبادی کو اس کے قواعد پریشان کرتے رہیں گے اور عربوں میں یہ احساس بڑھتا رہے گا کہ ایک غیر قوم نے ان کی آزادی چھین لی ہے اور ان کی عزت بھی چھین رہی ہے۔ عربوں کی جان بازی سے عاجز آکر برطانوی حکومت سوچ رہی ہے کہ فلسطین کی حکومت بالکل فوج کے حوالے کر دے۔ ایسا کیا گیا تو انشاء اللہ فلسطین بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔

انگریز فلسطین کو اپنے لئے بھڑوں کا چھتا نہ بننے دیتے اگر یہ مسئلہ مقامی ہوتا، اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں انھیں صرف عربوں اور یہودیوں کے درمیان انصاف کرنا ہوتا۔ برطانیہ کو عربوں سے کبھی لگاؤ نہ تھا اور انگلستان کے یہودیوں سے اس وقت قرضہ لینے کی ضرورت نہیں، برطانوی انصاف پرستوں کے مدنظر دراصل ایسا انتظام ہے کہ جو انھیں مشرقی بحر روم میں ایک بڑا فوجی مرکز بنانے کا موقع دیدے، تاکہ وہ نہر سوئز پر قبضہ رکھ سکیں، بحر روم میں تجارت چاہے جو کوئی کرے، رعب برطانیہ کا ہو، اور جرمنی خشکی کے رستے ترکی، ایران اور افغانستان تک اپنی تجارت اور سیاسی تعلقات کا جال پھیلا دے تب بھی برطانوی سلطنت کا مرکزی رستہ خطرے میں نہ پڑے۔ دوسرے پہلو سے دیکھئے تو ساری دنیا کے یہودیوں کا فلسطین میں دل لگا ہے، اور چونکہ یہ یہودی ساہوکار اور سرمایہ دار ہی نہیں بلکہ بہتیرے اخباروں کے مالک ہیں، یہ برطانیہ کو بہت بدنام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں بہت سے عیسائی عرب ہیں جو باغیوں کو روپیہ دے رہے ہیں اور برلن میں عربوں نے ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں سے وہ روپیہ اور سامان جنگ شام کی طرف سے فلسطین بھجواتے ہیں۔ یہ عملی مدد کے ذریعے ہیں۔ ان کے علاوہ مصر، حجاز، شام اور عراق کے عربوں کی عام رائے برطانیہ پر دباؤ ڈال رہی ہے، اور

کوئی فیصلہ جو فلسطین کے عربوں کو انصاف کے خلاف معلوم ہو اس پر یہ سب بھی احتجاج کریں گے۔ اب دیکھنا ہے
کہ گول میز کانفرنس کس طرح اس مسئلے کو حل کرتی ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی

ہسپانیہ کی خانہ جنگی سال بھر جاری رہی اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ہسپانی
"حکومت" اب آخری مورچے پر لڑ رہی ہے، جسے "باغی" کسی طرح فتح نہیں کر پاتے۔ اب تک عدم مداخلت
کی جو تشریح کی گئی اس سے حکومت کے لئے ہزاروں دشواریاں پیدا ہوئیں اور جنرل فرینکو کو ہر طرح سے مدد
پہنچتی رہی۔ لیکن اب جنرل فرینکو کے خیرخواہ یا تو ان کی مدد کرتے کرتے تھک گئے ہیں یا جس امید میں انھوں نے
مدد کی تھی وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فون ربن ٹروپ نے فرانس کے وزیر خارجہ کو یقین
دلایا ہے کہ ہسپانیہ میں چار ہزار سے زیادہ جرمن سپاہی نہیں، اور وہ بھی لڑتے نہیں ہیں بلکہ پیچھے سے سہارا
دے رہے ہیں۔ مسولینی نے برطانیہ کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لئے دس ہزار سے اوپر اٹیلین سپاہی
واپس بلا لئے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اب بھی بہت سے اٹیلین سپاہی جنگ میں شریک ہیں اور فرینکو کے پاس
سامان بھی بہت بھیجا جا رہا ہے۔ سامان تو بہت کارآمد ہے، جس کا ثبوت ان بم کے گولوں سے ملتا ہے جو
بارسیلونا کے شہر میں گرتے ہیں اور معصوموں کا خون کرتے ہیں، لیکن سنا گیا ہے کہ جب کبھی اٹلی کی طرف سے فرینکو
پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ کرکے نہیں دکھاتے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کا سبب اٹیلین سپاہیوں
کا نکماپن ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ ابھی تک اٹیلین سپاہیوں کی تعریف کسی نے نہیں کی ہے۔

ہسپانیوں کی طبیعت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ ان کی غیروں سے کبھی بنتی نہیں، اس لئے کوئی تعجب
نہیں اگر وہ افواہیں جو بہت دنوں سے پھیل رہی ہیں کہ قومی مزاج کی بدولت اٹلی اور فرینکو کا اتحاد پھیکا ہوتا
چلا جاتا ہے صحیح ہوں، اور مسولینی کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہو کہ فرینکو اٹیلین سپاہیوں کے بل پر لڑائی
جیتے گا اور پھر اٹلی کا جس طرح کہ چاہئے احسان ماننے سے انکار کر دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑائی ختم
ہونے پر فرینکو کی سیاست پلٹا کھائے گی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہسپانیہ میں اتنی غرضیں اٹکی ہیں کہ وہ
اسے بہت کچھ خوشی سے دینے پر تیار ہو جائیں گے، مسولینی جو کچھ دینا تھا دے چکا ہے اور اب اس کے
مانگنے کی باری آئی ہے۔ غالباً اس کے مطالبے ایسے ہوں گے جنھیں منظور کرنے میں فرینکو تامل کرے گا اور

برطانیہ اور فرانس پورا زور لگائیں گے کہ وہ انھیں منظور نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسولینی نے اتنا سب داؤں لگانے کے بعد بھی انگریزوں سے سمجھوتا کیا ہے، اوران کے ذریعے سے بھی اپنا حق محفوظ کرانے کی گنجائش رکھی ہے، برطانیہ جس بات پر راضی ہوجائے اس کے خلاف فرانس کی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔

چین اور جاپان کی جنگ | ہسپانیہ کی طرح چین پر بھی سیاست کے گدھ منڈلا رہے ہیں اور نہ جانے کب تک منڈلاتے رہیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی ہر فریق کا اندازہ غلط ثابت ہورہا ہے اور دونوں کی ضد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ جاپان نے یہ جنگ اس یقین کے ساتھ شروع کی تھی کہ چینی حکومت میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے فوجیں تیار نہ کرسکے گی، چین کے سرمایہ دار، زمین دار اوران سے بھی زیادہ وہ لوگ جو اطمینان سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جاپانی حکومت کا خیر مقدم کریں گے اور کہیں زبردستی اور کہیں اتحاد عمل اس کی ہر مشکل آسان کردے گا۔ لیکن چینیوں نے بہت جم کر مقابلہ کیا، متواتر شکستیں کھانے کے باوجود چینی حکومت کا قوم میں اثر و اقتدار بڑھتا رہا، سرمایہ دار جاپانیوں کی ہوس، زمیندار دیہاتیوں کے غصے اور غدار قوم پرستوں کے انتقام سے ڈر کر بڑی حد تک جاپانی حکومت سے الگ رہے ہیں، اور چینی فوجوں نے قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کرکے جاپانیوں کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس وسیع علاقے کو جو انھوں نے فتح کرلیا ہے اپنا کہہ سکیں۔ لیکن دوسرے پہلو سے دیکھیے تو جاپانی فوج نے ہر مورچہ فتح کیا ہے، آہستہ آہستہ چینی حکومت اور فوج کو جنوب مغرب کی پہاڑوں میں بند کردیا ہے اور انھیں وہاں اتنے عرصے تک بند رکھ سکتی ہے کہ اخلاقی اطمینان اور قومیت کے جوش کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ رہ جائے۔ جاپانی قوم کی تنظیم ایسی ہے اوراس میں ایثار کا مادہ اس افراط سے ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئی جو یہ کہتے تھے کہ جاپان کا دیوالہ نکل جائے گا یقیناً غلط ثابت ہوگی۔ جاپانیوں کا عزم اور استقلال بھوک کے پیٹ سے ڈرنے والا نہیں۔

لیکن چین بھی بالکل بے بس یا لاوارث نہیں۔ چینی حکومت کو اس کی امید نہ تھی کہ جاپان کا میدان جنگ میں مقابلہ کیا جاسکے گا؛ اور چینیوں میں قومیت کا جذبہ اس طرح بیدار ہوگیا ہے کہ جنگ کے نتیجے کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب چین کے تمام بڑے شہر اور آباد علاقے جاپانیوں کے قبضے میں ہیں، اور سوا اس کے کہ دیہات میں جاپانی حکومت کا نہ اثر پھیلا ہے اور نہ زور چلتا ہے، چینی اپنی شکست سے انکار نہیں کرسکتے۔

لیکن جاپان کسی کو دوست بنانا جانتے ہی نہیں، اور ان کی سیاست ذرا ذرا سی بات پر غرانے اور دانت دکھانے لگتی ہے، اس لئے چینیوں کی یہ عداوت بہت دنوں تک قائم رہے گی، اور موجودہ چینی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تب بھی جاپانیوں کو سارے ملک میں فوج رکھنا اور اس پر اتنا روپیہ خرچ کرنا ہوگا جو ان کی آمدنی کو کھا جائیگا اور غالباً سرمایہ دار بھی اتنے مطمئن نہ ہو سکیں گے کہ چین میں جتنا کہ چاہیئے سرمایہ لگائیں۔ چینی حکومت کا خاتمہ بھی جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اب روس اس پر مجبور ہے کہ اسکی مدد کرے اور دوسری قومیں بھی جاپانیوں کی ہوس دیکھ کر اسی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تجارت کا اصول یہ ہے کہ ہر طرح اپنے فائدے کی فکر کرے، اور اسی سبب سے انگریز اور امریکن جن کا کروڑوں کا سرمایہ چین میں لگا ہے اپنے کارخانوں اور کاروبار کو جہاں تک ممکن تھا بچاتے اور جنگ کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کا کوئی امکان تھا نہیں کہ لڑائی میں چینی جیت جائیں، اور اب تک کوئی چینی حکومت ملک میں اتنا انتظام نہیں کر سکی ہے کہ تجارت اطمینان سے اپنا کام کر سکے، اس لئے انگریز اور امریکی سرمایہ داروں نے اپنی ہمدردی ضائع نہیں کی، اور چین کی مدد کرنے کے بجائے جاپان سے ہر طرح بنائے رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جاپان نے اب صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ چین کا دروازہ بین الاقوامی تجارت کے لئے کھلا رکھنے پر راضی نہیں، اور جاپانی سیاست اور تجارت کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ چین میں جاپانی حکومت قائم ہوگئی تو یہی نہیں کہ آزاد تجارتی مقابلے کی مطلق گنجائش نہ رہے گی بلکہ ہر طرح سے جاپانی تجارت کو فائدہ اور باقی تمام قوموں کو نقصان پہنچانے کی منظم کوشش کی جائے گی، یہاں تک کہ اور تمام قوموں کی تجارت چین کو چھوڑ بھاگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر برطانیہ اور امریکہ اب نئے سرے سے اپنے نفع نقصان کا حساب لگا رہے ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر چین کی مدد کرنے کے سوا انھیں اپنا نقصان پورا کرنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھے۔

انگلستان کے لئے یہ بات خاص طور سے خطرناک ہے کہ جاپانی سیاست نفع نقصان کا حساب نہیں لگاتی، ضد کرتی ہے اور اپنی قوم کے مصائب سے بالکل نہیں ڈرتی۔ انگلستان نے مانچو کو پر جاپان کا قبضہ ہو جانے دیا۔ اس امید سے کہ کچھ دنوں کے لئے جاپان کا پیٹ بھر جائے گا۔ لیکن جاپان سیر نہ ہوا

اور چین پر منہ مارا۔ اس پر بھی انگلستان نے چوں نہیں کی، مگر جاپان کی ہوس کا وہی عالم ہے۔ اب انگلستان کو ایک تو اس کی شکایت ہے کہ چین میں اس کا جو کاروبار تھا وہ ختم کیا جا رہا ہے اور دوسرے اس کا خوف کہ جاپان نے چین کو بالکل فتح کر لیا تو وہ اور پاؤں پھیلائے گا۔ اور پھیلائے گا تو کدھر؟ آسٹریلیا کی طرف، ایشیا کے جنوب مشرقی جزیروں کی طرف، ہند چینی کی طرف، یا پھر برما میں، جس کی سرحد چین سے ملی ہوئی ہے اور جو خام مال اور قدرتی ذخیروں کا ایک بے مثل خزانہ ہے۔ اب انگریز جاپانیوں کی مخالفت نہ کریں تو کیا کریں

زبردست ظالم کی سیاست اسی طرح اپنی جڑ کاٹتی ہے۔ جاپان کی ہوس حد سے گزر نہ جاتی تو مانچوکو کی طرح چین بھی اس کا تھا اور مشرقی ایشیا کی فرماں روائی بھی۔ اسی معاملے کو مگر دوسرے پہلو سے دیکھئے تو قدرت اپنا کام بنا رہی ہے۔ اعتدال کی مصلحت ظلم کی سمجھ میں آجائے تو دنیا میں انصاف کا نام تک باقی نہ رہیگا۔

ہندوستان

صوبائی خود مختاری

ہندوستان کے تمام خود مختار صوبوں کے لیے ۱۹۳۸ء کا سال تعمیری کاموں اور اصلاحی کوششوں کا سال تھا۔ لیکن کانگریسی صوبوں میں خصوصیت کے ساتھ کام کو زیادہ یکسوئی، اطمینان اور حوصلہ مندی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے کئی وجوہ تھے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی تھی اور باقی صوبوں میں پنجاب کو چھوڑ کر کانگریس کی حیثیت ایسی تھی کہ اتحادی حکومت کے بنانے کا اسے موقع تھا۔ چنانچہ بعد میں آسام میں مکمل طور پر اور سندھ میں نامکمل طور پر کانگریسی حکومت بنا بھی لی گئی۔ بنگال کی غیر کانگریسی اتحادی وزارت کو کئی موقعوں پر نازک دوروں سے گذرنا پڑا اور اب بھی اس کا امکان ہے کہ وہاں کانگریس کی اتحادی حکومت قائم ہو جائے۔ ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں اپنی پارٹی کی طاقت کو دیکھ کر قدرتی طور پر اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت اور بھی زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم تھی، کانگریس کے جتنے کارکن اور رہنما اسمبلیوں کے اندر کام کر رہے تھے ان سے زیادہ قابل زیادہ منضبط، زیادہ مخلص، زیادہ آزمودہ، زیادہ عمر کے پسند اور زیادہ ٹھوس کام کرنے والے کارکن اور رہنما اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے۔ درحقیقت کانگریس کی اصلی قوت اسمبلیوں سے باہر تھی اور اسمبلیاں صرف اس باہر کی قوت کو مضبوط بنانے کے لئے اور اس کے اغراض اور احکام کی پورے طور پر پابند اور مطیع ہو کر کام کر رہی تھی۔ کانگریسی حکومتیں صرف اس لئے بنائی گئی تھیں تاکہ باہر کا کام اچھی طرح کیا جا سکے اور اس میں حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔

چنانچہ کانگریس نے اس زمانے میں ہر ضلع، ہر تحصیل اور بہت سے گاؤں میں اپنے نہایت مخلص، معتمد اور ایثار پیشہ کارکنوں کا جال پھیلا دیا۔ کانگریس نے دراصل دو متوازی مشینوں کے ذریعے سے اپنے تعمیری کام

کو چلایا۔ ان میں سے ایک مشین کے کل پرزے اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے جن پر اسے مکمل اور آخری اختیار حاصل تھا اور جن پر وہ پورے طور پر اعتماد کر سکتی تھی اور دوسری مشین کے کل پرزے وہ تھے جو حکومت برطانیہ کی طرف سے اسے دے گئے تھے۔ جو ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی دفعات کے اندر رہ کر تو کانگریسی وزراء کی اطاعت کر سکتے تھے لیکن اس سے باہر ان کی وفاداریاں بھروسہ کے لائق نہیں تھیں۔ اس لئے جہاں تک اپنے تعمیری کام اور عوام میں اپنا رسوخ بڑھانے کے سلسلہ میں، کانگریسی حکومت، اس دوسری جماعت سے مدد لے سکتی تھی وہاں تک تو اس نے ان کی مدد لی۔ لیکن اس سے زیادہ پروپیگنڈا کرنے اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کانگریس نے اپنی نجی مشین کے کل پرزوں کو استعمال کیا اور دیہاتوں میں جا کر ضلع اور صوبہ کی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں لاکھوں کی تعداد میں کسان شریک ہوئے اور جن کی اہمیت اور اثر صوبہ کے وزیروں کی شرکت کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔

پھر زمینداروں اور مل کے مالکوں کے خلاف جن میں سے اکثر کانگریس کی مخالفت کرتے رہے تھے زبردست مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں لیکن اس سلسلے میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کو کانگریس نے بالکل مایوس نہیں کیا بلکہ تھوڑا سا پریشان کر کے تحفظ کا اطمینان دلا دیا تاکہ وہ بالکل بد دل ہو کر پورے طور پر برطانیہ کے طرفدار نہ بن جائیں۔

ملک کی دیسی زبانوں اور انگریزی کے اخباروں کی بھی سرپرستی کی گئی۔ ان میں سے بہت سے اخبار تو پہلے سے ہی کانگریس کے حامی تھے اور بہت سے اس زمانے میں حامی بن گئے۔ باہر کے ملکوں میں بھی خصوصاً برطانیہ میں پروپیگنڈے کا معقول انتظام کیا گیا۔

ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا ایک بڑا گروہ چونکہ کانگریس کے ساتھ ابتدا سے رہا ہے اور ملک کی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ جس کی کانگریس زبردست حامی ہے، اپنے مفاد کو وابستہ سمجھتا ہے اس لئے کانگریس کو مالی دشواریوں کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا۔ پھر اس زمانے میں تو کانگریس کو صوبوں کی آمدنی کے وسائل پر بھی پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس لئے مالی وسائل کی طرف سے کانگریس کو پورے طور پر بے فکری رہی۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی صورت حال کی نزاکت اور حکومت برطانیہ کی پریشانیاں بھی کانگریسی

حکومت کے لئے ایک برکت ثابت ہوئیں۔ جنگ کا خطرہ برابر قائم رہا اور برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو مطمئن، پر امن اور دوست رکھنے کی پالیسی پر پوری طرح عمل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں برطانیہ کی برابر یہ خواہش رہی کہ ہندوستان میں ایک ایسی طاقتور جماعت برسر اقتدار رہے جس سے ضرورت کے وقت سمجھوتہ کیا جا سکے تاکہ سمجھوتہ کے بعد ہر طرح کے خطروں اور اندیشوں کی طرف سے اس کے اشتراک عمل کی وجہ سے اطمینان ہو جائے۔

یہ تمام وجوہ ایسے تھے جن کی بنا پر کانگریسی حکومتیں بہت سے ان کاموں کو جرأت اور حوصلہ کے ساتھ کر سکیں جن کو کرنے میں دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو کانگریس کی رہنمائی کے بغیر یا تو پس و پیش ہوا یا اگر ہمت کر کے شروع کیا تو بعد میں سخت مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

صوبوں کی حکومتوں کی کچھ کارگزاریاں تو ایسی ہیں جن کی نوعیت منفی ہے ؎

مرا بہ خیر تو امید نیست بد مرساں

اور کچھ ایسی جن کی نوعیت اثباتی ہے۔ پہلی کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو نہیں ہونے دیا جن سے صوبوں کی خود مختاری کم یا ختم ہو سکتی تھی اور دوسری کا یہ کہ انھوں نے ایسے کام کئے جن سے واقعی رعایا کی حالت میں پہلے کے مقابلہ میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔

منفی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ان حکومتوں نے ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی ان دفعات کو جن کا تعلق "تحفظات" سے تھا عملاً بے کار کر دیا۔ پندرہ سولہ مہینہ میں ایک مرتبہ بھی گورنر کو اپنے "خاص اختیارات" یا "اختیار تمیزی" کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ تو اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلہ میں نہ انڈین سول سروس یا کسی دوسری سروس کے کسی ممبر کے لئے۔ قانون اور امن کی حفاظت اور فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام بھی وزیروں نے خود ہی کر لی اور اس کام کے لئے ان اختیارات کے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جو ان سے پہلے برطانوی حکومت خود ان کے خلاف استعمال کیا کرتی تھی۔ اس پر کانگریس کا انتہا پسند طبقہ کانگریسی وزیروں اور کانگریس کے برسر اقتدار رہنماؤں سے جنھوں نے ان کی تائید کی سخت ناراض بھی ہو گیا ہے۔ لیکن گورنر کو بہرحال اپنے اس تحفظی اختیار کو استعمال

کرنے سے محروم رکھا گیا۔ ممکن ہے گورنر اپنی جگہ پر خوش ہو کہ اس ناخوش گوار کام سے مجھے نجات ملی اور جس کام کو مجھے بہ اکراہ کرنا پڑتا وہ ان لوگوں نے اپنی خوشی سے کر دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر محرومی کا یہ سلسلہ اسی طرح کچھ سالوں تک اور چلتا رہا تو یہ روایت قائم ہو جائے گی کہ گورنر کو جو اختیارات دئے گئے ہیں وہ استعمال کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ محض نمائشی ہیں جیسے ہاتھی کے دانت ہوتے ہیں۔ جو بظاہر تو بہت بڑے اور خوف ناک معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سے کاٹنے اور چبانے کا کام کبھی نہیں لیا جاتا۔ یہ تو وزارتوں کا منفی کارنامہ ہوا۔

اثباتی کارناموں کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۳۵ء کے دستوری قانون کے ماتحت صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ مالیات کو مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومت کے درمیان اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اس کا توازن قائم نہیں رہا ہے۔ آمدنی کے ترقی کرنے والے ذرائع مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں جو ملک کی آمدنی کے ایک بڑے حصہ کو صرف فوجوں پر اور سرکاری قرضوں کے سود کی ادائگی پر صرف کر دیتی ہے جس کی وجہ سے قومی تعمیر کے تمام شعبے پیاسے رہ جاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ کانگریسی حکومتیں شراب نوشی کو بند کرنے کا عہد کر چکی ہیں اور لگان کے اس غیر معمولی بوجھ کو بھی ہلکا کرنا چاہتی ہیں جو چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کو پیسے ڈال رہا ہے۔ ان کے اختیارات کے محدود ہونے کا اندازہ صوبہ مدراس کی مثال کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس صوبہ کی کل آمدنی سترہ کروڑ ہے اس میں سے ۴½ کروڑ روپیہ نشہ کی چیزوں کی فروخت سے اور ۷ کروڑ زمین کی مال گزاری سے وصول ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مصارف کو وسیع کرنے کی گنجائش جس قدر کم ہے وہ ظاہر ہے۔ صوبہ کی حکومتیں اپنے کاموں کو نئے ٹیکس لگا کر ہی چلا سکتی ہیں لیکن جب تک ملک کی پوری مالی اور معاشی عمارت کو نئے سرے سے تعمیر نہ کیا جائے۔ امیروں پر غریبوں سے نسبتاً زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے انیاہ کن فوجی اخراجات کو گھٹا کر نصف نہ کیا جائے اور سول ملازموں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور غیر دولت آفرین قرضوں کے سود کو کم نہ کیا جائے، اس وقت تک قومی تعمیر کے محکموں کی ترقی اور توسیع کا امکان بہت کم ہے۔

لیکن ان محدود اختیارات کے باوجود صوبہ کی وزارتیں جو کچھ کر سکتی تھیں اس کے لئے پوری کوشش کر رہی ہیں۔ سب صوبوں میں زمین کے لگان اور مالگذاری کو کم کرنے اور کسانوں کو زیادہ حقوق دینے کے

لئے قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ یو پی۔ اور صوبہ بہار کے لئے یہ مسئلے خاص طور پر بہت اہم بن گئے تھے۔ صوبہ بہار میں تو زمینداروں اور کسانوں میں اس معاملہ میں ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ یو۔ پی۔ میں بھی اس قسم کے سمجھوتہ کی کوشش کی گئی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسی طرح کسانوں کو قرضہ کے بوجھ سے نجات دلانے، کم شرح سود پر روپیہ حاصل کرنے، مال کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے اور دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ پنجاب میں ان قوانین کا بڑا چرچا رہا۔ حکومت کے مخالفوں نے ان کو "کالے قوانین" اور حکومت کے حامیوں نے "سنہرے قوانین" کے نام سے موسوم کیا۔ اصلاح دیہات کی طرف بھی توجہ کو بڑھا دیا گیا ہے۔ دیہی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی اور امداد کے کام سے بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مل کے مزدوروں کے فائدہ کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ مزدوروں کی انجمن کی طرف سے بمبئی کے تجارتی تنازعات کے قانون کی بڑی مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ اس میں مل کے مالکوں کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف ایک اسٹرائک کرنا چاہا جس کی کانگریسی حکومت نے سخت مخالفت کی۔ بڑی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی ایک صنعتی تنظیم کمیٹی کانگریس کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے جس کے جواہر لال جی چیرمین ہیں۔ اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ ملک میں جو چند بڑی صنعتیں قائم ہو چکی ہیں مثلاً پارچہ بافی، شکر سازی، جوٹ، لوہا اور فولاد اور قوت محرکہ پیدا کرنے والی صنعتیں ان کو پوری ترقی دی جائے اور دوسری طرف ایسی صنعتیں جیسے موٹر کار، دزنی مشینیری اور دزنی کیمیاوی صنعتیں وغیرہ ان کو شروع کیا جائے۔ بنیادی صنعتوں کی طرف بھی جن پر تمام بڑی، درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کا انحصار ہوتا ہے خاص طور پر توجہ کی جائے۔

اس کے علاوہ تعلیم کی اصلاح کی کوشش کو بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں ذاکر حسین کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق بہت سے صوبوں میں ٹریننگ اسکول اور تجربے کے مدرسے قائم کر دئے گئے ہیں۔ بالغوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم کی نئی تنظیم کے لئے بھی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ لیکن وسائل کی کمی کی بنا پر ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

کانگریسی صوبوں میں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں اور موجودہ حالات

میں کسی بڑی اصلاح کا کرنا ممکن نہیں ہے خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر ان ہی کاموں کی طرف توجہ کی جائے جن سے پرانے ساتھیوں کی رفاقت اور وفاداری کو مضبوط کیا جا سکے اور نئے لوگوں کو زیادہ تعداد میں اپنا طرفدار بنایا جا سکے اور یہ سب اس لئے کیا گیا تاکہ جب نئے انتخابات ہوں یا حکومت سے جنگ کرنا پڑے تو زیادہ لوگوں کی ہمدردی اور امداد حاصل ہو سکے۔ سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا۔ بہت سی کتابوں سے امتناعی احکام اٹھا لئے گئے ہیں۔ ضبط شدہ جائدادوں کی واپسی کا مسئلہ بھی زیر غور رہا۔ سیاسی فضا میں بہت زیادہ آزادی محسوس کی جانے لگی۔ کانگریسی جماعت کا ہر فرد محسوس کرنے لگا کہ حکومت میری ہے۔ ہم چشموں میں اعزاز اور مالی فائدہ بھی حاصل ہوا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے کانگریس کو اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعض صوبوں میں مثلاً سی۔ پی۔ میں کانگریسی کارکنوں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے کانگریس کے بعض پرانے اور نہایت مخلص کارکن اس سے علیحدہ بھی ہو گئے لیکن ان کی مخالفت کو بہت کم اہمیت حاصل ہوئی۔

اگر برطانوی سیاست دانوں کا کانگریس کو عہدے دینے سے مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے لوگوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ذاتی خودغرضیاں ترقی پا جائیں گی تو ان کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ خودغرضی کی چند مثالوں کو اگر نظرانداز کر دیا جائے تو بصورت مجموعی کانگریس کا ڈسپلن نہایت قابل تعریف نظر آئے گا۔ حکومت اور اقتدار کی حالت میں ان کی یکجہتی اور وفاداری کسی اعتبار سے بھی جنگ اور آزمائش کے زمانہ سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ ڈسپلن کی گرفت اس زمانہ میں اتنی سخت ہو گئی کہ جس سے مخالفوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کا ہے۔ کانگریس کی ہائی کمانڈ صوبوں کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کرتی ہے اور وزیروں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ وزارتوں کو صرف اپنی اسمبلی کے ممبروں اور اپنے منتخب کرنے والوں کو جواب دہ ہونا چاہیے اور ان پر کسی دوسرے شخص یا جماعت کا کوئی خارجی دباؤ نہ پڑنا چاہیے۔ وزارتیں اپنے صوبہ کی رہنما خود ہیں ان کی رہنمائی یا نگرانی کرنے کا حق صوبوں کی کسی جماعت مثلاً صوبہ کانگریس کمیٹی یا باہر کی کسی جماعت یعنی آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی یا پارلیمنٹری بورڈ کو نہیں پہنچتا۔ اس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہماری

جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ہم پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم اتحاد و یک جہتی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم اسمبلیوں میں کام کرنے کے لئے نہیں گئے ہیں بلکہ اسمبلیوں کو ایک محاذ جنگ بنانے کے لئے گئے ہیں۔ ہمارا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا ہے اور ہمارے تمام کام اسی اعلیٰ مقصد کے پابند ہیں اور اس اعلیٰ تر مقصد کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا فیصلہ وہی لوگ بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں جو اسمبلیوں سے باہر تمام ہندوستان کو آزاد کرانے کی تجویزوں اور منصوبوں پر غور کر رہے ہیں اور جن کو پوری قوم کا اعتماد اور اعتبار حاصل ہے۔

فیڈریشن ۱۹۳۵ء کے دستور کے مرکزی حصہ یعنی وفاقی حصہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس سال بھی برابر جاری رہیں، ریاستوں کے حکمرانوں سے حکومت ہند مشورے کرتی رہی۔ گاندھی جی کی لارڈ لنتھگو، ویسرائے اور میور ہیڈ وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ویسرائے کئی مہینہ تک انگلستان میں بھی رہے۔ کانگریس بھی اس طرف سے غافل نہیں رہی۔ تجویزیں اور منصوبے بناتی رہی۔ بیانات اور قرار دادیں شائع کرتی رہی۔ بھولا بھائی اور جواہر لال صورت حال کا مطالعہ کرنے کے لئے انگلستان بھی گئے۔ مسٹر ستیہ مورتی نے بھی اپنی پرانی عادت کے مطابق اعتدال پسند لوگوں کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کر دی۔ سوبھاش چندر بوس صدر کانگریس نے اعتدال پسندی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے ساتھ کانگریس نے اخلاقی ہمدردی کا اظہار کیا اور بالواسطہ امداد بھی کی جس سے بہت سی ریاستوں میں ان تحریکوں نے بڑی قوت اختیار کر لی۔ گولیاں چلیں جانیں گئیں، بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں۔ تحریک کو دبانے کے لئے اور مختلف کارروائیاں اختیار کی گئیں۔ لیکن یہاں بھی کانگریس نے وہی رویہ اختیار کیا جو اس نے صوبوں میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ رعایا کو کچھ حقوق دلا کر حکمرانوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے کہ اگر وہ ذمہ دار حکومت قائم کر کے اپنی ریاستوں میں کانگریسی یا قومی خیال کی وزارت کے قائم ہونے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے تو ان کے حکمرانی کے حق کا کانگریس تحفظ کرے گی۔ ویسرائے نے اپنی کلکتہ کی تقریر میں فیڈریشن کو بلا کسی ترمیم کے جلد نافذ کرنے کی طرف اشارہ کیا جس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے تری پورہ کانگریس کے بعد سول نافرمانی شروع کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ

کانگریس اور لیگ کے تعلقات اس پورے زمانہ میں نہایت ناخوشگوار رہے ہیں۔ ابتدا میں الزامی شکایتوں اور گفتگوئے مصالحت کا وہی غیر نتیجہ خیز سلسلہ جاری رہا جو اس سے پہلے کے دو سالوں میں جاری رہ چکا تھا۔ پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے جناح نہرو خط و کتابت کو کسی شخص نے اڑا کر شائع کر دیا۔ اس کا کچھ دنوں تک چرچا رہا۔ پھر دوبارہ گفتگوئے مصالحت شروع ہوئی جس میں مہاتما گاندھی اور سوبھاش چندر بوس نے مسٹر جناح سے گفتگو کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے کانگریس کی زیادتیوں، بدعنوانیوں اور بدنیتیوں کے خلاف احتجاج ہوتے رہے۔ پھر بھی لوگوں کو یہ امید رہی کہ ممکن ہے لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن سال کے اخیر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اور اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لیگ کی معرفت نہیں بلکہ براہ راست مسلم عوام سے رابطہ پیدا کرے گی اور اس کے لئے زیادہ منظم طور پر کوشش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

لیگ کی مقبولیت اس زمانہ میں مسلم عوام میں بڑھتی رہی۔ جہاں کہیں لیگ کے جلسے ہوئے یا جلوس نکالے گئے بہت بڑی تعداد میں لوگ ان میں شریک ہوئے لیکن اس کے باوجود سندھ میں لیگ کی وزارت قائم کرنے میں مسٹر جناح کو ناکامی ہوئی۔ اسی طرح آسام میں سر سعد اللہ کی لیگی وزارت جسے دراصل یورپین اور مسلمانوں کی اتحادی وزارت کہنا چاہیئے (کچھ مسلمانوں کے کانگریسی پارٹی میں مل جانے کی وجہ سے) ختم ہو گئی۔ بنگال کی لیگی اتحادی وزارت کے بارے میں بھی جو یورپینوں کے اتحاد کی وجہ سے قائم ہے کئی دفعہ ٹوٹنے کی افواہیں مشہور کی گئیں لیکن ابھی تک تو وہ سخت جان ثابت ہوئی ہے اگرچہ ایک دفعہ ٹوٹ کر دوبارہ بن چکی ہے اور اس کے کچھ مسلمان ممبر کانگریس کی پارٹی سے جا ملے ہیں۔ اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کا سندھ، آسام اور بنگال میں اس طرح مسلم لیگ سے علیحدہ ہو جانا لیگ کی مضبوطی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے نظام کی اندرونی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ لیگ (جو اپنے آپ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کہتی ہے) کانگریس کے خلاف ہے پھر بھی مسلمان، کانگریس کے ساتھ معاملہ اور ساز باز کرتے رہے خصوصاً سندھ جیسے صوبہ میں جہاں مسلمان ۷۱ فی صدی کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے اندر مسلم لیگ کے لئے بہت بڑی دعوت فکر و عمل موجود ہے۔

صنعتوں کے لئے تنظیمی کمیٹی | اکثر وہ چیزیں جو قریب ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بہت بڑی نظر آتی ہیں جب دور ہٹ جاتی ہیں تو زیادہ بڑی نہیں رہتیں۔ یہی حال واقعات کا بھی ہے۔ ہندو مسلم اختلاف کے واقعات جن سے آج کل اخباروں کے صفحے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں یا کسانوں اور زمینداروں، مل کے مالکوں اور مزدوروں اور کابینہ کے وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے وہ جھگڑے جنھیں بہت نمایاں جگہ دی جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ بجائے خود آئندہ کے مورخ کو دریا کے سطح کی محض ہلکی لہریں نظر آئیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں اور گہری اور تختہ الٹ دینے والی موجیں وہ ثابت ہوں جو اس وقت نگاہ سے چھپی ہوئی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ گذشتہ سال کے واقعات میں صنعتی تنظیمی کمیٹی کے تقرر کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے۔ اس کمیٹی کی کوششوں کے زیر اثر ہندوستان کی زندگی میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی ان کا اثر ان تبدیلیوں سے کئی گنا زیادہ بڑا ہوگا جو کسانوں کے لئے قوانین بنا کر اس وقت کی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے حقیقی مسئلہ کا تعلق تقسیم دولت سے اتنا نہیں ہے جتنا پیدائش دولت سے ہے۔ کسانوں کے لئے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان سے زمینداروں کا ممکن ہے بہت کچھ نقصان ہو جائے لیکن ان سے کسانوں کے پلے کچھ زیادہ نہیں پڑے گا۔

گذشتہ اکتوبر میں دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس کے ختم ہو جانے کے بعد مسٹر گیری وزیر صنعت مدراس کی دعوت پر تمام کانگریسی صوبوں کے صنعتی وزرا کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کے سامنے سوال یہ رکھا گیا تھا کہ آیا مختلف صوبوں میں بڑے پیمانہ کی نئی صنعتوں مثلاً موٹر سازی کی صنعت وغیرہ کو حکومتوں کی مربیانہ سرپرستی میں فوراً شروع کرا دیا جائے یا صوبوں کے باہمی مقابلہ اور ملک کے سرمایہ کے مسرفانہ استعمال کا سد باب کرنے کے لئے ایک مناسب منصوبہ پہلے سے بنا لیا جائے تبادلہ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ معاملات اتنے سادہ اور سہل نہیں ہیں کہ ان کا فیصلہ ایک دو جلسوں کی عام گفتگو سے ہو جائے اس کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی بنانے کی ضرورت ہے جس میں فنی اور مالی ماہروں کا شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ اور اس کمیٹی کا پہلا جلسہ گذشتہ دسمبر میں جواہر لال جی کی صدارت میں بمبئی میں ہوا۔ اور اب اس کی طرف سے ایک ہمہ گیر سوال نامہ شایع کیا گیا ہے۔

صدمات | گذشتہ سال چار عزیز ہستیوں کی موت کے صدمات کو ہمیں برداشت کرنا پڑا یعنی ڈاکٹر اقبال مرحوم غازی

مصطفیٰ کمال پاشا مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور بیگم انصاری مرحومہ۔

ڈاکٹر اقبال | ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا دنیائے اسلام اور انسانیت پر جو بیش بہا احسان ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے کبھی بھی بھلایا جا سکے۔ نئی نسلیں آتی رہیں گی اور اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتی رہیں گی اور اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتی رہیں گی۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ فوت ہو گئے غلطی ہے۔ وہ مرے نہیں بلکہ دائمی زندگی انھوں نے حاصل کر لی۔ ہم سب کے دل پہلے کی طرح اب بھی ان کے کلام کی لطافتوں اور بلندیوں سے معمور ہیں اور ہم میں سے ہر شخص حسب استعداد و حیثیت ان سے لطف اور فیض حاصل کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

غازی کمال پاشا | غازی کمال پاشا ہرچند ہندوستانی نہیں تھے اور ہندوستان کے واقعات میں ان کی وفات کا تذکرہ بعض لوگوں کو شاید عجیب معلوم ہو گا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خلافت کی تحریک کے زمانہ میں ترکی کی مملکت صوبہ مدراس سے بھی زیادہ قریب رہ چکی ہے اور ترکی کی سیاست ہندوستان کی سیاست سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ترکی کے ہیرو مصطفیٰ کمال کو ہندوستان کا ہیرو کہنا غلط نہیں ہے۔ چنانچہ جس طرح ہندوستان کے طول و عرض میں غازی مصطفیٰ کمال کے انتقال کا ماتم کیا گیا ہے اس سے اس بات کا پورا ثبوت بھی ملتا ہے ترکی کی مملکت کو زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی اور استقلال کی راہ پر لگانے میں مصطفیٰ کمال کا جو حصہ ہے وہ اتنا مشہور ہے کہ اس کے لئے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مملکت ترکی اسلامی دنیا اور انسانیت اپنے اس محسن کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

مولانا شوکت علی | مولانا شوکت علی کی موت ایک نہایت قریب ترین عزیز کی موت ہے مسلم عوام کے دل جس طرح علی برادران کی طرف کھنچتے تھے ویسے کسی دوسرے رہنما کے لئے کبھی نہیں کھنچے۔ علی برادران کی پرانی ہردلعزیزی خلافت تحریک کے بعد بہت کچھ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود آج بھی مسلم لیگ کے لئے مولانا شوکت علی ایک نہایت زبردست ستون تھے اور کانگریسی امیدواروں کے خلاف مسلم لیگ کو جو کامیابیاں ضمنی انتخاب میں ہوئی ہیں ان کا سہرا بہت بڑی حد تک مولانا شوکت علی مرحوم کے سر ہے۔ مولانا شوکت علی نے اپنی پوری زندگی ایک وسیع القلب انسان کی حیثیت سے گذاری۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں سے تھے۔ اولڈ بائے کی حیثیت سے علی گڑھ سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ ترکی پر جب

جنگ بلقان اور طرابلس کے سلسلہ میں مصیبت نازل ہوئی تو بے چین ہو گئے اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس ہمدردی کی وجہ سے چند وارہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ جنگ عظیم کی شکست کے بعد جب ترکی کے حصہ بخرے کیے گئے اور مقامات مقدسہ پر غیر مسلموں کا اثر بڑھنا شروع ہوا تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ خلافت تحریک کو شروع کیا اور جس بڑے پیمانہ پر چلایا وہ ان ہی جیسے عظیم الجثہ اور عظیم المرتبت شخص کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی اسلامی ممالک کی سیاسیات اور ان کی فلاح و بہبود سے ان کی دلچسپی آخری دم تک قائم رہی۔ مرحوم صاف دل اور صاف گو آدمی تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے لیکن زمانہ ایسا ناساز گار رہا کہ ان کی یہ دلی تمنا ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔

بیگم انصاری | بیگم انصاری مرحومہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی رفیقہ حیات ہونے کی وجہ سے قوم کی عزت و محبت کا مسکن تھیں مرحومہ کے دل میں بھی قوم، ملت اسلامی اور انسانیت کی محبت اتنی ہی زیادہ تھی جتنی ڈاکٹر انصاری مرحوم میں تھی۔ مرحومہ نے ڈاکٹر انصاری کی غیر طبی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ جامعہ ملیہ کو عطا فرمایا تھا اور چین کو جو طبی مشن روانہ کیا گیا ہے اسے ڈاکٹر انصاری کے آپریشن کے اوزار عنایت فرمائے تھے۔

خدا ان مرحوموں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

(از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن))

تہذیب کا لفظ ہمارے زمانے کی عجائبات میں سے ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مہذب ہونے کا یقین رکھتا ہے، ہر قوم اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنی تہذیب کی قدر کرے اور دنیا سے اس کی قدر کرائے۔ لیکن تہذیب کے معنی پوچھئے تو ہر شخص اس کی ایسی تشریح کرتا ہے کہ جس سے اس کا اپنا مذاق، اپنے خیالات، اپنا رہن سہن تہذیب کا لب لباب معلوم ہوتا ہے، اور قومیں اپنی تہذیب کے گن گاتی ہیں تو اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور سیاست اور جنگ میں جتنی ان کو کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تہذیب پھیلی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو تہذیب کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی صحیح تعریف ممکن نہیں، اور یا اتنا تنگ کہ اس کے وجود ہی کا یقین نہیں رہتا۔

اسلامی تہذیب کی تعریف کرنا اور بھی مشکل ہے، کہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں، اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے۔ اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں، زور باندھا ہے، وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے، اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا تو کبھی سیاست کا، کبھی دوسروں کے اثر کو جیسے جان کر مٹایا، کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، کبھی انا ولا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل گئی، فضا کی ایک کیفیت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئی، دن کا اجالا اور رات کا سکون بن کر زندگی میں گم ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا اتار چڑھاؤ ایسا رہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ مذہب اور تہذیب کے مفہوم پر غور کرتے رہے ہیں،

اس وقت اگر ہم بیٹھ کر سوچیں تو ہم بھی اسلامی تہذیب کا ایک خاکہ تیار کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے بناتے بناتے ہم ایسا کچھ بنا لیں کہ جو چاہے زبان سے بیان نہ ہو سکے، دل میں گھر ضرور کر لیگا۔

ایک بات کا خیال ہم کو خاص طور پر رکھنا ہوگا، اور وہ یہ کہ اسلامی تہذیب نے کبھی اپنے اور غیر کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی، مسلمانوں کو کبھی نرالے اور انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا، اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جن پر فوراً نظر پڑتی، اور جو آسانی سے بیان کر دی جائیں۔ اس کے برعکس ہماری تہذیب کا میلان ہمیشہ پھیلنے، دوسری تہذیبوں سے اثر لینے اور ان پر اپنا اثر ڈالنے کی طرف تھا، اور اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح، اچھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم نے کتنا دیا اور کتنا لیا۔ ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہ لگائی بلکہ ایسی طرح ملے جیسے کہ شکر اور پانی۔ یورپ والے اب صدیوں کی حجت کے بعد ماننے لگے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے علم کو بہت بڑھایا اور پھیلایا۔ لیکن یہ دعویٰ اب بھی شاید ہی کوئی تسلیم کرے کہ بول چال کی زبانوں کو ادبی زبانیں بنانا مسلمانوں کی ایک خاص خدمت تھی۔ ہماری تہذیب کا اثر روحانی، ذہنی اور جسمانی تندرستی کی طرح تھا جو کہ خود محسوس نہیں ہوتی، جس کی کیفیت بیان کیجئے تو خود سنائی معلوم ہوتی ہے، اور جس کے موجود نہ ہونے یا ضایع ہو جانے کا غم بھی اکثر نہیں کیا جاتا، اس لئے کہ خود فریبی انسانیت کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

اسلامی تہذیب میں نمایاں ظاہری علامتیں خاص طور پر اس وجہ سے پیدا نہیں ہو سکیں کہ مذہب اسے ہمیشہ ہموار کرتا رہا۔ اسلام، بجائے اس کے کہ تہذیب کی خلعت پہن کر الگ عزت کے مقام پر بیٹھ جائے، خود تہذیب کے مقام کو بدلتا اور اس کی حیثیت کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کبھی تہذیب کے ہم معنی، یعنی تہذیب میں گرفتار نہ ہوا، مسلمان کبھی اتنے مہذب نہ ہو سکے کہ اسلام سے غافل ہو جائیں، ان کا دین ان کی دنیا کو جھنجھوڑتا رہا، جیسے کوئی استاد نیند کے ماتے شاگرد کو۔ اس وقت بھی اگر آپ دیکھئے تو تہذیب ابھی انگریزی حکومت کا سہارا لیکر اور مغرب کی علمی ترقیوں کی قسمیں

کھاکر مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کر چکی ہے اور کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ہم دوسری قوموں کی طرح مذہب کو چھوڑ کر تہذیب کو پکڑ نہیں سکتے، اس وجہ سے ہم دوسروں سے کم سمجھے جاتے ہیں اور ہماری ہنسی بھی اڑائی جاتی ہے۔ لیکن تہذیب کے ناعاقبت اندیش فدائیوں کی ضد میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم صرف مذہب کو جانتے ہیں تہذیب کو نہیں جانتے، اس لئے کہ پھر ہمیں ہر موجودہ تہذیب سے قطع تعلق کر کے بالکل صحیح قرآنی تعلیم کی بنیاد پر ایک نئی اور سب سے الگ زندگی کی طرح ڈالنا ہوگی۔ یہ ممکن تو بیشک ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ہماری زندگی میں آگے چل کر ایسا کوئی انقلاب ہو جو موجودہ تہذیب کی عمارت کو ڈھا کر کوئی نئی عمارت اس کی جگہ پر کھڑی کرے۔ لیکن ایسا انقلاب پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے ہمارے واسطے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم مذہب اور تہذیب کو الگ سمجھیں، مذہب کو تہذیب کی روح اور عمل کا معیار مانیں اور اس کی آرزو دل میں رکھیں کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ اس لئے اگر میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کرتے وقت عقیدوں کا ذکر جتنا کہ آپ کے خیال میں ہونا چاہیئے نہ کروں تو اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں عقیدے کی اہمیت کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ یہاں بحث صرف تہذیب سے ہے، مذہب سے نہیں، اور جو عقیدے مشترک ہیں، یعنی تہذیب میں قریب قریب اسی شکل میں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مذہب میں، انھیں میں نے تہذیب میں شامل سمجھا ہے۔

تہذیب کے مفہوم اور عالم اسلام کی وسعت اور رنگارنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب کی چھ سات خصوصیتیں سب سے پہلے میرے خیال میں آتی ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ انسانیت کے اس تصور کا ہے جو اس تہذیب کی جان ہے، وہ تصور کہ جس نے انسانیت کے امتیازات کو نسل، مذہب اور مقام کا پابند نہیں رکھا، جس نے مسلمان کو آزادی دیدی کہ جس ملک کو چاہے اپنا وطن بنائے، جو زبان چاہے بولے، اور ہر نسل اور مذہب کے آدمیوں کے لئے اس کی صورت نکالی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ مسلمانوں میں آپس کی عداوتیں تھیں، لیکن یہ یا تو سیاسی تھیں یا مذہبی، تہذیبی نہیں تھیں اور انھوں نے کسی کو انسانیت سے محروم نہیں کیا۔ ہماری تہذیب کی اس خصوصیت کی سب سے اچھی مثال وہ رویہ ہے جو ہم نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا، جنھیں کسی نسل اور کسی مذہب کے لوگ

اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور جن سے اب تک ایسی نفرت برتی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کے سائے میں رہے طبیعت اور اخلاق کے لحاظ سے یورپ کے یہودیوں سے مختلف یا بہتر نہیں تھے، لیکن انھیں ہمارے دین نے اہل کتاب کی حیثیت دیکر سچی رواداری کا مستحق بنایا، اور ہماری تہذیب نے انکو خدمت اور ترقی میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا۔ یہودی تو خیر سامی نسل کے اور ایک خدا کو ماننے والے تھے، اسلامی تہذیب نے بت پرستوں کو بھی انسانیت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا اور ان کی گمراہی کو انھیں حقیر یا ذلیل سمجھنے کا بہانہ نہیں بنایا۔

انسانیت کے بعد اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت عقلیت ہے، یعنی وہ جگہ جو اس کے معیار زندگی میں عقل سلیم کو دی گئی۔ جس طرح ہم ہر آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی مانتے ہیں، ویسے ہی ہمارا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کو اپنی طبیعت اور اپنے عمل میں توازن قائم رکھنا چاہیئے، ایسا توازن کہ جو ایمان کو قائم اور مضبوط رکھے مگر انسان کو ضعیف الاعتقاد اور اوہام پرست نہ بننے دے، جو شوق اور عبادت کی سچی اور پوری قدر کرے مگر ضبط، بے اعتدالی اور انتہا پسندی کو فوراً پہچان لے، جو انسانی زندگی کو عقیدے اور عقل کا پابند رکھے مگر رسم اور عادت کا غلام نہ ہو جانے دے۔ تہذیب کی اس خصوصیت نے مسلمانوں کو جہاں تک کہ اخلاقاً صحیح ہے آزاد کر دیا، ان کی آمد و رفت اور میل جول پر کوئی قید نہیں لگائی، جب کبھی وہ رسم رواج میں گرفتار اور عادت سے مجبور ہونے لگے تو ان کے سامنے رہائی کی ایک تدبیر پیش کر دی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور ذہن میں ایک لوچ پیدا کر دی کہ جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ کر سکتے تھے۔ اسی عقلیت نے مسلمانوں کے دل میں تجربے اور احساسات کی اتنی وسعت رکھی کہ وہ منطق کے پھیر میں نہیں آئے، اور اگر کبھی آئے بھی تو بہت جلد اس سے نکل بھی گئے۔ اسی نے دینداری کو ریاضت سے روکا، دنیاداری کو بے لگامی سے، اور نعمت کی قدر اور عذاب کے خوف کے دو رنگ ملا کر نہ جانے کیسی کیسی دلکش تصویریں بنائیں۔

مسلمانوں میں عقلیت پیدا نہ ہوتی اور قائم نہ رہتی اگر اسلام نے بہت بین طور پر میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم نہ دی ہوتی۔ لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ دیکھئے تو علم اور عقیدے کے میدان میں عقلیت ان

لوگوں نے نہیں برتی جو کہ دینی علوم کے حامل تھے بلکہ ان لوگوں نے جنھیں خالص علمی شوق تھا یا وہ جن پر سیاسی ذمہ داریاں تھیں۔ اس کے برخلاف ہماری تہذیب کی تیسری خصوصیت، مساوات، ہرگز قائم نہ رہتی اگر وہ ہمارے دین میں شامل نہ ہوتی، اور اسے برتے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا۔ مساوات کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے سیاست اور دولت دونوں ہمیشہ برسرِ پیکار رہی ہیں اور انھوں نے اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی مگر اتنی کامیاب نہ ہوئیں کہ مساوات کے خلاف کوئی نظیر یا سند قائم ہو جائے۔ ابھی مساوات کا بھروسا صرف مذہب پر ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ مذہب کا حکم بہت صاف اور واضح ہے، اور اسی کے ساتھ انسانیت کی قدر بھی اس طرح ہماری تہذیب میں شامل ہو گئی ہے کہ سیاست اور دولت چاہے جیسا نشہ پلا دیں، جذبۂ دینی کا ایک گھونٹ اس کا توڑ کر دیتا ہے، یا انسانیت کی قدر نشے کو آہستہ آہستہ اتار دیتی ہے۔

اسلام نے آدمیت کو معیار مانا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملت اور جماعت کے احساس کو بھی لازمی ٹھیرایا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طرح کا تضاد ہے، لیکن اگر آپ یہ یاد رکھئے کہ انسانیت محض ایک تصور ہے اور حقیقت میں انسانی آبادی جماعتوں پر مشتمل ہے، اور ابھی تک زبان، خیالات، معاشرت اور ماحول میں ایسی یکسانی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے کہ جو دنیا کی تمام قومی حدبندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک جماعت بنا دے، تو یہ سمجھ جانا کچھ دشوار نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ملت بنے رہنے کی تاکید کیوں کی گئی۔ اسلامی تہذیب کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ملت کے احساس کو خاص تقویت پہنچائی، اور سیاست تو مساوات کی طرح ملت کے تصور کو بھی ہمیشہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی رہی۔ لیکن سیاست کا کچھ بس نہ چلا، اور تہذیب کو اس پر مطمئن ہونا پڑا کہ ملت اور انسانیت کے درمیان صلح قائم رکھے، جو کہ بذات خود ایک بڑی مشکل خدمت تھی اور بہت خوبی سے انجام دی گئی۔

اسلامی تہذیب کی جو خصوصیتیں میں نے اب تک بیان کی ہیں ان میں سے تعلیت مسلمانوں میں کمیاب ہو گئی ہے، اس لئے کہ مسلمان کئی سو برس سے اس کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اگر وہ کسی حد تک موجود ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے دشمن اسے اسلام سے خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ اسلامی

تہذیب کی دو اور خصوصیتیں ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں نہیں ملتیں، بلکہ یورپ میں اور ان کا ذکر میں صرف اس سبب سے کر رہا ہوں کہ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کو رونق انھیں سے تھی اور ہم اب بھی چاہیں تو یورپ کی تقلید کئے بغیر اپنی تہذیب کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو جلا کر اپنی محفل کو روشن کر سکتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی ان خصوصیتوں میں سے پہلی یہ تھی کہ علم حاصل کرنا انسانیت کا فرض ٹھہرایا گیا، اور اس کا یقین دلایا گیا کہ علم کی بدولت ہر طرح کی ترقی ممکن ہے، انسان ترقی کرتا رہا ہے اور آئندہ ترقی کرتا رہے گا۔ یہ دعویٰ اس زمانے میں بڑا انقلاب انگیز تھا جب ساری دنیا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کامل علم اور کامل معصومیت کی حالت سے آہستہ آہستہ گرتا رہا ہے اور عیبوں کی تاریکی میں گھرتا رہا ہے۔ اب یورپی قوموں کے علمی کرشموں کو دیکھتے ہوئے اس دعوی میں کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جماعت میں اب بھی وہ انقلاب انگیز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اب سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن کو وہ غلاف میں بند رکھتے ہیں۔

علم کے لئے جستجو، شک، تجربہ لازمی ہے، اور جس زمانے میں علم کی مشعل اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں تھی، اس نے علم کو ہر طرح کی آزادی دی، اور علم کے شیدائیوں نے ایسی رواداری برتی اور ایسے صدمے بھی اُٹھائے کہ جس کی مثال صرف یورپ کے دورِ جدید کی ابتدا میں ملتی ہے۔ یورپ میں اب علم اصولاً بالکل آزاد ہے، لیکن وہ سیاسی اور تہذیبی تعصبات سے خالی نہیں، اور اس نے دین سے ایسی سرد مہری اور عداوت برتی ہے کہ جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچا ہے اور خود علم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں دینی علوم کے نمائندے خالص علم کے نمائندوں سے جھگڑتے اور ان سے اور کسی طرح بس نہ چلا تو مار پیٹ کر کے اپنی برتری تسلیم کرائی۔ یہ سمجھئے انسانی کمزوری تھی، ورنہ جس علوم کی پرورش اسلامی تہذیب کی گود میں ہوئی وہ خودسر اور انتشار انگیز نہ تھے، انھوں نے نہ عقیدے کی جڑ کاٹی نہ حق بات کہنے سے جھجکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی قائم رہی، اور انسان کی صحیح نشو و نما اور ترقی کے لئے دونوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی۔

آخر میں آپ اجازت دیں تو میں اسلامی تہذیب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کردوں جس کا یقین

کرنا اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی غیر تہذیبوں کی پرورش کی، صرف اس سیاسی مصلحت کے اشارے پر نہیں جو دنیا کو کاٹ کر مسلم اور غیر مسلم کے دو حصوں میں تقسیم کرنا اپنے لئے مفر سمجھتی تھی، بلکہ تہذیبی باغبانی کے ایسے شوق میں کہ جس نے نفع نقصان کا حساب رکھنا اپنی توہین سمجھا، اور صرف اپنے چمن کی رنگارنگی کو دیکھتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محقق جنھیں اسلامی تہذیب کی خوبیاں تسلیم کرنا منظور نہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے فروغ کا زمانہ مسلمانوں کے سوا اور ہر تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا، اور اسلامی تہذیب مختلف قومی اور مقامی تہذیبوں کا ایک مجموعی نام ہے۔

اسلامی تہذیب ان تمام خصوصیات کو جو میں نے بیان کی ہیں ساتھ لیکر ہندستان آئی۔ وہ ہاتھ میں تلوار لیکر نہیں آئی، جیساکہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ تجارت کا مال یا سیاحت کا شوق یا خدمت کے حوصلے لیکر آئی۔ اس کا پہلا مرکز جنوبی ہندستان کی بندرگاہیں تھیں، جہاں سے وہ آہستہ آہستہ ملک کے اندر پھیلی۔ شمالی ہندستان میں وہ شمال مغرب کی تجارتی شاہراہ سے آئی، مگر پھر امیر محمود غزنوی کے حملوں کی گرد و غبار میں وہ اسی طرح غائب ہوگئی جیسے کہ خوشبو کسی آندھی میں۔ لیکن امیر محمود کے ساتھ استاد البیرونی کا بھی ہندستان میں آنا ہوا، اور غالباً تہذیب کے کسی سچے قدرداں کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ ان کی کتاب الہند تہذیب کی ایسی خدمت ہے کہ جو سلطان محمود کی پیدا کی ہوئی عداوتوں کی تلافی کر سکتی ہے۔ بہرحال عداوتیں اور لڑائیاں تاریخ ہی میں زندہ رہیں، نسل انسانی انھیں بہت جلد بھول گئی، اور ہندستان کا قریب کے ملکوں سے تعلق بڑھتا ہی رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں، جب محمد غوری کی فتوحات نے شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے لئے میدان صاف کر دیا تو شیخ معین الدین چشتی بھی ہندستان تشریف لائے اور انھوں نے خدمت اور تبلیغ کا کام اسی شہر سے شروع کیا جو کہ سب سے ممتاز راجپوت سلطنت کا مرکز تھا، اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے ہندو مسلمان دونوں اپنا خون بہا چکے تھے۔

مسلمان جب ہندستان میں آئے تو ہندستانیوں میں سیاسی حس بہت کم تھا، مگر مذہبی حس بہت قوی تھا اور اسی وجہ سے ہم اسلام کا رد عمل سب سے پہلے ہندستان کی مذہبی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں صدی میں شری شنکر اچاریہ کی اصلاحی تحریک نے مقدس کتابوں کو وہی رتبہ دیا جو کہ ہم قرآن کو دیتے ہیں، یعنی

ان کو الہامی مانا، اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اسی تحریک نے بدھ متیوں، جینیوں جوگیوں اور برہمنوں کی تعلیمات کو جو درشن یعنی حقیقت سے روشناس ہونے کے جو مختلف مگر برابر کی قدر رکھنے والے طریقے تھے اگر عقائد کے اس انتشار کو دور کیا جواب تک پایا جاتا تھا اور دینی تعلیم میں جو یک جہتی اس طرح سے پیدا کی گئی تھی اسے بدھ متیوں سے جاترا یعنی زیارت کا رواج اور جینیوں سے اہمسا کا عقیدہ لیکر اور مضبوط کیا۔ امیر محمود نے جب ہندستان پر حملے کئے تو میدان جنگ میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت آزمانے کے لئے ہندو دھرم اور ہندو جاتی، یعنی ملت موجود تھی، اور بعد کو جو تحریکیں اٹھیں وہ انھیں کی کشمکش کا نتیجہ تھیں۔

میں یہاں پر ان اثرات پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا جو اسلامی تہذیب نے ہندستانیوں کی ذہنیت پر ڈالے، لیکن یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ انسانیت اور مساوات کے جو پختہ عقیدے وہ اپنے ساتھ لائی تھی انھوں نے ذات کے اس تصور کو جو یہاں ایک اٹل قانون بن گیا تھا فلسفے اور مذہب سے نکال باہر کیا، اگرچہ رواج کو بدل نہ سکی، اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحادِ عمل کی صورت پیدا کی، جسے دونوں کے مذہب نہیں تو مذہبی منطق گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھگتی کے طریقوں کو، اپنشدوں کے فلسفے کو، ہندستان کی موسیقی اور فنون لطیفہ کو ایسا سراہا، صنعتوں کی اس طرح دل کھول کر سرپرستی کی اور ہندو معاشرت میں جو کچھ ضروری معلوم ہوا اس کو ایسی خوشی سے اختیار کیا کہ اسلامی تہذیب بہت جلد ہندستانی تہذیب بن گئی۔ ہندستان میں رواج کی اتنی قدر ہے کہ اسلامی تہذیب نے بہت کیا اگر معقولیت کے تصور کو قائم رکھا، اور زندگی اور معاشرت میں نمایاں طور پر نہیں تو کم از کم شاعری میں اسے ہر اور مسلک پر بھاری کر دیا۔ دنیاوی علوم کا نہ یہاں شوق پھیلا نہ انھیں کوئی ترقی دی جا سکی، لیکن تعلیم کا ایک نصاب اور شائستگی کا ایک ایسا معیار عام کر دیا گیا کہ جس نے تہذیب کو زوال سے بچایا اور ہر علم، فن اور ہنر کی قدر قائم رکھی۔

لیکن ہندستان کی اسلامی تہذیب کے ماننے والوں میں سے تمام ہندو اور بہت سے مسلمان اس کی شکایت کرتے رہے کہ اس تہذیب نے ہندستان میں گھر تو بنا لیا ہے مگر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز مٹانے اور اسلام سے اپنا رشتہ توڑنے پر تیار نہیں، معمولاً پوری رواداری برتتی ہے مگر کبھی کبھی اسلام کو حقیقت کا

واعظ کہہ کر ہر غیر فلسفے اور عقیدے سے منہ پھیر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کے کلام میں یہ شکایت اکثر ملتی ہے، اور غالباً وہی اکیلے نہیں بلکہ اور جتنے غیر مسلم مصلح ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے اگر مسلمانوں نے انسانیت اور مساوات سے عقیدت رکھنے کے باوجود مومن اور مشرک کے فرق پر زور نہ دیا ہوتا اور اگر وہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے۔ لیکن اسلام مومن اور مشرک کے فرق کو نظر انداز کر کے پھیلایا جاتا تو یقیناً اس کی کایا پلٹ ہو جاتی، وہ یہاں کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا، علم، معقولیت اور فطرت کا سکھایا ہوا مذہب نہ رہتا بلکہ رسم رواج اور قدامت پرستی پر بھروسا کرتا، مسلمانوں کے سامنے کوئی معیار نہ رہتا اور ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ اس میں نقصان صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا بلکہ ہندوستان کا بھی ہوتا اس لئے کہ انسانیت، عقلیت، مساوات ایسے تصور نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ دل میں سما جائیں تو پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ تنگ نظری، جہالت، اوہام پرستی، بزرگوں کی پوجا، دولت کی پوجا، اصل میں تو یہ ہیں جو انسان کی طبیعت کو روگ کی طرح لگ جاتے ہیں یا گرد کی طرح دل کے آئینے پر جم جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ ملت اسلامی کو غیر مسلموں سے الگ رکھنے، مومن اور مشرک کے فرق کو ضد کر کے قائم رکھنے اور شرعی قانون کو برابر حکومت کے اختیار اور رسم رواج کے اثر سے بالا و بالاتر قرار دینے کے باوجود بھی آپ دیکھئے تو ہماری معاشرت اسلامی قانون سے بہت منحرف ہو گئی ہے، ہم نے عورتوں کے سارے حق مار لئے ہیں، برادری اور ذات کو دیکھ کر شادی بیاہ کرتے ہیں، نوکروں کو اپنے ساتھ کھلاتے نہیں، اپنا سا بناتے نہیں، اپنے برتنوں میں پانی نہیں پینے دیتے۔ اخلاق کو اور جو نقصان ہوا ہے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہماری معاشرت ہندو معاشرت کے رنگ میں رنگ گئی تھی، لیکن قرآن کی تعلیم کا معیار موجود تھا۔ انگریزی حکومت اور اس سے بھی زیادہ انگریزی تعلیم نے ہم کو ایک ایسے پھیر میں ڈال دیا ہے کہ جس سے نکل جائیں تو سمجھئے جان بچی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی دو بڑی خصوصیتیں، عقلیت اور علم کی پیاس ہمیں ورثے میں نہیں ملیں بلکہ یورپی قوموں کو، اور اسی ورثے کی بدولت انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ساری دنیا ان کی ہو گئی ہے۔ اب یورپی

تہذیب کے سب سے کارگر ہتھیار یہی ہیں، اور ہم اسلامی تہذیب کو بچا نہیں سکتے جب تک کہ ہم اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پھر سے پیدا نہ کریں۔ ہمارے دیس کے بھائیوں نے، جنھوں لے اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول نہیں کئے تھے اور جواب اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا ہندستان کی مشترک تہذیب میں کوئی حصہ تھا، یورپی تہذیب کو اپنا کر بظاہر ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان میں آزاد خیالی کہ جو موجودہ معیار کے لحاظ سے ہر مہذب آدمی میں ہونا چاہیے مگر مسلمانوں میں عام طور پر نہیں ہے، وہ ملت اور ملت کے قانون کو چھوڑ کر جمہور بن گئے ہیں اور جمہوری طریقے پر معاشرتی قانون بناتے ہیں اور بناتے رہنا چاہتے ہیں، ہم نہ اپنے دین کو چھوڑتے ہیں نہ اپنے شرعی قانون کو، نہ ملت کے خیال کو اور نہ اسلامی تہذیب کی محبت کو۔ اگر ہم لے یہ مسلک خالی ضد میں اختیار کیا ہوتا تو معاملہ بہت آسان ہوتا۔ اور ہمارے لئے اس کی کوشش کرنا کہ تعلیم جلد پھیلے اور جہالت دور ہو کافی ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ دنیا میں اور ملک میں ہماری حیثیت کچھ بھی ہو ہماری کوئی سنے یا نہ سنے، بات ہم ٹھیک کہتے ہیں، کہ تہذیب اور معاشرت کو مذہب کا سہارا چاہیے، علم کو راہ پر رکھنے کے لئے عقیدہ چاہیے، سیاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ملت کا احساس، انسانیت کا معیار اور اخلاق اور مذہب کی فرماں روائی چاہیے۔ ہم عقلیت کے نام سے عقل کی پرستش نہیں کرنا چاہتے، بندر سے رشتہ جوڑنے کی خاطر خدا سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتے، آدمی بننا چاہتے ہیں مگر ایسی تہذیب نہیں چاہتے کہ جس کا دیوتا نفس پرستی ہو۔ ہماری مشکل وہی ہے کہ جو ہمیشہ سے آدمیت کی مشکل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کا معیار میانہ روی اور اعتدال ہے، اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے اگر میں عرض کروں کہ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اپنے دل سے ضد اور غصہ بالکل نکال دیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ ہندستان میں اسلامی تہذیب کو سلامت رکھنے کے لئے ہم کو کیا ہونا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے اسلامی تہذیب کی بقا کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کے صحیح اور اچھے ہونے کا پورا یقین ہو، ہم دل سے مانتے ہوں کہ انسانیت قوم اور نسل پرستی پر غالب آئے گی، معقولیت اور اعتدال پسندی کا مسلک ایک نہ ایک دن ہمیں اوہام پرستی اور جہالت اور انتہا پسندی کی بھول بھلیوں کے

باہر پہنچا دے گا، علم ایک طرف انسانی زندگی کو آسان کرتا اور دوسری طرف نجات کی راہ کو صاف دکھاتا رہیگا لیکن یہ تو اسلامی تہذیب کا نصب العین ہے، اسے بغیر سمجھے مان لینے اور زبانی عقیدت سے ہم حاصل نہیں کرسکتے۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کن اجزا سے بنا ہے، اور پھر انھیں کو اپنے عمل میں یکجا کر کے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اس لئے آپ اجازت دیں تو میں اس وقت کے چند عام رجحانات پر بحث کر کے اپنا مطلب صاف کردوں۔

میں اسے بالکل صحیح اور بہت اچھا سمجھتا ہوں کہ مسلمان اس وقت اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ وہ ایک ملت اور ایک تہذیبی جماعت ہیں، کیونکہ یہ دینی اور تہذیبی آئین کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی ہے لیکن مجھے کسی طرف اسلامی ملت اور تہذیب کے تصور کو غیر مسلموں کیا خود مسلمانوں کے لئے مفید اور ان کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی۔ ملت کا احساس سمجھئے چند دنوں کا مہمان ہے اگر وہ ملت کے افراد میں سچی محبت، خدمت کا شوق اور خدمت کی استعداد پیدا نہ کرے بلکہ افراد کی خود غرضیوں کے لئے ایک آڑ یا ان کے نکمے پن کے لئے بہانہ بنا رہے۔ انسانیت کے جس معیار کو ہم مانتے ہیں وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنوں کی ہر ضرورت پوری کر کے دوسروں پر احسان کرنے کے موقع نکالیں، ہماری ملت کے افراد اپنا حق وصول کر کے اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ دوسری جماعتیں ہماری اجتماعی اغراض پر بھی ذاتی اغراض کا شبہ کرتی ہیں، اور ہم اپنی ملت کا الگ وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے آداب برتنے سے انکار کرتے ہیں۔

حقیقت میں ہم جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نہ ہمیں کوئی دے سکتا ہے نہ ہم سے لے سکتا ہے ہم اگر خدمت کا وہ حق ادا کریں جسے ہمارے دین نے عبادت کا مرتبہ دیا ہے، علم حاصل کرنے اور پھیلانے کا فرض جیسا کہ چاہیئے انجام دیں تو ہماری ملت خود بخود بنی رہے گی، اور اس کے خادموں کے سامنے ہمارا دینی اور تہذیبی نصب العین بھی رہے گا، جس کی قدر دراصل تجربہ اور انسانی طبیعت اور زندگی کی اونچ نیچ سے واقفیت پیدا کرتی ہے۔ اس زمانے میں جب کہ جہالت اور اوہام پرستی ہم کو گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں

ڈر تھا کہ ہم اس میں گم ہو جائیں گے، مومن اور مشرک کے فرق کو نظروں کے سامنے رکھنا ضروری تھا، اس وقت جبکہ غیر مسلموں میں تعلیم پھیل رہی ہے، وہ رسمیں توڑی جا رہی ہیں جنھوں نے زندگی کو جکڑ لیا تھا اور عقل کی اتنی قدر بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہیں رہا ہے تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے۔ ہماری تہذیب کی قابل قدر خصوصیات بڑی حد تک عام تہذیب میں شامل ہو گئی ہیں، اب ہماری ملت صرف اس طرح ملت بنی رہ سکتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی زندگی اور عمل میں وہ فضیلت ظاہر کرے جو اسے اسلام کی بدولت حاصل ہے۔

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال کی جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے لئے مصلحت اندیش ہونا لازمی کر دیتی ہے۔ ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی بھلائی کی فکر کریں، ہمارے ذمے تو اسلام کی تبلیغ کرکے، یعنی اس کی تعلیم کو ہر تعلیم سے زیادہ موثر اور مفید ثابت کرکے دنیا کو نجات کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ مقصد بغض، حسد، کینے اور ضد سے حاصل نہیں ہو سکتا، تنگ نظری، خود غرضی اور خوف آپ اپنے پیر پر کلھاڑی مارتا رہتا ہے۔ ہم میں تو نوع انسانی کی ایسی سچی خیر خواہی ہونا چاہیئے کہ جو دھوکا کھائے اور باز نہ آئے، جو صدمے اٹھانے سے اور پختہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کم از کم اپنوں پر اعتبار ہونا چاہیئے، اور ہر شخص کو جو بظاہر خلوص کے ساتھ خدمت کا ارادہ رکھتا ہو سہارا دینا چاہیئے۔ وہ جہاد جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی آخری تدبیر تھی اس وقت لڑ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت کا صحیح جہاد تو ایسی مصلحت اندیشی ہے جو افراد کی استعداد کو ملت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنائے، اور قوم کی خدمت کو ملت کے الگ وجود کا سہارا۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے بہت ہیں، لیکن اسلامی تہذیب تو خطروں میں پلی ہے۔ اور اس کا کیا علاج ہے کہ مشیت ایزدی نے قدر اسی چیز کی بڑھائی ہے جو مشکل سے ہاتھ آئے اور آسانی سے ضائع ہو جائے۔ اسلامی تہذیب کی بقا کا مصلحت اندیشی پر منحصر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جب قدرت کو موتی جیسی دولت رکھنے کے لئے سیپ کے نازک سینے کے سوا کچھ نہ ملا ہو

مسلم لیگ اور ملّت کی تنظیم

(ذیل کے مضمون کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کسی بزرگ کو ان سے اختلاف ہو یا موضوع کے کسی اور دوسرے پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہوں تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ ان کے خیالات کو اپنے رسالہ میں شائع کریں گے۔)

مسلمانوں کے انتشار کی موجودہ حالت میں ان مسلمانوں کو بہت زیادہ قابل الزام سمجھا جاتا ہے جو مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کی طاقت کو نہیں بڑھاتے۔ یہانتک کہ لیگ کے بعض انتہا پسند حامی انھیں غدّار کے نام سے موسوم کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے لیکن غدار کون ہے؟ آیا وہ غدّار ہیں جو مسلمانوں کی جماعت، مسلم لیگ کو چھوڑ کر، ہندوؤں کی جماعت، کانگریس سے مل گئے ہیں یا وہ ہیں جو لیگ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو یورپینوں کا غلام رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا سہل نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر ممکن ہے بہت سے وہ لوگ جو لیگ سے باہر ہو گئے ہیں یا باہر رہنا پسند کرتے ہیں آخر میں اتنے زیادہ غدار ثابت نہ ہوں جتنے وہ لوگ جو لیگ میں شامل ہیں مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ لیگ میں بہت سے نہایت مخلص اور ایثار پسند لوگ بھی شامل ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لیگ پر ایسے لوگوں کو پورے طور پر اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ان کے دست و بازو ان کے قابو سے باہر ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور پیروؤں کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے انگریز آقاؤں کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلام کو بھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے ؎

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کیا مسلمانوں کی اپنی سیاست کوئی نہیں ہے؟ کیا وہ دوسروں کی سیاست کے پابند ہو کر ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے کے لئے مجبور ہیں؟ کیا مسلمانوں کی زندگی محض اس لئے ہے کہ وہ کبھی انگریز، کبھی ہندو

فرقہ پرست اور کبھی دیسی ریاستوں کے آلہ کار بنتے رہیں؟ کیا ان کا کوئی واضح سیاسی نصب العین ایسا نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی پارٹی اور اپنی وزارتیں بنا سکیں اور جب اپنے اس مقصد کو حاصل ہوتا نہ دیکھیں تو نہ یورپینوں کی امداد سے اپنی وزارت بنائیں نہ ہندوؤں کی امداد سے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصد محض وزارت بنانا نہ ہو بلکہ کام کرنا ہو اور جب کام کرنے کا موقع نہ دیکھیں تو وزارت سے بھی کنارہ کش رہیں۔ اگر جاہ طلبی اور نفع اندوزی زندگی کا واحد نصب العین نہیں ہے تو کیوں ایسی مفاہمتیں کی جاتی ہیں جن سے اپنی اور قوم کی آبرو ریزی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ بات کرنے تک کے روادار نہیں ہوتے۔

مضبوط سیاسی پارٹیاں سال دو سال کی ہنگامہ خیزیوں میں نہیں بنتیں محض زوردار تقریروں اور تحریروں اور بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں سے کھڑی نہیں ہو جاتیں۔ ان کے حضور میں قوم کے عزیز ترین افراد کو اپنے جان و مال کی گراں بہا قربانیاں پیش کرنا ہوتی ہیں۔ ان کو برسوں تک مسلسل خاموشی، سچائی اور استقامت کے ساتھ پسینہ اور خون سے سینچنا پڑتا ہے۔ اپنا عیش و آرام اپنی دولت اور عزت سب کو محفوظ بھی رکھا جائے اور پائدار اور ذی اثر سیاسی پارٹی بھی بنا لی جائے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں آزادی حاصل کی جا چکی ہے ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہو۔ ہندوستان میں بھی ممکن ہے ایسی پارٹیاں اپنی طرح کی دوسری پارٹیوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوں لیکن کانگریس کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ سب کچھ میں کانگریس کی حمایت کے سلسلہ میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس ہمدردی کی بنا پر لکھ رہا ہوں جو مسلم لیگ کے ساتھ مجھے لفظ "مسلم" کے لگے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہے اور جس کی بنا پر اس کی ہر ناکامی سے میرے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہماری ہمسایہ ہندو قوم اپنے لئے ایک نصب العین کو طے کر چکی ہے۔ وہ نصب العین ہے ہندوستانی

قوم کی آزادی جس کا مفہوم ان کے نزدیک تمدنی نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ اکثریت کے تمدن کا یعنی ہندوؤں کے تمدن کا جو اتفاق سے ملکی تمدن بھی ہے اقتدار قائم کیا جائے۔ اس میں مسلمانوں کے کسی جداگانہ تمدن کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ جماعت کی شکل میں کہیں نمایندگی نہیں دی جا سکتی۔ انفرادی طور پر البتہ ہندو تمدن کی ہمہ گیریوں میں ان کے لئے جگہ نکالی جا سکتی ہے اور انہیں جذب کیا جا سکتا ہے۔ انہیں ودیا مندر نام کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا چاہیئے۔ انہیں سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر قبول کرنا چاہیئے۔ انہیں بندے ماترم کے فرقہ وارانہ گیت کو قومی گیت بنانا چاہیئے۔ انہیں وشنو نگر نام کے عارضی شہر میں کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کرنی چاہیئے انہیں پوتر وشنو بھوجن کو کانگریس کے بھوجن بھنڈار میں کھانا چاہیئے۔ غرضکہ ہر جگہ انہیں ہندو تمدن کی برتری کے آگے سر جھکانا چاہیئے اور یہ اس لئے کہ ہندوستان کی سلطنت کی وارث انگریزوں کے بعد ہندو قوم بننے والی ہے ہندو قوم ہی انگریزوں سے لڑکر ان کی حکومت کو چھین رہی ہے۔ وہی آہستہ آہستہ ملک کی تمام طاقت کی جگہوں پر قبضہ کرتی جا رہی ہے اور اس کا کوئی دوسرا مقابل اور حریف نہیں ہے۔ ملکی آزادی اور ہندو تمدن کے اقتدار کے معاملہ میں ہندوؤں کے درمیان کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں کمیونسٹ، تشدد پسند اور دہشت انگیز غیر کانگریسی اور کانگریسی سوشلسٹ۔ آئینی کانگریسی اور غیر آئینی کانگریسی، نیشلسٹ کانگریسی اور لبرل، مہا سبھائی اور آریہ سماجی، سکھ، بودھ، جین۔ سناتن دہرم والے سب شامل ہیں۔

ملکی اور تمدنی آزادی کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہندو قوم نے کئی مورچے تیار کئے ہیں۔ ان میں ایک مورچے سے دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے اور ان سب مورچوں میں کانگریسی مورچہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اگر آج کانگریس اور حکومت برطانیہ سے فیڈریشن کے معاملہ پر جنگ شروع ہو جائے تو پہلا مورچہ جس پر حکومت برطانیہ کو فوراً قبضہ کرنا ہوگا وہ کمیونسٹوں۔ تشدد پسندوں اور دہشت انگیز دل کا مورچہ ہوگا۔ آزادی کی لڑائی کے یہ لوگ ہراول ہیں۔ ان میں سے کمیونسٹوں کو جو سرے سے کسی مذہب کو ہی نہیں مانتے مسلمانوں کے تمدنی نصب العین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ لوگ ہندوازم سے تو تھوڑی بہت مزاحمت کر بھی سکتے ہیں اس لئے کہ ہندوازم اتنا مذہب نہیں ہے جتنا رہنے سہنے کا ایک طریقہ ہے اور اس میں ملحد اور خدا پرست سب کی

کھپت ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام سے وہ کسی طرح بھی مفاہمت نہیں کر سکتے۔ رہے تشدد پسند اور دہشت انگیز یہ لوگ کالی دیوی کی پوجا کرنے والے کٹر مذہبی دیوانے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد دوسرا مورچہ جب پر برطانوی حکومت کو حملہ کرنا ہوگا وہ کانگریسی سوشلسٹوں کانگریس کے نوجوان انتہاپسندوں، کسان سبھاؤں اور مزدور سبھاؤں کا ہوگا کیونکہ ان کو اگر آزاد رکھا گیا تو یہ واقعی نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مورچہ اسمبلیوں کا ہوگا۔ کیونکہ گورنر کی مندرجہ بالا تشدد کی پالیسی سے وزرا اور اسمبلی کے ممبران اختلاف کریں گے اور مستعفی ہو جائیں گے۔ اس سے ایک زبردست کھلبلی اور ابتری پیدا ہو جائے گی۔ قومی زندگی میں اول درجہ کی بحرانی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور مجموعی طور پر یہ بڑا انقلاب انگیز واقعہ ہوگا۔

اس کے بعد چوتھا مورچہ سب سے زبردست اور طاقتور مورچہ ہوگا۔ دیہات کی ضلع کی صوبہ کی کانگریس کمیٹیاں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، رضاکاروں کی انجمنیں، سیوادل سب حکومت کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گی اور سب کو غیر قانونی قرار دینا ہوگا۔ اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرنا ہوں گی چھاپہ خانوں کی نگرانی کرنی ہوگی۔ ریلوں۔ لاریوں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ سول نافرمانی شروع ہوگی۔ گرفتاریوں کی بھرمار ہوگی۔ لاٹھی چارج ہوگا۔ گولی چلے گی چند روز تک بڑا ہنگامہ رہنے کے بعد تمام ایسے لوگ جو تحریک میں براہ راست شرکت کریں گے سرکاری قیدخانوں میں پہنچا دیے جائیں گے۔

اب اس کے بعد ایسے مورچے ہوں گے جن پر ہاتھ ڈالنے میں حکومت کو تامل ہوگا کیونکہ یہ براہ راست لڑنے والے لوگ نہیں ہوں گے۔ مثلاً آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن۔ آل انڈیا ویلج انڈسٹریز ایسوسی ایشن آل انڈیا ہریجن سیوک سنگھ، ہندی پرچارنی سبھائیں، ودیا مندر اور واردھا اسکیم کے ماتحت پرائمری اسکول گرام سدھار کی سبھائیں —— یہ بالکل تعمیری کام کرتی ہیں جو قانون کی زد میں نہیں آتے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں وہ پکے کانگریسی عقائد رکھتے ہیں۔ فرض کیجیے ان پر بھی برطانوی حکومت اپنی نگرانی قائم کر دیتی ہے۔

اب اس کے بعد ان لوگوں کا نمبر آئے گا جو زمانہ ساز، منافق، عیار۔ اور چالاک ہیں۔ حکومت سے بھی بگاڑنا نہیں چاہتے۔ جان اور مال کی بھی کوئی قربانی کرنا نہیں چاہتے کسی قسم کا کوئی اور دوسرا ایثار کرنا بھی نہیں چاہتے

لیکن پھر بھی قومی نصب العین کو بالکل ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان میں یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، سرکار کے اعلیٰ عہدہ دار، وکیل، ڈاکٹر، انجنیئر، پروفیسر، اخبار نویس، ساہوکار، دوکاندار، ملوں کے مالک، کالجوں اور اسکولوں کے طلبا، طبقہ متوسط کے بہت سے لوگ اور دوسرے پڑھے لکھے لوگ شامل کئے جا سکتے ہیں جب تک کانگریس غیر قانونی نہیں ہوتی ان میں سے بہت سوں کی وابستگیاں کانگریس کے ساتھ رہتی ہیں لیکن جب کانگریس غیر قانونی ہو جاتی ہے تو ان کی وابستگیاں کانگریس سے منتقل ہو کر لبرل فیڈریشن، ہندو مہاسبھا، آریہ سماج کی طرف چلی جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ آئینی طور پر اور وفاداری کا دعوےٰ کرتے ہوئے کم و بیش انہی مطالبوں کو پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کو کانگریس غیر آئینی طریقہ پر پیش کر رہی تھی اس کے علاوہ یہ اپنی وفاداری کا معاوضہ تنخواہوں رشوتوں اور دوسری رعایتوں کی شکل میں بھی طلب کرنا شروع کر دیتے ہیں اور حکومت کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ جیل میں تو نہیں جائیں گے لیکن حکومت کو اپنے خود غرضی کے مطالبوں سے عاجز کر ڈالیں گے ایک طرف تشدد کی پالیسی کی دماغی الجھن اور مالی پریشانی اور دوسری طرف ان "خیر خواہ" لوگوں کی "انعام طلبی"۔ غرضکہ یہ محاذ جنگ بھی حکومت کے لئے سخت پریشان کن ثابت ہوگا۔

پھر عورتوں کا محاذ جنگ ان سب کے علاوہ ہے۔ عورتوں پر یہ پابندی بھی نہیں ہے کہ ان کا تعلق کون سے طبقہ اور جماعت سے ہے۔ تحریک کے زمانے میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جن خاندانوں کے مرد "وفادار" اور "خیر خواہ" ہوتے ہیں ان کی بیویاں اور لڑکیاں پوشیدہ اور کھلے طور پر قومی تحریک کی امداد کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ عورتوں کی شرکت سے جنگ میں ایک عجیب دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے خلاف جبر و تشدد کیا جاتا ہے تو تمام ملک میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ مردوں کی غیرت اور حمیت جوش میں آتی ہے اور احتجاج کے طور پر تحریک کو تقویت پہنچنے لگتی ہے۔

جب تحریک اس منزل پر پہنچتی ہے اور حکومت کا جبر و تشدد انتہائی حد پر ہوتا ہے تو اس وقت بہت سے سیاسی کام خفیہ طور پر کئے جانے لگتے ہیں۔ ان کی وجہ سے حکومت کی گھبراہٹ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اپنے افسروں اور ملازموں، فوج اور پولس کے آدمیوں سب پر سے اعتبار اور اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ہر طرف خطرہ نظر آنے لگتا ہے پھر اگر ملک کی صورت حال خراب ہو اور ملکی لوگوں کے تعلقات غیر ملکیوں سے

خصوصاً دشمن ملکوں سے ہوں تو خوف و ہراس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کوئی آدمی بھروسہ کے لائق نظر نہیں آتا۔
غرضکہ جنگ کا یہ نقشہ ہے جس کو نظر کے سامنے رکھ کر کانگریس اپنی سیاسی اور تمدنی آزادی کے مطالبوں کو برطانیہ کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرتی ہے۔ اور ان نتائج اور عواقب کا ڈر ہے جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ، کانگریس سے لڑائی مول لینے سے ہچکچاتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے کانگریس کے مطالبوں کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیتی ہے۔

خصوصاً اب جب کہ آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئی ہیں، کانگریس سے جنگ کرنے میں حکومت برطانیہ کو اور بھی زیادہ پس و پیش ہوگا۔ اب حکومت برطانیہ اپنے سول، پولس اور فوج کے ملازموں اور وفادار "جی حضوریوں" پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتی جتنا پہلے کیا کرتی تھی۔ پہلے ان کے تصور میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کانگریسی خیال کے لوگ حکومت کی گدی کے بھی مالک بن سکتے ہیں لیکن اب تو وہ اپنی آنکھوں سے کلکٹر اور پولس کپتان کو کانگریسی وزیروں کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا دیکھ چکے ہیں اور اب ان کے لئے یہ خیال کرنا بالکل قدرتی بات ہے کہ کل پھر کانگریس والے برسر اقتدار ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ جو زیادتیاں کی جائیں گی ان کا دل کھول کر بدلہ لے سکیں گے۔ اس لئے سرکار برطانیہ اور کانگریس کی اس لڑائی میں وہ غیر جانب دار رہنے کو ہی بہتر اور افضل سمجھیں گے اور اگر خیر خواہی دکھانا ضروری ہی سمجھیں گے تو عاقبت اندیشی کا یہ تقاضا ہوگا کہ آنے والی حکومت کے ساتھ خیر خواہی کریں تاکہ پوری زندگی امن چین سے بسر ہو اور ملک کے لوگوں میں بھی غدار اور وطن فروش نہ کہلائیں۔

یہ تو کانگریس کی طاقت کا حال ہوا لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس اپنے مطالبوں کے منوا لینے کے لئے کون سی طاقت ہے۔ آیا اس کے قومی مطالبہ میں بھی اسی طرح کی کوئی ہمہ گیری اور یک جہتی پائی جاتی ہے اور پوری مسلم قوم اس کے ساتھ بھی اسی طرح شریک ہے جیسی کانگریس کے ساتھ ہے۔ اس کے پاس بھی لڑنے کے لئے اتنے ہی جنگ کے محاذ موجود ہیں جتنے کانگریس کے پاس ہیں۔ اس کے یہاں بھی مخلص ایثار پسند، ذی علم، معاملہ فہم اور عوام کو منظم کرنے والے رہنماؤں کی اتنی ہی کثرت ہے کہ وہ گاؤں گاؤں میں ان کو بکھیر دے اور ان کی وفاداری، انضباط پسندی اور اطاعت شعاری پر پوری طرح بھروسہ کر سکے کہ جب کبھی مرکز

سے کسی قسم کا کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ وہ اس کی پابندی کریں گے اور اس کے پورا کرنے میں کسی قربانی کے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ کیا اس نے بھی اپنے نوجوان کارکنوں میں استقلال جفاکشی سادگی اور احتیاجات کی کمی کی وہی اعلیٰ صفات پیدا کر دی ہیں جو کانگریس کے کارکنوں کی ایک عام خصوصیت ہیں۔ کیا اس نے بھی ایسے ہی تعمیری کام شروع کر رکھے ہیں جیسے کہ کانگریس نے اور ہندوؤں کے دوسرے مذہبی اور تمدنی اداروں نے عام طور پر شروع کر رکھے ہیں۔ کیا اس کی قوم میں بھی مخیر اور باہمت دولتمندوں کی ایسی ہی کثرت ہے۔ کیا اس کو بھی سرمایہ داروں کی ایسی ہی مالی امداد اور سرپرستی حاصل ہے جیسی ہندوؤں کے ہر ادارے کو ملی ہوئی ہے۔ کیا اس کے رضاکاروں کی فوج بھی ایسی ہی تربیت یافتہ اور منظم ہے جیسی کانگریس کی ہے۔ کیا اس کے یہاں بھی عورتوں میں اتنی ہی بیداری پھیل چکی ہے کیا وہ بھی مردوں کے ساتھ اسی طرح دوش بدوش قومی تحریک کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں جیسی ہندوؤں میں۔ کیا مسلمانوں کے یہاں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ایسے ہی نہایت اچھے قومی مدرسے، کلب، انجمنیں، اکھاڑے، ورزشی تعلیم گاہیں وغیرہ ہیں جیسی کہ ہندوؤں کے یہاں پائی جاتی ہیں کیا مسلمانوں نے بھی کئی نسلوں کے ایثار، دور اندیشی، کفایت شعاری اور خوش انتظامی سے وہ جائدادیں، ملیں، کارخانے اور کاروبار شروع کئے ہیں جو ہندوؤں نے کر رکھے ہیں۔ کیا انھیں بھی نئی نسل کی فلاح و بہتری کی اتنی ہی فکر ہے جتنی ہندوؤں کو ہے۔ کیا ان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی جاہل عوام سے رابطہ اور میل اتنا ہی بڑھا لیا ہے، ان کے دکھ درد میں اتنے ہی شریک ہونے لگے ہیں جتنے ہندو ہوتے ہیں۔

جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر کس بل بوتہ پر اپنا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی منظوری کی توقع قائم کی جاتی ہے؟

چاہتے سب ہی کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

جس وقت ہم داد عیش و عشرت دیتے رہے دوسرے محنت اور تکلیف اٹھا کر اور عاقبت اندیشی اور اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے میں مصروف رہے۔ جیسا آدمی بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ جو چیز ہمیں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا چاہیئے وہ کوئی دوسرا شخص ہم کو کیسے عطا کر سکتا ہے اور بفرض محال اگر عطا بھی کرے

تو ہماری غیرت اور حمیت اسے کیسے قبول کرنا گوارا کر سکتی ہے۔

مسلم لیگ کی طرف سے جو شکایتیں کانگریس سے کی جاتی ہیں وہ دراصل خود اپنی ذات سے کرنا چاہیں اور کانگریس سے محاسبہ کرنے کی جگہ خود اپنے نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے۔ جب ہم یہ کرنا شروع کر دیں گے تو ہم کو نہ تحفظات کی ضرورت ہوگی نہ اپنے مطالبوں کو قبول کرانے کے لئے درخواستیں دینے کی۔ نہ صلح کی گفتگو کے موقع ڈھونڈنے کی اور نہ سول نافرمانی اور جنگوں کے اعلانات کرنے کی۔

مسلم لیگ اگر ہندوؤں سے جنگ کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے اپنی طاقت اور اپنے دشمن کی طاقت کا پورا پورا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ نہ تو دشمن کو حقیر اور بے چارہ سمجھنا چاہیئے نہ خود اپنی طاقت کا بے جا گھمنڈ کرنا چاہیئے جنگیں چاہے وہ پر امن اور آئینی ہوں چاہے خونی اور انقلابی — ذرائع اور وسائل کا مطالبہ کرتی ہیں اور سرمایہ داری کے موجودہ دور میں جس کے پاس جتنے زیادہ وسائل ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ اگر پہلے حملہ کو جھیل لیا جائے تو پھر معاملہ دم کا اور مقابل حریف کو تھکا کر زیر کرنے کا رہ جاتا ہے کون سا حریف میدان میں زیادہ دیر تک ٹھیر سکتا ہے۔ کون جنگ کے نقشہ کو بہتر طریقہ پر ترتیب دے سکتا ہے کس میں پیش بینی، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی زیادہ ہے۔ کون حملے اور پسپائی کے اوقات کو بہتر سمجھتا ہے کون کمزور جگہ کو پہچان کر حملہ کر سکتا ہے کس کی نظر بنیادوں پر ہے اور کس کی فروعات پر — یہ تمام عناصر ہیں جو جنگ کی کامیابی اور ناکامی پر اثر ڈالتے ہیں۔ قومیں جنگوں کے لئے خاموشی کے ساتھ، برسوں تک تیاری کرتی ہیں۔ تیار نہیں ہوتیں تو بہت سی توہینوں، ذلتوں اور نقصانوں کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ رضاکاروں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ ان میں جفاکشی اور اطاعت شعاری پیدا کی جاتی ہے۔ آلات حرب اکھٹے کیے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال کی مشق کرائی جاتی ہے۔ فوجی افسروں کی تربیت کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا ہے۔ جنگ کا ایک پورا فن اور علم ہوتا ہے اور اس سے پوری طرح وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کے وسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں محض جسمانی طاقت اور بے خوفی کام نہیں دیتی بلکہ دولت علم اور عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے سابی سینا کے مقابلہ میں اٹلی، سرحد کے مقابلہ میں برطانیہ چین کے مقابلہ میں جاپان اپنی تعداد کی کثرت یا اپنی جسمانی طاقت اور بے خوفی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ اس لئے کامیاب

ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں علم، فنی مہارت، تنظیم اور دولت کے وسائل زیادہ تھے۔ پھر دوسری قوموں سے معاہدے کئے جاتے ہیں، حملہ اور مدافعت کی صورت میں امداد کے وعدے لئے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی طاقت کو بڑھایا اور حریف کی طاقت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ سوئیڈیٹن جرمنوں کو جیکوسلوویکیا میں اس لئے کامیابی ہوئی کہ ان کی پشت پناہی کے لئے نازی جرمنی کی پوری مسلح اور منظم طاقت موجود تھی۔ کیا لیگ نے بھی جنگ کا اعلان کرنے سے پہلے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے اسی طرح تیار کرلیا ہے یا ہماری حالت دیکھ کر لوگوں کا دل یہ کہنے کو چاہتا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک کے زمانہ میں مسلمانوں نے جو ایثار کئے تھے اس کا قصہ آج کل اکثر دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک فاضل اور مخلص اہل قلم جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح ۱۹۲۰ء کی جنگ میں سیاسی فضا پر مسلمان پورے طور پر چھائے ہوئے تھے اور نصب العین کے لئے قربانیاں کرنے میں زیادہ پیش پیش تھے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے اور "ہسٹری آف دی کانگریس" کے مصنف نے اس حقیقت کو چاہے کتنا ہی نظر انداز کیوں نہ کیا ہو لیکن تاریخ کے اس کھلے ہوئے کارنامہ پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس کے بعد آزادی کی دوسری تحریک میں بھی مسلمانوں کی قربانیاں کچھ کم نہیں رہی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب سیاست کی رہنمائی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی تو کانگریس کے سیاسی پلیٹ فارم سے یہ لوگ کس طرح خارج کردئے گئے اور اغیار کا اس پر کس طرح قبضہ ہوگیا۔ ان کی سب قربانیاں کس طرح پانی پر بنائی ہوئی تصویر کی طرح مٹ گئیں اور برادران وطن نے کیوں کر تمام سیاسی زندگی پر اپنا اجارہ قائم کرلیا اور تمام کارگذاری کے ٹھیکیدار خود بن بیٹھے۔

یہ مسلمانوں کی بدنصیبی کی وہ داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں وہ تھی مولانا شوکت علی مرحوم گاندھی جی کو اپنی جیب میں ڈالے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوما کرتے تھے "گاندھی جی کی جے" علی برادران نے یہ واقعی علی برادران نے اپنی مردانہ جرأت اور بے خوفی اور ایثار کرنے والی نخیت

کے اثر سے سرکار برطانیہ کے رعب کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور عوام کو بیدار کرکے کانگریس کی انقلابی تحریک میں شامل کر دیا۔ لیکن علی برادران سخت انتہا پسند تھے وہ آندھی کی طرح اٹھتے تھے اور بگولہ کی طرح اڑ جاتے تھے۔ وہ اپنی تحریکات کی تنظیم کرنے کے صبر آزما کام سے ناواقف تھے۔ وہ جو کام کرتے تھے نہایت بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور دور بینی اور عاقبت اندیشی کو کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ جب وہ آگے بڑھتے تھے تو واپسی کی راہوں کو مسمار کرتے جاتے تھے۔ وہ فتح کرنے یا اس کوشش میں مرجانے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ زبردست حملہ آور تھے لیکن مدبر اور قوم کے معمار نہیں تھے۔ ناکامی اور پسپائی یا ادنیٰ تر مقصد کے قبول کرنے کے خیال ان کے ذہن میں کبھی نہیں آتے تھے۔ مفاہمت اور مصالحت سے وہ ناواقف تھے ان کے حوصلے ہمیشہ نہایت بلند رہتے تھے۔ ناممکن کا لفظ ان کی لغت میں موجود نہیں تھا۔ وہ سکندر، نپولین اور انور بے جیسے تھے۔ اور جیسا تاریخ کے ان نامور لوگوں کا انجام ہوا وہی علی برادران کا بھی انجام ہوا۔

اس کے برعکس ان کے رفیق گاندھی جی بنیے کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ حساب کتاب اور مول تول کرنا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ نفع نقصان کے خمیرے ان کا گوشت پوست بنا تھا۔ بیوپار کرتے رہنا، موقع اور مصلحت کو دیکھ کر قیمت کو گھٹانا بڑھانا۔ لیکن ناپ تول میں اس کی کسر نکال لینا ان کی خاندانی عادت تھی۔ یہ کبھی بھی اتنے آگے نہیں بڑھے جہاں سے واپس آنا ممکن نہ ہو۔ انھوں نے کبھی کسی سے دشمنی مول نہیں لی۔ سب کو اپنا دوست کہا جس کی جڑ کاٹنا چاہتے تھے اس سے بھی ہمیشہ یہی کہا کہ میں تو تمہارا دوست ہوں، تمہاری جڑ نہیں کاٹ رہا ہوں بلکہ تمہارے ساتھ جو برائی خواہ مخواہ لگ گئی ہے اسے دور کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میری اس کوشش سے تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تم ختم بھی ہو جاؤ تو تمہیں شکایت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ دنیا سے شیطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس طرح کی متضاد طبیعتیں رکھنے والے لوگوں کا میل کس طرح ہوا اور کس طرح اتنے دنوں تک قائم رہا یہ نفسیات کا ایک پیچیدہ معمہ ہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس میں بھی گاندھی جی کے بنیا پن کو بڑا دخل تھا۔ وہ علی برادران کی تمام انتہا پسندیوں کے ساتھ اس وقت تک نباہ کرتے رہے جب تک انھیں اپنے سیاسی آلہ کے طور پر استعمال کرنے کا امکان باقی رہا اور جب انھوں نے دیکھا کہ علی برادران اپنا رسوخ اور اثر کھو چکے ہیں اور ان کا

ساتھ دیتے رہنے سے ہندوؤں میں خود اپنی مقبولیت بھی ختم ہو جائے گی۔ تو چپکے سے ان سے علیحدہ ہو گئے۔

علی برادران کو قدرتی طور پر گاندھی جی سے بڑی شکایتیں پیدا ہوئیں ۲۶ء اور ۲۷ء کے "ہمدرد" کے پرانے فایل اٹھا کر دیکھیے تو مولانا محمد علی کی تلخ تحریروں سے ان کی شکایتوں اور مایوسیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے انھوں نے گاندھی جی سے جب دوستی کی تو اپنے پاس کچھ نہیں رکھا جو کچھ تھا سب ان کے حوالہ کر دیا لیکن گاندھی جی نے بہت کچھ محفوظ رکھ کر علی برادران سے دوستی کی نتیجہ یہ ہوا کہ علی برادران بدنام اور رسوا ہو کر ختم ہو گئے۔ گاندھی جی کا اقتدار بڑھتا رہا اور آج انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد بھی بڑھ رہا ہے۔

عدم تعاون کی تحریک کے زمانہ میں جس طرح ہندو استادوں اور طالب علموں نے سرکاری تعلیم کا مقاطعہ کیا تھا ایسے ہی مسلمان اساتذہ اور طلبہ نے بھی کیا تھا جس طرح ہندوؤں کے لئے آزاد مدرسے کھولے گئے تھے ویسے ہی مسلم آزاد مدرسے بھی کھولے گئے تھے جس طرح ہندو کارکن تبلیغی اور تعمیری کام کرنے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا دئے گئے تھے اسی طرح مسلم کارکن بھی پھیلائے گئے تھے۔ بلکہ ۱۹۲۰ء کی تحریک میں چونکہ خلافت کا بہت زیادہ زور تھا اس لئے مسلمانوں کا کام نہایت بڑے پیمانہ پر اور نہایت منظم طریقہ سے ہو رہا تھا۔ انھوں نے داعی حکومت کے مقابلہ میں اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر دی تھی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ملک کے کونہ کونہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے وردی پوش چست اور قواعد کرنے والے رضاکار سرکاری پولس کا مقابلہ کرتے تھے اور اسے نیچا دکھلاتے تھے۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہی تنظیم تھی جسے دیکھ کر مالویہ جی مہاراج ہراساں اور پریشان ہو گئے تھے اور گاندھی جی پر مختلف طریقوں سے اثرات ڈال کر انھیں یہ باور کرایا تھا کہ اگر یہ تحریک اسی طرح جاری رہی تو مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ جائے گا۔ پھر اگر صلح کی کوئی گفتگو برطانیہ سے ہوئی اور اس میں ہندوستانیوں کو حقوق دئے گئے تو اس میں مسلمانوں کو بہت بڑا حصہ ملے گا اور ہندو مغلوب اور محکوم ہو جائیں گے۔ بہر حال ان طبعزاد خیال آرائیوں سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری (یا مذہبی جوش!) ہندو کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھا لیکن خلافت کمیٹی اپنے اس کاروبار کو زیادہ دن نہیں چلا سکی چند مسلم سیٹھوں کے (جنھوں نے خلافت کا روپیہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے کاروبار میں لگا دیا تھا) دیوالے نکلے۔ دولتمند ہمدردوں کی تعداد پہلے سے ہی کم تھی۔ دیوالے کی بدنامی نے (جس کی دشمنوں نے حاشیہ چڑھا چڑھا کر خوب تشہیر کی) رجحان

جہاں سے امداد مل رہی تھی۔ اسے بھی بند کر دیا۔ ترکوں نے جب خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو ساری عمارت بالکل ہی بیٹھ گئی۔ جو کارکن خلافت کے جھنڈے کے نیچے تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر جمع ہوئے تھے وہ کچھ دن تک تو سختیاں جھیلتے رہے لیکن زندگی کے معیار چونکہ بلند تھے عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ طبیعتوں میں عیش پسندی تھی ذہنیت جاگیردارانہ تھی۔ جس طبقہ سے عمر بھر کے تعلقات تھے اس میں ظاہری ٹھاٹھ کی بڑی قدر تھی اور یہ لوگ ہم چشموں کی نگاہوں میں اپنے متعلقین اور خود اپنے آپ کو حقیر کرنا نہ چاہتے تھے۔ لہٰذا ایک ایک کر کے کھسکنا شروع ہوئے کسی نے فرقہ پرور اور رجعت پسند تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر دیا۔ کسی نے اپنی وکالت اور بیرسٹری دوبارہ شروع کی۔ کسی نے ریاستوں میں ملازمت ڈھونڈی، کسی نے انشورنش یا ایجنسی وغیرہ کی قسم کا کوئی اجلا کاروبار شروع کیا جو مخلص اور مستقل مزاج تھے وہ گوشہ گمنامی میں عسرت اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے لگے وکالت، سرکاری ملازمتوں اور تعلیم گاہوں کو جن مسلمانوں نے عدم تعاون کے زمانہ میں چھوڑا تھا وہ معمولی قابلیت کے لوگ نہ تھے اگر ان کی زندگی کا معیار بلند نہ ہوتا اور کچھ نجی وسائل آمدنی ان کے پاس ہوتے۔ اگر وہ مستقل مزاج اور عقیدہ کے پکے ہوتے تو ضرور مسلم قوم کی اصلاح اور تعمیر کے کاموں میں لگے رہتے اور ان رہنماؤں کی کوششوں سے مسلمانوں کی وہ بیداری جو سر سید کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی اور ۱۹۲۰ء میں انتہائی نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی مستحکم بنیاد پر قائم ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس کے برعکس جو ہندو تعلیم گاہوں سے جن اساتذہ اور طلبہ نے بغیر اپنی پرانی تعلیم گاہوں کو اجاڑے اور ویران کئے ہوئے عدم تعاون کیا تھا وہ سب قومی تعمیر کے کاموں میں لگ گئے۔ وہ خود اپنے خاموش انداز میں نہایت اچھے رہنما ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنے جیسے اور ہزاروں رہنما اور کارکن تیار کئے جو ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور پتہ مار کر کام کرنے لگے۔ آل انڈیا چرخہ سنگھ کی شاخیں انھیں لوگوں نے ہر شہر اور تحصیل میں پھیلا دیں۔ سینکڑوں آشرم ملک میں کھول دئے جو ایک طرح سے کانگریس کی چھاؤنیاں بن گئیں۔ دور بینی، عاقبت اندیشی، امید اور اعتقاد کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ملک کی بگڑی ہوئی فضا سے بد دل اور مایوس نہیں ہوئے۔ قومی کام کے ایثار کو چھوڑ کر زندگی کے نفع بخش کاروبار میں نہیں لگے بلکہ صبر و استقلال کے ساتھ قومی تعمیر اور تنظیم کے کام میں لگے رہے۔ ہندو سبھا، شدھی اور سنگٹھن کا زور ہوا۔ کانگریس کا بازار کچھ مندا بھی پڑ گیا لیکن بجز

مجموعی ہندو سوسائٹی ان کے لئے سازگار ثابت ہوئی۔ ساہوکاروں یا طبقہ متوسط کے دوسرے آزاد لوگوں سے مثلاً وکیلوں ڈاکٹروں وغیرہ سے ان کا یا تو ذاتی تعلق تھا یا اپنے رفیقوں کے ذریعہ سے یہ تعلق پیدا ہوگیا۔ ہندو عورتوں کی تعلیم، بیداری اور قومی تحریکوں سے دلچسپی نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔ ایثار اخلاص کے ساتھ جب کام کئے گئے تو عام طور پر اعتبار و اعتماد بڑھتا رہا اور کام کے کرنے میں مالی مشکلات کبھی مانع نہ ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی طاقت کی تنظیم برابر بڑھتی رہی۔

اگر مسلمانوں میں علی برادران کے ساتھ ایک گاندھی جیسا ٹھنڈے دل کا کام کرنے والا بھی ہوتا اور ان کی پشت پناہی کے لئے دولتمند تعلیم یافتہ اور بیدار مغز لوگوں کی ایسی ہی کثرت ہوتی جیسی گاندھی اور ان کے رفیقوں کے ساتھ تھی اور ان کی زندگی میں فضول خرچیاں اور ہنگامہ پسندیاں بہت زیادہ نہ ہوتیں مختصر یہ کہ مسلمانوں میں اتنے ہی بنیے ہوتے جتنے ہندوؤں میں تھے تو ہمیں یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ بنیے اور خانصاحب کا مقابلہ جیسا زندگی کے اور دوسرے تمام میدانوں میں ہو رہا تھا سیاسی زندگی میں بھی ہوا اور جس طرح خانصاحب نے اپنی جائدادیں اور زمینداریاں بنیے کے حوالے کی تھیں اسی طرح سیاسی اقتدار بھی بنیے کو سونپ دیا۔ ایک طرف خود ہماری داخلی کمزوری، دوسری طرف حکومت کی یہ کوشش کہ مسلمانوں کے مہرہ کو اپنی سیاسی چالبازیوں کے لئے استعمال کرے اور تیسری طرف مہاسبھا کی اشتعال انگیز مسلم دشمنی اور خود مسلمانوں کی گرم مزاجی اور غصہ میں آپے سے باہر ہو جانے کی عادت ـــــ ان سب نے مل ملا کر مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو بالکل نکما کر دیا۔ مہاسبھا اور حکومت برطانیہ کی عیاریوں اور مکاریوں کے ہاتھ میں مسلمان بالکل کھلونا بن گئے۔ کانگریس سے علیحدہ ہو کر جلد بازی اور غصہ میں دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ اپنے سارے پچھلے قول اور فعل بھول گئے۔ بازیگروں کی طرح قلابازیاں کھانے لگے اور کانگریس کے نیک دل پرانے ہندو رفیقوں میں اپنا جو کچھ تھوڑا بہت اعتبار اور اعتماد رکھتے تھے اس کو بھی کھو بیٹھے۔ کانگریس روز بروز ہندو ادارہ بنتی گئی اور مسلمانوں میں روز بروز فرقہ پرور لیڈروں کی آواز اور ان کا اقتدار موثر ہو گیا۔ جن نوجوانوں کے اندر علی برادران نے آزادی کی نئی لگن پیدا کی تھی ان کی زندگی کا انجام ان حالات میں نہایت عبرتناک ہوا۔ اعلیٰ نصب العینوں کی طرف سے ان کے دلوں میں ایک طرح کا تمسخر اور حقارت سی پیدا ہو گئی۔ زندگی کی بلند قدروں کے تصور دھندلے ہو گئے ان کے دل کا آئینہ

گرد آلود ہوگیا۔ وہ مطلب پرست اور جاہ پسند بن گئے۔ کچھ جاکر ریاستوں میں ملازم ہوگئے۔ کچھ تجارت کرنے لگے کچھ اور اسی طرح کی بے اثر زندگی بسر کرنے لگے۔ جو لوگ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہے ان کا اثر بھی مسلمانوں میں صفر کے برابر ہوگیا۔ اسی بکھرے ہوئے شیرازہ کے کچھ اجزا ہیں جو کانگریس کی قیادت میں اب مسلم عوامی ملاپ کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور جو آج علی برادران اور خلافت کے زمانے کے ان اسلامی نصب العینوں کو جنھوں نے ان کے دماغ کی ساخت اور تربیت میں بڑا زبردست حصہ لیا ہے لغو اور دور از کار سمجھنے لگے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نفس کو فریب دینے کے لیے سوشلزم کے خوش آیند نصب العین میں پناہ لی ہے اور اپنے آپ کو اس دھوکہ میں رکھ کر کہ ہم سوشلزم کے حصول کے لئے کام کر رہے ہیں فی الحقیقت ہندو اقتدار اور ہندو برتری کے کاموں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے اکثر نے یہ چاہا تھا بلکہ پوری کوشش کی تھی کہ انھیں مسلمانوں کے درمیان کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے اداروں پر جن سرکار پرست اور خود غرض لوگوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انھیں موزوں نہیں سمجھا۔ ان کے پرانے ریکارڈ سے خوف کھایا اور انھیں مسلمانوں کے درمیان رہ کر کام کرنے اور اپنی جوانی کی بے اعتدالیوں اور لغزشوں کی اصلاح کرنے کے موقع سے محروم کر دیا چنانچہ ہار کر اور مجبور ہو کر انھوں نے کانگریس کا رخ کیا۔ کانگریس کے بیدار مغز رہنماؤں نے ان کی اہلیت کو تاڑ لیا۔ جوان قابل، تندرست مستعد وجیہہ، مقرر، مصنف انتہائی ایثار کے لئے آمادہ ــ کس بات کی ان لوگوں میں کمی تھی۔ ہندو قوم میں بھی ان کی ٹکر کے آدمی کم نکلتے تھے۔ انھوں نے اپنے کام سے انھیں لگایا اور اب وہ جن سے مسلمان بجا طور پر بہت کچھ توقعات قائم کر سکتے تھے، جن کی تربیت اسی مقصد کے لئے ہوئی تھی اغیار کی مرضی کے پابند ہو کر کام کر رہے ہیں ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

جو علی برادران کے فیض صحبت سے سیراب ہوئے تھے اور جو ان کی امیدوں کا ملجا اور ماوا تھے آج اسی پودے کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے ہیں جس کو وہ دونوں عمر بھر سینچتے رہے تھے اب ان نوجوانوں کا

خلوص اور ایثار کسی اور ہی نصب العین کے لئے وقف ہو چکا ہے ؎

وفا آموختی از ما بہ کار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

غرضکہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی یہ دردناک کہانی ہے اور اس کی ذمہ داری دوسروں پر کم اور خود اپنے اوپر بہت زیادہ ہے۔ ہمیں اپنی گمراہیوں اور بد اعمالیوں کا اعتراف کرنا چاہیئے اور صدق دل سے توبہ اور استغفار کر کے آئندہ کے لئے سعادت اور نیکی کے راستہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ کام بہر حال پتہ مار کر برسوں بلکہ نسلوں تک کرنے کا ہے۔

جو لوگ انقلاب اور سوشلزم کو مسلمانوں کی راہ نجات سمجھتے ہیں ان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ راہ اور سب راہوں سے زیادہ کٹھن ہے۔ انقلاب باتیں بنانے سے نہیں ہو جاتا اس کے لئے بڑی صبر آزما اور خاموش کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔ بڑی زبردست قربانیاں کرنا ہوتی ہیں اور انقلاب کے بعد سوشلزم قائم کرنے کا کام اور بھی زیادہ ہمت فرسا اور جانگسل ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ کام بھی بنیوں کی رہنمائی کے بغیر نہیں چل سکے گا۔ گاندھی جی اور ان کے چیلوں نے (جن میں بنیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے) بنیا قوم میں تیاگ اور سیوا کی شکتیوں کو ترقی دے کر ان کے اقتدار کی وسعت کے لئے ایک بڑا میدان پیدا کر دیا ہے کہ اب سوشلزم کے میدان میں بھی کوئی دوسرا شخص ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ تخریب میں تو ممکن ہے دوسرے لوگ ان سے بازی لے جائیں غالباً اسی مصلحت کے پیش نظر گاندھی جی نے سرحدیوں سے دوستی کی ہے لیکن جب تعمیر کا وقت آئے گا تو بنیوں کی اس گاندھی زاد نسل کی رہنمائی پھر دوبارہ قبول کرنا پڑے گی۔ یہی لوگ بڑی بڑی ملیں، پاور ہاؤس اور اسٹور کھڑے کریں گے اور ان کو کم ترین لاگت پر چلانے کا انتظام کر سکیں گے۔

لہذا بیسویں صدی کے ہندوستان میں جب تک عملی زندگی کا اس سے بہتر کوئی نمونہ پیدا نہ ہو گا، گاندھی کے بتائے ہوئے طریقوں میں ہمارے لئے بہت کچھ سیکھنے اور اختیار کرنے کے لئے موجود ہے۔ کانگریس کا موجودہ اقتدار در اصل کسی ادنیٰ چیز کا اعلیٰ چیز پر اقتدار نہیں ہے بلکہ تنظیم، کفایت

شعاری، عاقبت اندیشی، جفاکشی، جذبۂ خدمت اور استقامت کا فقدان فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، آرام طلبی، خودغرضی تلون مزاجی اور عدم تنظیم پر ہے۔ ہم نے اپنی اسلامی خصوصیات کو چھوڑ دیا دوسروں نے انہیں قبول کیا یہی وجہ ہے کہ وہ برسر اقتدار ہیں ؎

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور   مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں   طور موجود ہے لیکن کوئی موسیٰ ہی نہیں

لہٰذا ہمیں ہنگامہ پسند کارکنوں کی جگہ خاموش مخلص اور ایثار پسند کارکن زیادہ تعداد میں تیار کرنا چاہیئے انہیں تنظیم دینا چاہیئے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کا کام ایسا ہے کہ جس میں ہماری ہمت اور حوصلہ کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے۔ اس میں اگر ہم کامیاب ہوئے تو اپنی بہت سی محرومیوں اور مایوسیوں کی تلافی کرسکیں گے۔

اوپر جو کچھ باتیں عرض کی گئی ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے حوصلے کو توڑا جائے اور ان میں جو بیداری اور جوش اس وقت پیدا ہوا ہے اسے دبایا یا ٹھنڈا کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انہیں بھڑکنے کی جگہ آہستہ آہستہ سلگتے رہنا سکھایا جائے انہیں تنظیم کے ایسے کاموں کو شروع کرنے کے لئے مائل کیا جائے جو دیر تک چلنے والے ہوتے ہیں جن سے قوم میں سچی اور مستقل قوت پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ہنگامہ پسند کارکنوں کی جگہ خاموش، مخلص اور ایثار پسند کارکن زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرنا چاہیں۔ انہیں تنظیم دینا چاہیئے مسلمان مردوں اور عورتوں میں اصلاح اور ترقی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کے کام ایسے ہیں کہ جن میں ہماری ہمت اور حوصلہ کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے۔ ان میں اگر ہم کامیاب ہوئے تو اپنی بہت سی محرومیوں اور مایوسیوں کی تلافی کرسکیں گے۔

کانگریس کا مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ مسلم لیگ سے موجودہ حالت میں سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میری خدا سے یہ دعا ہے کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ ابھی بہت دن تک اور کوئی سمجھوتہ نہ کرے خوب اچھی طرح مسلم لیگ کے خلوص، صداقت، مستقل مزاجی اور اس کے اس دعوے کا کہ وہ مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ امتحان کرے یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے ابھی تک اپنے آپ کو اس بات کا مستحق ثابت نہیں کیا ہے کہ اسے اور صرف اسے مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ گفتگو کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسے مسلم

عوام سے رابطہ اور ان کی پرخلوص خدمت کر کے اپنے اس دعوے کو تسلیم کرانا ہوگا۔ میں کانگریس کے کارکنوں کے رویہ کو نہایت معقول اور مناسب سمجھتا ہوں اور مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا جو فیصلہ انھوں نے کیا ہے اسے بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں۔ مسلم لیگ اگر مسلمانوں کی سچی اور پرخلوص خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو اسے اس بات سے ناراض نہ ہونا چاہیے بلکہ خدمت اور ایثار کے میدان میں کانگریس کا مقابلہ کر کے یہ دکھانا چاہیے کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حقیقی بہی خواہ وہی ہے اسے مسلمانوں کے درمیان کام کرنے میں کانگریس پر ہر قسم کی فوقیت حاصل ہے۔ اگر اس کے باوجود کانگریس اس پر بازی لے جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو پھر حقیقتاً کانگریس کو ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا، لیگ کو نہیں۔ میں کانگریس کے کارکنوں کو ان کے فیصلہ پر صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور انھیں خوش آمدید کہتا ہوں اور مسلم لیگ والوں سے میری یہ خواہش ہے کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ لیکن ان کے سب طریقے خلوص اور خدمت پر مبنی ہونے چاہئیں۔ اشتعال انگیزی، منافرت خیزی، فتنہ پروری اور سازش سے انھیں پرہیز کرنا چاہیے کیوں کہ ان باتوں سے ممکن ہے وقتی کامیابی ہو جائے لیکن مسلم عوام کو وہ زیادہ دن تک دھوکے میں نہ رکھ سکیں گے۔ صحیح راستہ کٹھن اور دشوار گذار ضرور ہے لیکن کامیابی کا سیدھا راستہ وہی ہے ؎

تو آگ میں جل اور خاک میں مل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر، بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

(مضمون نگار صاحب اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے)

سب سے پہلے میں اس بات کو بتادینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں نہ تو پاکستان کی تحریک کا مبلغ ہوں نہ اس کا دشمن۔ میری حیثیت ایک طالب علم کی ہے جس کے مطالعہ کا موضوع جماعتی مسائل ہیں۔ ہندوستان کے جہاں اور بہت سے مسئلے ہیں مثلاً محکومی کا مسئلہ، غریبی کا مسئلہ، جہالت کا مسئلہ، چھوت اچھوت کا مسئلہ وہاں ایک نہایت اہم مسئلہ اس ملک کی دو مذہبی جماعتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھی ہے کچھ دنوں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے جا رہے ہیں (جن میں غیر مسلم بہت سے ہیں اور مسلمان بہت تھوڑے ہیں) جو سرے سے اس مسئلہ کی اہمیت سے ہی انکار کرنے لگے ہیں۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت اور غیر مسلموں کی ایک خاصی دیقیع، ذی اثر اور ذمہ دار تعداد کے لئے یہ مسئلہ ابھی تک بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما۔ اخبار اور مصنف اس مسئلہ کے تصفیہ کے سلسلہ میں اپنی پوری توجہ اور قیمتی وقت اکثر صرف کرتے رہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے حل بہت سے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً مسلم عوام سے براہ راست رابطہ، مسلم لیگ اور کانگریس سے مفاہمت، برطانیہ کے کمیونل اوارڈ کو اپنی موجودہ صورت میں قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ مسئلہ کے ان حلوں میں ایک حل اور بھی ہے جسے پاکستان کے تصور یا تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس بات کا اعتراف میں شروع ہی میں کئے لیتا ہوں کہ میرا مطالعہ ابھی بہت سرسری اور نامکمل ہے اس کی بنیاد پر کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا میں سخت غیر ذمہ دارانہ جسارت سمجھتا ہوں اس لئے اگر میرے بیان سے آپ کو کوئی واضح ہدایت یا رہنمائی نہ ملے تو آپ کو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی میری طرح ایک طالب علم کی حیثیت سے اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں اور میری یہ کوشش ہوگی کہ میں اپنے اس مختصر مضمون میں آپ کے سوچنے اور غور کرنے کے لئے کچھ سوالات پیش کر سکوں

اس سلسلہ میں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان سے کیا مراد ہے؟ چودھری رحمت علی صاحب ایک بزرگ ہیں جو غالباً کیمبرج میں ایک عرصہ سے مقیم ہیں۔ ان کو پاکستان کی تحریک کا لیڈر بتلایا جاتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق پاکستان اس خیالی علاقہ کا نام ہے جس میں پنجاب کشمیر سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان شامل ہیں۔ اور جس علاقہ کو آج ہم ہندوستان کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ان کے نزدیک ایسے دو غیر ہم آہنگ اور متضاد عناصر کا مجموعہ ہے جو زیادہ عرصہ تک یکجا نہیں رہ سکتے۔ چودھری رحمت علی صاحب نہیں چاہتے کہ ہندوستان کا لفظ پاکستان پر بھی حاوی ہو۔ بلکہ ان کے خیال میں پاکستان کو علیحدہ کرنے کے بعد جو علاقہ بچے گا اسی کے لئے ہندوستان کی اصطلاح کا استعمال کرنا صحیح اور جایز ہوگا۔

اصل میں پاکستان کے تصور کی ابتدا کا سہرا علامہ اقبال مرحوم کے سر ہے۔ علامہ موصوف نے اپنے صدارتی خطبہ میں جو آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۰ء کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پڑھ کر سنایا گیا تھا مسلمانوں کے سامنے ایک جداگانہ مسلم ہندوستان کا نصب العین پیش کیا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے پاکستان کا لفظ تو استعمال نہیں کیا تھا لیکن مفہوم ان کا کم و بیش کچھ اسی قسم کا تھا۔ عام طور پر تو اپنے اس خطبہ میں انھوں نے مسلم کانفرنس کے مطالبات کی حمایت کی تھی۔ اور ایک ایسے فیڈریشن کے قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا جس میں پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو قائم رکھا جائے اور فاضل اختیارات (Residuary powers) صوبہ کی حکومتوں کے ہاتھ میں رہیں۔ لیکن اسی خطبہ میں ضمنی طور پر "مسلم ہندوستان" کی تجویز کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔ ان کے اس مجوزہ "مسلم ہندوستان" میں کشمیر شامل نہیں تھا اور جن علاقوں کو شامل کیا گیا تھا ان میں بھی یکسانیت کے اصول کو محکم بنا کر رد و بدل کی جا سکتی تھی۔

لیکن چودھری رحمت علی صاحب کی تجویز میں زیادہ صفائی اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اس تجویز کو تحریک کا جامہ پہنایا اور اس کے نصب العین کو مبہم رکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

بہرحال یہ تو پاکستان کے تخیل کی ابتدا اور اصل کا بیان ہوا۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تجویز کی تائید میں دلیلیں کیا کیا پیش کی جاتی ہیں؟ چونکہ یہ تحریک کیمبرج یونیورسٹی سے نکلی ہے اس لئے اس کی تائید میں علمی یا کم سے کم علمی نما دلیلوں کی کمی نہیں ہے: جیالوجی، انتھراپالوجی، اتھنالوجی، زبانوں کے علم، مذہبوں کے علم، تاریخ، فلسفہ، اعداد

دشمار، اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات غرضیکہ تمام علوم کی خدمات مستعار لے کر اس تحریک کے جواز میں دلیلیں پیش کی جارہی ہیں۔ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے علاوہ عام مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول اور قابل فہم بنانے کے لئے روزمرہ کے مشاہدوں، تجربوں، تعصبوں، شکایتوں اور بے اطمینانیوں کو بھی پوری طرح نمایاں اور بیدار کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ کام ابھی تک بڑے پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر شروع نہیں ہوا ہے لیکن اس نے بہرحال لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

کچھ دن ہوئے اخبار زمیندار لاہور کے بنگال نمبر میں ایک بزرگ چودھری وہاب الدین صاحب نے جیالوجی اور تاریخ کے واقعات کو سامنے رکھ کر پاکستان کے سوال پر بحث کی تھی اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ پاکستان ہندوستان سے الگ ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ میں ان کی تحقیقات کی صحت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی کے بعد ملکوں کی طبعی تقسیموں اور طبقات الارض کی تفریقوں کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے۔ اب جن باتوں کو دیکھا جاتا ہے وہ یہ ہوتی ہیں کہ آیا پختہ سڑکیں، ریلیں، ڈاک خانے، تار گھر، ٹیلیفون، بندرگاہیں، ہوائی مستقر اتنی تعداد میں موجود ہیں جن سے ایک ملک کے دو علاقوں کے جغرافیائی فاصلہ کا کم کرنا ممکن ہے یا یہ صورت نہیں ہے۔ اگر ہے تو جغرافیہ اور طبقات الارض کی ساخت کے فرق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں کلکتہ سے پشاور تک اور بمبئی سے دہلی، لاہور، پشاور، کوئٹہ اور کراچی تک آمد و رفت کی جن سہولتوں کو ترقی حاصل ہو چکی ہے اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ علاقے ایک دوسرے سے قدرتی طور پر جدا ہیں صحیح نہیں ہے۔ قدرت نے ممکن ہے ان دونوں علاقوں کو الگ الگ پیدا کیا ہو لیکن انسان نے اس قدرتی خلیج کو ہموار کر دیا ہے۔ اس لئے جیالوجی کی اس دلیل کو تو میرے خیال میں بحث سے خارج ہی کر دیا جائے تو مناسب ہے۔

اسی طرح نسل کے اختلاف کی دلیل کو بھی اس بحث میں لانا مناسب نہیں ہے کیونکہ جہاں تک میری واقفیت ہے خالص نسل رکھنے والے لوگوں کا وجود دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔

اب رہے دوسرے تمام اختلاف ان میں میری رائے میں مذہب کے اختلاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک ہندوستان میں اسی کے فرق کی وجہ سے دوسرے تمام اختلافات یعنی زبان،

تاریخ، تمدن، معاشرت، فلسفہ ادب سیاست وغیرہ کے اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کے اختلاف کو پاکستان کی تحریک کے جواز میں ایک مضبوط دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے کچھ اعداد و شمار آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

پاکستان کے جو نقشے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں چونکہ دہلی کے صوبہ کو بھی پاکستان میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے صوبہ دہلی کی آبادی کے اعداد کو بھی پاکستان کے اعداد میں شامل کر لیا ہے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے صوبہ کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ ہے جس میں سے ڈھائی کروڑ کی آبادی مسلمانوں کی ہے اور ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کی۔ مسلمانوں میں میں نے عیسائیوں، یہودیوں، زرتشتیوں، پاکستان کے قبائلی مذہبوں اور متفرق چھوٹے چھوٹے اور لامعلوم مذہبوں کو بھی شامل کر لیا ہے کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کا کوئی خاص تعلق ہندوؤں سے نہیں ہے اور یہ پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ رہنا شاید زیادہ پسند کریں گے۔ لیکن اگر انہیں نہ بھی شامل کیا جائے تو مسلمانوں کی اوپر لکھی ہوئی تعداد میں صرف نو دس لاکھ کا فرق کرنا پڑے گا جس سے ہماری دلیل پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ ہندوؤں کی مجموعی آبادی پاکستان میں ڈیڑھ کروڑ ہے اور اس تعداد میں سکھ جین اور بدھ بھی شامل ہیں۔ سکھوں کی تعداد بجائے خود ۴۲ لاکھ کے قریب ہے۔ اس حساب سے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب مجوزہ پاکستان میں ۶۲ فی صدی کے قریب ہوگا اور ہندوؤں کا ۳۸ فی صدی اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ جہاں تک ایک صوبہ میں مسلمانوں کی ایک خاص بڑی اکثریت کے حاصل کرنے کا سوال ہے وہ تو اس انتظام سے حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اب اس کے بعد بہت سے اور سوال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم یہ اکثریت کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ ہم اپنی اس مذہبی اکثریت کے وسیلہ سے جمہوری طرز حکومت میں مخصوص طور پر مسلمانوں کے فائدہ اور اسلامی شریعت کے مطابق قوانین پاس کرانا چاہتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قوانین اور مسلمانوں کے فائدہ سے ہمارا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی حکومت کو مذہبی حکومت اور مسلمانوں کے طبقہ کو امتیازی مراعات اور حقوق رکھنے والا طبقہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا ہماری ریاست میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ کیا سول اور فوجی ملازمتوں

میں ان کو بھرتی نہیں کیا جائے گا؟ اگر کیا جائے گا تو کیا اسلامی مقاصد کے پورا کرنے میں غیر مسلم عہدہ داروں اور سپاہیوں پر بھروسہ کیا جا سکے گا۔ اگر بھروسہ نہ کیا گیا تو کیا فوجی خدمت انجام نہ دے سکنے کے معاوضہ میں ان سے کوئی خاص ٹیکس جزیہ کی قسم کا لیا جائے گا۔ اب اگر فرض کیجئے کہ ہم خالص اسلامی حکومت مذہب اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم آبادی مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور اپنی مذہبی غلامی کو خوشی سے گوارا کرے گی۔ کیا ایسی صورت میں وہ پاکستان میں شامل ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کرے گی اور اگر وہ آمادہ نہیں ہوئی تو پھر کیا انھیں زبردستی پاکستان میں شامل کیا جائے گا یا انھیں پاکستان سے نکال باہر کیا جائے گا۔ چار کروڑ کی مجموعی آبادی سے ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کو نکالنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ کس قسم کا دباؤ ڈال کر ان سے اپنے مطالبات منوائے جائیں گے۔ جب تک برطانوی حکومت کو ہماری سیاست میں اقتدار حاصل ہے کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ برطانیہ کی اخلاقی ہمدردی اپنے لئے حاصل کر لی جائے۔ کیا لیگ آف نیشنس اور ایشیا کے اسلامی ممالک کی اخلاقی ہمدردی کا دباؤ ڈالا جائے گا۔ بہرحال یہ سوال سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لائق ہیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں کی آزادی کے معنی یہ ہوئے کہ غیر مسلموں کی آبادی ختم ہو جائے تو اس سے موجودہ معیار اخلاق کے مطابق انسانیت اور انصاف کا خون ہوگا؟ اگر اس کے باوجود ہم کو برطانیہ جمعیت اقوام اور اسلامی ممالک کی ہمدردی حاصل ہو بھی گئی تو بقیہ ہندوستان کے ۲۴ یا ۲۵ کروڑ ہندو تو اپنے ہم مذہبوں کی قربانی کو اطمینان قلب کے ساتھ نہ دیکھ سکیں گے اور وہ یا تو براہ راست اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی، مالی اور مادی مدد کریں گے یا ان کے حق میں اس سے بھی اور زیادہ سخت قسم کی مداخلت کے لئے آمادہ ہوں گے یا اس کا بدلہ دوسری طرح لیں گے یعنی ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں پر جو پنجاب یا بنگال میں نہیں ہیں اور جو ان کی اکثریت کے صوبوں میں محکومانہ زندگی بسر کر رہے ہوں گے ظلم کرنا شروع کریں گے اور انھیں ہندو راج کا پوری طرح مزہ چکھائیں گے۔

اس سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ہماری اسلامی حکومت غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے گی۔ انھیں مسلمانوں کے ساتھ سارے حقوق دے گی اور ہم آہنگی اور رواداری کے ساتھ زندگی بسر کرے گی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مقصد مشترکہ

فائدہ ہے تو اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ایسی جماعت کیوں نہ بنائی جائے جو مشترکہ فائدہ کے کاموں کو مل جل کر انجام دے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے پاکستان کی اسکیم بناتے وقت شریک ہونے والے صوبوں کے تمام مسلمانوں کے جذبات اور مفاد کو بھی ہم نے اپنی نظر کے سامنے رکھا ہے یا نہیں؟ پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا میں تو بلاشبہ مسلمانوں میں پاکستان کے جذبہ کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ سرحدی صوبہ کے مسلمان خاص طور پر، اور کشمیر، سندھ اور بلوچستان کے مسلمان عام طور پر پنجاب کے ساتھ شریک ہونا پسند کریں گے۔

فرض کیجئے کہ سب کام منصوبہ کے مطابق ہو گیا اور کسی معجزہ کے ذریعہ پاکستان کی ریاست وجود میں آگئی اور یہاں مسلمانوں کے حسب منشا حکومت بھی قائم ہو گئی لیکن اس سے تو ۸ کروڑ مسلمانوں میں صرف ۲ ½ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوگا۔ بقیہ ۵ ½ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں سے پونے تین کروڑ مسلمان بنگال میں ہیں اور بنگال میں ان کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ اگر وہ جنوب مغربی بنگال کے چند اضلاع کو بنگال سے خارج کر دیں تو ان کی اکثریت بھی پاکستان جیسی بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن وہاں بھی ہندوؤں کی اسی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا جس کے اندیشہ کا اظہار پنجاب کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی ایک طویل خانہ جنگی کے شروع ہونے کا خطرہ ہے۔ جس میں بہت سی قیمتی جانوں اور مال کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن میں ایسی صورت حال کا تصور کر سکتا ہوں جب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہے۔ اور بنگال کے مسلمانوں کو مجبوراً یہ تمام طریقے اختیار کرنا پڑیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کامیاب ہونے کے بعد مسلمان طاقت کے نشہ میں مست نہ ہوں بلکہ انصاف اور رواداری کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ کر سکیں۔ لیکن ہمیں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا میں غیر ضروری فتنہ و شر سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا جرم نہیں ہے۔ ہمیں اس کے تمام وسائل اور ذرائع کا پورے طور پر پہلے جائزہ لینا چاہیئے اور جب تک ہم کو اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ صلح کا کوئی دروازہ ہمارے لئے کھلا ہوا نہیں ہے ہمیں لڑائی اور جنگ کی طرف ہرگز قدم نہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اپنی طاقت کا بھی ہمیں صحیح اندازہ اور احساس ہونا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہم اپنے حریف کو کمزور سمجھ کر نقصان پہنچانے کا حوصلہ کریں اور اس کو نقصان پہنچانے کی جگہ الٹا خود اپنا نقصان کر لیں۔

بہرحال اگر ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد ہم نے بنگال اور پاکستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا

کوئی حل نکال بھی لیا تو بھی تقریباً ہ ۲ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ باقی رہے گا یہ مسلمان وہ ہیں جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں جن کے پاس زمینداریاں بھی ہیں جن کے پاس سرمایہ بھی ہے جن کے ذاتی گھر اور جائدادیں بھی ہیں جن کے ذاتی کاروبار بھی ہیں جن کی مسجدیں ہیں جن کی مذہبی درسگاہیں ہیں۔ اور ان میں یو۔ پی کا صوبہ خصوصاً ایسا صوبہ ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ جہاں مسلم یونیورسٹی ہے۔ جہاں ندوہ کا مدرسہ ہے۔ دیوبند اور سہارن پور کے مدرسے ہیں۔ تاج محل ہے اردو کے بولنے والے ہیں اور ہزاروں دوسری اسلامی یادگاریں ہیں۔ اسی طرح مسجدوں، اسلامی مدرسوں اور اسلامی یادگاروں سے اور مسلمانوں کے قبرستانوں سے ہندوستان کا کونہ کونہ آباد ہے۔ کیا ہم ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ کیا ہم اسلام کی مجموعی جمعیت اور قوت بڑھانے کے لئے ایک مجموعی محاذ قائم نہیں رکھیں گے۔ کیا ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ہجرت کر کے پاکستان یا بنگال میں جا بسیں۔ لیکن اس سے جو پیچیدہ معاشی مسائل پیدا ہوں گے اور آبادی کا دباؤ زمین پر پڑے گا اس کے لئے ہم کیا کریں گے۔

ان سوالوں کے علاوہ چند اور عملی اور مادی مشکلات بھی ہیں جن کو ہمیں نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ اپنے موجودہ ذرائع دولت کے ذریعہ اپنی حکومت کا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے۔ سندھ کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیس پچیس سال میں شاید وہ اپنی حکومت کے خرچ کو چلانے کے قابل ہو جائے گا لیکن سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لئے ایسا کہنا مشکل ہے۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لوگوں کی معاشی زندگی کو مرکزی حکومت کے خرچ سے بہت کچھ تقویت پہنچتی ہے۔ اسی طرح پنجاب کے جو لوگ ہندوستان کی فوج میں اس وقت ملازم ہیں انھیں ہندوستان کی دولت کا ایک خاصا بڑا حصہ مل جاتا ہے۔ کیا جب پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے الگ ہو کر اپنی زندگی شروع کرے گی وہ اپنے اس مالی نقصان کو محسوس نہیں کریگی پنجاب کے ہزاروں ٹھیکیدار، تاجر، بڑھئی لاری والے اور دوسرے کام کرنے والے لوگ ایسے ہیں جو پنجاب سے ہندوستان آتے ہیں اور یہاں سے دولت کما کر پنجاب کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اب تو سب لوگ ایک ہی سیاست کے افراد ہیں لیکن اگر پاکستان اور ہندوستان دو علیحدہ علیحدہ ریاستیں ہو گئیں تو کیا اس صورت میں ہندوستان غیر ملکوں کے آزاد داخلہ کو اپنے ملک میں روا رکھے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے

وسائل دولت ابھی غیر ترقی یافتہ حالت میں ہیں جب ان کو ترقی دی جائے گی تو پاکستان کی دولت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ وہ پاکستان کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لئے کافی ہوگا لیکن محض قدرتی وسائل ہونا تو صنعتی ترقی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ قدرتی وسائل تو افغانستان میں بھی بہت اچھے ہیں لیکن قدرتی وسائل کے ساتھ سرمایہ تنظیم اور ماہر مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا پاکستان کے رہنے والے ہندوستان کے ان صوبوں کے ماہروں اور سرمایہ داروں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے جنھیں صنعتی کاروبار میں نصف صدی سے زیادہ کا تجربہ ہے؟

لیکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے حامی اپنی تمدنی اور مذہبی ترقی اور آزادی کو ان تمام مادی فایدوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں۔ اس صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی ترقی کے لئے میدان پورے ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا علیحدہ ہو جانے کی صورت میں۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے مذہب کا پیغام ہندوستان کے ایک ایک فرد تک پہنچے تو آپ کو ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیئے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہیئے۔ انھیں اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کا نمونہ اپنی زندگی میں ظاہر کر کے دکھانا چاہیئے۔ اس کا موقع ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا ہندوستان سے الگ ہو جانے کی صورت میں۔

پھر ہمیں موجودہ زندگی کے تلخ حقایق اور واقعات کو بھی نگاہ کے سامنے سے نہ ہٹانا چاہیئے کشمیر پر مہاراجہ کشمیر کا قبضہ ہے پٹیالہ پر مہاراجہ پٹیالہ کا راج ہے اسی طرح پنجاب کی اور ریاستوں پر راجاؤں کا قبضہ ہے۔ سکھوں کا برطانوی فوج میں بہت عمل دخل ہے۔ ہندوؤں کا پاکستان کے سرمایہ پر قبضہ ہے۔ یہ لوگ نسبتاً زیادہ تعلیمیافتہ اور دنیا سے واقف ہیں۔ پروپیگنڈا کی مشین پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ خیر ان سب کو بھی اپنے سے کمزور سمجھ لیجئے لیکن برطانوی شہنشاہیت کو کیا کیجئے گا۔ اگر اس کو آپ کا یہ انتظام پسند نہ آیا یا ایسی شرائط پر اس نے اسے منظور کیا جو آپ کے لئے ہندوؤں کی غلامی سے بھی بدتر ثابت ہوئیں تو پھر شیخ چلی کے یہ تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے اپنے اس مطالبہ کو منوانے کے لئے آپ کے پاس کون سے طاقت ہے۔ کیا آپ چوکھی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی۔ ہندوؤں سے بھی سکھوں سے بھی۔ سرکار پرست مسلمانوں سے بھی اور خود سرکار برطانیہ

سے بھی۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو میں آپ کو مبارک باد دوں گا اور مرحبا کہوں گا لیکن پھر بھی میرا آپ کو مشورہ یہی ہوگا کہ ملک کی تعمیری کاموں میں اس ہمت اور طاقت کو صرف کیجئے۔ بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خون اور اس کی خرابی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے ان تعمیری کاموں سے آپ پنجاب کشمیر سرحدی صوبہ بلوچستان اور سندھ ہی کو نہیں سارے ہندوستان کو پاکستان بنالیں گے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو میں یہی کہوں گا کہ اگر آسمان تک اڑنے کی طاقت نہیں ہے تو جہاں تک آپ کی رسائی ہو سکے وہاں تک اڑیے۔

غرضکہ ان تمام مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں پاکستان کی تحریک کو ایک مایوسی کے علاج سے تعبیر کرتا ہوں اگر سمجھوتہ اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہے تب توجبوراً مسلمان اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور اس کے لئے جتنی بھی قربانیاں کرنا پڑیں ان کو انھیں گوارا کرنا چاہیئے لیکن اگر سمجھوتہ کی ذراسی بھی امید انھیں کہیں نظر آئے تو انہیں امن اور محبت کی راہ کو چھوڑ کر فتنہ و فساد کی راہ کو اختیار نہ کرنا چاہیئے میں ذاتی طور پر سمجھوتہ سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ موجودہ خراب فضا کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو گئے ہوں ان کو بھی میرا مشورہ یہی ہوگا کہ پاکستان کی پرخطر راہ کو اختیار کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ اپنا اطمینان کرلیں کہ آیا واقعی صلح اور اس کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ خصوصاً مسلم نوجوانوں کو میرا مشورہ یہی ہوگا کہ وہ اپنی زبان سے جلد بازی میں کوئی ایسی بات نہ نکالیں جس سے ہندوستان کی موجودہ خراب فضا میں اور زیادہ تکدّر اور ناگواری پیدا ہو ہمیں جیکوسلووکیہ کی حالت سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اور اقلیتوں کو چاہے ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو چاہے ہندوؤں اور سکھوں سے حقیر اور بے ضرر نہ سمجھنا چاہیئے۔ ہر قوم پر مشکل اور مصیبت کے وقت آتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے لئے جس نے ابھی اپنی آزادی کی ابتدائی منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں اس قسم کی مشکلوں کے بہت سے وقت آئیں گے اور اقلیتوں کو خوش رکھنے کی پالیسی طویل مدت کے مصالح کو اگر سامنے رکھا جائے آخر میں سب کے لئے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان ایک عرصہ سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ بھائیوں میں اب نفاق نہ پیدا ہونا چاہیئے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کو مجبور نہ کرنا چاہیئے کہ وہ روٹھ کر اپنا گھر الگ بسانے کی فکر کرے۔

مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی
آبادی کا تناسب
پنجاب
۵۶،۵ فیصدی
فیصدی
صوبجات متحدہ
۱۵ فیصدی
بہار
فیصدی
بنگال
۵۵ فیصدی
آسام
فیصدی
بمبئی
مدراس

نقشہ پاکستان
افغانستان
سرحدی
پشاور
کشمیر
سری نگر
صوبہ
تبت
لاہور
کوئٹہ
پنجاب
دہلی
ایران
بلوچستان
ہندوستان
سندھ
کراچی
بحیرۂ عرب

بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا مسئلہ

(از جناب طفیل احمد صاحب متعلم جامعہ)

ہندوستان میں غیر مسلموں کی تعداد بحیثیت مجموعی اکثریت میں ہے اور مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں لیکن اگر ہندوستان کی صوبائی تقسیم کو فرداً فرداً دیکھا جائے تو ہم کو بعض صوبے ایسے بھی ملیں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ جیسے صوبہ بنگال ۔ پنجاب ۔ سرحد اور سندھ اس وقت میں آپ حضرات کے سامنے صرف صوبہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا کچھ حال بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ یہاں پر مسلمانوں کی اکثریت تو ضرور ہے لیکن بہت ہی معمولی ۔

ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت نے نہ صرف بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو شش و پنج میں ڈال رکھا ہے ۔

اس مسئلہ کے پہلو تو بہت سے ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً معاشی پہلو ۔ مذہبی پہلو وغیرہ ۔ لیکن یہاں جس پہلو سے میں خاص طور پر بحث کروں گا وہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا اور ان کی نشستوں کا سوال ہے ۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے اور تمام مسائل کا بھی حل ہو سکے گا ۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے ان کی نمایندگی یا نشستوں کا ذکر کروں وہاں کی آبادی آپ کے سامنے ہونی ضروری ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو ۔

بنگال | بنگال میں برطانوی علاقہ کی آبادی چار کروڑ چھیاسٹھ لاکھ پچانوے ہزار پانسو چھتیس ہے جس کی فرقہ وارانہ تفصیل یہ ہے ۔

(۱)	مسلمان	۲,۵۲,۱۰,۸۰۲	۵۴ فی صدی
(۲)	ہندو	۲,۰۲,۰۳,۵۲۷	۴ ۳/۴ "
(۳)	دیگر	۱۲,۸۱,۳۰۷	۲ ۱/۴ "

دیگر میں عیسائی اور دیگر قبائلی لوگ شامل ہیں ۔

بنگال میں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۴ فی صدی کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت تمام صوبہ میں برابر برابر تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

بنگال میں کل ۲۸ اضلاع ہیں جن میں سے مشرقی بنگال کے ۱۴ اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور چار اضلاع ایسے ہیں جہاں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے ۳ اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت میں ہیں اور باقی دس اضلاع ایسے ہیں جن میں غیر مسلموں کا غلبہ ہے۔ اور یہ بیشتر مغربی بنگال میں پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ بنگال)

پنجاب | پنجاب کی آبادی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کل آبادی	۲,۰۶,۸۵.۰۲۴	
مسلمان	۱,۱۴,۵۴,۳۲۱	۵۵.۳ فیصدی
ہندو	۶۵,۷۹,۲۶۰	۳۱.۸ "
سکھ	۲۲,۹۴,۲۰۷	۱۱.۱ "
دیگر (خصوصاً عیسائی)	۳,۶۷,۲۳۶	۱.۸ "

یہاں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۵ فی صدی اور کچھ کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت بنگال کی طرح تمام صوبہ میں برابر برابر تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

پنجاب میں کل ۲۹ اضلاع ہیں ان میں ۱۵ اضلاع ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور دو اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ تین اضلاع ایسے ہیں جن میں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے۔ لیکن مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت ہے۔ بقیہ صرف ۹ اضلاع ہیں جو سب پنجاب کے مشرق اور جنوب مشرق میں پائے جاتے ہیں" جہاں ہندوؤں کا غلبہ ہے (ملاحظہ ہو نقشہ پنجاب)

بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کی اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ شرائط موجود ہوں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ تو ان دونوں صوبوں میں اپنی اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو نہ تو جداگانہ حلقۂ انتخاب کی ضرورت ہے اور نہ نشستوں کے تحفظ کی۔ یہی نہیں بلکہ ان دونوں کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے سراسر مضرت رساں

ہے۔ کیونکہ جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے محفوظ ہونے کی صورت میں وہ صرف مقررہ نشستوں پر قبضہ کر سکتے ہیں حالانکہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب اور عدم تعین نشست کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستوں پر قبضہ کرلیں۔ چنانچہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں قابل وثوق اعداد و شمار پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان پنجاب میں ۷۰ فی صدی تک اور بنگال میں ۵۴ فی صدی تک نشستوں پر قبضہ کر سکتے ہیں۔

پھر اگر حقیقت یہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیوں ان تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور کیوں اپنی اکثریت کو جو زیادہ ہو سکتی ہے معرض خطر میں ڈال کر کم رکھنے پر مصر ہیں اس سوال کا جواب دینے کے لئے ان شرطوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے جن کی موجودگی میں یہ صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی شرط تو یہ ہے کہ علاقہ وار نمائندگی ہو۔ اور ہر بالغ مرد و عورت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو اور جائداد اور تعلیم پر ووٹ کے حق کو منحصر نہ کیا جائے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی بالغ آبادی کا تناسب دوسرے فرقوں کی بالغ آبادی سے کم نہ ہو۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے افلاس یا قرض کی وجہ سے کسی غیر مسلم کے ناجائز اثر میں دبے ہوئے نہ ہوں۔ اور اپنی رائے کو آزادانہ طور پر استعمال کر سکیں۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری۔ معاملہ فہمی۔ ہوشیاری اور چالاکی اتنی ہو کہ جتنی غیر مسلمانوں میں ہے۔ تاکہ وہ اپنی رائے کے حق کو صحیح طور پر اپنے فائدے کے واسطے استعمال کر سکیں اور دوسروں کے دھوکہ اور فریب میں نہ آئیں۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہب کا رشتہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ دوسرے تمام ایسے جذبوں اغراض اور مفاد پر غالب آ سکے جو غیر مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل کے محرک بن سکتے ہیں۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی عورتوں میں بھی اسی قدر آزادی، بیداری اور تعلیم پائی جائے جتنی غیر مسلم عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ بھی اپنی حق رائے دہندگی سے مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکیں۔

مذکورہ بالا چند شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ شرطیں فی الحال پوری نہیں ہوتیں۔ اس لئے بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ اگر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب نہ رکھے گئے اور مسلمانوں

کے واسطے نشستیں محفوظانہ کی گئیں تو مسلمان ووٹروں پر ساہوکار اور زمیندار اپنا ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو لالچ اور دھوکہ دے کر ان کے ووٹوں کو بے اثر کرکے اور مسلمان عورتوں کے پردے اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم امیدوار کو منتخب کرائیں گے۔ اور ان صوبوں میں مسلمان اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی، مالی اور معاشرتی حالت نہایت ردی اور ابتر ہے۔ مذہبی احساس کی بھی ان میں بہت زیادہ کمی ہے یہ لوگ بہت بھولے، سیدھے اور سادے ہیں۔ ان کو اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے چالاک اور مکار ساہوکار اور زمیندار جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

اس لئے ان صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معنی یہ ہیں کہ ایک جاہل مفلس اور بیوقوف آبادی کو مکار اور دولت مند لوگوں کے ناپاک مقاصد کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے اور ان کو اپنی ذاتی اور انفرادی ترقی اور فلاح و بہبود کا موقع دیا جائے۔

اگر اس اصول کو مشعل ہدایت بنالیا جائے تو پھر ان دونوں صوبوں کے بے بس مسلمانوں کو خود اپنے ہم مذہب مسلمانوں سے بھی بچانا ضروری ہوگا۔ جو ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں اور جو اتنے ہی دلیر اور بے باک ہیں جتنے کہ خود غیر مسلم ہیں۔

اسی طرح بہت سے غیر مسلم بھی ہمیں ملیں گے جو اپنے غیر مسلم ہم مذہبوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کا ایسا ہی شکار بنے ہوئے ہیں جیسے مسلمان ان کا شکار ہیں۔ اس واسطے آخر میں اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنا پڑیگا۔ جب مسئلہ کو اس روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان صوبوں میں دراصل معاشی مسائل کو ہی اہمیت حاصل ہے اور حقوق کا مسئلہ دراصل معاشی بنیاد پر طے کرنا ہی زیادہ پسندیدہ اور مناسب صورت ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مطالبوں سے جو فوائد حاصل ہوں گے ان سے تمام عوام یکساں طور پر مستفید ہو سکیں گے اور چونکہ مسلمان عوام کی ان صوبوں میں اکثریت ہے اس واسطے ان کا فائدہ اور اقتدار قدرتی طور پر ان صوبوں میں زیادہ ہو جائے گا۔ اور ساہوکار اور زمیندار جن میں سے بیشتر غیر مسلم ہیں وہ نقصان میں رہیں گے۔

پنجاب اور مسلمانوں کا مسئلہ
وہ علاقہ جس میں مسلم اکثریت ہے
وہ علاقہ جس میں ہندو اکثریت ہے
غیر جانب دار علاقہ
مسلمانوں کی بھاری اکثریت
ملتان
لاہور
فیروزپور
حصار
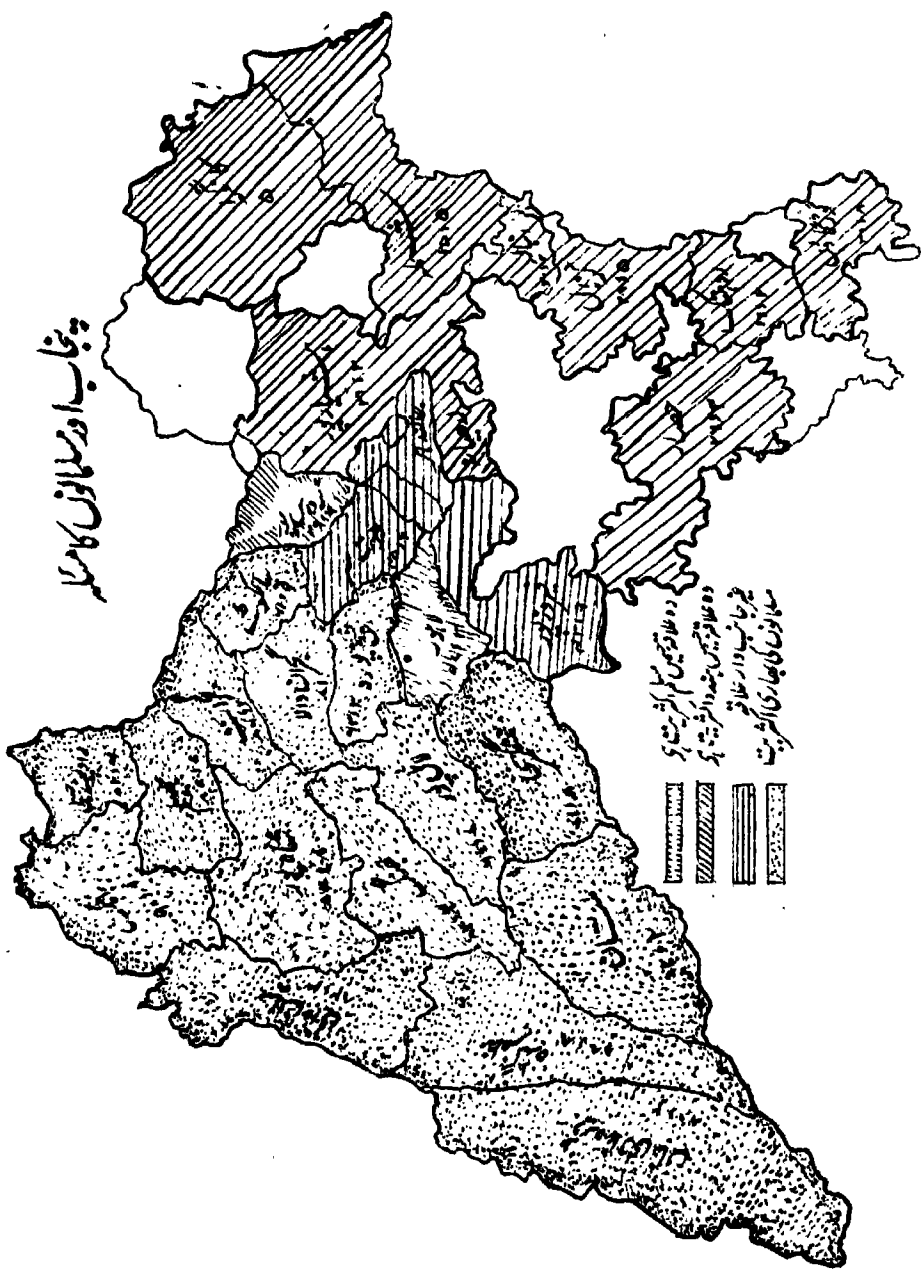
بنگال اور مسلمانوں کا مسئلہ
وہ علاقہ جس میں ہندو اکثریت ہے
وہ علاقہ جس میں مسلمان چھائے ہوئے ہیں
غیر جانب دار علاقہ

ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین

(ذیل کے مضمون میں جس کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نئے سیاسی نصب العین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک اپنے سیاسی مقصد کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔ یاران تیز گام محمل تک پہنچ گئے ہیں اور لیلائے مقصود کو حاصل کر چکے ہیں لیکن ہم صحرا کی ویرانیوں میں حیران و سرگشتہ کھڑے ہوئے راستہ کو ڈھونڈ رہے ہیں)

تحریک ترک موالات کی ناکامی اور خصوصاً نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہی مسلمانوں میں جو کچھ بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے وہ سمجھ چکے تھے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ کانگریس کی قومیت پرستی کے پیچھے کون جذبہ کار فرما ہے۔ ان میں سے بہتوں نے کانگریس سے کھلم کھلا علیحدگی اختیار کر لی اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی طرف اپنی کوشش کو پھیر دیا لیکن وقت کی فضا ناموافق تھی۔ مسلمانوں میں ابھی تک نہ تو صحیح سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اور نہ مسلمان عوام ان خطرات سے آگاہ ہوئے تھے۔ جو اس نام نہاد قومی ادارے کی پالیسی میں مضمر تھے۔ اس لئے ان رہنماؤں کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کا انتشار علیٰ حالہٖ قائم رہا اور دوسری طرف کانگریس نے حکومت کے سامنے اپنی زبردست تنظیم اور پیہم ایثار و عمل کا ایسا ناقابل انکار ثبوت پیش کیا کہ برطانوی حکومت کو سمجھ لینا پڑا کہ بغیر اس جماعت کو ساتھ لئے ہندوستان میں حکومت کی مشین کو چلانا ناممکن ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حکومت کو اپنے اختیارات کا ایک حصہ صوبہ جاتی خودمختاری کی صورت میں عوام کے نمائندوں کے حوالے کرنا پڑا۔ حالات نے رخ بدلا اور وہی سیاسی جماعت جو اس وقت تک حکومت سے برسرپیکار تھی اب اقتدار و طاقت کی مالک بن بیٹھی۔ کانگریس کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ برطانوی حکومت سے زیادہ بگاڑ نہ ہو اور اختیارات کی جو قسط مل رہی تھی اس کو لے کر مزید قوت و تصرف کے لئے راہ نکالے۔ چنانچہ انتخابات کے بعد ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں ابھی تک

مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ کانگریس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ قومی حکومت کے تحت
مسلمانوں کو اپنی حالت کے سدھارنے کا موقع ملے گا لیکن زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ کانگریس کی پالیسی اپنی اصلی
شکل و صورت میں ظاہر ہونے لگی۔ اب تو مسلمان چونکنے ہوئے اور ان کی جو توقعات کانگریسی حکومتوں سے
وابستہ تھیں ان پر پانی پھر گیا انھوں نے پہلی بار اپنے سیاسی انتشار اور جماعتی تنظیم کے فقدان کا نتیجہ دیکھ لیا۔ ان حالات
کا اثر بھلا کہاں تک نہ ہوتا۔ مسلم لیگ جو اس وقت تک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی پھر زندہ کی گئی اور بہت تھوڑے
عرصہ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت اس کے حلقۂ اثر میں آگئی۔ فی زمانہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت
ہے اور اسی کی عملی جدوجہد پر مسلمانوں کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بحیثیت مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے سامنے اس وقت کیا نصب العین
ہے اور ہمارے قومی حوصلوں کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ بظاہر لیگ کے سامنے بجز اس کے اور کوئی نصب العین
نہیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ یہاں مفاد کا لفظ
صرف مادی فوائد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے
تناسب سے ہو یا ممکن ہو تو اور زیادہ۔ اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمان کافی تعداد میں موجود ہوں۔ ان کی
زبان اور رسم الخط کانگریسی حکومتوں کے دستبرد سے محفوظ رہے۔ ان کے تمدنی مظاہر جوں کے توں برقرار رہیں
اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم ہو جائیں۔ لیکن کیا ان مقاصد کا
حصول بجائے خود مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دے گا۔ اور ان کا کھویا ہوا وقار اور ان کی گئی ہوئی عظمت
انھیں پھر دلا دے گا۔ اگر نہیں اور اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے تو کیا مسلمانوں کو بس اس سے زیادہ کچھ
مطلوب نہیں ہے کہ انھیں چند عہدے حاصل ہو جائیں اور اسمبلی میں ان کی نشستیں محفوظ ہو جائیں بے شک!
مسلمانوں کی اکثریت کا رجحان دیکھتے ہوئے تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اس سے زیادہ اور کسی چیز کے طلبگار
نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی معاشی پستی دور ہو گئی اور اقتدار و حکومت کے خزانے میں سے انھیں کچھ
حصہ مل گیا تو بس ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن درحقیقت وہ ایک سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں ان کی
نظروں کے سامنے زندگی کا وہ نظریہ ہے جس میں صرف مادی قدریں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم

کی ترقی صرف معاشی فلاح اور استحکام سے عبارت ہے۔ انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشی حیثیت سے ترقی کر جائیں۔ اقتدار و اختیارات کے خزانے میں حصہ دار ہو جائیں لیکن ان کی ہیئت قومی تبدیل ہو جائے ان کے افکار و نظریات غیر اسلامی ہو جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر وہ متحدہ ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں ان کی معاشی ترقی اور سیاسی اقتدار کیا کام آئے گا۔ ہمارے لئے تو سیاسی اقتدار اور معاشی استحکام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو یہ چیزیں صرف اس لئے درکار ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو غیر اسلامی تصورات کی آمیزش سے بچا سکیں۔ ہمارا انتہائی مقصد تو یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خالص اسلامی ماحول پیدا کر سکیں۔ دولت و ثروت کے وسائل اور اقتدار حکومت کی باگ ہمیں اس عظیم مقصد کے لئے مطلوب ہے اور اگر ہمیں یہ وسائل حاصل بھی ہو جائیں لیکن ہماری اصلی غرض و غایت پوری نہ ہو تو ہمارے لئے یہ سب کچھ محض بیکار ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کا یہ نصب العین رکھنا کہ بس ہمیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملک کے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ مل جائے یا جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں مسلمان وزارتیں قائم ہو جائیں در اصل ایک بڑی غلطی ہے جس سے کوئی بھی صحیح الخیال مسلمان متفق نہیں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہمارے مقاصد میں یہ بھی تو شامل ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط اور ہماری تمدنی آزادی برقرار رہے لیکن غرض یہ ہے کہ تمدنی آزادی کا جو تخیل ہمارے مدبرین اور سیاست دان حضرات کے نظروں کے سامنے ہے ہم کو اس سے اختلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تمدن نام ہے طرز زندگی، طریق معاشرت، زبان اور آداب و رسوم کا حالانکہ یہ سب تمدن کے مظاہر ہیں نہ کہ اس کی حقیقی روح۔ اسلامی تمدن تو در اصل ایک خاص ذہنیت اور زندگی کے ایک خاص زاویہ نگاہ کا نام ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط محفوظ رہے۔ ہمارے رسم و رواج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ ہماری مسجدیں اور خانقاہیں آراستہ و پیراستہ رہیں لیکن ان مختلف تمدنی مظاہر کے پیچھے جو روح کار فرما ہے جن نظریات و افکار نے اس مخصوص تمدن کی تشکیل کی ہے جس طریق فکر اور نظریۂ حیات پر اس تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے وہی بدل جائے۔ اس کو مٹا دیا جائے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بدلنے کے بعد ہماری تہذیب و معاشرت ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط ہر چیز خود بخود بغیر کسی خارجی کوشش کے بدل جائے گی۔ کیونکہ جب وہ ذہن باقی نہیں رہا جس نے تمدن کی اس عمارت کو بنایا تھا تو ضرور ہے کہ عمارت کا نقشہ بھی بدل جائے گا۔ پھر اس پر بھی غور کر لینا چاہیے

کہ یہ تمدنی روح، یہ نظریات و افکار، یہ طریق فکر اور مخصوص ذہنیت محسوسات میں سے نہیں ہیں جن کا بدلنا اور مٹنا بھی
ہماری آنکھیں دیکھ سکیں گی۔ یہ چیزیں تو بتدریج غیر محسوس طریقہ سے بدلتی ہیں اور جب ان میں کامل تبدیلی پیدا ہو جاتی
ہے تب جاکر کہیں ان کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک نصب العین
ہونا چاہیئے اور یہ وہ کہ ہمارا مستقل قومی وجود جن معنوی خصوصیات سے عبارت ہے وہ نہ صرف باقی رہیں بلکہ انھیں
نشوونما اور ارتقا کی راہ پر لگایا جائے۔ بالفاظ دیگر ہمارے ذہن اسلامی ذہن ہوں، ہمارے افکار و نظریات کی بنیاد مذہبی
ہو اور ہماری قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے۔

یہ تو ہمارا اصلی مقصد ہماری زندگی کی غرض و غایت اور ہماری اجتماعی کوششوں کا محور ہو لیکن اب سوال یہ ہے
کہ سیاسیات میں ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیئے اور حصول مقصد کے لئے بحیثیت ایک مستقل جماعت کے مسلمانوں کے
کیا مطالبات ہونے چاہیئں آج تک ہمارے مطالبات جیسا میں عرض کر چکا ہوں۔ اس حد سے آگے نہیں بڑھے
کہ آبادی کے تناسب سے ہماری نشستیں اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں برقرار رہیں اور ہماری زبان اور رسم الخط کا تحفظ
کیا جائے۔ لیکن جیسا ثابت کیا جا چکا ہے یہ ہماری جماعتی بقا کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اب صرف دو صورتیں
ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کامل تہذیبی خودمختاری (Cultural autonomy) حاصل ہو جائے۔
اور دوسرے یہ کہ ہم اپنا علیحدہ ملی وطن قائم کریں جہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکومت کریں۔ کلچرل آٹانومی
یا تہذیبی خودمختاری کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی اسمبلی اور صوبہ جاتی اسمبلی کے متوازی مسلمانوں کی علیحدہ اسمبلیاں ہوں۔
جنھیں ان تمام امور میں قانون سازی کے کامل اختیارات دئے جائیں جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اسی طرح
معاشرت اور معیشت کے مختلف دائروں میں جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ان کے فیصلہ کے لئے مسلمانوں کی علیحدہ
عدالتیں قائم ہوں اور ان معاملات میں جن کا تعلق ہمارے تمدن یا معاشرت سے ہے ہمیں کسی دوسری عدالت
کے سامنے جانا نہ پڑے۔ ہمارے مدارس علیحدہ ہوں اور تعلیم پر جس قدر روپیہ حکومت خرچ کرے آبادی کے
تناسب سے اس کا ایک جزو مسلمانوں کے لئے وقف ہو جس کو مسلمانوں کے نمائندے جس طرح چاہیں صرف
میں لائیں بظاہر ان دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی کلچرل آٹانومی زیادہ آسان اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن
اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں بعض ایسے نقائص ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کو دشواریاں

پیش آئیں گی بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام بھی اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گی۔

اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ تہذیبی خود مختاری یا کلچرل اٹانومی کے حق دار صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ یہ حق تو ہر قوم کا ہے کہ وہ اپنی تہذیب معاشرت اپنی زبان اور اپنی قومی ہیئت کو دوسری قوموں میں ختم ہونے سے بچائے اس لئے جب مسلمان اس کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو کیا وجہ عیسائی پارسی سکھ اور دیگر اقوام اس حق سے محروم رہیں۔ کیونکہ کلچرل اٹانومی کی اساس تو اس عقیدہ پر ہے کہ ہر قوم جو ایک مخصوص تہذیب وتمدن رکھتی ہے اس کا حق رکھتی ہے کہ اپنی بقاء وحفاظت کے لئے ضروری اختیارات حاصل کرے۔

دوسری دشواری یہ ہے کہ کلچرل اٹانومی کے حصول کے بعد مسلمانوں اور ہندوستان کی دیگر اقوام میں باہمی تعاون اور یکجہتی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھوں میں ہوگی تو ضرور ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت ایک خاص ڈھانچہ میں ڈھل جائے۔ ہم جس غرض کے لئے کلچرل اٹانومی کے طالب ہیں وہ یہی ہے کہ ہمارے افراد قوم اپنے افکار واعمال، اپنے ذہن ودماغ اور کردار وسیرت کے لحاظ سے سچے مسلمان ہو جائیں۔ ظاہر حالت میں مسلمانوں کی ذہنیت اور ہندوستان کی دوسری قوموں کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ہمارے اصول تمدن کچھ اور ہوں گے ان کے کچھ اور ہمارے تصورات وافکار اور ان کے نظریات متضاد نہ سہی مختلف تو ضرور ہوں گے۔ ہم جس راہ پر چلنا چاہیں گے ان کو اس سے گریز ہوگا حکومت وسیاست کی جو شکل ہمیں پسند ہوگی ضروری نہیں کہ انہیں بھی قبول ہو بغرضیکہ جب صورت حال یہ ہو تو ہم میں اور ان میں عملی اور فکری تصادم ناگزیر ہوگا۔ کیا ان حالات میں ہم اور وہ کامل اتفاق ویکجہتی سے حکومت کی مشینری چلا سکیں گے۔ اس کے لئے بڑے وسیع ظرف اور بڑی بے مثال رواداری کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ہماری راہ اسلام کی راہ ہوگی جو دنیا کی تمام راہوں سے جدا اور مختلف ہے۔

ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ کلچرل اٹانومی کے حصول کے بعد اپنے اندرونی معاملات کی حد تک تو ہم آزاد وخود مختار ہوں گے لیکن خارجی پالیسی کی تشکیل میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ کیا مسلمان اس کو پسند کریں گے کہ ہندوستان کی خارجی پالیسی میں ان کے رجحانات اور ان کی مرضی کو کوئی دخل نہ ہو۔ فرض کیجے کہ ہندوستان پر حصول آزادی کے بعد سامراجی ذہنیت چھا جائے اور یہ کوئی تعجب خیز چیز نہ ہوگی کیونکہ قومیت کا عروج اپنی

انتہا پر سامراج کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہندوستان جیسے ملک میں تو اس کا امکان اور زیادہ قوی ہے جہاں آبادی کی اس قدر کثرت ہے اور پیدائش دولت کے وسائل اس قدر وافر ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا مسلمان اس کو گوارا کر لیں گے کہ ان کا ملک قریب کی اسلامی سلطنتوں کے خلاف صف آرا ہو یا اسلامی سلطنتوں کے خلاف نہ سہی دنیا کے کسی اور ملک کے خلاف ظلم اور ناانصافی کی جنگ پر ہماری حکومت آمادہ ہو تو کیا مسلمان خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت کر لیں گے۔

ان تمام مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے میری حقیر رائے میں مسلم دفاق کا نظریہ بہت زیادہ آسان اور قابل قبول ہے۔ کیونکہ مسلم دفاق کے قیام سے آئے دن کے ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا ہر قوم اپنی اپنی حکومت کے تحت بالکل آزاد ہو گی مسلمانوں کا وجود ہندوستانی قومیت کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرے گا۔ پھر ہندو مسلمان اپنے اپنے تخیلات کے مطابق بغیر کسی دشواری یا تصادم کے زندگی بسر کر سکیں گے ہندوؤں کے تمام قومی حوصلے اور آرزوئیں جو اب محض مسلمانوں کی وجہ سے تشنہ ہیں اس وقت اپنی تکمیل کے لئے کوئی رکاوٹ نہ پائیں گی۔ ہندو آزاد ہوں گے کہ پراچین بھارت میں رامائن اور مہابھارت کا زمانہ پھر زندہ کر دیں اور مسلمانوں کو اختیار ہو گا کہ وہ ایک بار پھر خیر القرون کا منظر عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں اس لئے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد ہونا چاہیئے کہ ان کے تین ٹکڑے علیحدہ کر دئے جائیں۔ شمال مغرب میں پنجاب کشمیر، سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان، مشرق میں بنگال اور آسام۔ جنوب میں ریاست حیدرآباد۔ مگر یہ چیزیں حاصل ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں جان و مال کی قربانی کرنا پڑے گی اس کے لئے صبر و استقلال عزم راسخ اور بڑا ایثار درکار ہے ہمیں اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنا ہوں گی۔ افتراق و انتشار دور کرنا ہو گا اور سب سے بڑا کام یہ کرنا ہو گا کہ قریب کی اسلامی سلطنتوں کی ہمدردی حاصل کریں۔

ہندوستان کے تہذیبی منطقے
مسلم منطقہ
ہندو منطقہ
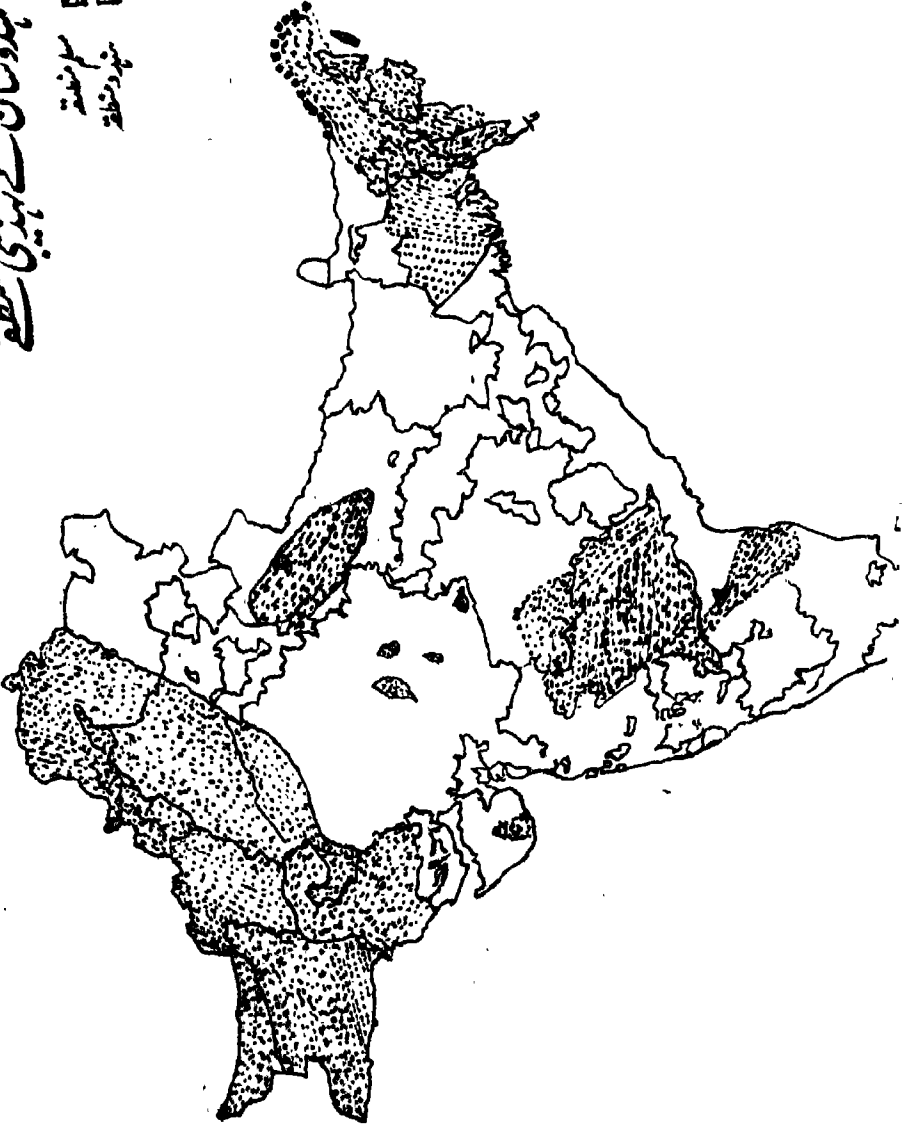
تعلیم سے کیا مراد ہے

(از جناب عبدالغفور صاحب استاد، استادوں کا مدرسہ جامعہ)

اگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو تعلیم اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں جو زندگی کا عمل ہے وہی تعلیم کا عمل ہے۔ زندگی کا ارتقاء اور تعلیمی ارتقاء دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی تعلیم شروع کر دیتا ہے وہ اپنے جسم اور اپنے گرد و پیش کی اشیاء سے قوت آزمائی شروع کرتا ہے۔ نئے نئے تجربے حاصل کرتا ہے۔ نئی نئی باتیں سیکھتا ہے، وہ بغیر کسی تعلیم کے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی چیختا ہے اور اپنے نئے ماحول کے اندر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اس کا اظہار وہ زبانِ حال سے کرتا ہے۔ جب بچہ کو بھوک لگتی ہے تو وہ اپنے جسم کو اینٹھنے لگتا ہے۔ اگر اس پر ماں کی توجہ نہیں ہوتی ہے تو پھر کروٹیں بدلتا ہے اور طرح طرح سے بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر اس سے بھی کام نہیں چلتا ہے تو پھر روتا ہے اور اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی نہ کسی کیفیت کو ماں سمجھ جاتی ہے اور بچہ کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ بچہ کی طرف سے یہ ضرورت قدرتی ہوتی ہے اس لئے اس کو پورا کرائے بغیر اس کو چین نہیں پڑتا۔ جب ایک مرتبہ وہ رونے سے اپنی بھوک کی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر جب بھی اسے بھوک لگتی ہے وہ کم و بیش اسی عمل کو دہراتا ہے۔ عدم توازن کی یہ منزل جو اس چھوٹے بچے کو پیش آئی وہ مختلف نوعیتوں کے ساتھ زندگی میں ہر آدمی کو برابر پیش آتی رہتی ہے۔ مثال کے طور کوئی آدمی جو تیرنا نہ جانتا ہو۔ یکایک دریا میں ڈال دیا جائے تو اس کی پریشانی اور بدحواسی آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ پرانے ماحول میں جس طرح اس آدمی کو ہاتھ پیر چلا کر توازن قائم رکھنے میں سہارا ملتا تھا اب نئے ماحول دریائی میں وہ پرانا توازن کام نہیں دے سکتا۔ اس نئے ماحول میں زندہ رہنے اور پنپنے کے لئے اسے ہاتھ، پیر، دھڑ، اور سر کو خاص طور سے سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اسے نئے ماحول کے ساتھ نیا تطابق حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی نئے تطابق کا نام سیکھنا یا علم حاصل کرنا ہے۔ اس کو اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نام ہے نئے ماحول اور نئے جوابی عمل میں ہم آہنگی یا تطابق کا۔ یہ عمل صرف انسانوں ہی تک محدود

نہیں معلی جانور بھی تقریباً اسی طرح سیکھتے ہیں۔ ایک کتے کو لکڑیوں کے کٹھرے میں بند کیجئے اگر اس سے پہلے کتا ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا ہے تو وہاں پر گھبرائے گا، چیخے گا، بھونکے گا، اور چاروں طرف دوڑ کر نکلنے کا راستہ ڈھونڈے گا چنانچہ خاصی کشمکش کے بعد وہ باہر آنے کا راستہ تلاش کرے گا اور باہر نکل جائیگا۔ اس نئی تکلیف دہ صورت سے بچنے کے لئے کتے نے جو نیا طریقہ سوچا ہم اسے کتے کا سیکھنا کہیں گے کیونکہ اب اگر دوبارہ اسی کتے کو کسی لکڑی کے کٹھرے میں بند کردیا جائے تو اسے اس میں سے نکلنے میں آسانی ہوگی اور وہ آسانی کے ساتھ گذشتہ تجربے کو دہرائے گا۔ دراصل یہ نیا تجربہ کتے کا سیکھنا ہے۔ جہاں تک سیکھنے کے عمل کا تعلق ہے انسان اور جانوروں پر اس کا اثر یکساں پڑتا ہے۔ مگر مدارج کے اعتبار سے دونوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے۔ نسل انسان میں اس اعتبار سے جس قدر ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی جانوروں میں نہیں ہوتا۔ ذہنی وسعتیں تو درکنار، اگر جانور اور انسان کی اعصابی ساخت کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور بعض چند گھنٹوں میں اپنی خوراک تک خود تلاش کر لیتے ہیں جیسے مرغی کا بچہ انڈے کے خول سے نکلتے ہی ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے۔ اور دانہ دنکا چگنے لگتا ہے ؎

"مرغک از بیضہ بروں آید و روزی طلبد　　　آدمی زادہ ندارد خبر از عقل و ہوش"

مگر انسان کا بچہ مرغی کے بچے سے اپنی نشوونما کے ارتقائی منازل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کی ارتقار کے منازل بہت تھوڑے ہیں۔ اس لئے ان کی نئی پود کو ان کے پورا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اس میں اس زندگی سے تطابق کی صلاحیت بہت کچھ پیدائش کے وقت ہوتی ہے جیسے مرغی کے بچے کی حالت میں ہم نے دیکھا۔ اس قسم کے جانوروں میں ارتقائی منازل کے بڑھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی پیدائشی صلاحیتیں محدود مگر پختہ حالت میں ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے انسان کے بچے کی صلاحیتیں ناپختہ ہوتی ہیں۔ اس لئے بعض لوگ اس غلط نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان کا بچہ تو چکنی مٹی کے مانند ہوتا ہے۔ ایک شخص اسے جس طرح چاہے موڑ سکتا ہے اور یہ لوگ اس غلط استنباط کے ماتحت بچے کے نشوونما کے قوانین پر غور نہیں کرتے اور بچوں کے رجحانات اور میلانات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس

لیے علم کو ایک طرفہ معاملہ سمجھ کر بچے پر نسل انسانی کے گذشتہ تجربات کا بوجھ برابر لادتے جاتے ہیں۔ علم کو آسان کرنے کے لئے وہ بچوں کے سامنے اس کے مختلف حصوں کو منطقی ترتیب کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو بیشتر صورتوں میں بچوں کے لئے صرف بامعنی علامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بچہ نشو ونما کی جس منزل میں ہوتا ہے اس میں وہ مجرد علامات کے مخفی معنوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اس عمر میں اس طرح چیزوں کو الگ الگ مضامین یا معلومات کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا معلم یا مربی اس چکنی مٹی کے مفروضہ کی بنا پر بچے کی نامی شخصیت سے چشم پوشی کرتا ہے اور سماج کی طرف سے ٹھپہ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح بھی ممکن ہو سماجی نقطہ نظر کو جلد سے جلد بچہ پر تھوپ دیا جائے۔ جب سے مدرسہ اور سماج میں رشتہ ٹوٹ گیا ہے اس وقت سے تو تعلیم اور بھی رسمی ہوگئی۔ اب تو صرف مضامین کو مضامین کی اور کتاب کو کتاب کی حیثیت سے پڑھا دینے کا رواج ہو چلا ہے۔ یہ چیز اگر بڑی عمر کے بچوں کی تعلیم تک مخصوص ہوتی جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ معلومات کو مجرد طور پر سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں) یا مضامین کو الگ الگ پڑھ کر بھی ان کو سمجھنے کی اور زندگی میں برتنے کی صلاحیت رکھ سکتے ہیں تو بھی جواز کی ایک صورت ہوتی۔ مگر یہاں تو بچے اور بڑے میں کوئی امتیاز ہی مدنظر نہیں رکھا جاتا۔

البتہ ماہرین تعلیم اس لوچ کی اہمیت کو دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس کو ارتقائی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسان کا مطالعہ نامی حیثیت سے کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ انسان کا بچہ شروع میں عاجز و ناتواں اور اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی دیکھ بھال اور پرورش کا محتاج ہوتا ہے تاہم اس میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت دوسرے جانوروں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی وہ ابتدائی عمر میں اگرچہ بالفعل عاجز و ناتواں ہوتا ہے مگر بالقوی وہ اپنے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کے بہت امکانات رکھتا ہے۔ انسان کی ابتدائی عمر کی یہ بے بسی اور خامی اس کو بڑھنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ انسان اپنے جسمانی مشاغل میں اپنے اعصاب اور رگ پٹھوں کے ذریعہ بوجھ اٹھانے والے قلی سے لے کر ایک باکمال مصور تک کا کام کر سکتا ہے۔ اعصاب اور رگ پٹھوں کا یہ لوچ انسان کو مختلف قسم کے کام کرنے کے امکانات پر قدرت بخشتا ہے۔ بظاہر یہ خامی اس لوچ اور وسعت پذیری کے ساتھ انسان

کے لئے قدرت کی طرف سے ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔ یہی حالت ذہن کے امکانی وسعتوں اور نشو و نما کی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان عمر کے تھوڑے سے عرصے میں ایک طرف نسل انسانی کے گذشتہ تجربات کا سرمایہ حاصل کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور دوسری طرف اس تمدنی ورثہ کی بنیاد پر ذاتی تجربے سے دوسرا رد و بدل رکھنے کا حوصلہ کرتا ہے۔ اگر انسان پیدائش سے چند پختہ عادتیں اور مہارتیں لے کر آتا تو اس میں اتنی وسعت پذیری نہ ہوتی اور انسانی تمدن اس قدر مالا مال نہ ہوتا۔

انسان کے بچے کی نامی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ اور یہ کام صحیح طور پر اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم ان عوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کی تعلیم اور تربیت میں کار فرما ہوتے ہیں یعنی یہ کہ بچہ کس طرح سیکھتا ہے۔ گذشتہ سطر میں مختلف مثالوں کے ذریعہ اس بات کو واضح کر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان نئی ضرورتوں سے کس طرح تطابق پیدا کرنا سیکھتا ہے۔ تطابق یا سیکھنے کا مسئلہ ایک ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ یہ کئی حیثیتوں سے حل کا محتاج ہے۔ اگر انسان کی تمدنی تاریخ پر غور کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ انسان نے اپنی بقا کے لئے کس طرح اپنے ماحول کے خلاف جد و جہد اور دنیا کو بالآخر اپنے لئے پر امن بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تسخیر فطرت کر کے دنیا کو وحشت اور تاریکی کی گھٹا سے نکالا ہے۔ اقبال اس حقیقت کو محاورہ مابین خدا و انسان کے عنوان سے یوں بیان کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تبدیلی اور ترقی کی اس صورت کو انسان کی نامی فطرت اور زمانہ کی نیرنگیوں نے ممکن کر دیا ہے ایک طرف نسل انسانی میں خود بدلنے کی صلاحیت ہے یعنی عمر کی مختلف منزلوں میں وہ مختلف ضرورتیں رکھتا ہے اور ہر ضرورت کے لئے اسے نیا تطابق یا توازن ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور پھر دنیا ایک حالت پر نہیں رہتی۔ وہ انسان کے سامنے نئے نئے مسائل نئی نئی مشکلات اور نئی نئی ضرورتیں پیش کرتی رہتی ہے انسان کو اپنی زندگی

برقرار رکھنے اور اچھے طریقہ پر رہنے کے لئے تطابق کرنا پڑتا ہے چنانچہ نئی دشواریوں میں ان کے حل کے طریقے نکالنا انسان کی شخصی اور جماعتی تعلیم، تمدن اور ترقی کی بنیاد ہے۔ جس فرد یا قوم نے زندگی سے تطابق کرنا نہیں سیکھا وہ زندگی سے محروم رہی۔ یہاں تطابق کا صرف سلبی پہلو مراد نہیں ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" بلکہ یہ بھی ہے کہ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" یعنی زمانے اور فطرت کے قوانین کا لحاظ رکھتے ہوئے انسان اپنی بقا کے لئے اس میں اپنی طرف سے اپنی ضروریات کے مطابق برابر تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف کی تکمیل یافتہ صورت کو ہم انسان کا "علم" یا "تمدن" کہتے ہیں۔

اب ہم تطابق یا سیکھنے کے عمل کو نفسیاتی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی یہ کہ ہم کسی چیز کو سیکھتے کیسے ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ یہ کیسے سیکھتا ہے کہ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں۔ اس طرح سیکھنے میں ہوتا یہ ہے کہ بچہ کئی موقعوں پر یہ دیکھتا ہے کہ جہاں پر ایک ہاتھ کی انگلیوں کے گننے کا ذکر آتا ہے وہاں پر ۵ کا عدد لازمی طور پر آتا ہے۔ وہ خود بھی ایک، دو کرکے گنتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بچہ شروع میں ۵ کے ہندسے اور ۵ کے عدد کے تصور میں صحیح ربط نہ سمجھ سکے۔ ۵ کے لفظ کا اطلاق ۳ چیزوں پر کرے یا ۴ کے ہندسے کا اطلاق ۵ کے عدد پر کرے مگر جیسے جیسے وہ مختلف مواقع پر ۵ کے لفظ کو ۵ اشیاء کے سلسلے میں دیکھے گا۔ ویسے ویسے ۵ کے لفظ اور ۵ اشیاء کا ربط اس کے ذہن میں واضح ہوتا جائیگا۔ اور جب بھی پانچ انگلیاں بچے کے سامنے گننے کے لئے پیش کردی جائیں گی۔ وہ فوراً اس کا جواب ۵ دے گا۔ اور ربط یا تعلق کا نام سیکھنا ہے یہ ربط صرف حافظہ کے ذریعہ قائم نہیں رہتا بلکہ جسمانی ربط و تنظیم کی بھی اس طرح کی صورتیں انسان کی عملی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کو تیرنا سیکھنا ہے وہ دریا میں کود جاتا ہے لیکن وہ پانی میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ جتنا جتنا وہ اوپر ابھرنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اتنا تہ کی طرف بیٹھتا جاتا ہے۔ اب ایک آدمی اسے تھوڑا سا سہارا دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ پانی میں توازن قائم رکھنے کے لئے آدمی کو ہاتھ پیر خاص تربیت سے ہلانے اور دھڑ کو خاص طور پر رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ آدمی آہستہ آہستہ اپنے اس دوست کی نصیحتوں پر عمل کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے تجربے سے اسے اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے اس طرح کئی دن تک برابر وہ مشق کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک

کہ بالآخر وہ توازن حاصل کرتا ہے۔ اور بے تکلف تیرنے لگ جاتا ہے یعنی اس طرح تیرنے میں جسم کے مختلف حصوں کا تعامل سیکھتا ہے۔ اب جب وہ دریا میں کودتا ہے بغیر کسی سابقہ یا ابتدائی تجربے یا اناڑی پنے کے بے تکلف اپنے جسم کو سنبھالتا ہے۔ اب یہ اس کا علم یا سیکھنا ہوگیا۔ کیونکہ وہ اس کی جسمانی مہارتوں کا ایک لازمی حصہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ہمارا علم یا سیکھنا "مہارت" ہے جسے ہم بغیر کسی تکلف کے مناسب موقع پر برت سکیں۔ بائیسکل چلانا سیکھنے کی صورت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اناڑی جس وقت بائیسکل چلاتا ہے۔ وہ چلاتے وقت بہت گھبرایا ہوا ہوتا ہے وہ ایک وقت میں کئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ سڑک پر چلنا ہے۔ سڑک پر جتنے موقعوں پر خطرے ہوتے ہیں ان سب کے متعلق سوچتا ہے۔ خود پیڈل چلانا اور ہینڈل کو تھامے رکھنا ان تمام چیزوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ مشق کرتا ہے اس کا کام آسان ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب پیڈل چلانے اور ہینڈل تھامنے کے خیال سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ بائیسکل پر سنبھل کر بیٹھنا سیکھتا ہے۔ اب وہ صرف راستے پر چلنے والوں کا خیال رکھتا ہے اور تھوڑی سی توجہ سے وہ نہایت صفائی اور آسانی سے سائیکل چلانے لگتا ہے۔ بغرض ہم جس قدر کسی عمل کو کرتے ہیں اسی قدر وہ عمل ہمارے لئے آسان اور بے ارادہ ہوجاتا ہے۔ حافظہ کے تعلق سے ہم اس عمل کو اور بھی صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم بچپن سے زبان اس طرح سیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے جب کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو اس کا کوئی نام ہوتا ہے یا جو عمل ہوتا ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا ہے۔ اس طرح کسی شے یا عمل اور اس کے ساتھ کسی نام یا آواز کو متعلق سمجھنے سے ہم زبان سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہم ایک چھوٹا پرندہ دیکھتے ہیں۔ لوگ اس کو چڑیا کہتے ہیں۔ کئی موقعوں پر ہمارے ذہن میں لفظ چڑیا اور چڑیا (پرندہ) کا ربط قائم ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی ہم چڑیا کو دیکھیں گے تو خود بخود چڑیا کا لفظ ہمارے ذہن میں دوڑ جائے گا۔ اگر ہم اسے ذہن سے نکالنے کی بھی کوشش کریں تب بھی ہم اس کو نہیں بھول سکیں گے۔ اس صورت میں چڑیا کی صورت ایک موقع ہے اور اس کے نام کا تصور جوابی عمل ہے۔ اس موقع اور جوابی عمل کا نام سیکھنا ہے۔ اس کو زیادہ واضح کرنے کے لئے گونگے اور بہروں کی مثال کو لیجئے۔ بالکل بہرہ آدمی کیوں گونگا ہوتا ہے؟ اس کو ہم موقع یا تحریک اور جوابی عمل سے اس طرح واضح کرسکتے ہیں کہ اگر بہرے آدمی کی زبان میں

کوئی خاص جسمانی نقص نہ ہو تو وہ بیشتر اس لئے گونگا ہوتا ہے کہ وہ کسی شئے اور مقررہ صورت کا تعلق نہیں سمجھتا
ہے کیونکہ وہ شئے کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنے طور پر وہ دوسری چیزوں سے ممیز کرتا ہے۔ مثلاً وہ چڑیا اور طوطے
میں تمیز کر سکتا ہے مگر وہ چڑیا کے لئے چڑیا کا لفظ اور طوطے کے لئے طوطہ کا لفظ نہیں بول سکتا۔ اس لئے کہ
وہ ان پرندوں کے سلسلے میں ناموں کے سننے پر قدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس اصول کی بنا پر بہرے گونگے
بچوں کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں۔ ان میں وہ پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ وہ جس آلے سے اشیاء اور تحریری
صورتوں میں تعلق سیکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر پڑھنا سیکھتے ہیں تو ان کا تعلق کرتے یا (سیکھنے) کا آلہ مختلف ہوتا ہے
یعنی بجائے وہ کان سے سننے کے آنکھوں سے استاد کے ہونٹوں کی حرکات کو دیکھتا ہے۔ اور ان حرکات
کے موافق تختۂ سیاہ پر الفاظ کو پہچاننے اور بولنے لگتا ہے۔

انسان اس طرح تحریک (موقع یا ضرورت) اور جوابی عمل سے جو کچھ ربط قائم کرتا ہے یا سیکھتا ہے۔
یہ ربط کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر سیکھنے کے یہ جوڑ الگ الگ مفرد اینٹوں کی حیثیت رکھتے تو ان
سے انسان کا علمی قصر ہرگز تعمیر نہ ہو سکتا۔ جس طرح ہم سماج کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک نسل دنیا میں
تصرف و تجربہ کر کے فنا ہو جاتی ہے تو دوسری نسل جو اس کی جگہ لیتی ہے وہ کم و بیش گذشتہ نسل کے تجربات کو بنیاد
بنا کر ان میں نئے نئے تصرفات کرتی ہے۔ اور اس طرح نئے نئے حقایق کا کھوج لگاتی ہے۔ وہ پھر اپنی جگہ
پر نئی نسل کے ان تازہ حقایق کو پرانے نسلی تجربے کے ساتھ پیش کرتی ہے اور نئی نسل ان کو سیکھ کر اپنے طور پر
اپنے دور میں اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور نسلوں کا یہ تجربی تسلسل تمدن کو مالامال کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان
اپنی انفرادی حیثیت سے بھی چھوٹے پیمانے پر یہی عمل کرتا ہے۔ وہ رات دن جو کچھ سیکھتا جاتا ہے وہ اس کا
جزو علم ہو جاتا ہے انسان کے علاوہ دوسرے جانور بھی چھوٹے پیمانے پر اسی طرح سیکھتے ہیں۔ مگر ان کے
عقلی و ذہنی قوا اس قدر تربیت یافتہ نہیں ہوتے کہ کسی چیز کو زیادہ دیر تک یاد رکھ سکیں۔ اور اگر یاد رکھنے
کے سلسلے میں بعض جانور مثلاً کتا کوئی غیر معمولی صلاحیت بھی دکھائے تب بھی وہ عقلی طور پر کسی تجربے سے
اس طرح پر نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ آئندہ کے لئے کسی نئے تجربے میں ان سے مدد
لے سکے۔ اس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدے سے جانتے ہیں۔

سیکھنا اور عادات :۔ آدمی کی زندگی اپنے انتخابی اعمال کی وجہ سے منظم اور مربوط ہوتی ہے جب وہ کسی نئے موقع سے تطابق حاصل کرتا ہے یا اس کے لیے جوابی عمل ڈھونڈھنے سے مجبور ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لئے کئی طرح کے جوابی عمل اختیار کرتا ہے۔ جیسے ہم نے تیرنے والے کی مثال میں دیکھا۔ اور جب آزمانے کے بعد ان میں سے چند جوابی اعمال تطابق میں مدد دیتے ہیں تو ان کو دوسرے جوابی اعمال پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دوسرے جوابی اعمال کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح وہ نئے مواقع سے ترجیحی اعمال کے ذریعہ نیا تطابق حاصل کرتا ہے اور جب تطابق میں مزید سعی اور کوشش کو دخل نہیں ہوتا تو پھر ہم اس کو عادت کہتے ہیں۔ اور اس عادت کے ذریعہ ایک طرف تو ہم گذشتہ تجربات کو محفوظ رکھتے ہیں اور دوسری طرف نئے تجربے کے لئے اس کو بطور اساس کے استعمال کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہم بیڈمنٹن اور ٹینس کی مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیڈمنٹن کا ایک کھلاڑی بلّہ لے کر میدان میں جاتا ہے۔ اسے سابقہ واقفیت صرف اس قدر ہے کہ ہاتھ کو اوسط درجے کے لوگوں کی طرح جو بیڈمنٹن نہ جانتے ہوں ہلا سکتا ہے۔ کلائی کو بھی آسانی کے ساتھ گھما سکتا ہے۔ اب وہ بیڈمنٹن سیکھتے وقت ہاتھ کے اس لوچ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلّہ پکڑتا ہے اور مخالف طرف سے چڑیا کے آنے کا انتظار کرتا ہے جب چڑیا آتی ہے تو اسے زمین پر گرنے سے پہلے بلّہ سے مار کر واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ چڑیا جال میں پھنس جاتی ہے اور کبھی میدان کے باہر گر جاتی ہے۔ مگر جب اپنے رگ و پٹھوں پر قدرت حاصل کر کے کھلاڑی کو خاص طریقہ پر بلّہ چلانے کی مشق ہو جاتی ہے تو پھر وہ مہارت حاصل کرتا ہے اور بغیر کسی خاص تکلف اہتمام کے حسب منشا چڑیا کو مخالف طرف بھیجنے پر قدرت پا جاتا ہے۔ نو آموزی کی حالت میں اب تک جو کام بہت اہتمام و احتیاط سے کرتا تھا اب ذرا سی توجہ سے اس کام کو عادتاً کرنے لگتا ہے۔ اب یہی کھلاڑی کرکٹ شروع کرتا ہے بہت سی ابتدائی منزلیں جو ایک کرکٹ کے کھلاڑی کو طے کرنی پڑتی ہیں سر کو نہیں کرنا پڑتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیڈمنٹن کے بہت سی آموختہ حرکات یا جسمانی لوچ کو اس نئے کھیل میں استعمال کر سکتا ہے۔ اور اسے ایک اناڑی کھیلنے والے کے مقابلے میں جس نے پہلے کرکٹ

کے قسم کا کوئی کھیل نہ کھیلا ہو کرکٹ سیکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی یہی حال تمام پیشوں اور مہارتوں کا بھی ہے ہر ایک آدمی کی شخصیت سیکھنے اور تجربے کے بعد بدل جاتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور طرز عمل بھی بدل جاتا ہے ہر ایک تجربے کے بعد وہ دوسرے تجربے کو جو پرانے تجربے پر منحصر ہوتا ہے نئی روشنی میں لیتا ہے۔ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اور اسی کی بنا پر اس میں بدلنے اور تطابق کی بہت سی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔

صرف ان معنوں میں جو موقع اور جوابی عمل کے رشتوں کی صورت پذیری انسانی علم کی تشکیل کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ صرف وقتی ضرورتوں کو پورا کرنے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جس طرح انسان کی زندگی نمو پذیر ہوتی ہے اسی طرح اس کی شخصیت اور اس کا علم بھی نمو پذیر ہوتا ہے۔ بلکہ جیسے جیسے اس کے تجربے بڑھتے جاتے ہیں ویسے ہی ویسے نئے نئے تجربے کرنے کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اور جذبات کی بلندی، احساسات کی لطافت اور نظر کی وسعت میں بھی برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں نئے نئے تصرفات کرتا ہے نئی نئی ہم آہنگیاں پیدا کرتا ہے۔ نئے نئے قدر ڈھونڈھتا ہے۔ وہ آج ترقی کی جس بلندی سے چیزوں کو دیکھتا ہے کل اس سے زیادہ بلندی پر پہنچ کر اس کا نقطۂ نظر مختلف ہو جاتا ہے۔ اپنے کام کی اور دنیا کے کام کی حیثیت اس کی نظروں میں مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا معیار بدل جاتا ہے اور اس بدلے ہوئے معیار کے مطابق وہ اپنے کام میں نیا تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف سے وہ نیا اثر قبول کرتا ہے اور اس نئے اثر کے ماتحت وہ کوئی نیا کام یا تصرف کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سماجی اور طبعی ماحول میں اصلاح اور تصرف کر کے اس کے ذریعہ اپنے ذات کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ اس مسلسل تعمیر کا نام تعلیم ہے۔ غرض سیکھنے سے مراد چند مہارتیں یا تطابق کی چند مخصوص شکلیں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا اثر سیکھنے والے کی ساری شخصیت پر ہوتا ہے۔ وہ خاص قسم کی عادتیں یا مہارتیں تو ضرور حاصل کرتا ہے مگر وہ عادتوں یا مہارتوں کا غلام نہیں بنتا بلکہ اگر اس کے سیکھنے میں ربط ہے اور اس کی شخصیت میں ہم آہنگ نمو پذیری پائی جاتی ہے تو وہ اپنی مہارتوں کو اپنے مطمح نظر/نصب العین تک پہنچنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور

جب وہ نصب العین کی کسی ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو تو دوسری منزل اس کے سامنے اور صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور اس کی دلکشی قریب پہنچنے پر مزید دعوتِ عمل دیتی ہے۔ اسی طرح وہ برابر آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنی کوشش ناتمام سے اپنی ذات کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اقبال نے حقیقت اس طرح بیان کی ہے :۔

۵ چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے ‏ آں زماں دلے من پے خوب تر نگارے

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے ‏ سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

تعلیم یا سیکھنے کے لازمی عناصر کیا ہیں؟ تعلیم کے مفروضہ مفہوم کے ماتحت ہم تعلیمی عناصر کو ایک عام خاکہ میں محدود کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں تعلیمی عمل سمجھنے میں آسانی ہو تعلیم میں گذشتہ مفہوم کے ماتحت ہم تین عناصر کو لے سکتے ہیں۔ (۱) قدرتی ماحول (۲) معاشرتی ماحول اور (۳) انسان کی ذات۔ ان تینوں عناصر کے باہمی اثرات کی وجہ سے علم کی تشکیل ہوتی ہے۔ قدرتی ماحول سے مراد وہ تمام کائنات ہے جس میں انسان تصرف کر کے اپنی ضروریات اور ارادوں کو پورا کرتا ہے۔ اور جس کی مدد سے وہ اپنی تمام تمدنی تعمیر کو ترقی دیتا ہے۔ معاشرتی ماحول سے مراد وہ طبقہ ہے جن کے اثر سے وہ زندگی کی قدروں کو طے کرتا ہے اس میں صرف موجودہ نسل شامل نہیں ہے بلکہ وہ گذرے ہوئے لوگ بھی داخل ہیں جن کے اثر سے کسی کام کے یا چیز کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کرتا ہے اور تیسرے انسان کی ذات خود انسان کی ذات کو ہم یہاں ان صلاحیتوں کی بنا پر دیکھتے ہیں جس میں سیکھنے یا بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تطابق حاصل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اور جو ایک ترقی پذیر نمو کا مالک ہے۔ لیکن چونکہ ہماری زندگی اس قدر پیچ دار ہو گئی ہے کہ بچے کے لئے قریب قریب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ وہ ۲۰، ۲۲ سال کے عرصے میں تمدن کی موجودہ سطح پر پہنچ جائے۔ اس لئے جماعت کی طرف سے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مخصوص اہتمام کو جس کے ذریعہ متمدن زندگی سے تطابق کو آسان کرنے میں مدد ملتی ہے "مدرسہ" کا نام دیا گیا ہے اور جس کے ذریعہ یہ اہتمام کیا جاتا ہے وہ بھی مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اور وہ "استاد" کہلاتا ہے تطابق حاصل کرنے کے لئے انسانی تجربات کو مختلف منزلوں میں حسب ضرورت محدود کیا گیا ہے

اس مجموعہ کا نام "نصاب" رکھا گیا ہے۔ اگر ہم ان کو اپنے مفروضہ عناصر کی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ہم ان کو یوں سمجھ سکتے ہیں :-

(۱) طالب علم مختلف اگرخام صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے نمو پذیر شخصیت رکھتا ہے۔

(۲) استاد معاشرتی ماحول کا ایک فرد ہے جو بچہ کو اس کی نشو و نما کے قوانین کی روشنی میں اس کی مخصوص ضروریات کے مطابق اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دیتا ہے۔

(۳) مدرسہ ایک مثالی دنیا ہے جس میں بچہ اپنے بننے والے نئے معاشرے کے ساتھ رہتا ہے۔ اور استاد کی مدد سے نسلی تجربات سے روشناس ہوتا ہے۔ اگر استاد معاشرے کی طرف سے صحیح رہنمائی نہیں کرتا تو تعلیم ناقص اور اگر مدرسہ مثالی اور تجربی دنیا نہیں ہے تو بچے کو اچھا شہری نہیں بنا سکتا۔ اس لئے تعلیم ناقص اس اعتبار سے تعلیم نام ہے اس عمل کا جس میں سیکھنے والا اپنے ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لئے اپنی محدود صلاحیت کو کام میں لاتا ہے اور استاد یا مربی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تدریجی طور پر اس کے تجربات و مشاغل پر نسلی تجربات و مشاغل کو اس طرح تعمیر کرے کہ جس کے ذریعے بچہ کی انفرادی اور شخصی زندگی کی تعمیر ہو اور وہ بڑا ہو کر قومی قصر کا ایک مضبوط ستون بنے۔

ہندوستان کی بنیادی صنعتوں کا مسئلہ

(از ڈاکٹر دی۔ایس۔ڈوبے۔ایم۔ایس سی۔پی۔ایچ ڈی بنارس ہندو یونیورسٹی)

بنیادی یا کلیدی صنعتوں کی اصطلاح ایسی صنعتوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو قوم کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔اور جن کی پیداواریں اکثر دوسری صنعتوں میں استعمال کی جاتی ہیں ہندوستان میں کلیدی صنعتوں کے شروع کرنے کے سلسلے میں تین باتیں ہیں جن کے بارے میں غور کرنا ضروری ہے :۔

(۱) ایسی صنعتیں جو ملکی تحفظ کے لئے لازمی ہیں

(۲) ویسی صنعتیں جن کی پیداوار کی ضرورت اکثر صنعتوں کے لئے رہتی ہے۔

(۳) ایسی صنعتیں جن کی وجہ سے ملکی پیدائش دولت کے کام کو بہت ترقی ہو جائے گی۔

دوسرے ملکوں میں مندرجہ ذیل کو کلیدی صنعتوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

(۱) دھاتوں سے متعلق صنعتیں :۔ پختہ لوہا اور فولاد اور ان کے میل والی پیداواریں امن اور جنگ کے زمانے میں تقریباً ہر صنعت کی ترقی کے لئے لوہا ناگزیر ہے۔دوسری اور تمام دھاتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۲) بجلی کی وزنی مشینیں :۔ بجلی کی اس ترقی کے زمانے میں بجلی کی طاقت کو پیدا کرنے والے کارخانوں کی ضرورت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کا شمار بھی کلیدی صنعت میں کیا جانے لگا ہے۔

(۳) قوت محرکہ کے پیدا کرنے کے لئے وزنی مشینیں :۔ اس میں انجن، موٹر، ہوائی جہاز، دخانی جہاز، زراعتی مشینیں اور قوت محرکہ کے پیدا کرنے والی دوسری مشینیں۔اس صنعت کی کئی نہایت وسیع شاخیں ہیں۔

(۴) وزنی کیمیاوی صنعتیں :۔ اس صنعت کی اہم شاخیں تیزاب اور القلی، رنگ اور کیمیاوی کھادیں ہیں۔دنیا کے دوسرے زراعتی ملکوں میں ان کھادوں کی تیاری کو بہت زبردست اہمیت حاصل ہے۔

دوسری صنعتیں جن کی وجہ سے قومی پیدائش دولت کا کام بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے اور جن کی

پیداوار یں قوم کی ترقی کے لئے لازمی ہیں وہ شکر، ربر، کیمیادی کھاد وغیرہ ہیں (کیمیادی کھاد کی صنعت کا شمار ذرعی کیمیادی صنعتوں میں بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اہمیت ہندوستان کے لئے بہت زیادہ ہے اس لئے اس کو ایک جداگانہ عنوان کے ماتحت درج کرنا بھی ضروری ہے)

ان صنعتوں کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ کئی کروڑ کے لگ بھگ ہوتا ہے اور ان کی پیداوار یں تمام ہندوستان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ لیکن چونکہ صنعت کا محکمہ صوبائی اختیار میں ہے اس لئے اگر انھیں تمام ہندوستان کے مفاد کو سامنے رکھ کر قائم کیا جائے گا تو سب صوبوں میں خوب تعاون عمل پیدا ہو سکے گا۔ ان صنعتوں کے شروع کرنے کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ بغیر مناسب تعاون عمل کے ان کا قائم ہونا بہت مشکل ہوگا یہ معلوم کرکے خوشی ہوتی ہے کہ کانگریس کے ارباب حل وعقد نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور صنعتی وزیروں کی ایک کانفرنس ان مسائل کو سوچنے کے لئے عنقریب ہونے والی ہے امید ہے کہ اس کانفرنس سے عملی فائدہ کی کوئی صورت نکل سکے گی۔ اس کانفرنس کے غور کے لایق جو سوالات ہو سکتے ہیں ان میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کے لئے کلیدی صنعتیں کیا ہیں؟ ملک کے لئے ان کی اہمیت کا سوال۔ ان کے شروع کرنے لئے موزوں ترین جگہ اور ان کی مختلف صوبوں میں تقسیم۔

۲۔ ان بڑی صنعتوں کو جاری کرنے کے لئے جن ابتدائی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے ان کا مسئلہ اور ان ابتدائی تحقیقاتوں کی مالی امداد کا مسئلہ اور تمام دوسری ابتدائی تفصیلات۔

۳۔ ان صنعتوں کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کا سوال اور ان پر ریاست یا نجی ایجنسیوں یا دونوں کی نگرانی کا سوال

۴۔ ان صنعتوں میں اندرونی اور بیرونی مقابلہ کا سوال اور اس کو روکنے کے ذرائع اور طریقے مثلاً محاصل درآمد کی ایک مشترکہ تامینی پالیسی اور دوسری مناسب داخلی نگرانیاں

۵۔ موجودہ بڑی صنعتوں کے تعاون عمل کا سوال اور ان کو امداد دینے کے ذرائع اور طریقے

اگر ان مسائل کا تصفیہ وزرا کی کانفرنس میں ہو جائیگا تو ہمیں امید ہے کہ ہم ایک محکم بنیاد پر اپنا کام شروع

کر سکیں گے۔

مندرجہ بالا مسائل میں جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے یہ مناسب ہوگا کہ کانفرنس فنی ماہروں معاشیات کے ماہروں اور سیاسی ماہروں کی ایک کمیٹی کا تقرر کر دے اور یہ لوگ ان صنعتوں کے سلسلے میں کچا مال اور دوسری فنی تفصیلات کے نقطہ نگاہ سے اس مسئلہ کو سوچ لیں اور ان صنعتوں کے معاشی پہلوؤں کا خاکہ تیار کر لیں اور قومی تحفظ کی روشنی میں اس پالیسی کو جسے اختیار کرنا ہوگا طے کر لیں۔

نہایت اہم صنعتیں جنھیں اس وقت اختیار کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ بجلی کی وزنی مشینوں کی تیاری

۲۔ قوت محرکہ کی وزنی مشینوں کی تیاری مثلاً بھاپ اور تیل کے انجن۔ قوت محرکہ کو پیدا کرنے والی مشینیں اور ان کے متعلقات، قوت محرکہ کے پیدا کرنے کے دوسرے ذرائع، زراعتی مشینیں اور ہندوستان میں جو صنعتیں اچھی طرح قائم ہیں مثلاً شکر، پارچہ بافی وغیرہ کی صنعتیں ان کے لئے مشینیں۔

۳۔ وزنی کیمیاوی صنعت۔ اس میں مندرجہ ذیل خاص عنوانات شامل ہیں :۔

(الف) ہندوستانی کچے مال سے تیزاب اور القلی بنانا۔

(ب) کول تار کے رنگوں کا بنانا

(ج) فاسفیٹ اور پوٹاس کے کھادوں کا بنانا۔

ہوا سے نائٹروجن کے مرکبات حاصل کرنے کی صنعت میں ایسے کھادوں کا تیار کرنا جس میں نائٹروجن موجود ہو اس کو زراعت کی ترقی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے ایک جداگانہ صنعت ہونا چاہئے۔ دھاتوں کی صنعتوں میں لوہے اور فولاد کے علاوہ الیومنیم کی تیاری کو آئندہ بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ ان کے علاوہ الکوہل، ربر اور ہتیاروں اور گولی بارود وغیرہ کی تیاری کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے۔

ان میں سے بعض صنعتوں کے بارے میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بتلایا جا سکتا ہے کہ ان کا محل وقوع کہاں ہونا چاہیئے لیکن دوسری صنعتوں کے بارے میں محل وقوع کا فیصلہ کرنے کے لئے بہت کافی مواد کو اکٹھا کرنا پڑے گا۔ کیمیاوی کھادوں کی صنعت اس قدر زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اسے تو جہاں جہاں

سہولتیں موجود ہوں سب صوبوں میں شروع کردینا چاہیئے۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ جب ایک دفعہ ان صنعتوں کے بارے میں فیصلہ ہوجائے اور انھیں ماہروں کی ایک کمیٹی ابتدائی تحقیقات کے بعد مختلف صوبوں کو سپرد کردے تو بعد کی مفصل تحقیقات کو خود صوبے انجام دیں۔ اور اس مفصل ابتدائی تحقیقات کے لئے جس روپے کی ضرورت ہو اسے متعلقہ صوبے خود اپنے بجٹ سے فراہم کریں۔ صوبے کی حکومتوں کو چاہیئے کہ تمام باریک کو باریک جزئیات کے بارے میں نہایت مکمل تحقیقات کرائیں۔ پھر اس تمام اسکیم کو ایسے ماہرین کی حیثیت تمام ہندوستان کے لئے دقیع ہے تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔

اور بعد میں غیر ملکوں کے بہترین ماہر بھی اس کی جانچ کریں۔ اس کے بعد جو آخری اسکیم تیار ہو اسے بغیر کسی چیز کو اتفاقات پر چھوڑتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ ہر ایک صوبہ کی حکومتوں کو ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے تک اس قسم کے مکمل مطالعہ کے لئے صرف کرنا ہوگا لیکن مستحکم بنیاد پر کھڑے ہونے کے لئے اس طرح روپیہ لگانا مناسب ثابت ہوگا۔ اگر حکومت کی طرف سے چلائی ہوئی کوئی اسکیم آخر میں ناکام ہوئی تو اس سے ملک کا حوصلہ بہت پست ہوجائیگا اور صنعتی ترقی رک جائے گی۔ ان تفصیلی تحقیقاتوں میں کچے مال کے وسائل، معاشی کارخانوں کے پیمانے، ان کے مناسب محل وقوع۔ پیدائش کی لاگت، جتنے مجموعی سرمایہ کی ضرورت ہے اس کے اعداد، امکانی، خارجی اور داخلی مقابلہ، اس مقابلہ کو روکنے کی تدبیر اور ہر دوسری ممکن تفصیل پر مکمل بحث ہونا چاہیئے۔ یہ سب کام صوبوں کو کرنا چاہیئے اور اس کے لئے صوبہ کے بجٹ سے رقم نکالنا چاہیئے۔ صنعت کے محکموں کو ۱۵ اور ۲۰ لاکھ کے درمیان جو امداد دی جاتی ہے اس کے پیش نظر تو ۵۰ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک رقم نکالنا عملاً ممکن ہوسکے گا۔

رہا سوال ان صنعتوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے اور ان کی نگرانی کا تو حکومتوں کے لئے ان صنعتوں کی پوری ذمہ داری لینا تو مشکل ہوگی کیونکہ ترقی کی موجودہ حالت میں ضروری تجربہ کار لوگوں کی ان کے یہاں بہت کمی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ان کلیدی صنعتوں کو جن سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے ایک نجی سرمایہ دار کے رحم وکرم پر چھوڑنا بھی خطرناک ہے۔ قوم کو بصورت مجموعی اپنی پالیسی کے منوانے

کا حق حاصل ہوتا ہے ۔ راقم الحروف کے نزدیک موجودہ حالات میں بہترین انتظام یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ نجی طور پر جمع کیا جائے اور گورنمنٹ سرمایہ داروں کے لگائے ہوئے سرمائے پر تین یا چار فیصدی منافع کی ضمانت کر لے بشرطیکہ سات یا آٹھ فی صدی سے جتنا زیادہ منافع ہو گا وہ مقررہ تناسب کے ساتھ (نصفا النصف) ریاست اور کمپنی کے درمیان تقسیم کر لیا جایا کرے گا۔ حکومت کی نمائندگی کمپنی کے ڈائرکٹروں کے بورڈ میں ایک خاص تناسب مثلاً ۳۳ فی صدی تک ہوگی۔ اگر سوشلسٹ رجحانات غالب ہو جائیں تو ایک شرط یہ بھی بڑھائی جا سکتی ہے کہ حکومت کو ۲۵ یا ۳۰ سال کے بعد پورے کارخانے کو خریدنے کا حق حاصل رہے گا۔ اس انتظام سے آئندہ کی طبقاتی جنگ کا بھی سدباب ہو جائے گا اور موجودہ زمانہ میں صنعتی ترقی کو بھی شروع کیا جا سکے گا۔ موجودہ انتظام کے مطابق اگر ہر صوبہ کو اپنی مفوضہ صنعتوں کے لئے ۵ کروڑ کے قریب سرمایہ کی ضرورت ہوئی تو ضمانت کئے ہوئے کمترین سود کی رقم ۳ فی صدی کے حساب سے ۱۵ لاکھ اور ۴ فیصدی کے حساب سے ۲۰ لاکھ روپیہ ہوگی اگر صنعت کو نہایت مکمل ابتدائی تحقیقات کے بعد شروع کیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ صنعت ۳ فی صدی منافع نہ دے سکے۔ اس لئے اگرچہ ضمانت کئے ہوئے سود کے لئے ۱۵ یا ۲۰ لاکھ روپیہ کا بجٹ میں حفظ ماتقدم کرنا پڑے گا لیکن عملی طور پر حقیقتاً حکومت کو یہ رقم صرف نہیں کرنا پڑے گی یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین سال کے بعد جب کہ صنعت پوری طرح پر قائم ہو جائے گی اور بیرونی اور اندرونی مقابلہ محصول درآمد اور دوسرے قوانین کے ذریعہ قابو حاصل کر لیا جائے گا تو منافع پر اس طرح کی نگرانی رکھی جا سکتی ہے کہ حکومت کو ۸ فی صدی کے زیادہ کے منافع پر ایک اچھی خاصی آمدنی حاصل ہو سکے ۔ اس کمترین منافع کی ضمانت کے لئے ایک مستقل فنڈ کو بھی شروع کیا جا سکتا ہے تاکہ اگر حکومت کو پہلے دو تین سالوں میں نقصان اٹھانا پڑے تو اس کی تلافی بعد کے چند سالوں کے فائدہ سے ہو جائے اور یہ بہت زیادہ اغلب ہے کہ دس سال تک جاری رہنے کے بعد اس فنڈ سے حکومت کو خاصی آمدنی ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس لئے موجودہ حالات میں بھی صوبہ کی حکومتیں نہایت اطمینان کے ساتھ ۱۵ لاکھ روپیہ کمنافع کی ضمانت کرنے کے لئے وقف کر سکتی ہیں ان کلیدی صنعتوں کی پالیسی مقرر کرتے وقت قومی تحفظ اور عوام کے فایدہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ضرورت

ہو تو ان سے بعض صنعتوں کو ٹکی تحفظ کے بجٹ سے امداد دی جا سکتی ہے۔

جن صنعتوں کے لئے ملک میں کافی کچا مال موجود ہے اور مصنوعہ مال کے کافی منڈی ہے ان کی ناکامی کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے یعنی بیرونی اور ملکی مقابلہ۔ بیرونی مقابلہ واقعی ایک سخت خطرہ ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔ اگر اس بیرونی مقابلہ کو روکا جائے تو ان صنعتوں کی کامیابی یقینی ہے۔ اس بیرونی مقابلہ کے روکنے کے سلسلے میں سب سے اہم عنصر ہماری محاصل درآمد کی پالیسی ہے جو فی الحال ہمارے ہاتھ میں مکمل طور پر نہیں ہے فیڈریشن میں جو اختیارات منتقل کئے جا رہے ہیں ان کے بارے میں چاہے جس قدر بھی اختلاف ہوئے ہو ایک بات بہرحال یقینی ہے کہ اگر تمام صوبوں اور ریاستوں کے نمائندے متفق ہو جائیں اور ان کا متفق ہونا ممکن ہے کیونکہ اس معاملہ میں صوبوں اور ریاستوں کے مفاد یکساں ہیں تو ہم ملک کے محاصل درآمد کی پالیسی پر اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے وزراء کی اس کانفرنس کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہر صوبہ کی حکومت ہر ممکن طریقہ سے جن میں محاصل درآمد کے ذریعہ تامیں بھی شامل ہے کم سے کم دس سال تک ان کلیدی صنعتوں کا تحفظ کرے گی۔ اگر تمام صوبوں کی حکومتیں اس محاصل درآمد کی پالیسی کے رشتہ میں اپنے آپ کو منسلک کرلیں گی تو قیمتوں میں اس قدر کمی بیشی کرنا ممکن ہوگا کہ اس کے ذریعہ صنعت کو کامیاب بنایا جاسکیگا صوبوں کے لئے اس قسم کا ارادہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔

جہاں تک اندرونی مقابلہ کا سوال ہے اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ سرمایہ کی اتنی زیادہ ضرورت ہے کہ نجی سرمایہ داروں کے لئے حکومت کی امداد کے بغیر صنعتوں کا شروع کرنا مشکل ہوگا اس کے علاوہ حکومت نہایت آسانی کے ساتھ ملکی قوانین بنا کر ان پر نگرانی رکھ سکتی ہے لیکن ایک اور بھی خطرہ ہے جس سے تحفظ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کہیں غیر ملکی کمپنیاں جن کے پاس سرمایہ بہت زیادہ ہے اپنی بڑی صنعتوں کو اس ملک میں شروع نہ کردیں اور اندرونی مقابلہ کا سبب بن جائیں۔ اگر موجودہ دستور کے اندر رہتے ہوئے ہم انھیں ان صنعتوں کو شروع کرنے سے باز نہ رکھ سکیں تو ہم یہ کرسکتے ہیں کہ کچے مال کے ذرائع پر اپنا اجارہ قائم کرلیں تاکہ ان غیر ملکی کمپنیوں کے لئے مقابلہ کی صنعتیں کھولنے

کے لئے ان ذرائع پر قبضہ پانا ممکن نہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ ایسے قوانین جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اندر رہتے ہوئے بنائے جاسکتے ہیں بنائے جائیں اور ان سے غیر ملکی کارخانوں کو قدرتی ذرائع پر قبضہ کرنے سے محروم کیا جائے۔ اس تمام مسئلہ پر صفائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی جس میں سیاسی اور فنی ماہر شامل ہوں بنائی جاسکتی ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ہماری صنعتوں پر قبضہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے نہیں تو آزادی محض مذاق ہوکر رہ جائے گی اور غیر ملکی قوموں کو اپنے تجارتی مفاد کے تحفظ کی آڑ میں ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے بہانے ملتے رہیں گے۔

ابتدا میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں بڑی غیر ملکی کمپنیوں کی جن کو ان کاموں کا بہت کافی تجربہ حاصل ہے امداد لینا پڑے تجارت اور معاشی زندگی میں بین الاقوامی رقابت آج کل اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی قوم سے اس قسم کی مدد لینا ناممکن نہیں ہوگا کیونکہ ہندوستان کی اس صنعتی ترقی سے زیادہ تر برطانوی تجارت پر اثر پڑیگا جہاں سے موجودہ زمانے میں ہم اپنی مجموعی درآمد کا پچاس فی صدی حصہ حاصل کرتے ہیں۔ جن صنعتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے لئے نہایت قابل اعتماد اور خوب مستحکم کمپنیوں سے مدد لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ لیکن جو مدد بھی لی جائے وہ ہماری اپنی شرائط کے مطابق ہونا چاہیئے۔

کچھ بڑی بڑی صنعتیں ایسی ہیں جن میں بالکل ویسا ہی کچا مال استعمال کیا جاتا ہے جیسے دوسرے ملکوں میں۔ ان کے لئے ہمیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ ان دوسرے ملکوں کے طریقوں اور مشینوں کو اپنے ملک میں نقل کریں۔ ان صنعتوں کے شروع کرنے میں کسی تحقیقات علمی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہاں کی ہر چیز ان سے بالکل مشابہ ہے البتہ مزدوروں کی اہلیت کار کردگی میں فرق ہے سو اس کا لحاظ رکھا جاسکتا ہے۔

پھر کچھ صنعتیں ایسی ہیں جن کا کچا مال ہمارے یہاں یورپ سے کچھ مختلف ہے تو ان کے لئے ہمیں ان طریقوں میں کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی جو دوسرے ملکوں میں رائج ہیں۔ اس کے لئے مقامی تحقیقات کی ضرورت ہوگی اور جب اس قسم کی تحقیقات علمی کرلی جائے گی تب ہی ان صنعتوں کو شروع کرنا ممکن ہوسکے گا۔

لیکن صنعتوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو ملک کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن جس کے

لئے ویسا معمولی کچا مال موجود نہیں ہے جیسا دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے لئے ایسے دوسرے
کچے مال ڈھونڈنا ہوں گے جو دوسرے ملکوں کے کچے مال کا بدل بن سکیں گے۔ اس کے لئے بہت زیادہ
تحقیقات علمی کی ضرورت ہوگی۔

پہلی قسم کی صنعتوں کے شروع کرنے میں تو کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح دوسری قسم کی
صنعتوں کو بھی تھوڑی سی تحقیقات علمی کے بعد شروع کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تیسری قسم کی صنعتوں کے لئے مکمل
تحقیقات کی ضرورت ہوگی اور تحقیقات کا کام مختلف صوبوں کی انسٹیٹیوں اور افراد کو سپرد کیا جاسکتا ہے تاکہ اس قومی
کمزوری کا ازالہ کیا جاسکے اور ملک کو اس کی تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جاسکے۔

اگر ان تمام چیزوں کا فیصلہ ہو جائے تو ہم اپنے ملک کی صنعتی عمارت کو ٹھوس بنیاد پر تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر
ہم ایک معقول پنجسالہ منصوبہ تیار کریں اور اسے پورے جوش کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو درآمد
کو ساٹھ یا ستر فی صدی تک کم کیا جاسکتا ہے اور ملک کو تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جاسکتا ہے
اس کے علاوہ اس قسم کی صنعتوں کی ترقی سے جیسے کیمیاوی کھاد کی صنعت ہے ہماری زراعتی پیداوار
میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور اس پالیسی پر عمل کرنے سے ہو سکتا ہے کہ قومی پیدائش دولت میں
آئندہ پانچ سالوں میں تقریباً تین ارب روپیہ کا اضافہ ہو جائے۔ دو ارب روپیہ کا زراعت میں اور ایک
ارب روپیہ کا صنعت میں اور یہ کانگریسی حکومتوں کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

ہندوستان میں آبادی کا مسئلہ

(از جناب پی ۔ کے ۔ ڈل صاحب)

ہندوستان کی آبادی کی ترقی کے اعداد و شمار سے ہر شخص واقف ہے۔ ۱۸۸۱ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی تھی اس ملک کی آبادی ۲۵ کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں انفلوئنزا کی وبا کے فوراً بعد آبادی کی تعداد ۳۱ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ہوگئی تھی اور اب اگر صحت عامہ کے کمشنر نے جو تخمینہ کیا ہے اسے صحیح مان لیا جائے تو ہماری آبادی برما کو شامل کرنے کے بعد ۴۰ کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ ۱۹۴۱ء تک جبکہ نئی مردم شماری کی جائے گی توقع ہے کہ آبادی بڑھ کر ۴۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

۱۸۸۱ء سے ۱۹۳۱ء تک یعنی پچاس سال کی مدت میں آبادی کے اضافہ کی شرح اعشاریہ آٹھ سالانہ ہوتی ہے ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ شرح ایک فی صدی سالانہ سے کچھ زائد ہوتی ہے۔ یورپ اور ایشیا کے اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جن کی آبادی کے اضافہ کی شرح اور آبادی فی مربع میل ہندوستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ ان میں جاپان کی مثال خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ دوسری مثال برطانیہ عظمیٰ کی ہے اگرچہ اس کی شرح اضافہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کم ہوگئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس اضافہ کی وجہ سے کون سے فوری مسائل پیدا ہوتے ہیں؟ ہندوستان کے موت و حیات کے اعداد و شمار جو شخص بھی مطالعہ کرتا ہے اسے ملک کے اندر شرح اموات کی کثرت کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ہم انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو پیدا کرتے ہیں جن کی ایک بڑی تعداد بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتی ہے اور ایسی تعداد جو خاصی بوڑھی عمر تک پہنچتی ہے بہت کم ہوتی ہے۔ پیدا ہونے والے ہر سو اشخاص میں سے ۲۵ پانچ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں صرف چودہ یا پندرہ اشخاص اس طرح مرتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمارا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرح اموات کو کم کیا جائے۔ اس وقت ہم

فی ہزار ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ گھٹ کر ۱۶ فی ہزار ہو جائے کہ یہی تقریباً جاپان کی بھی شرح ہے اگرچہ مغربی ملکوں کے معیار کے مقابلہ میں یہ بھی زیادہ ہے کیونکہ وہاں ۱۲ فی ہزار کو معقول شرح سمجھا جاتا ہے۔ اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے؟

صحت عامہ کو ترقی دینے سے بلاشبہ اس سمت میں ایک قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور صوبوں کی حکومتوں کو چاہیئے کہ بیماریوں کو روکنے اور ختم کرنے کے لئے حفظان صحت کے محکموں پر زیادہ روپیہ خرچ کریں۔ لیکن اگر آبادی کے اندر بیماریوں کی مدافعت کے لئے زندگی اور قوت موجود نہ ہو اور ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہو جو انسانی جسم کی تندرست نشو و نما کے لئے ناموزوں ہے تو حفظان صحت کے محکمے اپنے تمام نیک ارادوں اور حکومت کا زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں یورپ میں جو تجربات کئے گئے ہیں وہ ہمارے لئے بہت سبق آموز ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ شرح اموات کی یورپ کے ملکوں میں بھی اتنی ہی کثرت تھی جتنی ہمارے ملک میں ہے۔ ان ملکوں میں شرح پیدائش بھی اتنی ہی زیادہ تھی جتنی ہمارے یہاں ہے۔ پھر ایک زمانہ آیا جب شرح پیدائش گھٹنے لگی۔ عین اسی وقت شرح اموات میں بھی کمی ہونا شروع ہو گئی۔ اس لئے میرا یہ خیال یہ ہے کہ کوشش کو دونوں سمتوں میں شروع کرنا ہوگا اور اسی طریقہ پر عمل کر کے ہم اپنی شرح اموات کو گھٹا کر ۱۶ فی ہزار کی شرح پر لا سکیں گے صحت عامہ کی ترقی پر زیادہ روپیہ صرف کرنا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرح پیدائش کو بھی گھٹانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ شرح پیدائش ۳۵ فی ہزار سے گھٹ کر ۲۰ فی ہزار ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو بچوں کی اموات کی موجودہ خوفناک کثرت اور زچگی کی حالت میں نوجوان ماؤں کی اموات کی کثرت دونوں کم ہو جائیں گی۔

ہماری شرح اموات کی زیادتی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے آدمیوں کی عمریں مغربی یورپ کے ملکوں بلکہ جاپان کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے ساتھ جو متوقع عمر کی رپورٹ شائع کی گئی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچے کی متوقع زندگی پیدائش کے وقت صرف ۲۷ سال اور بچی کی صرف ۲۶½ سال ہوتی ہے۔ جاپان میں یہی عمر مردوں کے لئے ۴۴ سال اور عورتوں کے لئے ۴۳ سال ہوتی ہے۔ انگلستان میں مردوں کے لئے ۵۹ سال اور عورتوں کے لئے ۶۳ سال ہوتی ہے۔

اس ضمن میں آبادی اور غذا کی رسد کا جو باہمی تعلق ہے اس کا مطالعہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا ہماری غذا کی رسد آبادی کی ترقی کے ساتھ بڑھ رہی ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا غذا کی جو مقدار موجود ہے وہ ہمارے آدمیوں کے لئے ایک معقول معیار زندگی قائم رکھنے کے لئے کافی ہے یا نہیں ہے۔ دوسرے سوال کے جواب دینے کے لئے تو کافی مواد موجود نہیں ہے اور جو جواب دئے جاتے ہیں ان میں اندازے سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آبادی کو کافی غذا میسر نہیں آتی۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی نے تخمینہ کیا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ہماری غذا کی کل مقدار بحساب ۲ ہزار آٹھ سو کلاری فی آدمی فی یوم اکتالیس ارب نوے کروڑ کلاریز تھی اور ہندوستان میں آج ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ آدمیوں کے لئے غذا موجود نہیں ہے۔

پہلے سوال (یعنی آبادی کے اضافہ اور غذا کی مقدار کے اضافہ کی نسبتی شرح) کا جہاں تک تعلق ہے اعداد و شمار زیادہ موجود ہیں اگرچہ یہ بھی اتنے زیادہ بھروسہ کے لائق اور مکمل نہیں ہیں جیسے مغربی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس بات میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ مجموعی مزروعہ رقبہ یا رقبہ زیر اجناس خوردنی نے آبادی کے اضافہ کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ البتہ پیداوار کی مقدار کے بارے میں یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ زراعت کی مجموعی پیداوار نیز غذا کی پیداوار میں آبادی کے مساوی ترقی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ ترقی جو کچھ ہوئی ہے وہ ادنیٰ قسم کے اناج میں ہوئی ہے اور گیہوں کی پیداوار میں مسلسل کمی نظر آتی ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ گذشتہ بیس سالوں میں پالتو جانوروں کی تعداد میں تقریباً ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوگیا ہے اور ادنیٰ اناج کے کھانے میں پالتو جانور بھی شریک ہوتے ہیں تو اس کے ماننے میں کوئی شبہ کا موقع نہیں رہتا کہ ہماری غذا کی مقدار میں آبادی کے اضافہ کی نسبت سے خاصی بڑی کمی واقع ہوگئی ہے۔

اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ روزگار کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ روزگار کے خاص ذرائع زراعت اور صنعت ہیں۔ صنعت کے ذریعہ سے جن لوگوں کو روزگار ملتا ہے ان کا تناسب مردم شماری میں گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس زراعت پر بسر کرنے والے لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے

اور چونکہ مزروعہ رقبہ میں اضافہ آبادی کے اضافہ کے متناسب نہیں ہے اس لئے زراعت پیشہ آبادی کے پاس رقبہ فی کس برابر کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ زراعتی رقبہ مقبوضہ کی وسعت کے بارے میں اعداد موجود نہیں ہیں اور اس لئے یہ صحیح صحیح بتانا ممکن نہیں ہے کہ ملک میں غیر فائدہ بخش رقبات مقبوضہ میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ اسی وقت ہم یہ کہ سکیں گے کہ زمین کس حد تک آبادی کے دباؤ کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ لیکن اس بات کا یقین عام طور پر پھیلتا جا رہا ہے کہ زراعت کا کام نفع بخش نہیں رہا ہے اور مقبوضہ رقبے روز بروز غیر فائدہ بخش ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کھیتی کے لئے فراہمی اصل کی جتنی تجویزیں ہیں اور کاشتکار کو قرضے کے بار سے نجات دلانے کے جتنے منصوبے ہیں ان کی کامیابی نفع بخش مقبوضہ رقبوں کی موجودگی پر منحصر ہے۔

اس کے بعد میں اس کا تخمینہ کرنا چاہتا ہوں کہ ملک میں کتنا روزگار موجود ہے۔ اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن میں نے حال میں اس قسم کی ایک کوشش کی تھی میں نے سنہ ۱۹۰۱ء، سنہ ۱۹۱۱ء، سنہ ۱۹۲۱ء، سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے نقشوں سے کچھ اعداد لیے تھے اور ان کو مندرجہ ذیل طریقہ پر بے روزگاری کے دریافت کرنے کے لئے استعمال کیا تھا:-

مردوں کی مجموعی آبادی میں سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر تک کے مردوں کو منہا کر دیا اس سے روزگار سے لگنے کے قابل مردوں کی تعداد معلوم ہو گئی۔ اس میں سے پھر میں نے ان مردوں کی تعداد کو گھٹا دیا جو دس سے ساٹھ کی عمر کے تو تھے لیکن معذور تھے مثلاً پاگل، اندھے، بہرے، گونگے وغیرہ۔ مردم شماری کے اعداد سے کام نہ کرنے والے مردوں کی تعداد کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر کے لوگوں کو منہا کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے ان مردوں کو بھی منہا کر دیا جن کی عمر تو دس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن جو معذور تھے اس طرح کام نہ کرنے والی تندرست آبادی کے اعداد حاصل ہو گئے۔ دس سے ساٹھ تک کی عمر کے تندرست کام نہ کرنے والے مردوں کا جو تناسب دس سے ساٹھ تک کی عمر کی مجموعی مردوں کی آبادی سے تھا اس سے فی صدی بے روزگاری کا علم حاصل ہو گیا۔ چنانچہ یہ فرض کرنے کے بعد کہ یہ طریقہ قابل اعتماد ہے تمام ہندوستان کے لئے اعداد حسب

حسب ذیل ہوتے ہیں :۔

بے روزگاری کا تناسب فی صدی	مردم شماری کا سال
۷٫۱	سنہ ۱۹۰۱ء
۷٫۶	سنہ ۱۹۱۱ء
۱۰٫۳	سنہ ۱۹۲۱ء
۱۴٫۲	سنہ ۱۹۳۱ء

ان اعداد سے بے روزگاری میں مسلسل اضافہ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس طریقہ سے حقیقی بے روزگاری کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکے لیکن کم سے کم بے روزگاری کے اندازہ کرنے کے لئے اس طریقہ کو بالکل بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ اوپر کے اعداد کے دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب کہ آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا بے روزگاری میں بھی مسلسل اضافہ کا سلسلہ جاری تھا۔

غرض کہ آبادی کے مسئلہ کے مندرجہ بالا خاص پہلوؤں میں کچھ پہلوؤں پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے لیکن کچھ ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں فوری کارروائی شروع کی جا سکتی ہے اور کرنا چاہیئے۔

زرعی قرضداری اور حیدرآباد کے نئے قوانین

(از جناب محمد احمد سبزواری بی اے (عثمانیہ)

زراعت جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ریاست کا اہم پیشہ ہے اور جس پر ملک کی ۷۰ فیصد آبادی کا دار مدار ہے اس کی اصلاح و ترقی سب سے اہم ہے، مگر ہماری زراعت متعدد خرابیوں کا مجموعہ ہے، یہ مختلف خرابیاں ایک دوسرے سے اس قدر مل جل گئیں ہیں کہ ان کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے، زرعی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے تاوقتیکہ زراعت کی اصلاح کے لئے کوئی ایسا جامع خاکہ تیار نہ کیا جائے جو تمام شعبوں پر حاوی ہو، تاکہ بہ یک وقت خرابیوں کا انسداد ہو کر مجموعی حیثیت سے زراعت کو فائدہ ہو رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدرآباد نے اس نکتہ کو سمجھ کر ریاست حیدرآباد کی زرعی ترقی کے لئے ایک جامع زرعی پروگرام ترتیب دینے کا تہیہ کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے زرعی منڈیوں کے قیام کے لئے ایک قانون نافذ کیا گیا، تاکہ کاشتکاروں کو بے ضابطہ منڈیوں میں جو نقصان پہنچتا ہے اس سے محفوظ رکھا جائے، اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداواروں پر ہوتا ہے۔ محکمہ زراعت کو وسعت دی گئی، اس کے تحت متعدد مزرعے اور تجربے خانے قایم کئے گئے، جہاں زرعی پیداواروں، فصلوں کی بیماریوں، مویشیوں کی بیماریوں اور علاج معالجے کی جانب خاص طور پر توجہ کی جاتی ہے، چنانچہ اس وقت تک چاول، مونگ پھلی، نیشکر وغیرہ کی مقامی اعلیٰ قسمیں دریافت ہو چکی ہیں، اور ان کے تخموں کو ملک میں رواج دینے کی کوشش جاری ہے

فصلوں کی بعض بیماریوں کے علاج بھی معلوم کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں معلومات عامہ کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ محکمہ نے مویشیوں کی بعض بیماریوں کے نئے طریق علاج دریافت کئے ہیں جو اس قدر آسان اور ارزاں ہیں کہ ایک معمولی کاشتکار بھی ان کی قیمت برداشت کر سکتا ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جو کونسل کے اراکین، متعلقہ محکموں کے معتمدین، دنظا، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کوآپریٹو یونین کے نمائندہ پر مشتمل ہے۔ اس کے تحت اضلاع میں ضلع واری اور تعلقوں میں تعلقہ واری کمیٹیاں بنائی گئیں ہیں۔ جن میں غیر سرکاری مقامی لوگ بھی شریک کئے جاتے ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام اسکیم بناتی ہے اور ذیلی کمیٹیاں اسکو عملی جامہ پہناتی ہیں۔ مختلف مقامات پر دیہی تنظیم کے مرکز قائم ہیں، نمائشوں، مظاہروں، تقریروں اور طلسمی فانوسوں کے ذریعہ کاشتکاروں میں تبلیغ کی ہر ممکنہ کوشش کی جاتی ہے حال ہی کاشتکاروں کو قرضہ کے بار سے نجات دلانے، موروثی قرضوں کی تنسیخ کرانے اور ان کی زمینوں کو ساہوکاروں کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لئے تین دستورالعمل نافذ کرکے برطانوی ہند کے ان صوبوں کے لئے بڑی اچھی مثال قائم کی ہے، جہاں آج کل ساہوکاروں پر بعض پابندیاں عائد کرنے کے سلسلہ میں قوانین زیر غور ہیں۔ یہاں بہاؤنگر کی طرح سارا ندعی قرضہ معاف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ صرف قرضہ معاف کردینے سے کاشتکار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ از سر نو قرض لے گا اور پرانے حالات پھر عود کرائیں گے، دراصل حقیقی اصلاح یا تو ان خرابیوں کو مستقل طور پر دور کرنا ہے جن کی بدولت قرض لیا جاتا ہے، اور اس میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا ایسے ادارے قائم کرنا ہیں جو آئندہ ان کو زمین یا فصلوں کی ضمانت پر طویل مدت کے لئے قرض دے سکیں، چنانچہ اول الذکر خرابی کو دور کرنے کے لئے نئے قوانین بنائے گئے جن کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، دوسری خرابی کے لئے ایک مرکزی زمین گروی بنیک کی تجویز زیر غور ہے، نیز اسٹیٹ بنیک کے قیام کا مسئلہ بھی زیر بحث ہے، ان دونوں اداروں کے قیام سے ملک اور بالخصوص کاشتکاروں کو بڑا فائدہ ہوگا۔

نئے قوانین کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ کیوں ندعی قرضداری نے موجودہ زمانہ میں اتنی شدت اختیار کرلی ہے، زراعت میں قرضہ کی کیوں ضرورت ہوتی ہے، ملک میں

قرض دینے والے کون سے ادارے ہیں، نیز ساہوکاری طریق میں کیا خرابیاں ہیں جن کے انسداد کے لئے قانون بنانے کی ضرورت ہوئی، ذیل میں ان ہی باتوں کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔

تاریخی پس منظر ہندوستانی گاؤں جس زمانہ میں خود کفالت کے دور میں تھے، زراعت کے لئے کسی خاص قرضہ کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ کاشتکاروں کی ضروریات معمولی اور ادنیٰ تھیں، اکثر وبیشتر چیزیں خود پیدا کرلیا کرتے تھے، مثلاً گیہوں، جوار، مکی، نخود، دھان، دالیں وغیرہ، معمولی ترکاریاں مثلاً بیگن، اروی، کدو، لوکی، ہلدی، مرچ، ادرک، پیاز، لہسن گھر کے خرچ کے لئے کھیتوں میں پیدا کرلیا جاتا تھا۔ وہ خود روئی اگاتے تھے ان کی عورتیں سوت کاتتی، اور گاؤں کا جولاہا کپڑا بن دیتا تھا، اگر رنگنے کی ضرورت ہو تو گاؤں کا رنگریز مقامی رنگوں سے کپڑا یا سوت رنگ دیتا تھا، لوہار اور بڑھئی آلات زراعت اور گھر کی ضروریات کی چیزیں تیار کرتے، کمہار برتن بناتا، چمار جوتے تیار کرتا، حجام، دھوبی، سقہ، بھنگی، دائی، بھوئی اور دوسرے کمین اپنی مفوضہ خدمات انجام دیتے تھے، روپیہ دینے کی ضرورت کسی کو پیش نہ آتی تھی ہر ایک کو فصل پر غلہ دیا جاتا تھا، چراگاہوں کا رقبہ کافی تھا اس وجہ سے چارہ کی افراط تھی اور مویشیوں کی حالت اچھی تھی، دودھ، دہی، مکھن اور گھی خوب پیدا ہوتا تھا اور سب گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ پیشہ ور گڈریے اچھی قسم کی نسلیں پیدا کرتے اور کاشتکاروں کو اچھے مویشی مہیا کردیتے، یہی لوگ بھیڑوں کے اون سے کمبل بنتے تھے۔ اور کبھی اپنی خدمات یا اشیا کے معاوضہ میں نقد روپیہ طلب نہ کرتے بلکہ فصل پر غلہ لیا کرتے تھے۔ گو اس زمانہ میں بھی ساہوکاروں کا طبقہ موجود تھا جو جنس یا نقد کی شکل میں قرضہ دیتا تھا لیکن نہ تو قرضہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، اور نہ شرح سود اتنی اعلیٰ، پھر وہ کسان کو اس طرح دبا بھی نہ سکتا تھا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کیونکہ گاؤں میں پنچائتیں موجود تھیں جو گاؤں کے تمام معاملات کا تصفیہ کیا کرتی تھیں ان کے فیصلے موجودہ عدالتوں سے بالکل مختلف ہوتے تھے، ان مختلف اسباب کی بنا پر اس زمانہ میں زرعی قرضداری کا سوال پیچیدہ اور شدید نہ تھا۔

اب گاؤں کا قدیم نظام بدل رہا ہے، کاشتکار کی ضروریات میں نسبتاً اضافہ ہوگیا ہے، اس کی اکثر ضروریات گاؤں میں پوری نہیں ہوتیں، اشیا سے اشیا کا لین دین موقوف ہوگیا، نقد کی ضرورت

پیدا ہونے لگی اشتراک خاندان اور اجتماعی مفادات کے رجحانات کی جگہ انفرادیت اور معاشی آزادی لے رہی ہے کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ بین الاقوامی بازاروں کے لئے اگانے لگا ہے۔ جہاں کی قیمتوں پر اسکے گاؤں کی فصلوں کی اچھائی یا برائی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، پنچائتیں ختم ہوگئیں، ان کی جگہ شہروں میں عدالتیں قائم ہوئیں، چھوٹے چھوٹے معاملات کے لئے شہروں میں آنے کی ضرورت ہونے لگی، آنے جانے کے مصارف وکیل اور دوسرے لوگوں کو محنتانہ یا نذرانہ ادا کرنے کی ضرورت ہونے لگی، ان مزید اخراجات کے باوجود یہ یقین نہیں کہ عدالت میں حقیقی انصاف ہوگا کیونکہ جج کو حقیقی اور سچی باتوں کا علم نہیں ہوتا وہاں کارروائی اور ثبوت پر فیصلہ ہوتا ہے، پنچائتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا وہاں پنچ فریقین سے واقف ہوتے تھے اور سارے واقعات کا علم ہوتا تھا اس لئے فیصلے صحیح ہوتے تھے۔ وسائل نقل وحمل کے تیز رفتار ذرائع نے جہاں بعض سہولتیں پیدا کیں وہیں کاشتکار کے اخراجات میں بھی اضافہ کیا، نیز ان ذرائع سے وقت کی جو بچت ہوتی ہے اس سے اسکو کوئی فائدہ نہیں، گویا ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اب قرض لینے کے مواقع زیادہ پیدا ہوگئے ہیں، اسی وجہ سے چند سالوں سے زرعی قرضہ کے مسئلہ نے ساری دنیا میں اہمیت اختیار کرلی ہے۔ بالخصوص زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں تخفیف سے اس مسئلہ کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں اس لئے بھی اس کی اہمیت ہے کہ یہاں کے کسان اَن پڑھ، ناواقف، غیر منظم مفلس مسرف، حساب وکتاب سے ناواقف ہیں، ان کی ساکھ یا اعتبار بہت ہی کم ہے۔

قرضہ کی ضرورت موجودہ زمانہ میں کاروبار اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں کئے جاتے، کپڑے کے کارخانے کا مالک ہر سال ہزاروں گز کپڑا اس لئے تیار نہیں کرتا کہ وہ یا اس کا خاندان اس کو استعمال کرے گا۔ بالکل یہی حال زراعت کا ہے، اب کسان اس لئے کاشت کرتا ہے کہ اپنی پیداواروں کے معاوضہ میں ضروریات کی دوسری چیزیں خریدے گویا اب دونوں کاموں کا مقصد عالمی طلب کو پورا کرنا ہے۔ صنعت ہو یا تجارت دونوں میں قرض کی ضرورت ہے جس طرح صنعت میں سرمایہ قرض لیکر جمع کیا جاتا ہے اسی طرح زراعت کے لئے بھی قرض سے حاصل شدہ سرمایہ کی ضرورت ہے، بلکہ زراعت میں تو قرض کی ضرورت اس لئے اور زیادہ ہوجاتی ہے کہ یہ انفرادی پیشہ ہے صنعت میں چند افراد مل کر کچھ سرمایہ جمع کرتے ہیں مگر

زراعت میں یہ سہولت بھی نہیں، پھر یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر کسانوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مقبوضہ اراضی کی ضروریات عمدگی سے پوری کر سکیں، اچھی زراعت کے لئے سرمایہ ناگزیر ہے، کیونکہ اگر سرمایہ کی کمی سے آلات و اوزار یا مویشی محدود ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کسان اپنی طاقتوں کے بڑے حصہ کو ضائع کر رہے ہیں۔

— زراعت میں مختلف کاموں کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ عام طور پر ماہرین زراعت نے قرضہ کی تین صورتیں بتائی ہیں، پہلے قلیل مدت کے قرضے ہیں جن میں روزمرہ کے مصارف یا کسی خاص فصل کے اخراجات شامل ہوں، ان کی مدت ۹ ، ۱۰ تک ہوتی ہے، دوسرے متوسط مدت کے قرضے، ان کا کسی خاص فصل سے تعلق نہیں ہوتا، ان کی میعاد ایک سال سے تین سال تک ہوتی ہے، تیسرے طویل مدت کے قرضے ہیں، ان کا مقصد مستقل ترقیات و اصلاحات اراضی ہے، مختلف ملکوں میں اپنے مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مدت مختلف ہے، مگر ہندوستان میں ان کی میعاد کا اوسط ۲۰ سال ہے۔

قرض دینے والے ادارے | ہندوستان میں اول تو ویسے ہی بنکوں کی کمی ہے، جو بنک ہیں وہ تجارتی ہیں اور شہروں میں قائم ہیں، اور شہریوں ہی سے تجارتی تعلقات رکھتے ہیں، تجارتی بنکوں کے لئے زراعت پیشہ لوگوں سے کاروبار کرنا مشکل بھی ہے، بنک سے کاروبار کرنے کے لئے تھوڑی بہت واقفیت اور تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے یہاں کم و بیش مفقود ہے، کاشتکار کی ساکھ بہت ہی کم ہے، اس کے پاس ضمانت کے لئے زمین، مویشی اور فصل کے موقع پر پیداوار ہوتی ہے، بنک جن کا یہ اصول ہے کہ اپنے اثاثوں کو بوقت ضرورت زر نقد میں تبدیل کرا سکیں ان چیزوں کی ضمانت پر قرض نہیں دے سکتے، پھر کاشتکار کو چھوٹی چھوٹی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے جو سال بھر تک پھیلی رہتی ہے۔ بنکوں کے لئے ان رقموں کا حساب رکھنا اور انفرادی طور پر کاشتکار سے کاروبار کرنا آسان کام نہیں، جب ان کے سامنے تجارت کے دوسرے آسان راستے کھلے ہوتے ہیں تو ان کو کیا ضرورت کہ خواہ مخواہ خطرہ اور مصیبت کے کاموں میں اپنا روپیہ پھنسائیں، دراصل زرعی اغراض کے لئے قرض دینے والے خاص بنک ہوتے ہیں مگر ملک میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب انجمن ہائے امداد باہمی کا پہلا قانون نافذ ہوا تو اس سے یہ امید کی گئی تھی کہ وہ زرعی قرضداری کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش کریگا، لیکن یہ نئی تجویز بری طرح ناکام ہوئی دراصل غلطی ابتدا میں ہوئی امداد باہمی کو آپس کے اشتراک سے قائم ہونا چاہئے تھا، پہلے لوگوں میں اس کا احساس ہوتا پھر انجمنیں قائم کی جاتیں، مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا، حکومت نے قانون کے ذریعہ یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی، حکومت کی جانب سے جو لوگ اس کام کی تبلیغ کے لئے مقرر کئے گئے وہ ایک طرف تو اسکے صحیح اصولوں سے ناواقف تھے دوسرے انھوں نے اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے انجمن قائم کرنا شروع کردیں، بجائے "خوبی" کے "تعداد" پر غور ہونے لگا، صوبوں میں ایک قسم کا مقابلہ شروع ہو گیا اور انجمنوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ عمارت تو پہلے ہی سے اندر سے کھوکھلی تھی مگر اوپر کی لیپ پوت نے عیب کو چھپا رکھا تھا، مگر ۱۹۳۱ء میں کساد بازاری کی وجہ سے زمینوں اور پیداواروں کی قیمتیں گرنے لگیں تو سارا بھرم کھل گیا۔ بہرحال گوناگوں نقائص، کاشتکاروں کی ناواقفیت، اور چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کی بداعمالیوں کے سبب سے یہ تحریک ملک میں کچھ زیادہ سرسبز نہ ہو سکی، ۵۰ سال کے عرصہ میں صرف ۸ فیصد آبادی اس سے متاثر ہوئی، اور جو امیدیں اس سے وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔

حقیقی معنوں میں ملک کی زراعت کے لئے سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ ساہوکاروں کا ہے، کم و بیش ہر گاؤں میں ساہوکار کا وجود ناگزیر ہے، ان کا کاروبار بہت وسیع ہے، کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں سب سے زیادہ انکم ٹیکس ادا کرنے والا یہی طبقہ ہے۔ ہندوستانی زرعی قرضہ کی بڑی تعداد ان ہی سے حاصل کی گئی ہے، اس لئے وہ تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ ایک ایسے شعبہ کی مدد کر رہے ہیں جس کی طرف سے سب لاپروا ہیں۔ وہ بلاشبہ ایسے کم ساکھ والوں کو قرض دیتے ہیں جن کو کہیں سے قرض نہیں مل سکتا، وہ پیداآور بلکہ زیادہ تر غیر پیداآور دونوں ہی کاموں کے لئے قرض دیتے ہیں، وہ وقت پر ان کی مدد کرتے ہیں، اس میں بھی شک نہیں کہ ان کا کچھ روپیہ ڈوب جاتا ہے، بعض لوگ ان کا روپیہ واپس نہیں کرتے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساہوکار

ابھی تک اس شعبہ میں اپنا روپیہ لگا رہے ہیں خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حقیر نقصانات ان کے کثیر منافع کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، اور واقعہ بھی یہی ہے ساہوکار اپنی ترکیبوں، چالوں اور چالاکیوں سے مطالبات سے کہیں زیادہ رقم وصول کرتے ہیں، ان کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے، کاشتکار مجبور ہے کہ وہ ان سے قرض لے کیونکہ اور کوئی ذریعہ موجود نہیں، اس طرح ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور یہ من مانی شرطیں ان سے منوا سکتے ہیں، مختصر یہ کہ ساہوکار کاشتکاروں کا مخفی اور بین دونوں طرح استحصال کرتے ہیں۔ ان کے کاروبار میں کیا نقائص ہیں، اور وہ کس طرح کاشتکاروں کا استحصال کرتے ہیں ان کو ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

مہاجنی کاروبار کے نقائص (۱) جو رقم قرض دیتے ہیں اس پر بہت اعلیٰ شرح سود وصول کرتے ہیں، مسٹر ایس، ایم بھرد چہ جن کو ریاست حیدرآباد میں زرعی قرضہ کی تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا تھا بتلاتے ہیں کہ ریاست میں ۱۵ سے ۴۰ فیصد تک شرح عام ہے، مجھے حال میں ایک موضع کی معاشی تحقیق کا موقع ملا تو موضع کی شرح سود ۱۸ سے ۷۵ فیصد تک معلوم ہوئی، نیز اچھے اور عمدہ ساکھ والے کاشتکاروں کو کم شرح پر قرض دیتے ہیں، معمولی اور غریب کاشتکاروں سے بہت زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔

(۲) اپنی قرض دی ہوئی رقموں پر سود در سود وصول کرتے ہیں، اس طرح رقم بہت آسانی سے دوگنی ۳ گنی ہو جاتی ہے۔ مجھے دوران تحقیقات میں متعدد ایسے واقعات معلوم ہوئے جن میں رقم اصل سے بہت بڑھ گئی تھی مثلاً ایک مسلمان نے ۱۸ فیصد کے حساب سے سو روپیہ قرض لیا، ۵۰ روپیہ ادا کرنے کے بعد وہ مر گیا دس سال کے بعد جب اس کے بیٹے نے پرانا حساب کیا تو رقم ۴۰۰ ہو گئی تھی۔ ساہوکار نے متوفی کے بیٹے کو دو سو روپیہ قرض دیکر ۲۲۵ روپیہ کا کاغذ لکھوا لیا۔

(۳) جنس میں بھی اعلیٰ شرح سود اور سود مرکب کا طریقہ رائج ہے، ساہوکار اپنے موکلوں کو جنس کی شکل میں تخم یا کھانے کے لئے غلہ دیتا ہے، جتنا غلہ دیا جاتا ہے فصل پر اس کا ڈیوڑھا یا دوگنا وصول کیا جاتا ہے اسکو "ناگ" کا طریقہ کہتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ معلوم ہوا کہ کاشتکار نے نصف من غلہ قرض لیا، ۵ سال کے عرصہ میں وہ ۵ من غلہ دے چکا ہے مگر ابھی اس کو ۴ من غلہ دینا باقی ہے۔

(۴) مہاجن کو اجارہ حاصل ہے، اجارہ کا لازمی نتیجہ قیمت کی زیادتی ہے، چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کاشتکار اس کے پاس قرض لینے جاتے ہیں تو پہلے وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے، کئی روز مزید اصرار کے بعد رقم کی تعداد پوچھتا ہے، اور تعداد کو زیادہ بتاتا ہے، ۳، ۴ روز گذرنے کے بعد معاملہ کا تصفیہ ہوتا ہے، دراصل اس ٹال مٹول سے وہ کاشتکار کی ضرورت کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے تاکہ اس لحاظ سے اپنی شرطیں منوا سکے۔

(۵) شرح سود پیشگی وصول کر لیتا ہے، مثلاً اس نے کسی کو ۱۰۰ روپیہ ۶ ماہ کے لئے ۱۸ فیصد پر قرض دیئے لیکن دراصل وہ اس کو ۹۲ روپیہ ادا کرتا ہے اس طرح گویا وہ شرح میں مزید ۲ ½ فیصد کے قریب اضافہ کر دیتا ہے۔

(۶) ساہوکار کاشتکار سے قرض دیتے وقت یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ وہ فصل پر غلہ اسی کو فروخت کرے گا، اس طریقہ کو "لدونی" کا طریق کہا جاتا ہے، اس سے کاشتکار کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ فصل کے موقع پر پیداواروں کی قیمت ایک نہیں رہتی، پہلے قیمت زیادہ ہوتی ہے مگر جب فصلیں کٹ کٹ کر بازار میں آنے لگتی ہیں تو ان کی قیمت میں کمی ہونے لگتی ہے اور جب سارا غلہ بازار میں آ جاتا ہے تو قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اب جن کاشتکاروں کی فصل پہلے تیار ہو جائے ان کو بازار میں اچھی قیمت مل سکتی ہے مگر ساہوکار کے یہاں یہ نہیں ہوتا، وہ فصل پر غلے کو تول یا ناپ کر لے لیتا ہے اور حساب ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوتا ہے، ساہوکار موسم کی سب سے کم قیمت پر غلہ خریدتا ہے اور اس قیمت میں سے بھی ۲ سے ایک روپیہ فی من تک "حق ساہوکاری" وضع کرتا ہے۔

(۷) کاشتکار سونے، چاندی کی چیزیں، مویشی، مکان، اور زمین رہن رکھکر بھی قرض لیتے ہیں، زمین کے علاوہ دوسری چیزوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۴۰ یا ۵۰ فیصد قرض ملتا ہے، اور جب اصل و سود شے کی مالیت کے برابر ہو جاتا ہے تو یہ چیز ساہوکار کی ہو جاتی ہے، زمین کی صورت میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر رقم ایک مدت معینہ میں ادا نہ ہو تو زمین ساہوکار کی ہو جائے گی، اس طریق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کاشتکاروں کے قبضہ سے نکل کر ساہوکاروں کے پاس جانے لگتی ہے، مسٹر ہرو چپنے

۲۳ مواضعات میں تحقیقات کرکے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے تقریباً ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۹ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔[۱]

(۸) بعض ساہوکار جو ساہوکارہ کے علاوہ غلہ اور اشیا کا لین دین بھی کرتے ہیں، دو آدمیوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتے ہیں، مثلاً الف کو ب کو کچھ دینا ہے، تو وہ اپنے ساہوکار کو چٹھی لکھ دیتا ہے کہ میرے حساب میں ب کو اتنی رقم ادا کردو، اب ساہوکار ب کو نقد رقم بہت کم دیتا ہے، بلکہ اپنی دوکان کی اشیا اس کو فروخت کرتا ہے، اس طرح ایک جانب اعلیٰ شرح سود ملتی ہے دوسری جانب مال گراں قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

(۹) دوکان داری کرنے والے ساہوکار غلے کے معاوضہ میں بھی اشیا فروخت کرتے ہیں، ساہوکار غلہ کو تولنے کے لئے غلط اوزان استعمال کرتے ہیں، نیز غلہ لانے والے ادنیٰ ذاتوں کے مزدور ہوتے ہیں اس لئے غلہ کچھ صاف نہیں ہوتا، اور ساہوکار مٹی، بھوسہ، اور کنکر کے نام سے کچھ حصہ اور الگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح سیر بھر غلہ خریدنے کے بعد ۹ یا ۱۰ چھٹانک کی قیمت کا گراں مال ان کو دیتے ہیں۔

(۱۰) چھوٹی مقداروں کے تولنے میں ترازو کی ڈنڈی مار کر فروخت کرتے ہیں، ڈنڈی مارنے سے کتنا فرق ہوتا ہے اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے کیونکہ یہ ہاتھ کی صفائی، مشاقی، انگوٹھے کی سختی، اور ترازو کی ڈنڈی کی لنبائی پر منحصر ہے مگر اندازہ ہے کہ سیر بھر میں ۲ چھٹانک سے ۳ چھٹانک تک بل رہتا ہے۔

(۱۱) بڑی مقداروں کے تولنے یا ناپنے میں غلط قسم کے اوزان استعمال کرتے ہیں، اس طرح کافی فرق ہو جاتا ہے۔

(۱۲) ایک چیز کے مختلف بھاؤ رکھتے ہیں، مثلاً نقد اور اُدھار کے بھاؤ میں فرق رہتا ہے، تھوک

---

[۱] "حیدرآباد میں زرعی قرضداری" از ایس ایم بھروچہ، گورنمنٹ سنٹرل پریس، حیدرآباد دکن ۳۰ء صفحہ ۴۴

اور خردہ فروشی کا بھاؤ الگ ہوتا ہے، طویل اور کم مدت ادھار کے لئے قیمتیں الگ ہیں، اس طریقے سے بعض اشیا کی قیمتوں میں ۳۰، ۵۰ فیصد کا فرق ہو جاتا ہے۔

(۱۳) گاؤں کے مقامی بازاروں پر اپنا قبضہ رکھتے ہیں، باہر سے اگر کوئی آدمی مال خریدنے آئے تو بھاؤ بگاڑنے اپنا مال اس کو فروخت کرنے، یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، ایک مرتبہ کا زخم خوردہ دوبارہ گاؤں کا رخ نہیں کرتا اور بازار پر ان کا قبضہ بحال رہتا ہے۔

یہ چند اجاگر نقائص تھے، مگر ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی ان کے کاروبار میں موجود ہیں مثلاً حسابات میں اس طرح الٹ پھیر کرتے ہیں کہ کاشتکار کو نقصان ہوتا ہے، سادہ کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لیکر بعد میں اس میں زاید رقم درج کر لیتے ہیں۔ حساب کتاب میں ایسے ہندسے استعمال کرتے ہیں جن کو دوسرے نہ سمجھ سکیں، کبھی "گرہ کھلائی" کے نام سے کچھ رقم بطور تحفہ طلب کرتے ہیں، اپنے موکلوں سے مفت خدمت لیتے ہیں، ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ دودھ، دہی، مکھن، گھی، ایندھن، ترکاری یا اسی قسم کی دوسری چیزیں بلا معاوضہ مہیا کیا کریں۔

نقائص کو دور کرنے کی تدابیر ان مختلف خرابیوں نے کاشتکار، اور مجموعی حیثیت سے زراعت کو اس قدر تباہ کر دیا ہے کہ کاشتکار سال بھر محنت کرتا ہے مگر سال کے بڑے حصہ میں اس کو فاقہ یا نیم فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ نہ اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہیں اور نہ سلیقہ کا مکان، دوسری رسمی ضروریات کا تو ذکر ہی کیا۔ ساہوکاروں نے کاشتکاروں کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کیا، اور ان کو زرعی مزدور بنا دیا جب کوئی خرابی انتہائی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے خلاف جذبات مشتعل ہوتے اور ہنگامے اور فساد شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ ۱۸۵۵ء میں سنتال کا بلوہ، ۱۸۷۴ء میں دکن کا بلوہ، اور ۱۹۱۰ء میں اجمیر کا بلوہ اسی کی مثالیں ہیں، دکن کا بلوہ بہت شدید تھا، اور حکومت کو ۱۸۷۵ء میں اس کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ جس نے کاشتکاروں کے ہنگاموں کو حق بجانب قرار دیا، اسکی سفارشات پر ۱۸۷۹ء میں قانون امداد کاشتکاران دکن نافذ ہوا، مگر یہ صرف انتہائی صورتوں کی مثالیں تھیں مگر جب کچھ عرصہ سے مختلف کمیشنوں اور افراد نے زرعی حالات کی تحقیقات کی طرف توجہ شروع کی تو یہ تمام خرابیاں منظر عام پر آنے لگیں اور

اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ان کا انسداد کیا جائے۔

اصلاح کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو مروجہ طریقہ کو اڑا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا نیا طریقہ رائج کیا جائے جس میں یہ خرابیاں نہوں، یا پھر موجودہ طریقہ میں کچھ اصلاح کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ ساہوکاری طریق کو گوناگوں خرابیوں کے باوجود بالکل اڑایا نہیں جا سکتا، کیونکہ زراعت اس کے بل بوتے پر چل رہی ہے، کاشتکار بھینس ہے اور ساہوکار جونک، بھینس جانتی ہے کہ تالاب میں جونکیں ہیں جو پانی میں داخل ہوتے ہی لپٹ کر خون پینا شروع کر دیں گی مگر وہ تالاب کو چھوڑ نہیں سکتی اور جونکیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ اگر بھینس کو جونکوں سے محفوظ رکھنا ہے تو ایسے پختہ حوضوں کی تعمیر ضروری ہے جن میں جونکیں نہوں، یا اگر یہ ممکن نہو تو کم از کم ایسی دوائیں یا طریقے استعمال کئے جائیں جن کی وجہ سے جونکیں سست اور کمزور ہو جائیں تاکہ بھینسوں کو کم نقصان پہنچا سکیں، کاشتکار ساہوکاروں کی مکاریوں اور چالاکیوں سے واقف ہے مگر وہ مجبور ہے، اور کوئی ذریعہ اس کے سامنے نہیں اس لئے وہ ان ہی سے امداد حاصل کرتا ہے اگر اس کو ساہوکاروں کے پھندے سے نکالنا ہے تو ایسے اداروں کا قیام بہت ضروری ہے جو صحیح اصولوں پر ان کی مدد کر سکیں۔ مگر ملک میں حسب پیمانہ پر ان نئے اداروں کی ضرورت ہے ان کا قیام فی الوقت ممکن معلوم نہیں ہوتا، اب دوسری صورت یہی رہجاتی ہے کہ مروجہ طریقہ کے نقائص اور خرابیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کی جائے، ریاست حیدرآباد کے پیش نظر پہلی صورت ہے دوسری صورت کو وہ اختیار کر چکی ہے۔ ۶ رجون ۳۸ء کو تین دستورالعمل یعنی مصالحت قرضہ، قرض دہندگان اور انتقال اراضی نافذ ہو چکے ہیں۔

دستورالعمل مصالحت قرضہ کا مقصد کاشتکاروں کو سودی اور قدیم قرضہ سے نجات دلانا ہے، کیونکہ اس کا بار اتنا سخت ہے کہ موجودہ حالات میں اس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا، اور تاوقتیکہ یہ بار کم نہو آئندہ ترقی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اس قانون کی رو سے ایسی کمیٹیوں کی تشکیل ہوگی جو قرضہ کی مصالحت کرائینگی ان کا صدر سرکاری آدمی ہوگا اور اسکے علاوہ دو یا زائد نامزد شدہ اشخاص ہوں گے، جو قرضدار یا قرض خواہ اپنے قرضہ کا تصفیہ کرانا چاہے گا اس کو کمیٹی کے سامنے ایک درخواست پیش کرنا ہوگی،

درخواست پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں، درخواست کنندوں کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے یا اس کا قرض وصول نہیں ہو رہا، نیز قرضہ کی تاریخ، اصل، شرح سود، اپنے اثاثوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات بھی درج کرنا ہوگی، مصالحت قرضہ کی درخواست صرف ایسے کاشتکار دے سکیں گے جن کی سالانہ مالگذاری ۵۰۰ روپیہ یا اس سے کم ہو، کمیٹی فریقین کی شہادتیں سننے کے بعد اس رقم کا تعین کرے گی جو قرضدار کو ادا کرنا ہے، نیز دوران ادائی میں شرح سود کا بھی تعین کرے گی، اگر کوئی کاشتکار تصفیہ شدہ قرضہ کو ادا کرنے میں تساہل سے کام لے تو رقم مذکور اس سے مالگذاری کی باقیات کی صورت میں وصول کی جائے گی۔

قرض دہندگان کا دستور العمل صوبہ مدارس، اور برار و متوسط کے قوانین کو پیش نظر رکھکر بنایا گیا ہے ۱۳۴۳ف میں یہ قانون بطور امتحان اضلاع اورنگ آباد و عثمان آباد میں نافذ کیا گیا، وہاں اس کے نتائج بڑے اچھے رہے، اور اب اس کو پوری ریاست میں نافذ کر دیا گیا ہے۔

اس قانون کی رو سے ساہوکاروں پر حسب ذیل پابندیاں عاید کی گئیں ہیں۔

(۱) ساہوکاروں کے لئے رجسٹری کرانا اور اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۲) عطا شدہ اجازت نامہ صرف ایک ضلع کے لئے کارآمد ہوگا، اگر کاروبار کئی اضلاع میں ہو تو ہر ضلع کے لئے علیحدہ علیحدہ اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کی فیس ۱۰ روپیہ ہوگی، ۴ سال کے بعد اس کی تجدید لازمی ہے۔

(۳) حسابات کے اندراجات میں وہی ہندسے استعمال کئے جائیں جو استعمال کردہ زبان میں معمولی طور پر مستعمل ہوں۔

(۴) صحیح شرح سود کا اندراج۔

(۵) قرضہ کی ادائی جو بشکل جنس ہوتی ہو اس کی قیمت، نیز مد اصل، سود، محسوب کردہ رقم کی مقدار الگ الگ بتانا پڑے گی۔

(۶) ہر سال فرد حساب وقت ذیل کے ایک ماہ کے اندر اندر قرض دار کے پاس بھیج دی جائیگی۔

نقد حساب کے لئے — دیوالی

حسابات غلہ کے لئے — ویساکھ بدی

(۷) ہر فرد حساب کے دو پرت ہوں گے، ایک قرضدار کے پاس، دوسرا قرض دہندہ کے پاس رہیگا

(۸) ہر قرض دہندہ کو ایک مجوزہ رجسٹر رکھنا پڑے گا۔[۵]

اس قانون کی رو سے زیادہ سے زیادہ شرح سود کا تعین بھی ہوگیا ہے، یعنی کفالتی قرضوں پر ۹ فیصد اور غیر کفالتی قرضوں پر ۱۲ فیصد سے زاید سود وصول نہ ہوگا، نیز سود مرکب بھی وصول نہ کیا جاسکے گا۔

[۵] نمونہ رجسٹر

تاریخ	دیون کی جانب سے قرضہ کی بابت جو ادائی عمل میں آئی ہو اس کے متعلق کیفیت کہ ادائی بشکل جنس عمل میں آئی ہے یا نقد (الفاظ میں)	جمع: اعداد ادائی		ادا شدہ رقم کا کل محسوب		کیفیت	خرچ: تاریخ	قرضہ کی کیفیت (الفاظ میں) آیا نقد دیا گیا یا بشکل جنس	اعداد قرضہ		شرح سود	مقدار سود عائد شدہ	کیفیت
		بشکل نقد	بشکل جنس صراحت تعداد و وزن	زر اصل میں	سود میں				بشکل نقد	بشکل جنس بصراحت تعداد و وزن			

بابت زر اصل ——— بابتہ سود ——— بقایا بر آمدہ شدہ بتاریخ ۱۳ سنہ ف

میزان اختتامی ——— جملہ ——— دستخط دائن یا مختار

نوٹ:- اس رجسٹر میں اگر "غرض قرضہ" کا ایک خانہ بڑھا دیا جائے تو معلوم ہوسکے گا کہ کاشتکار نے کس کام کیلئے قرض لیا اس سے مختلف زرعی اغراض کے قرضہ کا اندازہ ہوسکے گا، پیدا آور و غیر پیدا آور قرضہ کا فرق معلوم ہوسکے گا نیز یہ بھی معلوم ہوسکے گا کہ کیا غیر پیدا آور قرضے آسانی سے ادا ہورہے ہیں۔ مضمون نگار

انتقال اراضی کے دستور العمل کا مقصد کاشتکاروں کی زمینوں کو ساہوکاروں کے قبضے اور ملکیت میں جانے سے روکنا ہے، ۲۱۲ مواضعات میں کتنی زمین مکفول اور منتقل ہو چکی ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس قانون کی رو سے وہ تمام قومیں جو بالعموم زراعت کرتی ہیں " محفوظ اقوام زراعت پیشہ " کی تعریف میں داخل کی گئیں ہیں۔ قانون میں تشریح کی گئی ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں، آدمی ہندوؤں، اقوام وحشی، اور انڈین دیسی عیسائیوں میں کون کون سی ذاتیں یا فرقے اقوام محفوظہ میں شامل ہوں گے۔ مگر یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ان اقوام کے صرف وہی لوگ محفوظ متصور ہوں گے جو بحیثیت پٹہ دار، شکمی دار یا قابض اراضی یا مالکانہ ایسی زمین پر کاشت کرتے یا قابض ہوں جس کی مالگذاری ۵۰۰ روپیہ سال سے زائد نہ ہو، جو لوگ اس سے زائد مالگذاری ادا کرتے ہیں محفوظ نہیں ہیں، البتہ اگر کسی وجہ سے ان کے محاصل میں کمی ہو کر اس مقدار میں آ جائے تو وہ بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ اس قانون کی رو سے حسب ذیل پابندیاں لگائی گئیں ہیں۔

۱۔ کسی محفوظہ اقوام کے کسی فرد کی اراضی کا دوامی انتقال کسی غیر محفوظہ گروہ کے فرد کو تعلقہ دار ضلع کی منظوری کے بغیر نہ ہو سکے گا۔

۲۔ جو اراضی رہن کی جائیگی اس کی مدت ہر صورت میں مع توسیعات ۲۰ سال سے زائد نہ ہوگی۔

۳۔ جبتک اراضی مرتہن کے قبضہ میں ہو اور وہ زر لگان وصول کرتا رہے زر رہن پر کوئی سود واجب الادا نہ ہوگا۔

۴۔ راہن مدت رہن کے اندر ہر وقت زر رہن ادا کر کے فک رہن کرا سکے گا۔

۵۔ محفوظہ اقوام کا کوئی شخص اپنی زمین " قول " (کاشت کیلئے دوسرے کو دینا) پر دینا چاہے تو اسکی مدت ۲۰ سال سے زائد نہ ہوگی۔

۶۔ محفوظہ اقوام کے کسی رکن کی اراضی ڈگری، یا حکم عدالت دیوانی، یا سررشتہ مال کی تعمیل میں فروخت نہ کی جا سکے گی اور ۲۰ سال سے زائد مدت پر قول کیلئے دی جا سکے گی۔

آئندہ سے رہن بالوفا کی شرط کالعدم قرار دی گئی، نیز اگر کوئی ایسا دوامی انتقال بلا منظوری کیا جائے جس کے لئے منظوری حاصل کرنا لازمی ہو، تو اس کی شکل رہن بالقبض کی ہوتی جس کی مدت ۲۰ سال سے زائد نہ ہوگی اس قانون کی رو سے تعلقدار کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ ایسے رہن ناموں میں ترمیم کر سکے

جو قانون کے مطابق نہوں۔

یہ قوانین جن مقاصد کو پیش نظر رکھکر وضع کئے گئے ہیں اور ان سے جن خرابیوں کا انسداد اور جن فوائد کی توقع ہے انکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، حکومت حیدرآباد تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے زرعی اصلاح کے لئے ایک منظم قدم اٹھایا مگر کسی خرابی کے متعلق قانون بناکر یہ سمجھ لینا کہ کلیتہً اسکا انسداد ہوگیا صحیح نہیں ہوسکتا، دنیا اس معیاری اخلاق سے ابھی بہت دور ہے، حقائق و مشاہدات کو نظرانداز کردینا ایک نقاد کا کام نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا مقصد کاشتکاروں کی امداد اور ان کو ساہوکاروں کے ظلم و ستم سے بچانا ہے، مگر جب تک کاشتکاروں کی حالت سقیم ہے اور ساہوکاروں کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے اس وقت تک نہ تو قرضہ لینے سے روکا جاسکتا ہے اور نہ ساہوکار کی من مانی شرائط کا انسداد کیا جاسکتا ہے، ساہوکار قانونی گرفت سے بچنے کے لئے مختلف ترکیبیں ڈھونڈ سکتے ہیں، اور کاشتکار اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر ان کو تسلیم کرسکتے ہیں۔ مثلاً وہ کاشتکار سے وہی قدیم اعلیٰ شرح سود وصول کریں، رجسٹر میں سرکاری شرح درج کریں باقی سود زر اصل میں شامل کردیں، یا ایک زمین جس کی مدت رہن ۲۰ سال ہوچکی ہو اسکو ایک نئے رہن نامہ کی صورت میں اپنے کسی عزیز کے نام منتقل کردیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں قانون یا حکومت کچھ نہیں کرسکتی، نیز کسی قانون کی صحیح خامیوں کا اندازہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کو نافذ ہوئے کچھ عرصہ نہ گذر گیا ہو، اس لئے اب جبکہ قوانین کو نافذ ہوئے چھ ماہ کے قریب ہورہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ حکومت کی جانب سے ایسی تحقیقات عمل میں لائی جائیں جن سے معلوم ہوسکے کہ کاشتکاروں کو ان سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے، اور حکومت کا حقیقی منشا کس حد تک پورا ہورہا ہے۔

یہودیوں کا مستقبل

(از خواجہ احمد صاحب فاروقی، بی اے)

نازیت نے یہودیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک برتا ہے وہ تاریخ حاضرہ کی ایک بڑی المناک داستان ہے۔ ہروان راتھ کے قتل کی پاداش میں اس جور و ظلم میں اور اضافہ ہو گیا ڈاکٹر گائبلس کی ایک جنبش قلم سے چودہ ہزار یہودی گرفتار کر لیے گئے، ان کے تمام معابد، مدارس، تھیٹر، سینما اور رقص گاہیں بند کر دی گئیں، ان کی دکانیں لوٹ لی گئیں اور ٹیکسوں کی بھرمار سے ان کے اوپر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اور جب امریکہ اور انگلستان نے جرمنی کے اس سفاکانہ اور بے رحمانہ طرز عمل پر آواز بلند کی تو ریش (Reich) نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں امید ہے کہ دنیا اس یہودنوازی سے باز آئے گی، اگر اپنی خاطر نہیں تو کم از کم ان یہودیوں کی خاطر، جو ابھی جرمنی کی سرزمین میں زندہ سلامت ہیں۔

آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر نازی دیوتا اپنے ناخن و چنگال کو یہودیوں کے خون سے رنگین کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا وجوہات ہیں جنھوں نے یہودیوں کی موجودگی ریش کے لئے ناگوار اور قابل نفرت بنا دی ہے۔ یہ سوالات اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

تمام دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ یہودی آباد ہیں اور ان میں سے تقریباً دو تہائی روس، پولینڈ، رومانیہ اور جنوبی مشرقی یورپ میں بستے ہیں۔ جرمنی اور آسٹریا میں بھی یہود دشمنی شروع ہونے سے قبل دس لاکھ کے قریب یہودی آباد تھے۔ برطانیہ عظمیٰ میں یہودیوں کی تعداد ۳ ½ لاکھ سے زائد ہے اور ممالک متحدہ میں ان کی آبادی تقریباً ۳ لاکھ ہے لیکن وہاں کی سوسائٹی کے لئے وہ بالکل بھی خطرہ کا سبب نہیں سمجھے جاتے۔ یورپ کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جس کا سبب ان کی گذشتہ تاریخ میں پوشیدہ ہے۔ ان کی وضع اور ان کی ذہنیت بھی دوسرے باشندوں سے مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں یہودیوں کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہے لیکن جرمنی میں ان کا معاملہ

اس قدر نازک نہ ہونا چاہیئے تھا جہاں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اور جہاں کی قومی اور سیاسی زندگی میں انھوں نے نمایاں اور قابل وقعت حصہ لیا ہے۔ اسی طرح اسٹریا میں بھی ان کے معاملات پیچیدہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ نازی تسخیر سے پہلے اسٹریا میں یہودی باہمی اشتراک اور امن و آشتی کی زندگی گذار رہے تھے۔

جرمنی کی یہودیوں سے منافرت حسب ذیل اسباب پر مبنی ہے :-

ہٹلر ایسی حکومت مطلقہ قائم کرنا چاہتا ہے جو لوگوں کے ذہن و ضمیر خیالات اور حسیات پر بھی قابو حاصل کئے ہو۔ ان کے دماغ اور جسم دونوں حکومت کے اشارہ پر مستعد ہوں لیکن یہودی اگر کسی کے آگے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ سرنگون ہو سکتے ہیں تو وہ صرف ان کا مذہب ہے۔ ان کے امیال و عواطف، جذبات اور وجدان صرف موسیٰ ہی کی تعلیم کے تابع ہو سکتے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یہ گویا نازیت اور یہودیت کا بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان خلیج دن بدن وسیع ہوتی جاتی ہے۔

دوسرے ہٹلر کا یہ ایمان اور راسخ عقیدہ ہے کہ جرمن خالص آرین قوم ہیں اور ان میں غیر آریہ کی آمیزش ان کی تمام بلند خصوصیات کو تباہ کر لینے کے مترادف ہے، اس لئے وہ یہودیوں سے اختلاط اور میل جول قطعاً نہیں چاہتا۔ ہٹلر کی کوئی دلیل اس سے زیادہ حماقت مآب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جرمن اور یہودی دونوں مخلوط اقوام سے متعلق ہیں لیکن بعض وقت حماقت بھی اہم اور قابل غور ہو جاتی ہے خصوصاً اس وقت جبکہ کوئی ڈکٹیٹر اسے "جزو ایمان" بنا لے۔

ہٹلر بحیثیت آمر جرمنی کے مجمع کی نفسیات سے خوب واقف ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجمع کو اکسانے کے لئے کوئی چیز ہدف ملامت ہونا چاہیئے اسی وجہ سے اس نے ملک کی تمام خرابیوں اور برائیوں کی ذمہ داری دو چیزوں پر رکھ دی ہے۔ ایک اشتراکیت پر دوسری یہودیوں پر۔ یہودی ملک میں بڑی معزز جگہوں پر فائز تھے۔ یہ بات جرمنوں کو ناگوار تھی لیکن سب سے بڑی ناگواری کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے یہودیوں کے مقروض تھے، ان وجوہات کی بنا پر

نازیوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو چیز جرمن قومیت کی اندر ہی اندر جڑ کاٹ رہی ہے وہ یہودیوں کی قوم ہے اور جب تک اس مسموم عضو کو دور نہیں کیا جائے گا ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

ہٹلر کو بین الاقوامیت سے نفرت ہے وہ اشتراکیت قومی کا قائل ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ جرمنوں کے لئے جرمنی ہی ابتدا ہو اور انتہا۔ وہ کسی پر تکیہ نہ کرے اور خود اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ لیکن یہ اصول یہودیوں کی ذہنیت سے متصادم ہوتا ہے۔ یہودی طبعاً بین الاقوامی ہیں ان کی تجارت دولت اور ثروت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دلائل یہود دشمنی کے جواز کے لئے زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن جرمنی کی زود اعتقاد دنیا اسی منطق سے ہانکی جا رہی ہے۔ یہ طے ہے کہ نازیت اپنے آپ کو یہودیوں کے مطابق نہیں کر سکتی اور نہ یہودی ہی فطرتاً اپنے آپ کو نازیت کے مطابق کر سکتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں میں کسی قسم کی مصالحت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ہر دو اقوام میں سوائے منافرت کے اور کوئی غرض مشترک ہے ہی نہیں؟

بالفور اعلان سے بہت سے یہودیوں کی توقعات وابستہ تھیں اور انہیں امید ہو چلی تھی کہ شاید ان کا مستقبل درخشان ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ کچھ ایسے بھی یہودی تھے جنھوں نے رائل کمیشن کی سفارشات کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تقسیم فلسطین ان کے درد کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ ہر یہودی کے لئے اپنی برسوں کی جگہ چھوڑنا اور وہاں جا کر بسنا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس طریقہ سے ان حکومتوں کو اپنی طرف سے مشکوک کر لینا ہے جن کے سایۂ عاطفت میں وہ عرصہ سے رہتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ حکومتیں ہر وقت یہ سمجھیں گی کہ یہ لوگ جب چاہیں گے ہجرت کر دیں گے اور ان لوگوں کی ہمدردی بھی فلسطین اور اس ملک کے درمیان ہی رہے گی۔ اس لئے انھوں نے یہی سوچا کہ یہودیوں کے لئے بجائے ایک حکومت کے ہو کر رہنے کے یہی اچھا ہے کہ وہ متعدد حکومتوں کے وفادار ہو کر رہیں اور بجائے "قوم" بننے کے "فرقہ" ہی بنے رہیں، اس لئے کہ پہلی صورت خطرہ اور اندیشہ سے خالی نہیں، اور اس میں طرح طرح کی عملی دشواریاں بھی ہیں اس کے علاوہ انھیں یہ بھی خیال

تھا کہ فلسطین میں کوئی یہودی حکومت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی دوسری بڑی حکومت اس کے سہارے کے لئے نہ ہو۔ اور یہ امداد دوسری حکومتوں کی نگاہ میں کھٹکے گی اس لئے کہ ان کی یہودی رعایا کی ہمدردیاں اس "محافظ" حکومت کے ساتھ ہو جاویں گی، اس کے علاوہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ تمام دنیا کے ا۱/۲ کروڑ یہودی فلسطین کی اسی چھوٹی سی ریاست میں جا کر بس جاویں جو ان کے لئے کبھی کافی نہیں ہو سکتی۔

لیکن باوجود اس کے بالفور کا اعلان ہوتے ہی ہزاروں یہودی فلسطین پہنچ گئے اور اسے اپنا وطن بنا لیا۔ یہودی مہاجرین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ عرب اکثریت کو ان سے خطرہ محسوس ہونے لگا اور انھوں نے بجا طور پر ان کی آمد اور سکونت پر احتجاج کیا لیکن یہودی جن کے پاس اثر بھی تھا اور دولت بھی برابر آتے رہے۔ زراعت کے لئے زمین خریدتے رہے اور رہائش اختیار کرتے رہے انھوں نے یروشلم میں ایک یونیورسٹی تعمیر کی اسے نئے سازوسامان اور جدید آلات سے آراستہ کیا اور سائنٹفک ذرائع سے فلسطین کے مادی وسائل میں اضافہ کر دیا لیکن یہ جو کچھ کیا گیا وہ غریب عربوں کے حقوق غصب کر کے کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بقول راغب بے فلسطین میں ایک عرب بھی ایسا نہیں ہے جو بالفور کے اعلان کی مخالفت کرنے کے لئے اپنی جان سے دریغ کرے۔

برطانیہ فلسطین میں ہوائی مستقر بنانا چاہتی ہے اس لئے اسے ہمدرد، یہودیوں کی آمد ناگوار نہیں ہوئی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عرب بغاوت پر آمادہ ہو گئے جو اب بھی باوجود بالفور اعلان کے مسترد ہو جانے کے جاری ہے۔ برطانیہ کے سامنے بڑی دقتیں ہیں۔ حبش کی فتح سے اطالیہ کے وسائل میں اضافہ ہو گیا ہے اور بحر روم میں اس کا اقتدار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور اب فرینکو کی فتح سے اس کے امکانات اور بھی قوی ہیں، مسولینی بحر روم کے مشرقی علاقوں میں برطانیہ کے لئے دقتیں پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ فلسطین کے عربوں کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے متنفر کر دیا جائے تاکہ اسے اپنے قدم جمانے کا موقع ملے اس کی عرب نوازی پالیسی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی پر امریکہ اور برطانیہ کے یہودیوں کا اثر بہت کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ لیبر پارٹی

کے بیشتر افراد عربوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ میجر اٹلی (—————) لیبر پارٹی کے لیڈر عربوں کے سخت مخالف ہیں لیکن باوجود اس کے برطانیہ نے کوئی فیصلہ کن پالیسی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ یہودیوں کو بھی رکھنا چاہتی ہے اور عربوں کو بھی خفا کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے اس نے یہودیوں کے "قومی وطن" کے قیام میں کافی پابندیاں عائد کیں، ان کے داخلہ کی تعداد معین کر دی، اس کے بعد تقسیم ملکی کے ذریعہ ان کی جائے سکونت کو محدود کرنا چاہا۔ لیکن عربوں کی مخالفت بدستور جاری رہی۔ اور وہ اعلان بلفور کی منسوخی پر تلے رہے۔ آخرکار ۱۰ نومبر کو پارلیمان برطانیہ نے اسے مسترد کر دیا اور ووڈہیڈ کمیشن کی سفارشات کو منظور کر لیا گیا لیکن لندن کانفرنس جو حال میں منعقد ہونے والی ہے اس کی کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہا جاتا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ہنوز طے ہونے کے لئے باقی ہے۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے ان کے قومی وطن کا تخیل اگر بروئے کار آ بھی جائے تو ان کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جگہ کی تنگی کا سوال بدستور باقی رہتا ہے پھر یہ کچھ معقول بات نہیں معلوم ہوتی کہ تمام یہودیوں کو ان ملکوں سے کھدیڑ کر جہاں کہ وہ برسوں سے وفاشعاری کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ فلسطین میں بھر دیا جائے اور تمام دنیا کے دروازے ان کے اوپر بند کر دئے جائیں۔

اسٹریا کے وہ یہودی جن کو ہر جرمنی نے ان کی آن میں نکال باہر کیا، ان کی آہ و بکا ڈینوب کے ساحل پر ایک عالم نے سنی لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اقوام یورپ ایک عرصہ سے یہودیوں کے مسئلہ پر غور کر رہی تھیں لیکن (EVIAN) کانفرنس کا بھی نشستند گفتند و برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ زبانی جمع خرچ اور "ریزولیشن" فرمائی" ایک عرصہ سے جاری ہے اور اب مدانتھ کے قتل کے جرم میں جو وحشیانہ سلوک یہودیوں کے ساتھ برتا گیا ہے اس کے اوپر رزوولٹ (—————) سے لیکر زیلینڈ تک ہر شخص آتش بدامن نظر آتا ہے لیکن اس سے ہٹلر کے طرز عمل میں ذرہ برابر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ مکے کا جواب مکے سے دینے کے لئے آمادہ ہے اور نازی پریس اس کی ہمنوائی کے لئے موجود ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ممالک اگر یہودیوں کے ساتھ رحم کر سکتے ہیں تو کریں اور انھیں بھر لیں ورنہ یوں ہی رہنے دیں، یورپ کے ممالک ان مظلومین سے اظہار ہمدردی تو کرتے ہیں لیکن ان بے روزگاروں کو اپنے ملک

میں گھساتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا ان کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہو جائے۔ ابھی تک صرف انگلستان اور
ہالینڈ دو ملک ایسے ہیں جنھوں نے انھیں جائے پناہ دی ہے اور ان کی مشکلات رفع کرنے کی کوشش
کی ہے انگلستان میں ۱۹۳۳ء سے لے کر اب تک گیارہ ہزار یہودی داخل کئے جا چکے ہیں اور ان کی رہائش
کا بندوبست برطانوی مستعمرات میں کیا جا رہا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کی یہ بھی کوشش ہے کہ کسی طرح جرمنی کے تمام یہودیوں
کو جائے پناہ مل جائے لیکن یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسرے ملک تھوڑی سی
قربانی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہودیوں کا اگر کوئی فلسطین کے علاوہ دوسرا قومی وطن بن سکتا ہے تو وہ
سلطنت برطانیہ یا جنوبی امریکہ میں ممکن ہے لیکن یہ تجربہ بھی اگر کیا گیا تو فلسطین کی طرح ناکامیاب رہے گا اس لئے
کہ وہی دقتیں وہاں بھی پیش آئیں گی کوئی رہتی ہوئی قوم کسی "غیر" کی مداخلت اور شرکت آسانی سے قبول نہیں
کرے گی۔

یہودی شاید دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم قوم ہے۔ جور وظلم کی برداشت نے ان کے اندر
محنت کا مادہ پیدا کر دیا ہے اور مستقبل کی تلخیوں کے خیال نے ان میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کر دی
ہے۔ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے اور علمیت کی بھی کمی نہیں۔ ان کی قوم کے بہت سے اشخاص دنیا
کے ممتاز ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں اس لئے شاید اگر کوئی ملک انھیں داخل کرنے پر آمادہ ہو اور
وہ وہاں وفاشعار باشندوں کی حیثیت سے رہنے پر راضی ہوں تو وہ حکومت یا ملک خسارہ میں نہیں رہ
سکتا۔

یہودیوں کے سامنے اب صرف دو صورتیں ہیں:۔ یا تو وہ اپنی ایک علیحدہ قومی حکومت قائم کریں
اور اپنی بقا کی وہی کوشش کریں جو دوسری حکومتیں کرتی ہیں یا پھر دوسرے ملکوں کے وفاشعار باشندے ہو کر
رہیں۔ پہلی صورت کے ناممکن العمل ہونے پر جو صیہونیت کے مطالبہ کو پورا کرتی ہے اوپر
صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اب رہی دوسری صورت وہ یقیناً مناسب اور معقول ہے یہودیوں نے
ازل زمانہ میں یہی راستہ اختیار کیا تھا اور اب بھی ان کے لئے یہی راستہ

خطرہ سے خالی اور صاف نظر آتا ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ فلسطین کو بجائے سیاسی امیدوں کا
آماجگاہ بنانے کے اپنا مقدس مذہبی مرکز بنائیں جیسا کہ وہ اسے صدیوں سے سمجھتے آئے ہیں۔ اب رہی وہ بڑی
آبادی جو بعض ملکوں میں صدیوں سے ظلم وستم کا شکار ہو رہی ہے اور آج بھی حقارت کی نگہ سے دیکھی جاتی ہے اسے
چاہیئے کہ اقوام متعلقہ کے مشورہ سے ان ملکوں سے اٹھا کر دوسرے ملکوں میں بانٹ دیا جائے جہاں کہ وہ
جاں نثار باشندوں کی حیثیت سے رہیں اور دوسرے یہودیوں سے جو چیز ان کا رشتہ قائم کرنے والی ہو وہ
سیاسی غرض نہ ہو بلکہ مذہب ہو جس کو آج تک انھوں نے اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے۔

تعلیمی دُنیا

(از جناب عبد الغفور صاحب ایم اے (علیگ))

ٹریننگ اسکول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گذشتہ ایام میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی صدارت کے فرائض انجام دینے واردھا تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ٹریننگ اسکول واردھا کے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں انھیں استاد کے فرائض سے آگاہ کیا ممکن ہے جو مشکلات آپ کو دیہی علاقوں میں کام کرتے ہوئے پیش آئیں آپ کو گھبرا دیں گاؤں کی گندگی۔ جہالت۔ بیماریاں۔ غربت۔ افلاس اور نکبت کس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہ دے گی، مگر آپ کا سچا امتحان وہی ہوگا۔ اگر باوجود ان مصیبتوں کے آپ اپنے مشن میں لگے رہے تو ایک دن فتح اور کامیابی آپ کے قدموں کو چوم لے گی۔ اگر بچوں کی تربیت کرتے ہوئے آپ والدین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیں گے تو میں کہوں گا کہ آپ کا بلند مقصد مکمل نہیں ہو سکا۔ میری دلی خواہش یہ ہے کہ جتنی جلد ہو سکے آپ اپنے گاؤں کے سچے خادم بن جائیں۔ آپ کی مخالفت بھی کی جائے گی۔ تاہم آپ کو اپنا مقدس کام صبر آزما حالات میں چلاتے رہنا ہوگا

"استاد کو دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو اس بات سے مکدر نہ ہونا چاہیئے کہ بچہ جلد جلد سبق یاد نہیں کرتا۔ نہ ہی آپ کی یہ خواہش ہونا چاہیئے کہ بچہ آپ کی غلامانہ پیروی کرے۔ تمام بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔ ایک اچھا استاد وہی ہے۔ جو بچے کی شخصیت کی عزت کرتا ہے۔ جسے پورا یقین ہے کہ ہر بچے میں کچھ انجانی خوبیاں ہوتی ہیں جو شاید کسی نہ کسی دن ظاہر ہو جائیں اور ملک میں غیر متوقع بھلائی کا موجب بن جائیں۔ اگر ایک باغبان گلاب کی جگہ سورج مکھی کا پودا لگا دے تو وہ ناقابل معافی غلطی کرتا ہے۔ ایک اچھے باغبان کے دل میں ہر پودے اور ہر پھول کے لئے خاص جگہ ہے۔ وہ ہر پودے کی محبت بھرے دل سے آبیاری کرتا ہے ہر پودے کے لئے اس کی یہی کوشش ہے کہ وہ رنگین تر پھول پیدا کرے۔

" اسے اس قدرتی اصول کا اچھی طرح پتہ ہے کہ مختلف قسم کے پودے مختلف پھول دیتے ہیں۔ اور باغ کی رونق ان کے تنوع اور رنگوں کی دلفریب تبدیلی سے ہی ہے۔

پس ایک اچھا استاد بچے کی عزت کرے گا۔ اس کی شخصیت کا خاص لحاظ رکھے گا۔ کیونکہ اسے پورا یقین ہے کہ بچے کی شخصیت کی مکمل اٹھان میں ہی زندگی کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔[1]

مرکزی تعلیمی بورڈ دہلی | مرکزی تعلیمی بورڈ دہلی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق ایک سب کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی تھے۔ بورڈ نے کمیٹی کی رپورٹ کو منظور کرلیا ہے کھیر کمیٹی نے واردھا اسکیم کے بنیادی اور جزوی اصول کو مان لیا ہے۔ بورڈ نے اس پر اثبات کرتے ہوئے ایک طرفہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ یہ اسکیم وڈ۔ ایبٹ رپورٹ سے ملتی جلتی ہے لہٰذا اس کی تائید ہونا چاہئے ہمیں ڈر ہے کہ بورڈ کے ممبروں نے شاید دونوں رپورٹوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ وڈ ایبٹ کی محکمانہ سفارشات کو واردھا رپورٹ سے وہی نسبت ہے جو اعلان آزادی کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے۔

تعلیمی سنگھ کا اجلاس | تعلیمی سنگھ کا ششماہی اجلاس نومبر کے آخر میں واردھا میں ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ سکریٹری نے رپورٹ میں بتلایا کہ اب تک اسکیم کے ماتحت پانچ مرکز کھولے گئے ہیں۔ جامعہ ملیہ، واردھا، پٹنہ، بنارس اور سری نگر کشمیر۔ سنگھ کی علمی کارگزاریوں کے سلسلہ میں انھوں نے بیان کیا کہ اساتذہ کی ہینڈ بک چھپنے کو ہیں اور تین بنیادی حرفتوں کے متعلق رسالے بھی تیار ہو چکے ہیں۔

"نئی تعلیم" | نئی تعلیم کے نام سے یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو ایک تعلیمی ماہنامہ کا آغاز ہو جائے گا جس کا اردو ایڈیشن جامعہ سے اور ہندی ایڈیشن واردھا سے چھپا کرے گا۔

صوبوں کی حکومتیں اور واردھا اسکیم | سی پی کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ انکے یہاں واردھا اسکیم سب سے جلد اور سب سے بڑے پیمانہ پہ جاری ہوگی فی الحال اس اسکیم کے ماتحت سو ایک استاد والے مدرسے کھولے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے اساتذہ واردھا ٹریننگ مرکز میں نئی تعلیم کے بنیادی حرفوں اور اصولوں کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

اس سال محکمہ تعلیم کے انسپکٹر اور دوسرے افسروں کو بھی یہی تربیت دی جائے گی اور اس طریق پر ایک قلیل مدت میں پورے محکمے میں نئی تعلیم کی روح پھونک دی جائے گی۔ حکومت آسام نے بھی اپنے تعلیمی افسروں کو نئی تربیت دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

واردھا اسکیم کی عام مقبولیت کا پتہ ایک تجویز سے چلتا ہے جو پچھلے دنوں یو۔ پی تان گریجویٹ تعلیمی افسروں کی

انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ فتح گڈھ میں منظور کی انجمن نے نئی تعلیم کا پرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنی طرف سے بنیادی حرفتوں کے لئے ایک منضبط نصاب تیار کرے گی۔ اس کام کے لئے پانچ اساتذہ نے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں۔

اردو ہندی | ۱۸ دسمبر کو اردو ڈے ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا۔ الہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو نے صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے زبان کے جھگڑے کا بہت دکھ بھرے دل کے ساتھ تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اردو کے متعلق تین چار سال سے جو روییہ لوگوں نے اختیار کر لیا ہے اس سے مجھے انتہائی تکلیف اور رنج ہے ہندوؤں کا اردو کی اٹھان میں بڑا حصہ ہے۔ اردو ایک غیر منقسمہ جائداد ہے اور اگر ہندو اردو کو تباہ کر رہے ہیں تو وہ اپنی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں آخر میں انھوں نے تنبیہ کی کہ زبان کے جھگڑے کی وجہ سے قومیں اور سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔ قوم کا سب سے گرانقدر ورثہ اس کی زبان اور تمدن ہے اگر زبان تباہ ہو گئی تو قومی زندگی سے بھی ہاتھ دھولینا چاہئے۔

اردو ہندی کی بحث میں ریورنڈ سی ایف اینڈ ریوز نے ایک شاخسانہ اٹھایا ہے اور وہ جنوبی ہند کی زبانوں کا ہے جو دراوڑی اصل سے ہیں۔ الہ آباد میں تقریر فرماتے ہوئے آپ نے کہا ہندوستان کی عام زبان ٹکسالی سکہ ہونا چاہیئے جس سے بوقت ضرورت ہر جگہ کام لیا جا سکے یہ ہر جگہ روزمرہ استعمال کی چیز تو نہیں ہو سکتی جنوبی ہند میں ہندوستان کے خلاف جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ اس لئے شمالی ہند کو چاہیے کہ ہندوستانی لغت کی تدوین میں جنوبی زبانوں کا خاص لحاظ رکھے اور بعض عام الفاظ ان زبانوں سے بھی اس کی لغت میں شامل ہونا چاہئیں۔

ہندی کانفرنس راجی نے تجویز منظور کی ہے کہ تمام ہندی بولنے والے صوبوں کو ایک کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں پر سیاسی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارا نفس ایک زہریلی تعصب کی فضا میں جاری ہے۔ اور ہمارے کانوں میں سیاسی نعروں کے سوا عقل و انصاف کی مدھم مگر صاف آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

دیہی علاقوں میں یونیورسٹی کی توسیع

مسٹر محمد امام صاحب نے میسور یونیورسٹی کی سینیٹ میں ایک تجویز پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ یونیورسٹی کی طرف سے

سے دیہی علاقے میں ایک نوآبادی قائم کی جائے۔ اس نوآبادی میں طلبا رہیں گے اور دہ دیہات کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا محض علم کے محفوظ مینار سے ہی مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ مردانہ وار غربت جہالت اور بیکسی کے اس سمندر میں کود پڑیں گے جس میں ہندوستان کے گاؤں اور ان کی معاشی زندگی بھی چلی جارہی ہے مغربی ممالک میں تعلیمی نوآبادی کی تحریک پچھلی صدی سے جاری ہے۔ اوکسفورڈ۔ اور برمنگھم اور مانچسٹر وغیرہ میں اس قسم کے ادارے مخلص قومی کارکنوں نے قائم کئے تھے جو آج بھی کامیابی سے چل رہے ہیں۔

میسور یونیورسٹی کی طرف سے ایک اور تجویز بھی انٹر یونیورسٹی بورڈ میں پیش کی جانے والی ہے جس کی رو سے مادری زبان ابتدائی درجے سے لے کر کالج تک ذریعہ تعلیم قرار دی جائے گی انٹر یونیورسٹی بورڈ ایک حد تک بہت اعتدال پسند ادارہ ہے اور اس کے سکریٹری نے پچھلے سال آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعہ پر اسی تجویز کی بیحد مخالفت کی تھی۔ ان کے بھاری بھرکم گربھونڈے دلائل کے باوجود یہ تجویز کانفرنس کے ہر جلسے میں برابر منظور ہوتی چلی آئی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اب یہ کفر والحاد کا سیلاب جو ان کے محفوظ "نشیمن" کے دروبند توڑتا چلا آرہا ہے کیسے رک سکے گا۔

انگلستان میں ہندوستانی طلبا: ۱۹۳۳-۳۴ء میں ولایت میں ہندوستانی طلبا کی تعداد ۱۸۵۰ تھی اگر ہم ہر ایک طالب علم کا خرچ ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ لگائیں۔ اور ہر طالب علم کے قیام کے تین سال کے اخراجات کا حساب کریں تو پورا خرچ آٹھ لاکھ بتیس ہزار پانچ سو پاؤنڈ ہوتا ہے۔ اور ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ کا تخمینہ بھی کم ہی ہے۔ اوکسفورڈ اور کیمبرج میں تو لوگ ۲۵۰ بلکہ ۳۰۰ پاؤنڈ سالانہ سے کم خرچ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ لکھوکھا روپیہ ولایت کی جہازی کمپنیوں کو کرایہ کی مد میں بھی چلا جاتا ہے۔ اور اس "ولایت یاترا" کے بعد مبلغ علم معلوم۔ ہندوستان کے دہقان کا یہ خونِ گرم ولایت کے برفیلی فضا کو گلف اسٹریم کی طرح گرمادیتا ہے مگر مفلوک الحال ہندوستان میں جائدادوں کی قرقیاں۔ ایک یا دو نو وقت کے فاقے تباہ و برباد شرفا چھوڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر کوئیل رپورٹ کے مرتب کرنے والے کے الفاظ میں بیشتر اوقات یہ طلبا اپنے قیام انگلستان سے کسی قسم کا علمی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ اکثر حالات میں جسم کے لحاظ سے ڈھانچہ اور دماغ کے لحاظ سے ایک کھوکھلا ڈھول لے کر واپس آتے ہیں"

شانتی نکیتن کا سالانہ اجلاس: امسال دسمبر کے آخیر ہفتہ میں شانتی نکیتن کا سالانہ جلسہ ادارے کے مشہور و معروف آم کے باغ میں ہوا۔ اس

موقعہ پر ڈاکٹر ٹیگور نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

"جب میں نے پہلے پہل یہاں ایک استاد کی زندگی شروع کی تو میری نگاہ میں کوئی انقلاب انگیز مقصد نہ تھا دیسے تو مدرس کی زندگی ہمارے ملک میں زندگی سے خالی اور بے کیف ہوتی ہے لیکن میں نے اپنے ذمہ بچوں کو پڑھانے کا کام بڑی خوشی لیا کیونکہ مجھے اس کام میں مسرت تھی اور نسل انسانی کی اس محبت آمیز خدمت میں ایک کیف سرمدی۔ اس ادارے کو قائم کرنے سے میرا مقصد تحصیل علم کے لئے خوشگوار فضا مہیا کرنا تھا وہ فضا جو ذہن اور روح کے تمام قوار کی بہترین اور ہم آہنگ نشو ونما میں مدومعاون ہوتی ہے۔ میں نے ان سب متلاشیان حق کو جن کی روحیں ایسی فضا کے لئے بیتاب ہیں دعوت عام دی کہ وہ آکر اکتساب فیض کریں۔ مگر افسوس ہے میری دعوت پر اس جوش اور بلند آہنگی سے لبیک نہیں کہی گئی جس کی مجھے امید تھی"

اخیر میں ڈاکٹر ٹیگور نے بقول من از بیگانگان ہرگز نہ نالم۔ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد، ان نزدیکان بے بصر کی شکایت کی جو نزدیک رہتے ہوئے بھی شانتی نکیتن کی حسین جذبے کو پا نہ سکے اور ان دوران بابصیرت کی تعریف کی جنھوں نے مہینوں کی مسافت کا فاصلہ طے کر کے اس ادارے میں زندگی کی نئی رَد دوڑتی ہوئی دیکھی۔

ٹیگور اپنے معترضین کی ایک مرتبہ نہیں بلکہ بہت مرتبہ شکایت کر چکے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان کا وہ ادارہ جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے جو اس کشمکش اور ذہنی بے چینی کے دور میں بھی شانتی اور باہمی اخوت کا علم بردار ہے اس طبقے کی ہرزہ سرائی سے محفوظ نہ رہ سکا جس کے لئے ہر جدت بدعت ہے۔

رورش پیکٹ پچھلے دنوں الہ آباد میں انڈین ہسٹری کانگریس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں رورش پیکٹ کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس پیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اقوام اور ملتیں آپس میں ایک مقدس عہد کریں کہ وہ ہر حالت میں فنون لطیفہ اور سائنس کے اداروں، تاریخی یادگاروں وغیرہ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گی

پروفیسر رورش ایک بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اور ان کے ادبی اور آرٹ کے شاہکار مختلف ممالک کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ ان کو چینی اور سنٹرل ایشیا کے تاریخی نوادر اور عہد عتیق کی یادگاروں سے خاص

دلچسپی ہے۔ ان کا دل اس ہیبتناک المیہ سے بے حد متاثر ہوا ہے جو جاپان چین کے اسٹیج پر ہاوٹزر مشینوں اور توپوں کی دھلانے والی گونج کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اور چین۔ بدنصیب چین اپنے ادبی۔ آرٹ کے خزانے کو یوں چھپائے چھپائے لئے پھرتا ہے جیسے کہ ننھی چڑیا اپنے بچوں کو دونوں پروں کے نیچے۔ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چمٹا لیتی ہے اور ہوا میں عقاب کی برق صفت تیزی ماں اور بچے دونوں کو اچک لینے کے لئے تیار ہے۔ اس معاہدہ کا یہی مقصد ہے کہ اس قسم کے شاہکار جو نسل انسانی کے لئے ازلی مسرت کا خزینہ ہیں کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائیں اب تک ۲۱ ممالک۔ بہت سی انجمنیں اور سوسائٹیاں اور دو بین الاقوامی کانگریسیں اس عہد نامہ پر صاد کر چکی ہیں۔

ڈانسزیو | ڈانسزیو (D'Annunzio)۔ اٹلی کا مشہور معروف ڈراما نویس۔ ناولسٹ شاعر۔ لیڈر سپاہی ایک لحاظ سے فاشزم کا موجد ہے۔ اس کے اصول۔ اس کا تخیل اس کا نعرہ۔ اس کے امتیازات۔ اس کا سلام مسولینی کے ہتھوڑے کی چوٹ سے نہیں نکلے۔ بلکہ ایک شاعر کے دل اور ایک شاعر کے رنگین تخیل سے۔ ایک موسیقی کے ساز سے جس کی دکھتی ہوئی رگیں کلینشو شیر فرانس' اور لائڈ جارج' ویلز کے جادوگر نے بے طرح چھیڑ دی تھیں

ڈانسزیو ایک تخیل پسند ادیب تھا مگر اس کا دل ہمیشہ "سپے خوبتر نگار سے" تڑپتا تھا جنگ عظیم سے پہلے اس کا نام شہرت کے آسماں پر چاند بن کر چمک اٹھا تھا۔ مگر اس کے دل میں طاقت اور قوت کی ایک بے پناہ خواہش موجود تھی۔ اور جب اُسنے فیوم ( ) پر اپنا رومانی مارچ کر کے قبضہ کر لیا تو اس کا مقصد اپنے زندگی میں ایک نیا باب کھولنے کا تھا فیوم میں ہی اس نے اپنا رومن سلام ایجاد کیا۔ وہی طریقہ جسے پہلے مسولینی اور پھر ہٹلر نے اختیار کیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ یہ سلام اس نے شاید کسی پرانے مجسمے یا دیواروں کے نقوش سے نقل کر لیا تھا رومن لوگوں کا یہ طریقہ نہ تھا سلطنت روما کے زمانے میں آزاد شہری ملاقات کے وقت ہاتھ ملاتے تھے اور محض غلام لوگ اس طرح ہاتھ اٹھاتے تھے جو نازی یا فاشسٹ ملنے کا طریقہ ہے۔

دانسزیو نے ہی وہ دلچسپ اور مؤثر طریق گفتگو ایجاد کیا جسے مسولینی نے خوبصورتی سے اپنا لیا۔ آج مسولینی بھی (پیازا ڈی وینیزیا) کے چھجے پر کھڑا ہو کر فولادی لہجے میں ویسے ہی پکارتا ہے جیسے ڈی انزیو نے فیوم میں ایکٹ کیا تھا۔

ڈی انزیو چھجے سے پکار کر کہتا تھا۔ فیوم کس کا ہے؟"

نیچے سے اس کے ہمنا کار سپاہی ہم آہنگی سے جواب دیتے "ہمارا"

دوبارہ فیوم کا شاعر ڈکٹیٹر "اور اٹلی کس کا ہے؟"

جواب میں مجمع چلاتا "کہتا" "ہمارا"

اس ہمارا کی لفظی ترکیب نے اس مجمع میں اور وہاں سے پھیل کر کل اٹلی میں ایک قومی عصبیت۔ جارحانہ اقدامات۔ ایک خطرناک جذبۂ خودی کا مرض پیدا کر دیا۔ اور وہی قوم جو میزینی اور گیری بالڈی کی قیادت میں قربانی اور جذبۂ ایثار کا نمونہ تھی اب بہیمیت اور درندگی کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔

مسز پرل بک امسال ادب کا نوبل انعام مسز پرل بک (Mrs. Pearl Buck) کو ملا ہے جو ایک مشہور و معروف امریکی ناول نویس ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ امریکی کی صفت ان کے نام کے ساتھ آج کل کی قومی عصبیت کا تحفہ ہے۔ مسز بک اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی تصانیف کے ماحول۔ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کے لحاظ سے خالصۃً چینی ہیں! ایک مسلمان کے لئے یہ امر کوئی تعجب کی چیز نہیں۔ بقول ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست۔ اس کی علمی۔ سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جغرافی حدود۔ رنگ اور قوم کی تمیز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

مسز بک کے والد عیسائی مبلغ تھے اور ان کی پیدائش چین کے پرانے شہر (یوچو) میں ہوئی ان کا بچپن شہر چیانگ کیانگ کے ایک بنگلے میں گذرا جو ایک پہاڑی پر واقع تھا اور جہاں سے ایک گنجان آباد شہر اور ایک بہتے دریا کی آوازیں فاصلے کے مدھم کر دینے والے اثرات کی وجہ سے عجب دلفریبی لئے ہوئے پہنچی تھیں۔ ان کی دایہ ایک چینی بڑھیا تھی جو ان کے خاندان کے ہمراہ ۱۸ سال رہی اور اکثر بچپن میں جب ننھی پرل اس کے گھٹنے سے سر ٹیک کر بیٹھ جاتی تو وہ اسے تائی پنگ بغاوت کے ہولناک قصے سناتی۔ بچوں میں جنگ اور خونریزی۔ بہادری اور جانفروشی کے واقعات سے نفسیاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اور بچپن کے وہی تاثرات مسز بک کی مشہور تصانیف (The Good Earth) میں ظاہر ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر تک انھوں نے چین میں ہی تعلیم پائی اور اس کے بعد امریکہ کے ایک کالج میں داخل ہو گئیں سند حاصل کرنے کے بعد وہ پھر چین میں واپس آگئیں اور دو سال کے بعد انھوں نے ایک امریکی مبلغ جان بک سے شادی کر لی اور ان کے ساتھ وہ شمالی چین میں چلی گئیں۔ وہاں کا پانچ سالہ قیام ان کے اپنے الفاظ میں ان

کی زندگی کا سب سے معنی خیز اور سخت ترین دور ہے اور یہاں انھیں چینی زندگی اور رسم و رواج کے مطالعہ کرنے کا سب سے اچھا موقعہ ملا۔

ناول نویسی شروع کرنے سے پہلے انھوں نے ایک تجربی دور گزارا۔ انھوں نے سب چینی ناول پڑھ ڈالے اور چین کے قدیم ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ مگر ان کا سب سے دلچسپ اور بارآور مطالعہ خود چینی زندگی تھی۔ جو اپنے تنوع، خاموش حسن اور انتہائی غربت میں ان کے دروازے کے باہر پھیلی ہوئی تھی وہ زندگی جس میں ہر مصیبت کے لئے ایک معنی خیز تبسم، جس میں ہر سیاہ گھٹا کے لئے ایک منور کرنے والی بجلی موجود ہے۔ وہ زندگی جس کا سب سے بھلے آئینہ اس کا اپنا ادب ہے اور جس کا ایک ہمدردانہ عکس مسز بک کے ناول ہیں۔

ادارۂ معارف اسلامیہ | اس مرتبہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا سالانہ جلسہ عربک کالج دہلی میں منعقد ہوا استقبالیہ کمیٹی کے صدر سر عبدالرحمٰن سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں نظام حیدرآباد کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے مالی امداد سے ادارے کی علمی سرگرمیوں کی قدر فرمائی ہے اس کے بعد سر شاہ سلیمان وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے ایک بلیغ خطبے میں اسلامی علوم و فنون کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کا تخیل بلند، ان کا نقطہ نگاہ محققانہ ان کا طریقہ سائنٹیفک تھا ان کے لئے علم کا مقصد خدمت تھا اور آج ہلاکت ہے۔ اختتام پر انھوں نے ادارے کی توجہ دو اہم مقاصد کی طرف مبذول کی۔ پہلا مقصد تو موجودہ مغربی علوم و فنون کو اپنی زبان میں ڈھالنا اور دوسرے انگریزی ترجموں کے ذریعے دنیا کو فنون اسلامی کے بیش بہا خزینے سے روشناس کرانا۔ آخر میں علمی اور فنون لطیفہ کے نوادر کی نمائش کا افتتاح کیا گیا۔

ہمیں امید ہے کہ ادارہ اپنی مفید علمی اور ادبی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھے گا۔ ہندوستان میں اسلامی تمدن کو روشناس کرانے کی جتنی آج ضرورت ہے شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی اور اگر مسلمان اس مسئلہ پر غور کریں کہ انھوں نے [illegible] اسلامی کیا بعض ہندوستان کے اسلامی تمدن کو دنیا کے سامنے

کے لئے کیا کچھ کیا ہے تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔ امید ہے ادارہ معارف اسلامیہ اپنی سرگرمیوں کو محض علمی تحقیقات اور اہل علم کی دلچسپیوں تک ہی محدود نہیں رکھے گا بلکہ عوام کے لئے بھی اس قسم کا ادب مہیا کر سکے گا۔ جو ہر مسلمان کے دل میں ایک جائز جذبۂ افتخار پیدا کرے اور دوسری اقوام کے دل میں اس شاندار تمدن کے لئے ایک جذبۂ عزت۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عا ر	۱۲عہ ر	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عمہ ر
القول الاظہر	عہ ر	۸ ر	" " " دوم	ع۸ ر	عا ر
رہنمایان ہند	عا ر	عہ ر	تاریخ یونان قدیم	عا ر	•
امرائے ہنود	۸ہے ر	سے ر	نکات الشعراء	ع۸ ر	۱۲عہ ر
القمر	عہ ر	، ر	وضع اصطلاحات	۱۲سے ر	۸سے ر
تاریخ تمدن حصہ اول	عا ر	۸عہ ر	بجلی کے کرشمے	۱۲عہ ر	۸عہ ر
" " " دوم	عا ر	۸عہ ر	تاریخ ملل قدیمہ	۱۲عہ ر	•
فلسفۂ جذبات	ع۸ ر	عا ر	محاسن کلام غالب	عہ ر	۱۰ ر
البیرونی	عا ر	عہ ر	قواعد اردو	ع۸ ر	عا ر
دریائے لطافت	سے ر	ع۸ ر	تذکرۂ شعرائے اردو	۱۲عہ ر	۶عہ ر
طبقات الارض	ع۸ ر	عا ر	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق	سے ر	ع۸ ر
مشاہیر یونان و روم حصہ اول	للعہ ر	سے ر	تاریخ ہند ہاشمی	•	۸عہ ر
" " " دوم	سے ر	ع۸ ر	مثنوی خواب و خیال	عہ ر	عہ ر
اسباق النحو حصہ اول	•	۶ ر	کلیات ولی	صہ ر	للعہ ر
" " دوم		۶ ر	چمنستان شعراء	صہ ر	۸عہ ر
علم المعیشت	ہے ر	صہ ر	ذکر میر	•	عا ر

المشتہر مظفر حسین شمیم انجمن ترقی اردو (ہند) القریش [illegible]

طاقت اور جوانی قائم رکھنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا
اوکاسا
اوکاسا کی گولیاں
معدہ میں پہونچ کر فوراً حل ہو جاتی ہیں
اور ان کے اجزا خون میں مل کر جسم
کے تمام حصوں میں (جیسا کہ دونوں تصویروں
میں دکھایا گیا ہے) اپنا اثر کرتے ہیں ،
اوکاسا دل و دماغ ، گردوں ، معدہ اور ہاضمہ میں سے ہر ایک پر پورا پورا اثر کرتا ہے ۔
اوکاسا کا اصلی اثر غدود منی پر ہوتا ہے اس سے تمام جسمانی طاقت اور قوت مردانگی از سر نو پیدا ہونے لگتی
ہے عورتوں پر بھی یہی اثر ہوتا ہے جس سے ان کا بانجھ پن اور عام کمزوری اور حیض کا نہ آنا اور اس قسم کی تمام شکایتیں
دور ہو جاتی ہیں ۔
اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے ۔
اوکاسا ایسے اجزا سے بنی ہوئی ہے جو آپ کے جسم میں موجود ہیں اس لئے آپ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں ۔
مردانہ طاقت بحال کرنے کے لئے آج ہی سے اوکاسا شروع کر دیجئے
خرید کرتے وقت مردوں کے لئے اوکاسا (سلور) اور عورتوں کے لئے اوکاسا (گولڈ) طلب کیجئے ۔
بڑا بکس دس روپیہ
اوکاسا ہر دوا فروش کے یہاں ملتا ہے ۔
دہلی یا براہ راست
اوکاسا کمپنی (برلن) لمیٹڈ پوسٹ بکس بمبئی

"آبِ کوثر" اور "موجِ کوثر"

یعنی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ

شیخ محمد اکرام ایم اے۔ آئی سی ایس۔ مصنف غالب نامہ

نئی نسل کی نسبت عام شکایت ہے کہ انہیں یورپ اور امریکہ کے فلسفیوں اور مصنفوں سے تو خوب واقفیت ہے لیکن وہ شاہ ولی اللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دوسری اسلامی شخصیتوں کے کارناموں سے بے خبر ہیں۔ شاید اس کمزوری کی ایک اصولی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے حالات یکجا نہیں ملتے اور جو علیحدہ تذکرے ملتے ہیں ان میں ان کے حالات اور تصانیف کا ذکر اس قدر الجھا ہوا اور مشکوک اور غیر ضروری باتوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

مصنف نے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور دو جلدوں میں قوم کی مفصل مذہبی اور روحانی تاریخ عام فہم زبان میں قوم کے سامنے پیش کر دی ہے۔

آبِ کوثر میں دورِ قدیم یعنی آغاز اسلام سے اٹھارویں صدی کے اخیر تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام کن بزرگوں کی بدولت ہوئی ہے۔ یہاں کون کونسی مذہبی تحریکیں مختلف وقتوں پر جاری ہوئی۔ اسلامی طریقہ تعلیم میں کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں؟ اسلام نے ہندوستان کے لئے کیا کیا ہے یہ حالات تاریخی ترتیب سے درج ہیں۔ اور ساتھ ساتھ تمام مشہور مشائخ کبار اور علماء و فضلاء کے حالات اور ان کے کارناموں اور انکی تصانیف پر تبصرہ ہے۔ چشتی، قادری، سہروردی اور دوسرے صوفیہ سلسلوں کے بزرگوں کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ عبد الحقؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حالات خاص تفصیل سے دئے ہیں۔ موخر الذکر کی تصانیف پر قریباً ساٹھ صفحے کا مفصل تبصرہ ہے۔

موجِ کوثر میں دورِ جدید کا ذکر ہے۔ شروع میں حضرت سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے خلفا کی اصلاحی کوششوں اور تحریک جہاد کے حالات دئے ہیں۔ تیسرے باب میں علیگڈھ تحریک کی مفصل تاریخ ہے۔ چوتھے میں کتب [illegible] پانچویں میں [illegible] کا تاریخ اور آخر میں علامہ اقبال کے فلسفہ [illegible] کا خلاصہ ہے۔ ہر جلد کا حجم تقریباً تین سو صفحات۔ قیمت مجلد [illegible]

ملنے کا پتہ: منیجر [illegible] گجرات پریس سورت۔ صوبہ بمبئی

مطبوعاتِ امتِ مسلمہ امرتسر

سہولت تبلیغ کی وجہ سے قیمت کم کر دی گئی

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں | ایک ممتاز گریجوایٹ نے برسوں حدیث کا مطالعہ کر کے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اس قابل قدر کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے صفحات ۵۰۰ کے قریب۔ قیمت ۱۲/

برہان القرآن | یہ کتاب ان تحریری مباحث پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب "مدیر اہلحدیث" اور حضرت خواجہ احمد دین صاحب کے درمیان ہوئے۔ اس میں اہلحدیث پر اتمام حجت کر دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بے غلط مطاع نہیں اور قرآن کے سوا کوئی غیر فانی وحی نہیں قیمت ۸/

ریحان القرآن | مولوی حبیب الرحمٰن مئوی کے رسالہ "نصرت الحدیث" مولوی قاسمی کے "عقاید کفریہ" اور مولوی عبداللہ کے "عقاید بے حدیثہ" وغیرہ کا مکمل جواب۔ قیمت ۴/

قرآنِ مجید و رسولِ حمید | حضرت رسالتمآب کے مقدس سوانح از روئے قرآن مجید قیمت ۸/

اسلام اور حریت و مساوات | اس موضوع پر جناب خواجہ عباداللہ صاحب اختر بی۔ اے اور جناب مرزا بشیر الدین محمود صاحب قادیانی کے مابین دلچسپ مناظرہ۔ قابل مطالعہ اور ناول سے زیادہ دلچسپ کتاب ہے قیمت ۸/

تعلیماتِ قرآن | مرتبہ جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاذ تاریخ جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ کتاب اس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے کہ قرآن کریم مکمل کتاب اور اپنی شرح آپ ہے۔ کسی خارجی شئے کا اپنی تفسیر میں محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب اس نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ آج تک کسی زبان میں قرآن کریم کی تشریح پر اس قسم کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت ۱۲/

قول حسن | اس میں از روئے قرآن حکیم ثابت کیا گیا ہے کہ ہمارا نام صرف مسلم ہے باقی تمام نام شیعہ سنی اہل قرآن، اہلحدیث وغیرہ بدعی ہیں جن کی وجہ سے امت کو نقصان عظیم پہنچ رہا ہے قیمت ۲/

خدا کی محبت قیمت ۴/ — خون کے آنسو [illegible] قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ **منیجر بلاغ امرتسر**

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرماکر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۲	فروری ۱۹۳۹ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

سائنس کی تعلیم

(از ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی۔ ایم اے (کیمبرج) پی ایچ ڈی (لیپزگ) پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

اس مختصر مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ سائنس کی جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے اس پر تنقیدی نظر ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

اکثر علوم اور خصوصاً سائنس میں جو ترقی گذشتہ ایک سو سال کے دوران میں ہوئی ہے اس کے تفصیلی ذکر کی آج ضرورت نہیں۔ اس امر سے ہر تعلیم یافتہ شخص کم و بیش واقف ہے کہ علوم و فنون کے عمارتوں کی جو بنیادیں بابلی مصری، چینی، ہندوستانی، اور عرب قوموں نے ڈالی تھیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی چلی گئیں اور اب آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ لیکن اس سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے کہ ان سر بفلک عمارتوں کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ اگر بر وقت ان کو مستحکم نہ کیا جاتا تو شاید اب ان عمارتوں کا نشان بھی نظر نہ آتا۔ سائنس کی بنیادوں کے متعلق اس تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے کہ ان کے بنیادی اصولوں میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ جو نتیجے پہلے بدیہی تھے اب ان کے ثبوت کی تلاش ہے۔ جو تعریفیں پہلے کافی کھی جاتی تھیں اب وہ مہمل قرار دی جاتی ہیں۔ جو مسئلے کسی زمانے میں انتہائی اہمیت رکھتے تھے وہ اب کہیں گوشہ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ریاضیات میں کبھی ضابطوں اور ان کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ اب ان کو یاد رکھنے کی کوئی فکر نہیں کرتا بلکہ طریقہ استدلال پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ طبیعیات میں پہلے "خواص مادہ" کے مضمون کی بہت اہمیت تھی اور اب جوہری طبیعیات کا موضوع اہم ترین سمجھا جاتا ہے۔ علم کیمیا کا مرکز ثقل غیر نامیاتی کیمیا سے ہٹ کر نامیاتی اور طبیعی کیمیا کی طرف آگیا ہے باقی دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں آپ ہماری درس گاہوں کا ملاحظہ فرمائیے۔ اکثر طلبا کو مدرسہ اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اپنے مضمون کے بنیادی اصولوں سے کما حقہٗ واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ خود نفس مضمون کے متعلق ان کی معلومات وہیں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ سو سال کے دوران میں

جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر انھوں نے کبھی کسی عام فہم کتاب کو پڑھا ہے کوئی پبلک لکچر سنا ہے تو زیادہ سے زیادہ چند نئے ناموں سے واقف ہو جاتے ہیں اور انھیں اصطلاحوں کے بل بوتے پر اپنے دوست احباب پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان نئے اصطلاحوں کے تشریح اور ثبوت سے قطع نظر اگر ان کی تعریف ہی پوچھئے تو وہ صحیح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ مثلاً آج کل آپ اکثر اصحاب کی زبان پر ناقلیدسی ہندسہ، چار ابعاد، اور جوہری مرکزہ اور اسی قسم کے بیسیوں الفاظ پائیں گے حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنے حضرات ان الفاظ کے حقیقی معنوں سے بھی واقف ہیں۔

اس جہالت اور ناواقفی کا ذمہ دار ہم ان بے چارے طالب علموں کو نہیں ٹھیرا سکتے جو ہندوستانی نظام تعلیم کے مختہ ستم ہیں۔ زمانہ تعلیم کا اکثر و بیشتر حصہ کہنہ اور متروکہ معلومات کے بہم پہنچانے میں صرف کر دیا جاتا ہے اور جدید ترین معلومات تک پہنچنے کی کبھی نوبت نہیں آتی۔ اس کے دو بڑے وجوہات ہیں جو شاید ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اول تو نصاب تعلیم میں تحدید کر دی جاتی ہے کہ کسی مضمون کے متعلق فلاں چیزیں پڑھائی جائیں گی اور انھیں پر امتحان لیا جائے گا۔ نصاب بنانے والے اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جدید ترین معلومات بھی ان میں شامل کر دی جائیں تو وقت کافی نہیں ہوگا اور پھر ایسے پڑھانے والے بھی نہیں ملیں گے جو مدرسوں اور کالج کی مختلف منزلوں پر ان جدید معلومات سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسری طرف پڑھانے اور پڑھنے والوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ مقررہ نصاب کسی طرح ختم ہو جائے اور امتحان کے وقت زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔ اس لئے نہ تو طالب علم ہی کی خواہش ہوتی ہے کہ نصاب کے باہر جدید معلومات حاصل کریں اور نہ استاد ہی انھیں ایسی ترغیب دلاتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اتفاق سے کسی طالب علم میں بلند پروازی کا رجحان ہو تو استاد اس کو پکڑ کر پھر اسی کنج قفس میں بٹھا دیتے ہیں۔ اب چونکہ انھیں امتحانوں کے فارغ التحصیل طلبہ آگے چل کر مدرس یا لکچرار ہوتے ہیں اس لئے ان میں نئی معلومات مفقود ہوتی ہیں اور اسی فقدان کی شکایت نصاب تعلیم بنانے والے حضرات کیا کرتے ہیں۔ غرض کہ علت و معلول کا یہ دائرہ پورا ہو جاتا ہے اور یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ جس کو چاہیں علت قرار دیں اور جس کو چاہیں معلول۔

سائنس کی تعلیم میں اس نقص کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ نہ صرف قیمتی وقت بلکہ اس سے زیادہ قیمتی

دماغ مشکل اور پیچیدہ مشقوں اور سوالوں کے حل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہ رجحان دوسرے علوم کی بہ نسبت علم ریاضی میں بہت زیادہ ہے' اور انگلستان کے مدرسوں اور کالجوں سے ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ براعظم یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ میں یہ رجحان بہت کم ہے۔ اس کے متعلق کوئی طویل بحث کرنے کی بجائے میں صرف ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو شاید اس بحث سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کرنے کے بعد میں لائپ زک یونیورسٹی میں تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ یہاں پروفیسر ہائی زن برگ کی وجہ سے طبیعیات کا ڈپارٹمنٹ بہت مشہور تھا اور بہت سے ممالک سے پروفیسر وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ سیمینار کے سلسلہ میں سب لوگ جمع تھے امریکہ کے ایک پروفیسر نے مجھ سے تذکرۃً دریافت کیا کہ میں نے اس سے قبل کیا تعلیم پائی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کیمبرج سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کر کے آیا ہوں تو انھوں نے بہت حیرت سے دریافت کیا کہ "کیا آپ واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ٹرائی پاس کے سوالوں کو حل کرنے کے بعد بھی آپ کا دماغ صحیح وسالم ہے ؟"

حاصل یہ کہ سائنس کی تعلیم میں جو وقت بے فائدہ مشقوں اور سوالات کی تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے اس کو بنیادی اصولوں کی تشریح ان کا ایک دوسرے سے تعلق جدید سائنس میں ان کی اہمیت وغیرہ کی توضیح میں لگایا جائے تو مفید تر نتائج پیدا ہوں گے اور طلبہ میں خود غور وفکر کی عادت پیدا ہوگی۔ یہ نہیں کہ سوالات کو چند قاعدوں کی مدد سے میکانی طور پر حل کر دیں اور ان میں یہ احساس بھی نہ ہو کہ کوئی جواب فی نفسہٖ مہمل یا مضحکہ خیز تو نہیں ہے۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان میں میں نے ایک سوال دیا تھا کہ اگر ایک موٹر کی قیمت بمبئی میں ساڑھے تین ہزار کل دار اور ریلوے کا کرایہ ۱۵۰ روپیہ کل دار ہو اور حیدرآباد میں ۵ روپیہ فی صدی کے حساب سے کروڑگیری ادا کرنی پڑے اور یہاں کا ایجنٹ ۲۰ فی صدی نفع لے کر فروخت کرے تو خریدار کو سکہ عثمانیہ میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی جب کہ شرح تبادلہ ۱۰۰ روپے کلدار کے لئے ۱۱۵ روپیہ ۴ آنے سکہ عثمانیہ ہو اس سوال کے جواب میں بعض امیدواروں نے لاکھوں روپیہ قیمت نکالی اور ایک برخوردار نے تو غضب کر دیا کہ دو کروڑ سے زیادہ روپیہ جواب میں حاصل کئے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ میٹرک کے طالب علم کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا جواب مہمل ہے اور وہ' جواب کو برقرار رکھتا ہے۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں کسی فارسی کتاب میں ایک مقولہ پڑھا تھا کہ اگر کسی دعظ کا اثر سامعین پر نہ ہو تو یہ سامعین کا قصور نہیں بلکہ واعظ کا قصور سمجھو کہ اس نے مضمون کو اس طرح نہیں بیان کیا جو دل نشین ہو۔ میری دانست میں یہ مقولہ حرف بہ حرف صحیح ہے اور طلبہ اور عوام الناس میں سائنس اور ریاضی کی طرف سے جو دہشت بیٹھی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار صرف اساتذہ ہیں جو مضمون کو اس قدر خشک اور غیر دلچسپ بناتے ہیں کہ طالب علم کو خواہ مخواہ ایک قسم کی منافرت پیدا ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سائنس و ریاضی کے ادق سے ادق مسائل کو بھی دلچسپ بنانا ممکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود استاد کو بھی کافی مہارت ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کے ابتدائی مدارس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس مہیا نہیں کئے جاتے حالانکہ تعلیم کی یہی وہ منزل ہے جو سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ میری رائے میں کوئی مدرس چاہے وہ جماعت صغیر یا اول کو پڑھاتا ہو بی اے ٹرینڈ سے کم نہیں ہونا چاہیئے اور مڈل اور میاٹرک کے مدرسین کم از کم ایم اے اور ایم ایس سی ہونے چاہئیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں آپ اس شرط کو محال دے سکتے ہیں لیکن ہر علم کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے۔ کسی مضمون کو وہی شخص آسان بنا سکتا ہے یا دلچسپ طریقہ پر سمجھا سکتا ہے جو اس کے ہر پہلو پر پوری طرح حاوی ہو۔ اگر آپ ایک میاٹرک کامیاب شخص کو پڑھانے بٹھائیں تو ظاہر ہے کہ وہ سوائے اس کے کہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو دہرا دے اور کیا کر سکتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ ایک ایسے مدرسہ میں جو یورپین اداروں کی نگرانی میں ہے اور جہاں طلبہ سے تقریباً ۸ روپیہ ماہانہ فیس لی جاتی ہے بعض ایسے استاد سینیر کیمبرج کی جماعت کو پڑھاتے ہیں جو خود بھی صرف سینیر کیمبرج کامیاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو تنخواہیں اس وقت ابتدائی جماعت کے مدرسین کو دی جاتی ہیں ان تنخواہوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس نہیں مل سکتے۔ لوکل فنڈ کے بعض مدارس کے متعلق مجھے ذاتی علم ہے کہ استادوں کی تنخواہیں پندرہ بیس روپیوں سے زیادہ نہیں جو دوسرے محکموں میں چپراسیوں کو ملتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ معقول مشاہرے دے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین کو ابتدائی مدارس میں بھیجا جائے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے تاکہ ہندوستان کے طلبا کی بنیادی تعلیم بھی ان غیر ممالک کے طلبہ کی طرح مستحکم ہو سکے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی قوم کو بناتا

ہے اور اس کے لئے کسی ملک کو بجٹ میں عدم گنجائش کا عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے شعبوں کی گنجائش سے اس کمی کو بہر حال پورا کرنا ضروری ہے۔

اب تعلیم کے مضامین پر غور کیجئے تو جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے پر بھی جدید معلومات تک پہونچنے کی نوبت نہیں آتی۔

غالباً ارباب تعلیم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کی اس قلیل مدت میں جو ایم۔اے کامیاب کرنے پر ختم ہوتی ہے کسی سائنس کے جدید ترین اصول نہیں بتلائے جا سکتے لیکن ایک تو فرانس، جرمنی اور امریکہ کے نظام تعلیم سے اس وہم کے خلاف ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے خود ہر یونیورسٹی میں غور کیا جا سکتا ہے کہ میٹرکولیشن سے لے کر ایم۔اے تک یعنی ۹ سال کے دوران میں کیا کچھ نہیں بتایا جا سکتا بشرطیکہ بہت سے فرسودہ مضامین اور لایعنی تفصیلات کو چھوڑ دیا جائے اور بے فائدہ مشقوں اور سوالوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے علوم ریاضی اور طبیعیات کے لئے جن سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے میں نے چند دنوں قبل تفصیلی نصاب بنا کر بتلایا تھا کہ ۹ سال میں ان علوم کے جدید ترین اصول بتائے جا سکتے ہیں اور پھر طالب علم کے لئے چھوڑ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق ان میں سے کسی ایک شاخ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرے۔ یہ نہیں کہ ریاضیات کے ایک ایم۔اے کامیاب طالب علم کو تفرق اور تکمل کی وہی تعریفیں معلوم ہوں جو ڈھائی سو سال قبل نیوٹن اور لائب نٹز نے کی تھیں اور یہ معلوم ہی نہ ہو کہ جدید ریاضی میں ان میں کب کا انقلاب ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے سائنسوں سے واقفیت رکھنے والے حضرات اپنے اپنے سائنس کے متعلق اسی قسم کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔

اس طرح وقت ضائع کرنے کی بجائے جدید تحقیقات کے بنیادی اصول طالب علم کے سامنے تعلیم ختم کرنے سے قبل ہی پیش کر دئے جائیں تو وہ نسبتاً کم عمر میں اپنے مضمون کے انتہائی مدارج سے واقف ہو کر اس عمر میں جبکہ انسان کا دماغ پوری قوت کے ساتھ کام کرتا ہے اپنی اپنی تحقیقات میں مصروف ہو جائیں گے جدید سائنس کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ تقریباً تمام بڑے انکشافات اور اہم ترین ایجادات ابتدائی عمر میں ہی ہوتے ہیں اور تحقیقاتی کام کرنے کا بہترین زمانہ جوانی کا ہے۔ پروفیسر آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کا انکشاف

۲۴ برس کی عمر میں کیا تھا۔ پروفیسر بوہر نے کوانٹم نظریہ کا انکشاف ۲۸ برس کی عمر اور پروفیسر ہائی زن برگ نے کوانٹم میکانکس کا انکشاف ۲۵ برس کی عمر میں کیا۔ پروفیسر لوئی ڈے بر دگلی کی عمر اپنے اہم ترین انکشاف کے وقت ۳۱ برس پروفیسر شرودنگر کی عمر ۳۹ برس اور پروفیسر ڈیراک کی عمر ۲۴ برس تھی۔ یہ سب علما اپنے مضمون کے ماہر اور نوبل انعام یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ گذشتہ چند سال کے دوسرے نوبل انعام یافتہ مثلاً یورے اندرسن، ڈی بائی وغیرہ بھی مقابلتہً کم عمر ہیں۔ یہ اسی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے سے قبل طالب علم اپنے مضمون کے جدید ترین تحقیقات سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ خود بھی اسی پایہ کی تحقیقات کر سکتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہماری جامعات کے میٹرک سے لے کر۔ ایم اے تک تمام نصابوں کو بنیادی طور پر بدل دیا جائے۔ یوں تو ہر چند سال کے بعد کسی قدر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن ایک فرسودہ مضمون کی بجائے دوسرے فرسودہ مضمون کو رکھنے سے کوئی اصولی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب محض ردوبدل کا زمانہ نہیں بلکہ ایک انقلاب کی ضرورت ہے کہ پورا نصاب تعلیم مکمل طور پر بدل دیا جائے۔ اس ضمن میں ایک غلط فہمی کو بھی رفع کر دینا ضروری ہے جو ہماری قومی زندگی پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ ایک خاص طبقہ میں آج کل جامعہ عثمانیہ کی تعلیم اور یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کی مذمت کرنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ ہم ان لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتے ہیں کہ بے شک ہماری تعلیم میں نقائص ہیں اور ایسے نقائص ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں لیکن یہ نقائص صرف جامعہ عثمانیہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے ہندوستان اور انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ سات سال کے عرصہ سے میں کلکتہ، مدراس، الہ آباد، پنجاب وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کا مسلسل ممتحن رہا ہوں اور ڈاکٹر آف سائنس سے لے کر یم۔ یس سی اور بی اے (آنرز) تک تمام ڈگریوں کے لئے امتحان لیتا ہوں۔ میں ہمارے ان کرم فرما ناقدین کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان بیرونی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ عثمانیہ میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں پائیں گے جو کچھ بھی نقص ہیں وہ موجودہ نظام تعلیم اور نظام امتحان کے ساتھ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔
اس نظام تعلیم کا ایک اور نقص یہ ہے کہ موہوم افادیت کے خیال سے تعلیم کے اصلی مقصد کو نظر انداز

کر دیا جاتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ اس قربانی کے باوجود حقیقی افادیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی تشریح کے لئے یہاں صرف مٹرکیولیشن کے علم ہندسہ کی تعلیم پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میٹرک کے لازمی ریاضی کے نصاب میں عملی ہندسہ رکھا گیا ہے جس میں صرف مختلف شکلوں کا بنانا سکھایا جاتا ہے اور ان عملوں کے ثبوت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ ان مسئلوں پر غور کیجئے تو ان میں سادہ ترین مسئلوں جیسے ایک خط کے دو مساوی حصے کرنے کے مسئلہ کے علاوہ پیچیدہ ترین مسئلے بھی شامل ہیں۔ اب ہر سمجھ دار شخص یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اگر افادیت ہی کسی مضمون کے پڑھانے یا چھوڑ دینے کا معیار ہو تو ان عملی مسئلوں کا طالب علم کو آئندہ زندگی میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ۹۹ فی صدی میٹرک کامیاب طلبہ کو یہ کب ضرورت پڑتی ہے کہ ایک ایسا دائرہ بنائیں جو ایک دئیے ہوئے نقطے میں سے گذرے اور دو دئیے ہوئے خطوں کو مس کرے۔ افادیت کا تو یوں خاتمہ ہوا۔ دوسری طرف آپ طالب علم کی مشکلات پر غور فرمائیے۔ ثبوت یا طریقہ استدلال سے تو وہ بالکل واقف نہیں ہوتا کہ ان کی بنا پر عمل کو خود نکال سکے اس لئے اس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ طریقہ عمل کو زبانی یاد کرے اور امتحان میں بجنسہٖ دہرا دے۔

اس سوال پر کہ ریاضیات کے ابتدائی اصول سے واقفیت طلبہ کے ذہن و قوت استدلال کی تربیت کے لئے اور ان کو ایک مفید شہری بنانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں ارباب اقتدار اور ارباب تعلیم ایک مرتبہ کامل غور و خوض کے بعد تصفیہ کر لیں اور اگر پڑھانا ہی ضروری سمجھا جائے تو پھر ان علوم کو اسی طریقہ سے پڑھانا چاہئے جو ان کے لئے ناگزیر ہے۔ علم ہندسہ کو بغیر ثبوت اور استدلال کے پڑھانا قطعی مہمل ہے اور یہ استدلال میٹرک کے طلبہ کی طاقت سے باہر بھی نہیں۔ اگر وقت کے ناکافی ہونے کا سوال ہے تو زیادہ حصہ پڑھانے کی ضرورت نہیں چند مسئلوں پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

کالج کی تعلیم میں بھی بعض وقت اہم مسئلوں کے ثبوت غیر تشفی بخش طور پر دئیے جاتے ہیں اور بنیادی مفہوم اور اصول جن پر سارے مضمون کا دارومدار ہوتا ہے اچھی طرح پر نہیں سمجھائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا ضابطوں کی مدد سے پیچیدہ سوال تو حل کر لیتے ہیں لیکن خود نفس مضمون کو واضح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ گذشتہ ہفتہ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بیرونی یونیورسٹی کے ایم ایس سی امتحان کے پرچہ

کو جانچتے وقت مجھے اس قسم کی افسوس ناک مثالوں سے سابقہ پڑا تھا۔

ہماری یونیورسٹیوں میں یہ بھی عیب ہے کہ اعلیٰ جماعتوں میں طریقہ تعلیم تقریباً اسی قسم کا ہے جو مدرسوں میں رائج ہے حالانکہ اس منزل پر کتابی تعلیم کی بہ نسبت خود طلبہ کے لکچروں اور مباحثوں کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔ یہ طریقہ سیمینار اور COLLOGUIUM کے نام سے مشہور ہے اور جرمنی و فرانس میں اس کا بہت رواج ہے۔ اس سے ایک طرف طلبہ کو جدید تحقیقات سے واقفیت اور مہارت ہوتی ہے تو دوسری طرف ان میں خود تحقیق و تجسس کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی حال حال تک ہمارے پاس یونیورسٹی کا مقصد اولین یہی سمجھا جاتا تھا کہ طلبہ کو نصابی تعلیم دے کر امتحان پاس کرایا جائے اور پھر ڈگری عطا کی جائیں۔ تحقیقاتی کام کا اگر کہیں کچھ انتظام تھا بھی تو اس کی اہمیت دوسرے درجہ پر تھی۔ شکر ہے کہ اب اس طرف بھی قدم اٹھنے لگا ہے اگرچہ اب بھی اس کی حقیقی اہمیت کے موافق اس کا انتظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب بھی اکثر یونیورسٹیوں میں کتب خانے اور تجربہ خانے سائنٹیفک طور پر منظم نہیں ہیں۔ تحقیقاتی رسالوں اور کتابوں کے منگوانے کی بہ نسبت درسی کتابوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً ریاضی اور طبیعیات کے رسالوں کو لیجیے ان علوم کے زیادہ نہیں تو کم از کم پچاس بہترین رسالے دنیا کے مختلف مقاموں سے نکلتے ہیں ہندوستان کے شاذونادر ہی کتب خانے ایسے ہوں گے جہاں آٹھ دس سے زیادہ رسالے موجود ہوں۔ بعض جگہ پیسوں کی کمی کا عذر ہے تو بعض جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے رسالے بہت کم لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ جو لوگ پیسے نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ دوسری نمائشی چیزوں کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور جو دوسری زبانوں سے ناواقفی کا عذر کرتے ہیں وہ خود انگریزی رسالوں اور کتابوں کی طرف بھی کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ نسلوں کے لئے مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے تحقیقاتی کام میں کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی۔

پھر بعض مقاموں پر جو فنڈ کی نام نہاد کی کمی کے باعث اہم رسالے یا کتابیں فراہم نہیں کر سکتے بعض دوسری کتابوں اور رسالوں کی اس قدر افراط ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کا کیا مصرف ہوگا۔ مثال

کے طور پر ایک رسالہ "نیچر" ہی کو لیجئے یہ انگریزی کا ایک مشہور رسالہ ہے جو لندن سے ہر ہفتہ نکلتا ہے اور یوں سمجھئے کہ سائنٹیفک نیوز ایجنسی کا کام دیتا ہے۔ یعنی چونکہ دوسرے رسالے ماہانہ سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ اور ان میں طویل تحقیقی مضامین کے چھپنے کے لئے عرصہ لگتا ہے اس لئے محض ان انکشافات کا اعلان مختصر طور پر نیچر میں کردیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بعض کتابوں کے تبصرے اور سائنٹفک مجلسوں کی مختصر روئداد بھی شائع ہوتی ہے۔ کسی شخص کے لئے اس رسالہ کو ایک آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن ہندوستان میں اکثر مقاموں پر صرف یونیورسٹی کے حدود کے اندر کم از کم نصف درجن کاپیاں اس رسالہ کی آتی ہیں جس کا چندہ تقریباً ۲۰ گنی دینا پڑتا ہے حالانکہ صرف ایک کاپی بھی ساری یونیورسٹی کے ضرمیات کے لئے کافی ہے اس کی بچت سے دوسرے رسالے منگوائے جاسکتے ہیں جو بدرجہا زیادہ اہم ہیں۔

اسی ایک رسالہ کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے ایسی بہت سی دوسری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک کل نہیں ہوتا اور ہر شعبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تمام مشترکہ دلچسپیوں کے رسالے اور کتابیں یونیورسٹی یا خود شہر کے مرکزی کتب خانہ میں منگوائی جائیں۔ ان میں نیچر، فلاسفیکل میگزین، رائل سوسائٹی کے پروسیڈنگ، پیرس اکاڈیمی کے پروسیڈنگ وغیرہ شامل رہیں۔ جو رسالے صرف خاص موضوع پر ہوں اس شعبہ کے کتب خانہ میں منگوائے جائیں اور ہر اہم رسالہ ضرور منگوایا جائے۔ چاہے اس کی قسط سے فرنیچر کی مد میں یا انتظامی مصارف میں یا بالآخر اساتذہ کی تنخواہوں میں کمی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رسالے الماریوں کی زینت ہی نہ رہیں بلکہ حتی الامکان ان کا استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے اول تو خود اساتذہ کو ان سے واقف ہونا چاہیئے، پھر وہ طلبہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ ہر ایک تحقیقی مضمون کو تفصیل سے پڑھ کر سمجھ سکے اس لئے مناسب ہوگا کہ اپنے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہر استاد ایک مضمون کا انتخاب کرے اور حال میں اس مضمون کے متعلق مختلف رسالوں میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ان کا خلاصہ سیمینار میں بیان کرے۔ اس ضمن میں چند مضمون اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے سپرد کئے جاسکتے ہیں تاکہ وہ ان کے متعلق مواد فراہم کریں اور اچھی طرح مہارت حاصل کرنے کے بعد سیمینار میں لکچر دیں۔ اس طریقہ سے طلبہ کے معلومات اور تجربہ میں بہت اضافہ ہوگا اور تحقیقی کام کی طرف

سبب بے حد ترغیب ہوگی۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان MIGRATION SYSTEM رائج کیا جائے یعنی اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چند میقاتیں بیرونی جامعات میں دوسرے اساتذہ کی زیرنگرانی کام کرسکیں۔ اس سے ان کو نہ صرف مختلف ماہرین کے معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا بلکہ تعلیم کے متعلق مختلف تحریکوں سے بھی واقفیت ہوجائے گی جرمنی میں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے اور طلبہ کے خیالات کی وسعت اور پختگی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لیکن ہر طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے علاوہ مختلف مقاموں میں تحصیل علم کرسکے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف جامعات آپس میں یہ انتظام کریں کہ ایک جگہ کے اساتذہ وقتاً فوقتاً دوسری جامعہ میں ایک یا دو میقاتوں تک لکچر دیتے رہیں۔ اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اگر یہ انتظام اس طریقہ پر کیا جائے کہ مثلاً مدراس سے ایک پروفیسر کلکتہ جائے اور کلکتہ سے ایک پروفیسر مدراس آئے تو میرے خیال میں زیادہ انتظامی دقتیں بھی نہیں ہوں گی۔ اور اگر ایسی دقتیں ہوں بھی تو انھیں کسی نہ کسی طرح حل کرنا چاہیئے۔ محض مشکلات کے خوف سے کسی اہم اسکیم کو پس پشت ڈال دینا تدبیر کی علامت نہیں ہے۔

حضرات اس مختصر مضمون میں سائنس کی تعلیم کے متعلق چند خیالات نمونتہً آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں۔ جو کم و بیش دوسرے علوم کے متعلق اسی طرح صحیح ہیں۔ آج کل نہ صرف ہماری ریاست میں بلکہ کل ہندوستان میں تعلیم کی تنظیم جدید پر غور ہورہا ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے۔

بہت سی اہم باتیں وقت کی تنگی کے سبب یہاں چھوٹ گئی ہیں جو کسی آئندہ موقع پر تفصیلی معلومات کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

زمین اور آبادی

(از جناب محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات)

زمین اور آبادی میں جو گہرا تعلق ہے اسے کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے۔ زمین کے بغیر کوئی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے کھانے کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں زمین سے ہی براہ راست یا بالواسطہ حاصل کی جاتی ہے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے تو اس سے کھانے کے لئے اناج ترکاری اور پھل ملتے ہیں۔ کپڑے بنانے کے لئے روئی اور دوسرے ریشہ دار پودے تیار کئے جاتے ہیں جانوروں کو زمین پر ہی چراتے اور پالتے ہیں تب ان سے دودھ گھی۔ گوشت کھالیں حاصل کی جاتی ہیں اور ان سے بوجھ اٹھانے اور کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے۔ زمین کی مٹی سے مکانات بنا کر کھڑے کئے جاتے ہیں اور لوہا تانبا اور دوسری دھاتیں نکالی جاتی ہیں۔ غرضکہ زمین کے ایسے ہی بے شمار اور فائدے ہیں جن سے آبادی کے زندہ رہنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین میں بصورت مجموعی کس قدر آبادی کے پرورش کرنے کی وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا تو مشکل ہے۔ کیونکہ زمین کے سب حصے ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ کچھ زمینیں آدمیوں کے لئے مفید ہوتی ہیں کچھ غیر مفید۔ کچھ زمینیں پتھریلی پہاڑی ہوتی ہیں کچھ دلدلی۔ کچھ میں جنگلات کثرت سے لگے ہوتے ہیں کچھ بالکل خشک ریگستان ہوتی ہیں۔ کچھ زرخیز ہوتی ہیں کچھ بنجر ہوتی ہیں۔ کچھ معدنیات سے پر ہوتی ہیں کچھ خالی اور بے کار ہوتی ہیں۔ کچھ کے فائدے کا علم لوگوں کو ہوتا ہے اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کے فائدے سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زمین کو محنت کے ذریعہ کم و بیش مفید بنایا جا سکتا ہے اور جتنا انسان کی ایجاد اور اختراع کی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے اتنی ہی آدمی کی محنت آسان ہوتی جاتی ہے اور پرانی بے کار زمینوں کو کارآمد اور زرخیز بنانے کا کام سہل ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے زمین میں آدمیوں کو پرورش کرنے کی جس قدر گنجائش ہے وہ کوئی قائم اور دائم چیز نہیں ہے

بلکہ علوم و فنون کی ترقی اور تنزل کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہمیں ہر عہد کے سرمایہ علم و فن کا لحاظ کرتے ہوئے زمین کی وسعت اور گنجائش کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

لیکن چند ظاہری باتیں ایسی ہیں جن سے آبادی اور زمین کے توازن کا کچھ نہ کچھ پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی ملک میں یہ دیکھیں کہ وہاں کے لوگوں کی عمریں اوسطاً زیادہ ہوتی ہیں۔ ان کے قد و قامت سے توانائی اور تندرستی ظاہر ہوتی ہے۔ چہرے تر و تازہ اور شاداب ہوتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں ان کی تندرستیاں عموماً اچھی رہتی ہیں اور عمر کے زیادہ حصہ میں ان میں کام کرنے کی چستی، ولولہ، امنگ اور اہلیت پائی جاتی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی زمین آبادی کی ترقی کے لئے موزوں اور مناسب ہے[لہ] اگر صورت حال اس کے برعکس نظر آئے تو ہمیں اس کے خلاف نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ اگر زندگی کو قائم رکھنے والے اسباب، زندگی کو ختم کرنے والے اسباب کے مقابلہ میں زیادہ ہوں تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ فطری ماحول آبادی کی ترقی کے لئے موافق ہے اور یہ نہ ہو تو سمجھنا چاہیئے مخالف ہے۔

جن مفکرین نے آبادی اور زمین کے تعلقات پر غور و فکر کیا ہے وہ زمین کی وسعت اور گنجائش کے بارے میں دو مختلف نتیجوں پر پہنچے ہیں جن سے معاشیات کے ماہروں کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک گروہ کو ہم یاس مشربوں یعنی ایسے لوگوں کا گروہ کہہ سکتے ہیں جو زمین کی گنجائش کی کمی اور قدرتی وسائل و دولت کی قلت

لہ یہاں میرے اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں آبادی کے لئے صرف زمین کو ہی ایک تنہا ذریعہ معاش سمجھتا ہوں اور تجارت و صنعت اور علمی پیشوں کو جن کے لئے زمین کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ بعض ملک ایسے ہو سکتے ہیں جو تجارت اور صنعت یا علمی پیشوں یا دوسری ذاتی خدمات کے ذریعہ اپنی آبادی کے معیار زندگی کو ایک بلند سطح پر قائم رکھ سکتے ہیں لیکن اس سے زمین کی بنیادی اہمیت ان ملکوں کیلئے بھی زائل نہیں ہو جاتی۔ انھیں اپنی تجارت کے لئے سامان اور خریدار، اپنی صنعتوں کیلئے کچا مال، اپنے علمی پیشوں اور ذاتی خدمتوں میں مصروف رہنے والے لوگوں کے لئے غذا، اگر اپنے ملک کی زمین سے نہیں تو کسی نہ کسی دوسرے ملک کی زمین سے ضرور حاصل کرنا پڑتی ہے۔ نو آبادی کے حاصل کرنے کیلئے سامراجی ملکوں میں جو کشمکش جاری ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ صورت میں زمین اور آبادی کا مسئلہ صرف ایک ملک تک محدود نہیں رہتا کئی ملکوں بلکہ پوری دنیا پر پھیل جاتا ہے لیکن زمین اور طبعی ماحول پر انسانوں کا بصورت مجموعی جو انحصار ہے اس کی اہمیت بہرحال باقی رہتی ہے۔ اس سے آبادی اور زمین کے مقابلہ کو وسیع رقبہ پر پھیلا کر تھوڑی مہلت حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اس مقابلہ کو سرے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

کو آبادی کی ترقی کے راستہ میں حایل دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین سے جتنی پیداوار حاصل ہو سکتی ہے اس کی مقدار محدود ہے اور انسانی آبادی میں اضافہ اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے دنیا کے سب لوگوں کو زمین کی پیداوار سے جی بھر کے فائدہ اٹھانے کا موقع کبھی بھی نہ مل سکے گا۔

دوسرا گروہ امید پروروں یعنی معاشیات کے ایسے ماہروں کا ہے جو انسانی ترقی کے بارے میں نہایت خوش آئند توقعات رکھتے ہیں۔ وہ زمین کی پیداوار کی کمی کو موجودہ افلاس اور زبوں حالی کا سبب قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اس کا الزام غیر مساوی تقسیم دولت اور دوسری معاشری اور سیاسی خرابیوں پر رکھتے ہیں۔

آئیے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ ان دونوں گروہوں کے عقائد کا مطالعہ کریں۔ پہلے یاس مشربوں کو لیجئے۔ اس گروہ کا سردار اور امام مالتھس ہے جس نے سب سے پہلے ان لوگوں کے پُر جوش حوصلوں کو سرد کرنے کی کوشش کی جو چاہتے تھے کہ دولت کی معقول تقسیم سے دنیا میں خوش حالی اور فارغ البالی کے دور سعید کا آغاز کریں اور دنیا کو بہشت کا ایک نمونہ بنا دیں۔ اس نے ان لوگوں کو بتلایا کہ تمھاری یہ تمام تمنائیں اور آرزوئیں ایک سودائے خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زمین کی پیداوار اور آبادی کے جو اٹل قوانین ہیں وہ تمھاری تمام کوششوں کو ضرور بالضرور برباد کر ڈالیں گے۔ آبادی کے اضافہ کا یہ قانون ہے کہ وہ دونی چوگنی آٹھ گنی بڑھتی ہے لیکن زمین کی پیداوار میں اضافہ ایک دو تین کی نسبت سے ہوتا ہے۔ آبادی اور غذا کے اضافہ کی رفتار میں جو کثیر فرق ہے اس سے غذا اور آبادی کا توازن بگڑتا رہتا ہے جس سے لوگوں میں غذا کے حاصل کرنے کے لئے کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے کچھ کھانے سے محروم رہتے ہیں اور جب کبھی یہ توازن بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے وبائیں پھیلتی ہیں۔ قحط سالی پیدا ہوتی ہے۔ خانہ جنگیاں اور بین الاقوامی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ غرضکہ فتنہ و فساد اور تکلیف و مصیبت کا دور دورہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے آدمی مر جاتے ہیں۔ یا مارے جاتے ہیں اور اس طرح غذا اور آبادی کا بگڑا ہوا توازن دوبارہ برابر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہی سلسلہ از سر نو شروع ہو جاتا ہے۔ جو قومیں عقلمند اور عاقبت اندیش ہوتی ہیں وہ کوشش کرتی ہیں کہ اپنی آبادی کو حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں اور زیادہ اولاد کو قصداً اور ارادتاً پیدا نہیں ہونے

دیتی ہیں اور اپنی اس پیش بینی کی وجہ سے قدرتی مصیبتوں سے نجات حاصل کر لیتی ہیں اور جو ایسا نہیں کرتیں یا نہیں کر پاتیں انہیں وقتاً فوقتاً قدرت کی ان اصلاحی کوششوں کا مقابلہ کرنا اور اپنی ناعاقبت اندیشیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مالتھس کے بعد رکارڈو نے زمین کی پیداوار کے بارے میں اپنا قانون پیش کیا جس سے مالتھس کے نظریہ آبادی کی جو خامی تھی وہ رفع ہو گئی۔ مالتھس اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان نہ کر سکا تھا کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ تیزی کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی اس کسر کو رکارڈو نے پورا کر دیا۔ اس نے لوگوں کے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر اس بات کو ثابت کیا کہ جب ایک ہی زمین پر زیادہ محنت اور لاگت لگائی جاتی ہے تو چاہے محنت اور لاگت پہلے کے برابر ہی لگائی جائے لیکن اس سے زمین کی پیداوار میں پہلے کے برابر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے کی نسبت سے کم اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے اگر ایک روپے کی لاگت لگانے سے پیداوار میں ایک من کا اضافہ ہوا تھا تو بعد میں ایک روپیہ لگانے سے پون من کا اضافہ ہوگا اور چاہے لاگت کو برابر ایک ہی روپیہ سے ہم بڑھاتے جائیں لیکن پیداوار کا نیا اضافہ ہر پچھلے اضافہ کے مقابلہ میں گھٹتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک حد ایسی بھی آ سکتی ہے کہ ایک روپیہ کی مزید لاگت لگانے کے باوجود پیداوار میں کوئی مزید اضافہ نہ ہو۔ رکارڈو نے اپنے اس نظریے کا نام قانون تقلیل حاصل رکھا تھا۔

جب لوگوں نے رکارڈو کے اس قانون تقلیل حاصل کو مالتھس کے قانون آبادی کے ساتھ ملا کر دیکھا تو ان کے نزدیک زمین اور آبادی کا مسئلہ بالکل صاف ہو گیا۔ انھوں نے کہا آبادی کے بڑھنے سے اس میں شک نہیں کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر نیا شخص ایک منھ کے ساتھ دو ہاتھ لے کر بھی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ منھ تو اتنی ہی غذا طلب کرتا ہے جتنی پہلے آدمیوں کے لئے ضروری تھی لیکن بعد کے آدمیوں کے ہاتھ پہلے آدمیوں کے ہاتھوں کے مقابلہ میں زمین سے کم غذا حاصل کر پاتے ہیں۔ نئے کام کرنے والے جب زمین پر کام شروع کرتے ہیں تو ہر چند وہ پرانے کام کرنے والوں کے برابر محنت کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں پرانے کام کرنے والوں کے مقابلہ میں زمین سے غذا کی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔ اسے فطرت کا بخل کہیے جو چاہے کہیئے لیکن یہ اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس لئے اگر آبادی زیادہ بڑھے گی تو لوگوں کے افلاس اور پریشان حالی میں بھی ضرور اضافہ ہوگا۔ مالتھس اور رکارڈو

کے بعد جان اسٹوارٹ مل نے اس نظریے کو ضروری ترمیم اور اصلاح کے بعد اور زیادہ بہتر شکل میں پیش کیا اور بعد میں مارشل نے اسے اور بھی زیادہ پسندیدہ شکل دے دی جس کی تائید ہے۔ ایم کینس اور کیمبرج اسکول کے دوسرے ماہرین معاشیات نے جاری رکھی۔

اس یاس پسند گروہ کے مقابلہ میں جو انسانی ترقی کے امکانات کو محدود سمجھتا ہے دوسرا گروہ امید پروروں کا ہے جن کا کہنا ہے کہ انسانوں کی مرفہ الحالی اور معاشی ترقی پر قدرت کی طرف سے کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ وہ اپنے دعوے کی تائید میں کہتے ہیں کہ زمین کی زرخیزی میں پچھلے زمانے میں اضافہ ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ کاشت کے نئے طریقوں کے دریافت ہو جانے سے نئی نئی زمینیں زیر کاشت لائی جا رہی ہیں۔ پھر نئے ملکوں میں زرخیز زمینیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ دوسری طرف آبادی میں اضافہ اس قدر تیزی سے نہیں ہو رہا ہے جس کا اندیشہ مالتھس اور اس کے پیروؤں نے کیا تھا۔ ایجاد واختراع کی جن نئی قوتوں کو انسان نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے ان کے ذریعہ کثیر سے کثیر آبادی کے لئے مرفہ الحالی کے وسائل فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ آج جہاں کہیں بھی افلاس اور پریشاں حالی نظر آتی ہے اس کا اصل سبب آبادی کی کثرت نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ آبادی کی کثرت افلاس کا نتیجہ ہے اس کا سبب نہیں ہے۔ مالتھس نے اپنے زمانے میں انگلستان کو ضرورت سے زیادہ آباد بتلایا تھا اور تلقین کی تھی کہ انگلستان کو یا تو عاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنی تعداد کو گھٹانا چاہیئے ورنہ قحط سالی، وبا اور خانہ جنگی کے پھیلنے کا اندیشہ ہے جس سے آبادی کو قدرت کی طرف سے جبراً کم کر دیا جائے گا۔ لیکن انگلستان کی آبادی کم ہونے کی جگہ دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی رہی اور اس کثیر آبادی کے لئے امریکہ کی زائد پیداوار سے غذا اور اپنی ملکی پیداوار سے سامان آسائش فراہم ہوتے رہے۔ انگلستان کی موجودہ آبادی کثرت تعداد کے باوجود آج جس قدر خوش حال نظر آرہی ہے اتنی مالتھس کے زمانہ میں نہیں تھی حالانکہ اس وقت آبادی آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ پھر یہ بات انگلستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام یورپ اور امریکہ کے متعلق یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ اور دنیا کے زیادہ تر ملکوں کے سامنے آبادی کی زیادتی کا مسئلہ آج اس قدر اہم نہیں ہے جتنا آبادی کی کمی کا ہے۔

ایشیا کے چند ملکوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سیاسی رہنما اس وقت آبادی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس آبادی بڑھانے کی تدبیریں نکال رہے ہیں۔ غرضکہ اس قسم کے واقعات اور مشاہدات تھے جنھوں نے امید پرور گروہ کو مالتھس اور کارڈو کی مخالفت پر آمادہ کیا تھا۔ اس گروہ کے ابتدائی علمبرداروں میں کیری ہملٹن وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں بعد میں ہنری جارج نے بھی ان کے نظریوں کی مخالفت میں حصہ لیا اور موجودہ زمانے میں ایڈورڈ کینن اور ان کے شاگرد ڈالٹن اور رابنس اور لنڈن اسکول آف اکنامکس کے دوسرے معاشی ماہروں نے مالتھس کے نظریے کے مقابلہ میں نئے حالات کو سامنے رکھ کر ایک نیا نظریہ یعنی نظریہ آبادی متناسب (OPTIMUM THEORY OF POPULATION) پیش کیا ہے۔

اس نظریے کے حامیوں کے نزدیک آبادی کی محض تعداد چاہے وہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو خطرناک چیز نہیں ہے۔ وہ آبادی کے اضافہ سے نہیں گھبراتے جس چیز کو وہ خطرناک سمجھتے ہیں وہ غیر متوازن آبادی ہے یہ غیر متوازن آبادی تعداد کی کمی کی حالت میں بھی پائی جاسکتی ہے۔ اور تعداد کی زیادتی کی حالت میں بھی۔ اس کا تعلق محض تعداد سے نہیں ہے بلکہ تعداد کی طلب سے ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عہد جہالت اور وحشت میں آج کی آبادی کے مقابلہ میں صرف ایک بٹہ ایک لاکھ آبادی پائی جاتی ہو لیکن پھر بھی دنیا ضرورت سے زیادہ آباد نظر آتی ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آج سے پانسو سال بعد دنیا میں آج کے مقابلہ میں پچاس گنا آبادی زیادہ ہو اور پھر بھی دنیا ضرورت سے کم آباد معلوم ہو۔ آبادی کی تعداد بجائے خود مطلق طریقہ پر کوئی معیار نہیں بن سکتی بلکہ اسے طریقہ پیداوار اور نظام معیشت سے نسبت دینے کی ضرورت ہے اور آبادی کی جس تعداد کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا امکان پیدا ہوسکے وہی مناسب ترین آبادی ہے اور اسی کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ آبادی کے بڑھنے کا امکان طریقہ پیداوار دولت اور انسانی ایجاد واختراع کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ چیزیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے آبادی کی انتہائی حد بھی ایک جگہ قائم نہیں رہتی وہ بھی بدلتی رہتی ہے مسٹر کار ساونڈرس بھی اسی نقطہ خیال کے حامی ہیں۔ انھوں نے دنیا کی آبادی کو نسلوں کے اعتبار

سے تقسیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یورپی نسل کے لوگ جہاں جہاں آباد ہیں وہاں آبادی کا رجحان کمی کی طرف ہے اور بعض ملکوں میں فی الحال اور بعض میں اب سے دس سال بعد اور بعض میں بیس سال یا اس سے زاید مدت میں آبادی کی یہ کمی ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے لئے ناکافی ثابت ہوگی۔ صرف چین، ہندوستان اور چند دوسرے غیر یورپی ملک ایسے ہیں جن کی آبادی میں ترقی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے اور ان کے قدرتی وسائل، طریقہ پیداوار دولت اور معیشت کی موجودہ تنظیم کا لحاظ کرتے ہوئے اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں آبادی کی کثرت کا مسئلہ آئندہ سالوں میں ایک خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ یہاں ہم ہندوستان کے مسئلہ آبادی کا ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں۔

(۲)

ہندوستان کے مسئلہ آبادی کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو تو یہ ہے کہ آیا ہندوستان میں اسوقت آبادی گنجائش سے زیادہ ہے یا نہیں اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ صورت حال قائم اور جاری رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی ہے۔ پہلے پہلو کا بالواسطہ ثبوت تو امراض اور اموات کے اعداد پیش کرکے دیا جا سکتا ہے اور بلا واسطہ ثبوت غذا کی رسد کا تخمینہ کرکے۔ اگر اس تخمینہ سے یہ ثابت ہو کہ غذا ناکافی ہے اور دوسرے ملکوں سے مصنوعہ اشیا یا خدمات کے معاوضہ میں غذا کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ہندوستان کی آبادی کو بساط اور گنجائش سے زیادہ کہا جائے گا اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوگا کہ آیا یہ صورت حال قائم رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی یہ صورت حال دو ہی صورتوں میں ختم ہو سکتی ہے یا تو یہ ہو کہ وسائل غذا میں آبادی کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہو یا پھر یہ ہو کہ آبادی تیزی کے ساتھ گھٹنا شروع کردے۔ اب آیئے ان سوالوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جائے۔

کسی ملک کی آبادی اور اس کی زمین میں جو باہمی تعلق پایا جاتا ہے اس کی نوعیت کا اگر پتہ چلانا ہو تو اس کی سہل ترین صورت یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس ملک میں لوگوں کی عمر اوسطاً کیا ہوتی ہے یعنی جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ ہر ملک میں کچھ بچے تو ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اسی پچاسی برس کی عمر تک پہنچتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو چالیس پچاس سال سے آگے نہیں بڑھتے اور کچھ پیدا ہونے کے

دو تین دن بعد ہی مر جاتے ہیں۔ لیکن ان مختلف عمروں تک پہنچنے والوں کے تناسب ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں۔ طویل عمر تک پہنچنے کا انحصار بچے کی قوت حیات پر ہوتا ہے۔ بچے کی قوت حیات پر نسل اور وراثت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم اثر گرد و پیش کے حالات کا پڑتا ہے۔ زندگی کی ترقی کے لئے پہلی ضرورت کافی اور مناسب غذا کھلی اور صاف ہوا میں ورزش اور جسم کا آرام ہے۔ دوسری ضرورت سردی گرمی اور دوسرے مخالف موسمی اثرات سے بچاؤ کی تدبیریں ہیں۔ تیسری ضرورت زندگی کے دشمن جو جراثیم اور امراض ہیں ان سے جسم کو محفوظ رکھنا ہے اور چوتھی ضرورت یہ ہے کہ اگر ان ابتدائی مدافعانہ تدبیروں کے باوجود کوئی شخص امراض کا شکار ہو جائے تو اس کے علاج کا معقول انتظام موجود ہو۔ اگر یہ سب چیزیں فراہم ہو جائیں تو پھر بچہ کے لئے زیادہ عمر تک زندہ رہنے کی توقع بہت بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو انسان فانی ہے اور پیدا ہونے کے بعد مرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن جتنے زیادہ دن تک اس اٹل تقدیر کو ٹالا جا سکے اتنی ہی انسان کی کامیابی ہے۔ دنیا کے مہذب ملکوں نے اس سلسلہ میں جو معیار قائم کئے ہیں وہ ہمارے لئے ایک نمونہ اور مثال ہیں۔ ڈنمارک میں پیدائش کے وقت بچوں کے زندہ رہنے کی توقع اوسطاً ۷۰ برس کی جاتی ہے۔ انگلستان اور ویلز میں ۶۵ سال تک جرمنی میں بچاسی سال تک اور فرانس میں ۶۴ سال تک۔ لیکن ہندوستان میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے جینے کی توقع اوسطاً ۳۲ سال کی ہوتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب بچے صرف ۳۲ سال تک جیتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بہت سے بچے کم عمری اور نوجوانی میں مر جاتے ہیں اور بہت کم اسی بچاسی سال تک کی عمر تک پہنچ پاتے ہیں اور اگر اوسط نکالا جائے تو لوگوں کی عمروں کا اوسط ۳۲ سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ اس افسوسناک حالت کے کیا وجوہ اور اسباب ہیں؟ کیا ہمارے بچوں کا بیج کمزور ہوتا ہے انھیں اپنے والدین سے بہت کم قوت حیات کا ترکہ ملتا ہے۔ کیا ماں کے پیٹ میں انھیں مناسب غذا اور آرام نہیں ملتا۔ کیا پیدا ہونے کے بعد بچے کو اس کی ماں ایسا دودھ نہیں پلا سکتی جو اس کی قوت حیات کو مضبوط کر سکے۔ کیا دودھ چھوٹنے کے بعد بچپنے کے نازک دور میں بچوں کی غذا ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا جو بندوبست ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتا۔ کیا ان کی نشو و نما اور ترقی کا سلسلہ ابتدا ہی میں رک جاتا ہے۔ کیا

امراض کے مقابلہ کرنے اور ان کو رفع کرنے کی قوت ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ سردی گرمی کو برداشت نہیں کرسکتے موسم کا ذرا سا تغیر ان کے نظام جسم میں ابتری پیدا کرکے انھیں بیمار ڈال دیتا ہے۔ کھانسی بخار، ملیریا، انفلوئنزا، ٹائیفائیڈ، تپ دق، ہیضہ، چیچک، پلیگ وغیرہ کے وہ شکار رہتے ہیں۔ عورتیں زچگی کی حالت میں بخار میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہیں۔ یہ سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر شخص اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کی شہادت پیش کرسکتا ہے کہ درحقیقت ہمارے بدنصیب ملک میں صورت حال ایسی ہی ہے۔ ہماری ملک کی شرح اموات ۲۹ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے کمترین شرح اموات ۱۵ فی ہزار قرار دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی شرح اموات اس اوسط سے ۲ ½ گنا زیادہ ہے۔ پھر جب مختلف عمروں کی موتوں پر نظر کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی شرح اموات تمام مہذب ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے تقریباً $\frac{1}{5}$ ایک برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں اور اموات کی کل شرح میں بچوں کی موتوں کا تناسب $\frac{1}{5}$ ہے۔ شہروں میں خصوصیت کے ساتھ حالت نہایت افسوسناک ہے۔ مثلاً بمبئی میں ایک ہزار پیدا ہونے والے بچوں میں سے ۶۵۵ بچے بچپنے میں ہی مر جاتے ہیں ؂

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

برخلاف اس کے لندن میں ایک ہزار بچوں میں صرف ۷۰ بچے بچپنے کی عمر میں مرتے ہیں ؂

~~ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا~~

ایک زمانہ تھا جب یورپ کے ملکوں میں بھی ہندوستان کی طرح شرح اموات بہت زیادہ تھی لیکن اسی صدی کے دوران میں وہاں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

ہمارے یہاں بچے پیدا بہت ہوتے ہیں۔ ہماری شرح پیدائش ۴۳ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ شرح پیدائش ۴۵ فی ہزار مقرر کی ہے۔ ہم اس لحاظ سے اس معیار کے بہت قریب ہیں۔ لیکن ہماری شرح اموات چونکہ بہت زیادہ یعنی ۳۰ فی ہزار ہے اس لئے

باقی رہنے والے بچوں کا تناسب پانچ فی ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری مجموعی آبادی میں اضافہ ہماری شرح پیدائش کے تناسب سے نہیں ہوتا۔

طبی تحقیقات کا کام کرنے والے عالموں کی جو آل انڈیا کانفرنسیں ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھیں ان میں دونوں مرتبہ ایک رزولیوشن ایک ہی طرح کے الفاظ میں بجنسہ منظور کیا گیا تھا۔ اس رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا:۔

"اس کانفرنس کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ہر سال ایسے امراض سے جن کا تدارک ممکن ہے، ہندوستان میں تقریباً پچاس ساٹھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ جو لوگ امراض میں مبتلا ہو کر اچھے ہوجاتے ہیں ان کی محنت سے اوسطاً فی شخص دو تین ہفتہ تک ملک محروم رہتا ہے۔ لوگوں کے کام کی اہلیت میں امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جو کمی واقع ہوتی ہے وہ بیس فی صدی سے ہرگز کم نہیں ہوتی پیدا ہونے کے بعد جو بچے جوان ہو کر دولت کماتے ہیں ان کا تناسب پچاس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے حالانکہ نہایت آسانی سے اسے اسی یا نوے فی صدی کیا جاسکتا ہے۔ کانفرنس کا یہ عقیدہ ہے کہ اوپر جو تخمینے پیش کئے گئے ہیں ان میں اعداد کو مبالغہ کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ واقعی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہے اور ہندوستان کو ہر سال اربوں روپیہ کا نقصان قابل علاج بیماریوں کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے کروڑوں آدمی غیر ضروری درد اور تکلیف، رنج اور مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔"

یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو طبی تحقیقات کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ صورت حالات نہایت افسوسناک ہے۔ اب آئیے اس کے بنیادی سبب کا بھی پتہ لگایا جائے۔

اس کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا سبب غذا کی کمی ہے۔ لوگوں کو مناسب غذا کافی مقدار میں نہیں ملتی۔ نوعمری کی شادی اور والدین کی کمزوریوں کی وجہ سے اس میں شک نہیں اولاد کی قوت حیات پر برا اثر پڑتا ہے لیکن اگر بچے کی تربیت اور نگہداشت ابتدا سے ہی اچھی طرح سے کی جائے تو بڑی حد تک اس

اثر کو زائل کیا جا سکتا ہے اور چند نسلوں میں کمزور بچوں کی جگہ طاقتور بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے پہلا اور نہایت اہم سوال کافی اور مناسب غذا کا ہے۔ بچوں کے لئے اچھا اور بہت سا دودھ چاہیئے۔ ماں کا دودھ گائے کا دودھ بھینس کا دودھ نوجوانوں اور بالغوں کے لئے مکھن گھی، دودھ، اناج، ترکاری، پھل، انڈا، گوشت، شکر اور شہد چاہیئے۔ یہ چیزیں مہیا کر دیجئے آپ کے بچوں کی شرح اموات کم ہو جائے گی، آپ کے جوان امراض سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ان کی کارگذاری کی اہلیت میں اضافہ ہوگا۔ ان میں مقابلہ کا اور سابقت کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوگی۔ وہ آگے بڑھیں گے اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے۔ دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔ ساری دنیا ان پر رشک کرے گی۔ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب نہیں بنیں گے بلکہ رحمت اور محبت کے فرشتے بن سکیں گے۔ اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے اور دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مناسب اور کافی غذا کہاں سے دی جائے۔ غذا کا ذخیرہ زمین میں دفن ہے۔ زمین کو کھود کر اور نباتات کی نشو و نما اور پختگی کے لئے فطرت کی طرف سے جو مدت مقرر کی گئی ہے اس کا انتظار کرکے اسے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے غذا کے اس ذخیرے کو زمین سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے چاہے یہ زمین اپنے ملک کی ہو چاہے دوسرے ملکوں کی۔ دوسرے ملکوں کو ان کی غذا کے رسد کے معاوضہ میں دینے کے لئے کچھ سامان یا اہلیت اپنے پاس موجود ہونا چاہیئے تب ہی دوسرے ملک خوشی سے اپنی غذا کے ذخیرے میں ہمیں شریک کریں گے ورنہ ہمیں اپنے ملک کے غذا کے ذخیرے پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔

ہندوستان کی آبادی چونکہ زیادہ تر زراعت پیشہ ہے اس لئے یہاں کے لوگ اپنی غذا کی چیزیں اپنے ملک کی زمین سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ ہندوستان میں آج کیا صورت حال ہے۔ کیا یہاں کی زمین اپنی آبادی کو کافی مقدار میں غذا دے رہی ہے یا دے سکتی ہے یا نہیں دے رہی ہے اور نہیں دے سکتی ہے۔ شرح اموات اور امراض کی حالت کا جو بیان اوپر کیا گیا ہے اس سے تو یہ بات بالواسطہ ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی رسد کافی نہیں ہے۔ لیکن یہ شہادت قطعی نہیں ہے

کیونکہ دوسرے اسباب بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو تندرستی اور زندگی کے قیام اور ترقی میں حایل ہوں۔ لوگ جاہل اور بے تمیز ہو سکتے ہیں۔ حفظان صحت کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن میرا یہ دعوے ہے کہ ہندوستان میں یہ تمام باتیں ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس ملک میں ابتدائی اہمیت غذا کی کمی کو حاصل ہے اور اس کا ثبوت میں ابھی پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر شاہ اور مسٹر کھمباتا نے ۱۹۲۲ء میں اپنی مشترکہ کتاب ویلتھ اینڈ ٹیکس ایبل کیپے سٹی آف انڈیا شائع کی تھی۔ اس کتاب میں پروفیسر شاہ نے ایک طرف تو ہندوستان میں غذا کی جو سالانہ پیداوار ہے اس کا تخمینہ کیا تھا۔ اس میں ہر قسم کے اناج اور غذاؤں کا لحاظ رکھا گیا تھا اور دوسری طرف یہ دیکھا تھا کہ کمترین خوراک جو ہندوستان کی آبادی کے لئے ضروری ہے اس کی کیا مقدار ہے۔ اس خوراک کا تخمینہ اس طرح کیا گیا تھا کہ پہلے تو سرکاری طور پر مختلف موقعوں پر جو کمترین غذا ایک آدمی کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اس کے اعداد کو جمع کیا گیا۔ مثلاً ہندوستان کی جیلوں میں قیدیوں کو جو روزانہ خوراک دی جاتی ہے۔ بمبئی کے صوبہ میں قحط سالی کے زمانہ میں جو خوراک ایک ایک آدمی کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستانی فوج میں اور ملاحوں کو حکومت کی طرف سے جو راشن دیا جاتا ہے ان کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر بمبئی کے مزدور جس قدر غذا اوسطاً کھاتے ہیں تحقیقات کے بعد اس کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر یورپ کے مزدور جس قدر غذا کھاتے ہیں اس کے اعداد دیے گئے اور ان سب کا اوسط نکال کر ایک اوسط آدمی کی غذا کا تخمینہ کیا گیا۔ پھر مردوں کے اس اوسط سے عورتوں اور بچوں کی خوراک کے لئے ایک اوسط مقرر کیا گیا اور پھر تمام ہندوستان کے لوگوں کے لئے اوسطاً جس قدر کم سے کم غذا چاہیئے اس کا تخمینہ کیا گیا۔ اس باقاعدہ تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کمترین غذا کی جتنی ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انھیں جو غذا اس وقت مل رہی ہے وہ چالیس فی صدی کم ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہندوستان کے ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی بالکل بھوکا رہے۔ یا تینوں آدمی ایک تہائی بھوکے رہیں عموماً دوسری ہی صورت پر عمل ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی عام طور پر فاقہ زدہ نظر آتے ہیں اور ان کی قوت حیات اور بیماریوں کو دفع کرنے کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔

اس قسم کے تخمینے اور لوگوں نے بھی کیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ لایق ذکر ڈاکٹر ڈوبے کا تخمینہ ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کی غذا کی رسد ان کی ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے۔ بچوں کو کمزور اور فاقہ زدہ ماؤں کا دودھ پینا پڑتا ہے۔ جانوروں کا دودھ بھی مناسب چارہ نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے اور اس کی مجموعی رسد بھی بہت قلیل ہے جس کی وجہ سے ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ غلہ اور اناج جن کے بغیر گذر کی کوئی صورت ہی نہیں ہے وہ بھی کافی مقداروں میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ تندرستی کو قائم رکھنے کے لیے جن دوسری چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً ترکاری، شکر، مکھن، گھی، انڈا، گوشت، پھل یہ چیزیں تو صرف چند خوش نصیب لوگوں کو میسر آتی ہیں باقی تمام تر آبادی ان چیزوں سے محروم رہتی ہے۔ نتیجہ اس کا شرح اموات کی کثرت اور بیماریوں کی اس ہمہ گیری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جن کے بارے میں اعداد اوپر درج کیے جا چکے ہیں۔

غرضکہ جو کچھ اب تک بیان کیا گیا اس سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ہندوستان کی زمین یہاں کی آبادی کے لیے جتنی چاہیے اتنی غذا پیدا نہیں کر رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا کیا علاج ہے صحت اور زندگی کے قائم رکھنے کے لیے جو دوسری چیزیں چاہیے انھیں تو فی الحال چھوڑیے۔ صرف غذا کے مسئلہ کو لیجیے۔ غذا کی کمی کئی طریقوں سے دور کی جا سکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ غذا کی رسد کو بڑھایا جائے۔ غذا کی رسد بڑھانے کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خود اپنے ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اسے روکا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ باہر کے ملکوں سے غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ ان تدبیروں سے تو ملک کے اندر غذا کی مقدار کو بڑھایا جا سکتا ہے لیکن دوسرا طریقہ توازن پیدا کرنے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غذا کھانے والوں کی تعداد کو کم کیا جائے یعنی آبادی کو گھٹایا جائے۔ آبادی کو دو طرح سے کم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اپنے ملک کی زائد آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں بھیجا جائے اور دوسرے اس طرح کہ نئی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے تاکہ جو بوڑھے اور بیمار مرتے جائیں ان کی جگہیں اس وقت تک خالی رہیں

جب تک آبادی اور غذا میں توازن نہ پیدا ہو جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ملک کی صنعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ باہر کے ملکوں کی مصنوعات منگانا بند کیا ہے تاکہ ان ملکوں کی مصنوعات کے معاوضہ میں ملکی غذا کی جو مقداریں باہر بھیجنا پڑتی ہیں وہ نہ بھیجنا پڑیں اپنے ملک سے دوسرے ملکوں کو مصنوعات روانہ کی جائیں اور اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں ان ملکوں سے اشیاء غذا حاصل کی جائیں۔ چوتھا اور آخری طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اوپر جتنے طریقے بتلائے گئے ہیں ان سب کو جمع کیا جائے اور سب کو بیک وقت اختیار کیا جائے۔

آئیے ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو الگ الگ لے کر دیکھیں کہ یہ کس حد تک مفید اور قابل عمل ہیں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ موجودہ طریقہ کاشت کو جاری رکھتے ہوئے اجناس خوردنی کے تناسب کو بڑھایا جائے اور اجناس غیر خوردنی کے تناسب کو گھٹایا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زراعت کو عام طور پر وسعت دی جائے اور اس طرح کسانوں کی قوت خرید کو بڑھایا جائے تاکہ بعد میں وہ جو چاہیں خرید سکیں۔

آئیے پہلے پہلی صورت کو لیں۔ ہندوستان میں اجناس خوردنی کا تناسب ۸۰ فی صدی ہے اور اجناس غیر خوردنی کا تناسب ۲۰ فی صدی ہے۔ اجناس غیر خوردنی عموماً تجارتی اجناس ہیں اس لئے ان کی کاشت عموماً بہتر قسم کی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ اگر ان کی کاشت کو بند کر دیا جائے تو غذا کی رسد میں کم سے کم ۲۰ فی صدی کا ضرور اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کسان کا مقصد محض اپنی غذا کی رسد بڑھانا نہیں ہے بلکہ کسان کو لگان وغیرہ ادا کرنے کے لئے نقد رقم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسان تجارتی فصلوں کو اس لئے بوتا ہے کہ ان کے بونے سے اسے نقد رقم حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ان کی کاشت بند کرے گا تو زمیندار اور سرکار کا مطالبہ ادا کرنے میں ضرور اسے دشواری پیدا ہوگی اور اسے اپنے کھیت تک سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ اس لئے کسان کے لئے موجودہ حالات میں یہ طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم

ہوتا۔

اب دوسرے طریقے یعنی زراعت کی عام ترقی کو لیجئے۔ اس سلسلہ میں ترقی کی گنجائش ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے۔ زراعتی ترقی کے لئے پہلی ضرورت آبپاشی کا انتظام ہے۔ ہندوستان کے کل رقبہ میں سے تقریباً ۱/۵ حصہ کی آبپاشی کی جاتی ہے باقی ۴/۵ رقبہ کی فصلیں برسات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ بارش مناسب موقع پر اور کافی مقدار میں ہو جائے تو فصل اچھی ہو جاتی ہے ورنہ فصل خراب ہو جاتی ہے۔ بارش کے غیر یقینی ہونے سے ملک کی پیداوار کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا تخمینہ کسی حالت میں کروڑوں اور اربوں روپیوں سے کم نہیں ہے۔ لیکن آبپاشی کا انتظام ہر جگہ ممکن نہیں ہے اور جہاں ممکن ہے وہاں آبپاشی کے ذرائع کو تعمیر کرنے میں بہت زیادہ سرمایہ لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہندوستان کے جتنے رقبہ پر آبپاشی ہوتی ہے اس میں تقریباً آدھا ایسا رقبہ ہے جس کی آبپاشی سرکاری نہروں اور تالابوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور آدھے کی پرائیویٹ ذرائع سے۔ سرکاری نہروں وغیرہ سے کل مزروعہ رقبہ کے صرف ۱/۱۲ حصہ کی آبپاشی ہوتی ہے لیکن پھر بھی ان کے بنانے میں حکومت کو ایک ارب ۳۷ کروڑ کا سرمایہ لگانا پڑا تھا یعنی فی ایکڑ ۲۲ روپیہ کا سرمایہ۔ پھر یہ سرمایہ اس وقت لگانا پڑا تھا جب پانی کی بہم رسانی کے ایسے ذرائع موجود تھے جن سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔ اب ایسے ذرائع بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے آبپاشی میں مزید اضافہ کروڑوں روپیہ صرف کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

زراعتی ترقی کے لئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ کسانوں کی جوت میں کافی بڑے رقبہ ہوں۔ کسانوں کی جوت میں اس وقت جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بنگال میں جو لوگ کھیتی کا کام کرتے تھے ان کی جوت میں اوسطاً ۲٫۲ ایکڑ کا رقبہ تھا۔ ہندوستان کے دوسرے بڑے صوبوں میں اس رقبہ کا اوسط ۳ ایکڑ ہوتا تھا۔ بمبئی، سرحدی صوبہ اور پنجاب میں البتہ یہ رقبہ اوسطاً ساڑھے دس ایکڑ ہوتا تھا۔ یہ رقبے اتنے مختصر ہیں کہ ان پر مشین اور دوسرے جدید سائنٹیفک طریقوں کا استعمال نفع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ آبادی کے اضافہ اور صنعتوں کی کمی کی وجہ سے کسانوں کی جوت میں جو رقبے ہیں

وہ نسل بعد نسل گھٹتے چلے جا رہے ہیں اور جب تک آبادی نہ گھٹے یا صنعتیں اور دوسرے پیشے آبادی کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر جذب نہ کریں اس وقت تک زراعت کی ترقی میں یہ چیز بہت زیادہ حایل رہیگی حکومت کی طرف سے قوانین بنا کر اور امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرکے کسان کے کھیتوں کے انتشار کو رفع کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں لیکن اس میں بھی روپیہ کا خرچ زیادہ ہے۔

زراعتی ترقی کے اور دوسرے کاموں کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے مثلاً اچھے بیج، اچھے کھاد، اچھے اوزار، اچھے بیل، جانوروں اور کیڑوں سے فصل کی محافظت، پودوں کی بیماریوں کا علاج، جتائی، بوائی، نرائی کے نئے طریقوں کی تعلیم، ایک مقررہ معیار کی یکساں پیداوار حاصل کرنا، پیداوار کو اچھے نرخ پر ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرنا، نئی نفع بخش فصلوں کی کاشت، مکھن، شہد، مرغی اور گوشت کی پیداوار بڑھانا، نئی زمین کو کاشت میں لانا۔ ان سب کاموں کے لئے ابتدا میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اور ان کے بارے میں جو علمی تحقیقات ہو چکی ہیں ان سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ان طریقوں سے غذا کی پیداوار اسی صورت میں بڑھائی جا سکتی ہے جب زیادہ سرمایہ، زیادہ دماغی اور جسمانی محنت اور زیادہ تنظیم سے کام لیا جائے۔

اوپر جو باتیں بیان کی گئیں ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے لیکن آسانی سے نہیں بلکہ زیادہ سرمایہ اور محنت صرف کرنے کے بعد جتنی زیادہ غذا کی ضرورت ہوگی اس نسبت سے بہت زیادہ سرمایہ اور محنت خرچ کرنا پڑے گی۔ ہندوستان نیا ملک نہیں ہے بلکہ یہاں ہزاروں برسوں سے زمین پر مسلسل کاشت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے یہاں قانون تقلیل حاصل کا عمل جاری ہے اور جب تک اجناس خوردنی کی قیمتوں میں ترقی نہ ہو زمین میں نفع کے ساتھ سرمایہ اور محنت کی زیادہ مقدار نہیں لگائی جا سکتی۔

غذا کی رسد بڑھانے کی اس صورت کو تو ہم نے دیکھ لیا۔ اب آیئے دوسری صورت کو لیں یعنی یہ دیکھیں کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اسے ہندوستان کے لوگوں کے لئے باہر جانے سے کس حد تک روکا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء غذا کی مجموعی

پیداوار کا جو حصہ برآمد کیا جاتا ہے وہ بہت کم ہے اور برابر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اب اشیاء غذا کی برآمد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی ہے۔ کھانے کی چیزوں کی برآمد کو قانوناً بند کرنے سے ملک کے لوگوں کو فائدہ پہنچنا یقینی نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں کسان اپنے نفع کی خاطر ان چیزوں کا بونا ترک کر کے تجارتی فصلیں بونا شروع کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسری تدبیر بھی غذا کی رسد نہیں بڑھا سکتی۔

اب تیسری تدبیر کو لیجئے یعنی باہر کے ملکوں سے زیادہ غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ باہر کے ملکوں سے غذا اسی وقت منگائی جا سکتی ہے جب ملک کے اندر ضروری قوت خرید موجود ہو۔ قوت خرید آمدنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کی اوسط آمدنی جس قدر کم ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ آمدنی اور قوت خرید زیادہ ہوتی تو ملک میں بھی زراعت کو خاصی ترقی دی جا سکتی تھی اور باہر سے بھی کھانے کی چیزیں منگائی جا سکتی تھیں۔ یورپ کے صنعتی ملک اپنی تمام غذا اپنے ملک میں پیدا نہیں کرتے بلکہ دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ ان کے پاس چونکہ دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات غذا کے معاوضہ میں دینے کے لئے موجود ہوتی ہیں اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس چونکہ باہر بھیجنے کے لئے مصنوعات نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے باہر سے کھانے کی چیزیں منگانا ممکن نہیں ہیں۔ ہم ہمیشہ انگلستان کے مقروض رہتے ہیں اور اس قرض کی ادائگی کے سلسلہ میں سالانہ ہمیں اپنے ملک کی کھانے کی چیزیں اور کچا مال ولایت بھیجنا پڑتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو ہم کیسے دوسرے ملکوں سے کھانے کی چیز منگا سکتے ہیں۔

غرضکہ غذا کی رسد بڑھانا بہت مشکل ہے اب توازن کے پیدا کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ آبادی کو کم کیا جائے۔ آبادی کو جیسا میں نے ابھی بیان کیا دو طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملک کی زیادہ آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں منتقل کیا جائے اور دوسری یہ ہے کہ نئی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے۔ ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو آبادی کے منتقل کر دینے کے امکانات بہت کم ہیں۔ دنیا میں بہت سے نئے ملک اور نوآبادیاں ایسی ہیں جن میں اگر ہندوستانی منتقل کر دئے

جائیں تو اس سے ان ملکوں اور ہندوستان دونوں کا فائدہ ہو لیکن ان سب ملکوں نے ہندوستانیوں کے داخلے کے خلاف سخت امتناعی قوانین جاری کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مہاجرین کی تعداد بہت کم ہے اور ہندوستان کی بڑھی ہوئی آبادی کو ہجرت سے بہت کم فائدہ پہنچنے کی امید رکھنا چاہیئے۔

آبادی کے کم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نئی اولاد پیدا کرنا کم کیا جائے۔ بلاشبہ یہی طریقہ ہندوستانیوں کے لئے اس وقت سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہندوستانی اپنی شرح پیدائش کو کم نہیں کریں گے تو اوپر لکھے ہوئے سب علاجوں کو اختیار کرنے کے باوجود کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی میں ہر دسویں سال جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے یہ یقیناً ایک نہایت تشویش ناک امر ہے۔ ترقی کی یہی رفتار قائم رہی تو چاہے ہم ملک کے چپہ چپہ پر انگلستان، جرمنی اور جاپان کی طرح صنعتیں کیوں نہ قائم کر دیں اور زراعت کو چاہے کیسی ہی ترقی کیوں نہ دیں ہماری حالت کبھی بہتر نہ ہو سکے گی۔ اس لئے اولاد کی پیدائش کو گھٹانا ایک لازمی اور قطعی فرض ہو گیا ہے۔ لیکن اس بات کا عام احساس پیدا کرنا اور لوگوں کے تعصبات اور رسم و رواج کا مقابلہ کرنا بہت دشوار کام ہے۔ پھر ضبط نفس کے علاوہ جو دوسرے مانع اولاد طریقے تبلائے جاتے ہیں ان کے خلاف مذہبی معتقدات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ پھر مالی اعتبار سے بھی یہ سب طریقے غریبوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے آبادی میں کسی فوری کمی کی توقع کرنا مناسب نہیں ہے لیکن ضبط نفس کی تعلیم کو جہاں تک مذہب اور اخلاقیات کی حدود میں رہتے ہوئے ممکن ہو پھیلانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لوگوں میں پیش بینی اور عاقبت اندیشی کے جذبہ کو پیدا کرنا چاہیئے۔ شادی کی عمر کو بڑھا دینا چاہیئے بچے کو دودھ پلانے کی مدت کو طویل کر دینا چاہیئے۔ دل بہلانے کے دوسرے مشغلوں مثلاً مطالعہ کتب اور فنون لطیفہ سے رغبت پیدا کرانا چاہیئے غریبوں اور بے کسوں کی امداد، خدمت خلق کے اور دوسرے کاموں، روزہ اور نماز کی طرف بھی لوگوں کو مائل کرنا چاہیئے کہ ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر۔

اس کے بعد آخری طریقہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دینے کا رہ جاتا ہے۔ اس میں جو گنجائش ہے اس کے بارے میں ہندوستان کے مفکروں اور معاشیات کے ماہروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہندوستان

یں صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بہت سی قدرتی سہولتیں موجود ہیں۔ مصنوعہ مال کے لئے ایسے گاہک آج بھی موجود ہیں جو باہر کے مال کو خرید کر اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ان خریداروں کو ملکی مال کا گاہک بنایا جا سکتا ہے اور دوسری طرف جب یہاں کی کثیر آبادی کو روزگار سے لگایا جائے گا اور ان کی قوت خرید کو بڑھایا جائے گا تو خریداروں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ خریداروں کی اس ترقی سے ملکی صنعتیں خوب ترقی پائیں گی اور روزگار اور قوت خرید میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

لیکن صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بڑے سرمایہ، باہنر مزدوروں، منتظموں اور حکومت کی اعانت اور مربیانہ سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک یہ سہولتیں فراہم نہیں ہوں گی، صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہے گی۔ اس کے علاوہ اور دوسرے سوالات بھی ہیں جو اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا جائے گا یا اوسط اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں مزدوروں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے زیادہ تر کام مشینیں ہی انجام دیتی ہیں۔ اس لئے اگر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا گیا تو ان کے ذریعہ سے ہندوستان کی موجودہ کثیر آبادی کے بہت کم حصہ کے لئے روزگار نکل سکے گا۔ اس وقت بڑے پیمانہ کی منظم صنعتوں میں ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صدی حصہ لگا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کا شمار دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں میں آٹھویں درجہ پر ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان میں منظم اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ترقی پا جانے سے یہاں کی پیداوار آج کے مقابلے میں دوگنی ہو گئی (جو ترقی کی خاصی تیز رفتار ہوگی) تو اس سے زیادہ سے زیادہ تقریباً ایک فی صدی آبادی کے لئے اور روزگار فراہم ہو سکے گا۔ لیکن ہندوستان میں آبادی کے محض اضافہ کی رفتار ایک فی صدی سالانہ ہے۔ اس لئے اگر آبادی کا موجودہ اضافہ جاری رہا تو ہمیں ہر سال ان کے لئے روزگار فراہم کرنے کے واسطے اپنی موجودہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے برابر نئی صنعتیں کھولنا ہوں گی۔ لیکن بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کو اسی وقت تک جاری رکھا جا سکتا ہے جب ان کے بنائے ہوئے مال کے لئے ایک وسیع منڈی موجود ہو۔ اگر کچے مال اور معدنیات کی رسد کے محدود ہونے کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو صنعتی ترقی کی اس رفتار کے لئے جس کو بحث کی خاطر ہم نے اوپر فرض کر لیا ہے ایک ایسی وسیع منڈی کی ضرورت ہوگی جس کے لئے ایک دنیا تو کیا ہماری جیسی کئی دنیائیں

بھی ناکافی ہوں گی۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے لیکن پھر بھی صنعتی ترقی کی اس رفتار کا حریف ہونا غالباً اس کے لیے از بس دشکل ہوگا اور موجودہ حالات میں جب کہ ہر ملک خود کفالتی نظام کے چکر میں ہے ہمیں اپنے آپ کو ملکی منڈی تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔

اس سے قطع نظر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے چھوٹی صنعتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور جتنے آدمیوں کو روزگار بڑی صنعتوں میں ملتا ہے اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ آدمی چھوٹی صنعتوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے روزگار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے بہت سی بنیادی اور ضمنی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے لیکن بصورت مجموعی آبادی کے لئے روزگار میں بہت زیادہ اضافہ کی امید رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

پھر ان غیر ملکی صنعتوں کو جن کا مال اس وقت ہندوستان میں فروخت ہوتا ہے۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے جو نقصان پہنچے گا اس کے اثرات بھی ناگوار صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں میں ہماری پیداوار کی موجودہ برآمد بند ہو جائے اور ہمارے ملک کے کسانوں اور کچا مال پیدا کرنے والوں کو جو فائدے اب حاصل ہوتے ہیں نہ ہو سکیں۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے ان کے مال کے لئے ملکی طلب ضرور پیدا ہوگی لیکن وہ شاید ان کے نقصان کی تلافی نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ اس کے سیاسی نتائج بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جن ملکوں کی صنعتوں کو ہماری ملکی صنعتوں کی ترقی سے نقصان پہنچے گا ممکن ہے وہ زور اور زبردستی، فتنہ انگیزی اور فساد کے ذریعہ ہماری صنعتی ترقی کو روکنا چاہیں۔ بہرحال جہاں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے فائدے ہیں وہاں اس کی ان نقصانوں اور خامیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور روزگار مہیا کرنے کی جو اہلیت ان میں پائی جاتی ہے اس کے محدود ہونے کا تو ہمیں شروع سے ہی اعتراف کر لینا چاہیئے۔

لیکن ہو سکتا ہے کہ صنعتوں کی ترقی کے ساتھ علمی پیشوں اور دوسری خدمتوں کے لئے ہمارے ملک میں زیادہ گنجائش نکل آئے، اور گھریلو اور چھوٹی صنعتیں بھی آرائش و زیبائش اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں جاری رہ سکیں، زراعت اور اس کے ضمنی اور متحدہ پیشوں کو بھی ہم خوب ترقی دے لیں اور ہماری غیر ملکی

تجارت میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہو۔ ہم بہت سی مصنوعہ یا نیم مصنوعہ چیزیں باہر کے ملکوں سے بھی منگانا جاری رکھیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے سب طبقوں کی خوش حالی میں عام طور پر اضافہ ہوگا اور لوگوں کی آمدنیوں کے ساتھ غذا کی زیادہ مقداریں خود اپنے ملک کے اندر اور باہر کے ملکوں سے خریدی جا سکیں گی۔

چوتھا اور آخری علاج میں نے یہ بتلایا تھا کہ ان سب علاجوں کو جمع کر دیا جائے اور سب کو ایک ہی وقت میں اختیار کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اتنا اہم اور تشویشناک ہوگیا ہے کہ اس کے لئے کوئی ایک واحد علاج اب کافی نہیں ہو سکتا۔ مختلف مورچوں سے اس پر حملہ کرنے کی ضرورت ہے جب ہی اس کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

کیا مزدوروں کی معاشیات سرمایہ داروں کی معاشیات سے مختلف ہے؟

(ذیل میں ہم ایک نہایت اہم اور دلچسپ بحث کی ابتدا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشیات کے وہ اصول جو ملکیت ذاتی، مقابلہ اور آزادیٔ کاروبار کی مفروضہ بنیادوں پر تعمیر کئے گئے تھے، سرمایہ دارانہ معیشت کے علاوہ اور دوسری قسم کی معیشتوں پر بھی منطبق کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ آجر کے نفع کی جگہ مزدور کے مفاد کو، نفع کی جگہ رفع احتیاجات کو اگر معاشیات کا مرکز بنایا جائے تو آیا اس صورت میں اسی طرح کا معاشیات کا علم تعمیر ہوگا جیسا راسخ العقیدہ ماہرین معاشیات پیش کرتے ہیں یا نتیجہ اس سے کچھ مختلف برآمد ہوگا۔ ہم معاشیات کے اصول سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں کو ایک عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر جامعہ کے صفحات میں اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مدیر)

معاشیات ایک اجتماعی علم ہے یعنی یہ بے جان فطرت یا نباتی اور حیوانی دنیا یا تنہا انسانوں کی زندگی کے مظاہر سے بحث نہیں کرتا بلکہ ان تعلقات سے بحث کرتا ہے جو انسانوں کے درمیان جماعت میں باہم مل کر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

جماعتی تعلقات کی وابستگیاں کتنی اہم ہوتی ہیں یہ ہر شخص جانتا ہے۔ انسان کے ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں بھی انسان کے بارے میں جماعت سے الگ رہنے کا تخیل قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسان کے متعلق یہ ٹھیک کہا گیا ہے کہ وہ جماعتی حیوان ہے۔

لیکن انسان کے جماعتی تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک طرف خاندانی تعلقات ہوتے ہیں۔ پھر ایسے سیاسی تعلقات ہوتے ہیں جو مختلف جماعتوں اور طبقوں کی کشمکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایسے تعلقات ہوتے ہیں جو آدمیوں کے تمدنی میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام تعلقات سے علم المعیشت میں بحث نہیں کی جاتی۔ اس کے مطالعہ کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ صرف ایسے جماعتی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے

جو آدمیوں میں جماعتی پیداوار کے پیدا اور تقسیم کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کا نام دولت آفرینی کے تعلقات رکھا جاتا ہے۔

جس طرح آدمیوں کا جماعت سے باہر تصور کرنا ناممکن ہے ایسے ہی کسی ایسے شخص کا تصور بھی ناممکن ہے جو جماعت میں رہتے ہوئے دوسرے آدمیوں سے دولت آفرینی کے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ ان حالتوں میں بھی جب لوگ براہ راست پیدائش دولت میں کوئی حصہ نہیں لیتے، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان میں دولت آفرینی کے کوئی تعلقات (اگر دولت آفرینی کو اس کے وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے) نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو کھانا، پینا، پہننا یا کسی نہ کسی دوسری شکل میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے اور جس حد تک یہ کرنا پڑتا ہے اس حد تک دولت آفرینی کے تعلقات بھی ان لوگوں سے پیدا کرنے پڑتے ہیں جو اپنی محنت سے اس کو اپنی ضرورتیں پورا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذرایع دولت آفرینی (زمین فیکٹری اور ورکشاپ) پر قبضہ کرکے ایک آدمی بغیر محنت کئے زندہ رہ سکے لیکن دوسرے آدمیوں کی محنت کی موجودگی اور دولت کی پیدائش اور تقسیم کے تعلقات پیدا کئے بغیر آدمی کا زندہ رہنا قطعاً ناممکن ہے۔

لیکن کیا علم المعیشت دولت آفرینی کے جتنے تعلقات لوگوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں ان سب کا مطالعہ کرتی ہے؟

مثال کے طور پر قدرتی معیشت یا خاندانی زرعی معیشت کو لیجیے جس میں اپنی ساری ضرورتوں کو خود اپنے حلقہ میں محدود رہ کر پورا کیا جا سکتا ہے اور جس میں دوسری معیشتوں سے تعلقات پیدا نہیں کئے جاتے یہاں دولت آفرینی کے تعلقات کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔ اس میں محنت کی مشترکہ تنظیم اس طرح پر کی جاتی ہے کہ اس سے عورتوں، مردوں، بالغوں اور بچوں میں ایک طرح کی تقسیم عمل تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن سب خاندان کے کھیا کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں تعلقات میں تنظیم خاندان کے بزرگ کی شعوری منشا، اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے خاندان کی ضرورتوں کا تخمینہ کرتا ہے پھر اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ زمین کے کتنے حصہ میں جوار، باجرا بونا چاہیے، کتنے میں مکہ، گیہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہ تعلقات اتنے سہل اور آسان ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی خاص مطالعہ یا علم بنانے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک کمیونسٹ جماعت کو لیجئے جس کی بنیاد سوویٹ یونین میں پڑ رہی ہے۔ ایسی جماعت میں تمام اراکین اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے مشترکہ طور پر محنت کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھیں گے اور ان کی یہ مصروفیت ایک منصوبہ کی پابند ہوگی اور اس کی تشکیل وہ ادارہ کرے گا جو اس معاشی اتحاد کی مشترکہ مرضی کا اظہار کرے گا۔ یہ ادارہ پہلے کمیونسٹ سوسائٹی کی ضرورتوں کا تخمینہ کرے گا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر معیشت کے مختلف شعبوں اور کاروبار کی مختلف شاخوں میں محنت کو تقسیم کرے گا۔ اوزاروں اور اشیاء خام کو بھی بلا کسی مبادلہ یا خرید و فروخت کے منصوبہ کے مطابق ہی تقسیم کیا جائے گا اسی طرح نیم مصنوعہ اشیاء بھی منصوبہ کے مطابق ان کارخانوں میں بھیجی جائیں گی جو انہیں مصنوعہ شکل دیتے ہیں۔ مصنوعہ شکل حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری گوداموں میں پہنچ جائیں گی اور سوسائٹی کے تمام کارکنوں کے درمیان ان کی احتیاجات کے مطابق تقسیم کر دی جائیں گی۔ اسی طرح جماعتی تنظیم اور اس کی شعوری نگرانی کے ذریعہ آدمیوں کی ضرورتوں اور ان کی پیدائش دولت میں منصوبہ کے ماتحت مطابقت پیدا ہو جائے گی۔

یوں تو زرعی قدرتی معیشت اور کمیونسٹ معیشت میں بہت زبردست اختلاف ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جس میں یہ دونوں مشترک ہیں اور وہ یہ ہے کہ دونوں کی تنظیم اور نگرانی شعوری انسانی مرضی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں جدید سرمایہ کی معیشت کو لیجئے یہ تمام انفرادی نجی کاروباروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور موجودہ سرمایہ دار ملکوں میں بڑے بڑے سرمایہ کے کاروبار کے ساتھ ساتھ جس میں ہزاروں مزدور ملازم رکھے جاتے ہیں بے شمار چھوٹے چھوٹے کاروبار ملتے ہیں جن میں لاکھوں کاریگر اور کروڑوں کسان نجی طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان بے شمار چھوٹے بڑے کاروبار کی نگرانی کسی ایک واحد شعوری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی ان کا کوئی نگرانی کرنے والا مرکز نہیں ہوتا جو پہلے سے انسانی ضرورتوں کا اندازہ کرے اور پیدائش کے مختلف شعبوں میں ان ضرورتوں کے مطابق محنت کو تقسیم کرے۔ ہر انفرادی آجر اندھا دھند کام کرتا ہے۔ اسے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ جن اشیا کو وہ پیدا کر رہا

ہے ان کی کتنی طلب ہوگی یا یہ کہ اس کے علاوہ اور کتنے آدمی اسی چیز کے پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ سب سے بے تعلق ہو کر صرف اپنے نجی مفاد کو سوچتا ہے اور جماعت کے مجموعی مفاد کی اسے بالکل پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ من مانا نظام پیدا ہوتا ہے جسے سرمایہ دارانہ جماعت کے مزاج سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اس قسم کی نراجی جماعت کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ ایسی جماعت میں انسانی ضرورتوں اور پیدائش دولت میں توازن کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جماعت میں ان غیر منظم تعلقات کی نگرانی کچھ قوانین کے ذریعہ ضرور ہوتی ہے لیکن ان قوانین کا عمل اندھا دھند طریقہ پر ہوتا ہے۔ اس میں معاشی کام میں شریک ہونے والوں کی مرضی اور شعوری جدوجہد کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں اور منظم جماعت میں (وہ کسانوں کی خاندانی جماعت ہو چاہے مستقبل کی کمیونسٹ جماعت) نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ علم المعیشت میں ان ابتدائی قوانین سے بحث کی جاتی ہے جو سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت آفرینی کے تعلقات کی نگرانی کرتے ہیں۔

جہاں تک کافی بالذات اور کمیونسٹ معیشت میں شعوری انسانی مرضی کا دخل ہے ان کے مظاہر میں ہم کو علم المعیشت کے مطالعہ کے لئے مواد نہیں مل سکتا۔ کمیونسٹ سوسائٹی کے دولت آفرینی کے تعلقات کے لئے جو ابتدائی فطری معیشت سے یقیناً بہت زیادہ پیچیدہ ہوں گے غالباً ایک خاص علم کی ضرورت ہوگی لیکن وہ علم معیشت کا علم نہیں ہوگا۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ سوویٹ معیشت کے قوانین کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سوویٹ معیشت کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ حالت ارتقا میں ہے۔ اس میں منصوبہ والی اور نراجی دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سادہ اشیائی تعلقات سے لے کر نجی سرمایہ دارانہ تعلقات تک سب قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ان عناصر کی وجہ سے ہمارے سامنے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں مثلاً سوویٹ معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کے قوانین کا ابھی تک کتنا عمل دخل موجود ہے منصوبہ والی اور نراجی صنعت میں وہاں کس قسم کے تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی نسبتی اہمیت کیا

ہے۔ ان کے ارتقا کا کیا رجحان ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل میں نہ صرف بہت زیادہ نظری دلچسپی پائی جاتی ہے بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق سوویٹ مملکت کے بعض معرکتہ الآرا مسائل سے ہے۔ اس مطالعہ سے ہمیں نہ صرف ارتقائی اور درمیانی دور کے قوانین کا علم حاصل ہوگا بلکہ جماعتی تعمیر کے کام میں بھی ہم شعوری طور پر حصہ لے سکیں گے۔ اس کے برعکس سوویٹ معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت کے مقابلہ سے ہمیں علم المعیشت کے بنیادی تخیلات کے سمجھنے میں بھی بہت مدد ملے گی۔

آخر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ علم المعیشت سرمایہ دارانہ جماعت کے نہایت اہم مفادوں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کے تمام نظری نتائج اور مفروضات میں طبقہ وارانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ ہمیں علم المعیشت کو مزدوروں کے طبقہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی مطالعہ کرکے دیکھنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں واقعات کو اپنے حسب دل خواہ توڑ مروڑ کر پیش کرنا چاہئے۔ سرمایہ داری کا ارتقا ناگزیر طریقہ پر ہمیں مزدور طبقہ کی فتحمندی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کا بہترین ثبوت مزدور طبقہ کی روس میں فتح ہے۔ اس لئے مزدوروں کے طبقہ کو خالی الذہن ہوکر معروضی طریقہ پر سرمایہ دارانہ جماعت کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس ارتقا کے قوانین کے مطالعہ کے بعد مزدوروں کا طبقہ اپنی پالیسی اور جنگ کے طریقوں کو بہتر طریقہ پر تنظیم دے سکے گا اور کمیونسٹ سوسائٹی کے پیدا ہونے میں جن مصائب اور تکالیف کا اب سامنا کرنا پڑ رہا ہے انھیں کم کر سکے گا۔ پرولتاریہ کے مفاد اگرچہ برسر اقتدار سرمایہ دار جماعت سے بنیادی طور پر مختلف ہیں لیکن جہاں تک معاشری ارتقا اور کل انسانیت کے مفاد کا تعلق ہے وہ اس سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔

دنیا کے مختلف اور تغیر پذیر تمدن

دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے طرزِ زندگی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ان کے مکانات، ان کے لباس، ان کے مراسم، ان کی حکومتیں اور ان کی تفریحیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں یعنی ان مختلف علاقوں کا تمدن ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یورپ کے علاقہ کا تمدن ایک قسم کا ہے تو ایشیا کا دوسرے قسم کا۔ اسی طرح شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے تمدن اور طرح کے ہیں۔ افریقہ کا اور بھی مختلف ہے۔

ان بڑے علاقوں کے علیحدہ علیحدہ ملکوں کو اگر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تمدن و معاشرت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ فرانسیسی تمدن جرمنوں کے تمدن سے یا اسپین، اٹلی یا سویتستان کے تمدنوں سے مختلف ہے۔ حالانکہ ان سب ملکوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایشیا میں چینی اور جاپانی جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں ان کی معاشرت بہت مختلف ہے۔ ہر ملک کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں۔ کھانا پکانے اور مکان بنانے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور تفریحوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر ملک کا تمدن مختلف ہے۔

دنیا کے لوگوں کے تمدن میں یوں تو بہت سے اختلافات ہیں لیکن اگر ان کے فرق کو دو عنوانوں کے ماتحت دیکھا جائے تو صورت حال کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ یعنی (۱) صنعتی تمدن اور (۲) زراعتی تمدن۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ صنعتی تمدن کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ سامان کو اٹھانے اور منتقل کرنے کے لئے بھی مشینوں کا استعمال کرتے ہیں اور خبر رسانی کے لئے بجلی کا۔ دستکاری تقریباً بالکل غائب ہو گئی ہے یہاں تک کہ کھیتی کا کام بھی مشینوں کی مدد سے ہی کیا جاتا ہے۔

لیکن کرۂ زمین کے دوسرے حصوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے تمدن کو زراعتی کہا جاتا ہے۔

یہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کے یہاں فیکٹریاں بہت کم ہوتی ہیں انجن اور مشین تقریباً بالکل نہیں ہوتے۔ انسانوں یا جانوروں کے ہاتھ پاؤں یا ہوا اور پانی کی چکیوں کی مدد سے یہ اپنے سب کام کرتے ہیں باہر کے لوگوں سے یہ بہت کم تجارت کرتے ہیں اور ریلوں یا موٹروں سے تقریباً ناواقف ہوتے ہیں۔

غرضکہ تمدن کی یہ دو خاص قسمیں ہیں۔ دنیا کی ایک ارب نوے کروڑ آبادی ستر ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے ان سب ملکوں کا مطالعہ کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ ان ملکوں میں سے چند کو منتخب کر کے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کن میں زراعتی تمدن پایا جاتا ہے اور کن میں صنعتی تمدن۔ کون سے ملک زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کر چکے ہیں اور کون سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک بھی ایک حالت پر قائم نہیں ہے۔ تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس لئے ہمیں مطالعہ کرتے وقت اس مستقل تبدیلی کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔

ہم گیارہ ملکوں کا مطالعہ کریں گے جن کو مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت جمع کیا جاسکتا ہے۔

I امریکہ اور یورپ کے طاقتور صنعتی ممالک

(۱) برطانیہ عظمیٰ

(۲) فرانس

(۳) جرمنی

(۴) ریاست ہائے متحدہ امریکہ

II یورپ کا ایک تغیر پذیر زراعتی ملک

(۱) روس

III ایشیا کا ایک ایسا ملک جو نہایت تیزی سے صنعتی ملک بن رہا ہے

(۱) جاپان

IV ایشیا کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

(۱) ہندوستان

(۲) چین

V جنوبی امریکہ کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

(۱) ارجنٹائن

(۲) برازیل

(۳) چلی

ہم نے ان گیارہ ملکوں کو تین وجوہ کی بنا پر مطالعہ کے لئے منتخب کیا ہے :-

(۱) ان کی مجموعی آبادی ایک ارب ساڑھے بائیس کروڑ ہوتی ہے یعنی کرۂ زمین کی کل آبادی کی تقریباً دو تہائی ان کے رہنے سہنے کے طریقوں سے واقفیت کے معنی یہ ہیں کہ کرۂ زمین کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کی معاشرت کا حال معلوم ہو گیا۔

(۲) ان گیارہ ملکوں میں دنیا کی خاص خاص نسلوں اور خاص خاص تمدنوں کے تقریباً سب ہی لوگ شامل ہیں ان کی مناسب نمائندگی ان کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے مطالعہ سے ہمارے لئے کل کرۂ زمین کے تمدن کا مطالعہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

مثلاً برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے امریکہ دنیا کی چار بڑی صنعتی قومیں ہیں۔ جس طرح ان ملکوں میں صنعتی طرز معاشرت کو گذشتہ زمانے میں ترقی حاصل ہوئی ہے اس سے اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں موجودہ زمانہ میں کس طرح صنعتی طرز معاشرت کی ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے ان چار ملکوں کو صنعتی ملکوں کا نمائندہ سمجھنا ٹھیک ہے۔

اسی طرح روس کے ذریعہ مشرقی اور وسطی یورپ کی ایک بہت بڑی آبادی کی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مشرقی ملکوں کی زندگی کا اندازہ چین اور ہندوستان کے زراعتی تمدنوں کا مطالعہ کر کے کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے منتخب کرنے کی یہ ہے کہ ان گیارہ ملکوں کو ہمارے زمانہ میں نہایت اہمیت حاصل ہے اور آئندہ رہنے کی امید ہے۔ ان کے رقبہ کی وسعت، ان کی آبادی کی کثرت اور ان کے قوت محرکہ کے ذرایع اور وسائل کی روز افزوں ترقی ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو دنیا کے اور تمام دوسرے

ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور رہے گی چنانچہ برطانیہ عظمی، فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یورپ کے طرز معاشرت کو دنیا میں پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ روس کے قبضہ میں دنیا کی ایک بہت کثیر آبادی ہے اور اس کا علاقہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان چین اور جاپان بھی جدید دنیا سے اب تک الگ تھلگ تھے اب اس کے معاملات میں بہت اہم حصہ لینے لگے ہیں اور ارجنٹائن، برازیل اور چلی امریکہ کے جنوبی براعظم کے نہایت ممتاز ممالک ہیں۔ ان میں گذشتہ چند سالوں میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی ہوئی ہے کہ اب وہ تمام دنیا کے لئے بہت بڑی مقداروں میں غذا فروخت کرنے لگے ہیں۔

یہ گیارہ ملک ایسے ہیں جن سے ہمیں آئندہ بہت زیادہ واسطہ پڑے گا۔ اس لئے ان کے تمدن کو سمجھنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔

دنیائے جدید کے ان تغیر پذیر تمدنوں کو سمجھنے کے واسطے ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابتدائی زمانہ میں ان کی کیا حالت تھی۔ کون سے اثرات تھے جن کی وجہ سے ان میں تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی موجودہ خصوصیات کیا ہیں۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ آج کرۂ زمین پر جہاں کہیں بھی لوگ آباد ہیں ان کی معاشرت میں تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ مغربی یورپ کے ملک گذشتہ سو سالوں سے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن اختیار کر رہے ہیں اور اب کچھ سالوں سے مشرقی یورپ، جنوبی افریقہ، اور جنوبی امریکہ کے لوگ بھی صنعتی تمدن کو اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مشرق بعید اور ہندوستان میں کام کرنے کے طریقوں، نقل و حمل اور خبر رسانی کے وسائل اور معاشری زندگی میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس لئے ان تمدنوں کی تاریخ کا مطالعہ جس سے مختلف زمانوں میں ان کے طرز معاشرت کا باہمی مقابلہ کیا جا سکے نہایت ضروری ہے۔

اس مطالعہ کو زیادہ مناسب طریقہ پر اس طرح شروع کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں عہد وسطی کی زندگی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے یعنی یہ تبلایا جائے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ اور ایشیا میں عام طور پر کیسا سوشحال تھی پھر اس کے بعد الگ الگ ملکوں کو لے کر یہ دیکھا جائے کہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے کس طرح انھوں

نے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کیا اور آج بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

(نوٹ) ذیل کے نقشہ میں دنیا کے ان ملکوں کو جن کے بارے میں حالات بیان کئے جائیں گے نقطے لگا کر ظاہر کیا گیا ہے۔
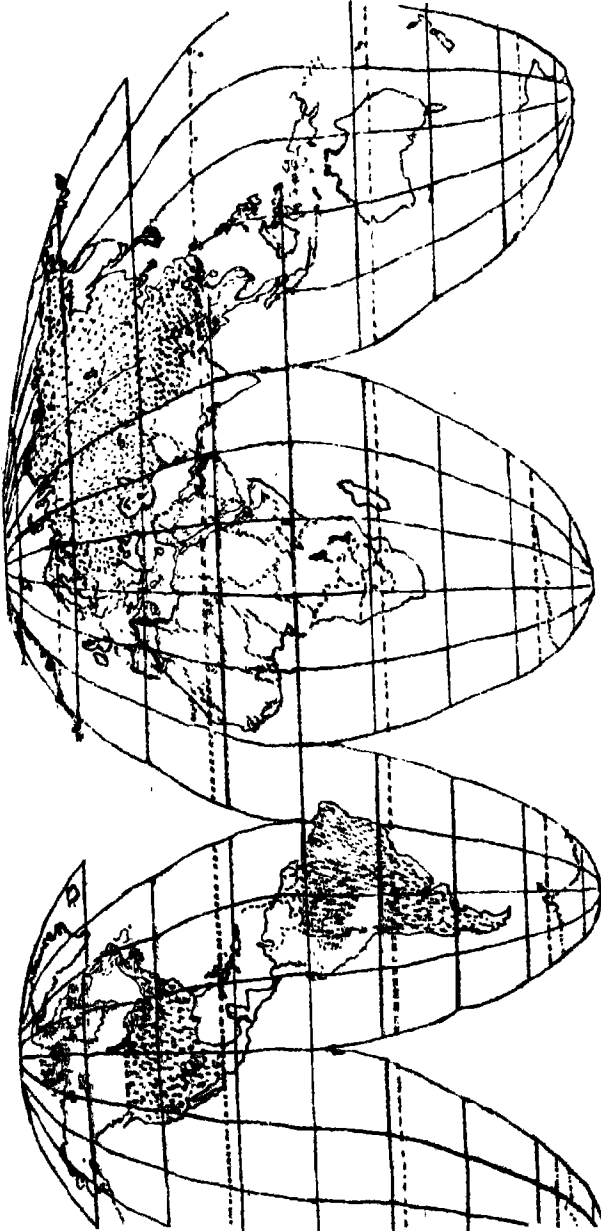
پبلکِ زندگی کی اخلاقی صفات

(از جناب محمد عاقل صاحب)

ہر شخص کو دنیا میں دو طرح کی زندگیاں بسر کرنی پڑتی ہیں۔ ایک اس کی نجی یا پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے اور دوسری اس کی عام یا پبلک زندگی۔ نجی زندگی کا تعلق اس کی خاص اپنی ذات سے قریب کے دوستوں اور رشتہ داروں سے ہوتا ہے اور باہر کے لوگ اس سے واقف نہیں ہوتے لیکن پبلک زندگی پر سب لوگوں کی نظر ہوتی ہے اور اس کا اثر سب لوگوں پر پڑتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی نجی زندگی میں بہت سچا، نیک اور دوسروں کے لئے قربانی کرنے والا ہو۔ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں، عزیز اور دوستوں کے حقوق کو نہایت اچھائی کے ساتھ پورا کرتا ہو۔ لیکن اس کی پبلک زندگی گندی اور ناپاک ہو۔ پبلک زندگی کے فرائض کو وہ ٹھیک طرح سے انجام نہ دیتا ہو۔ اس کی محبت اور وفاداری صرف چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ خاندانی کشش، قبیلے، فرقے اور جماعت کی محبت نے اسے متعصب اور جانب دار بنا دیا ہو۔ صرف اپنے چھوٹے حلقہ کے فرائض، ایمانداری سے پورا کرنا، وہ ضروری سمجھتا ہو اور باقی سب لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ دشمنوں جیسا ہو۔ ان کو لوٹنے مارنے، ان کو نقصان پہنچانے، ان کو دھوکہ فریب دینے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص نہایت ایثار اور قربانی سے کام کر رہا ہو۔ اپنی ذات کی بھلائی اس کے سامنے بالکل نہ ہو بلکہ صرف اپنے عزیزوں اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کے چھل فریب، بے ایمانی اور دغا بازی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ایسے شخص کا جرم سنگین تو نہیں رہے گا۔ لیکن پھر بھی وہ مجرم ہے۔ اس لئے کہ اس نے اعلیٰ وفاداری کے مقابلہ میں ادنیٰ وفاداری کو ترجیح دی۔ نجی فائدہ کے لئے پبلک فائدہ کو قربان کیا

"نجی فائدہ اور پبلک فائدہ" کے اس فرق کی طرف ہم ہندوستانیوں کو اس وقت خاص طور پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں پنچایتی حکومت قائم کرنے کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں ہمیں اختیارات مل چکے

ہیں اور بہت جلد اور زیادہ اختیارات ملنے کی امید ہے۔ لیکن ہر حق کے ساتھ ایک فرض، ہر اختیار کے ساتھ ایک ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ جو حقوق ہمیں ملے ہیں انھیں اپنے ذاتی اثرات دولت اور اقتدار کے بڑھانے کا ایک ذریعہ نہ بنانا چاہیئے بلکہ کل قوم کے فائدے اور خدمت کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہئے بہت آسانی سے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نفع کے لئے اپنے اختیارات کو استعمال کرنا شروع کردیں۔ لیکن یہ بات زیادہ دنوں تک نبھ نہیں سکتی ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم اگر ایسا کریں گے تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے اور اگر سب نے یہی کیا تو کیسی افراتفری مچے گی۔ کیسا فساد برپا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو جائیں گے اور پنچایتی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جو فرائض شہریوں پر عاید ہوتے ہیں انھیں ہم الگ الگ عنوانوں کے ماتحت آج بیان کرنا چاہتے ہیں پہلے ہم ووٹروں کو لے کر دیکھیں گے کہ ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ہم مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کو لیں گے پھر سیاسی جماعتوں کے فرائض کا بیان کریں گے اس کے بعد جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے فرائض کو دیکھا جائے گا۔ اور اخیر میں ادنیٰ عہدہ داروں کے جو پبلک فرائض ہیں ان کا بیان کیا جائے گا جس ریاست کے سب شہری اپنے فرض کو پہنچانتے ہیں اس کی خوش حالی اور پائداری یقینی ہے۔ اور جس ریاست کے شہریوں میں پبلک زندگی کی اخلاقی خوبیاں غائب ہیں اس کی بنیاد گویا ریت پر رکھی گئی ہے اور ایسی ریاست زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ ووٹروں کو اپنی پبلک زندگی میں کون سی اخلاقی صفات پیدا کرنی چاہییں جن سے ان کا شمار اچھے شہریوں میں کیا جاسکے۔ ہر ووٹر کو اپنی رائے دینے کے حق کو ایک مقدس فرض سمجھنا چاہیئے۔ اسے رشتہ داری ذات، برادری، فرقہ مذہب ان سب باتوں سے ہٹ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ جس شخص کو میں ووٹ دے رہا ہوں۔ اس میں واقعی اس بات کی قابلیت ہے یا نہیں کہ وہ سب لوگوں کے مفاد کی صحیح نمائندگی مجلس قانون ساز میں کر سکے۔ کیا وہ منتخب ہونے کے بعد رعایا کے لئے اچھے قانون ان کی بھلائی کی اور بہتری کے لئے اچھی تجویزیں اور منصوبے سوچ سکے گا اور انھیں عملی جامہ پہنا سکے گا یا نہیں۔ اگر جواب "ہاں" ہو تو اسے اس امیدوار کو ووٹ دینا چاہیئے ورنہ ہرگز ووٹ نہ دینا چاہیئے۔ اکثر ووٹروں کو دیکھا

گیا ہے کہ وہ اپنی ذات برادری یا مذہب کے لوگوں کو چاہے ان میں قابلیت ہو یا نہ ہو ووٹ دینا پسند کرتے ہیں۔ پھر یہاں تک بھی غنیمت ہے بہت سے لوگ رشوت لے کر ووٹ دیتے ہیں یا زمیندار ساہوکار یا کسی بدمعاش غنڈے کی دھمکیوں سے ڈر کر بھیڑ بکری کی طرح ووٹ دینے کی جگہ جاتے ہیں اور دھمکی دینے والے جسے کہتے ہیں اسے ہی چپکے سے ووٹ دے کر لوٹ آتے ہیں۔ یہ بڑی سخت نادانی اور گمراہی ہے ایسا کرنے سے وہ اپنے پاؤں میں خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مارتے ہیں۔ جو لوگ دھمکی اور لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے وہ ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان سے بھلائی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی وہ ضرور دھوکا دیں گے۔ اسی طرح پبلک معاملات میں نجی دوستی اور مروت بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ نالائق آدمی خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور اپنے دوستوں اور حامیوں کو بھی ذلیل کرتا ہے اس لئے ووٹ دیتے وقت عقل و تمیز سے کام لینا چاہیئے اور جس شخص کی طرف داری کے لئے دل گواہی دیتا ہو جس کی طرف سے ضمیر مطمئن ہو اسی کو ووٹ دینا چاہیئے۔ چاہے اس میں اپنے جان اور مال کا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ جو لوگ امیدواری کے لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ اکثر جانے بوجھے ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پچھلی زندگی میں پبلک کی خدمت کے کون کون سے کام کئے ہیں۔ یہ ایماندار اور سمجھ دار ہیں یا بے ایمان اور بے وقوف۔ اس لئے جان بوجھ کر غلط آدمی کی حمایت کرنا سخت فرض ناشناسی ہے۔ اس سے جہاں تک ہو بچنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک سوال پارٹی کا پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کے تمام ملکوں میں سیاسی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور رعایا کے تمام لوگ کسی نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور پارٹی جس کو کہتی ہے اس کو ووٹ دیتے ہیں۔ کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد تو اس پارٹی کا حکم ماننا فرض ہے۔ لیکن پارٹی میں شریک ہونے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ پارٹی کے مقاصد کیا ہیں؟ یا مقاصد ایسے ہیں کہ جن سے ملک اور قوم کا فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر جو پارٹی کے لیڈر ہیں ان کا پچھلا کارڈ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انھوں نے ملک اور قوم کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں وہ لوگ سمجھ دار اور دوراندیش ہیں یا یوں ہی خواہ مخواہ کی شورش مچاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد پارٹی کے فیصلہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور جب تک

پارٹی کے ممبر رہیں جو پارٹی کہے ویسے ہی کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہے۔ کیونکہ پنچایتی نظام میں ہر آدمی اگر الگ الگ اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا چاہتا ہے تو اس کے لئے کوئی کام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پارٹی بنانے سے بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے پارٹیاں قائم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کی ہر شخص کو ہر وقت آزادی حاصل ہے کہ جب تک چاہے ایک پارٹی کا ممبر رہے اور جب چاہے اس سے علیحدہ ہو جائے اگرچہ اچھا آدمی تو وہی سمجھا جاتا ہے جو بات کو ایک دفعہ سوچ سمجھ کر طے کرے اور پھر اخیر وقت تک جب تک صورت حال واقعی ناقابل برداشت نہ ہو جائے اپنی بات پر اڑا رہے پھر دوسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ووٹر کا کام امیدوار کو ووٹ دینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے چنے ہوئے ممبروں کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے اور ان سے جواب طلب کرتا رہے جب کوئی ممبر اپنے فرض کو ٹھیک طرح پورا نہ کرے تو اس کے خلاف خوب پروپگنڈا کرے اور آئندہ کے لئے اس کا چنا جانا ناممکن بنا دے۔ اگر ووٹر اپنے فرائض کو اس طرح پورا کریں تو ممبروں سے خوب اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ اپنے حلقہ کی ضرورتوں خواہشوں اور تمناؤں کا خوب غور سے مطالعہ کریں۔ اپنے ووٹروں کی بھلائی اور بہتری کی تجویزیں اور منصوبے سوچیں اور اس کے لئے قانون بنوائیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت انھیں خود غرضی سے کام نہ لینا چاہئے اپنے حلقے کی بھلائی کی اور بہتری کی خاطر دوسرے حلقہ کے لوگوں کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ایسے کام سوچنا چاہئیں جس سے سارے ملک اور قوم کا فائدہ ہو۔ اگر کوئی ایسا موقع ہو جس میں اپنے حلقہ کا تو تھوڑا فائدہ ہوتا ہو لیکن اس تھوڑے فائدے کی خاطر سارے ملک کا بڑا نقصان ہو رہا ہو تو اس وقت ممبر کو دلیری اور ہمت کے ساتھ اپنے حلقہ کے فائدہ کو کل قوم کے فائدہ کے لئے قربان کر دینا چاہیئے۔ لیکن اکثر ممبر اپنے ان فرائض کو نہیں پہچانتے یا قصداً پورا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ووٹروں کو رشوت دے کر انہیں ڈرا اور دھمکا کر منتخب ہوتے ہیں اور چنے جانے کے بعد اپنی جیب گرم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے انھوں نے دوسرے سے ووٹ خریدا تھا ایسے ہی یہ دوسرے کے ہاتھ ووٹ بیچنا چاہتے ہیں۔ جو ٹھیکیدار ساہوکار

یا کارخانہ دار انھیں روپیہ دیتے ہیں ان کے فائدہ کے لئے۔ قانون بنواتے ہیں ان کے ہاتھ میں بکے ہوئے
ہوتے ہیں یا اگر حکومت اپنی طرف داری کے لئے ان کا ووٹ چاہتی ہے تو یہ اس کے بدلے میں اپنے
عزیزوں رشتہ داروں کو ملازمت دلوانا چاہتے ہیں خود کمیٹیوں کے ممبر بننا اور بڑے بڑے بھتے کمانا
چاہتے ہیں یا حکومت کے اثر سے اور سیکڑوں دوسرے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے چننے والے
حلقے کو خوش کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کہتے اور کرتے ہیں جس سے ان کی واقعی خدمت یا کل قوم کی
خدمت تو نہیں ہوتی لیکن اس حلقہ کے لوگوں میں جو ادنیٰ جذبات اور تعصبات پائے جاتے ہیں ان کی البتہ
تسکین ہو جاتی ہے فرقہ وارانہ جذبات کو اور طبقہ وار کشمکش کو بھڑکانے والی تقریریں اور غیر ذمہ دار تنقیدوں
سے یہ ووٹروں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ کسی پارٹی کے وفادار نہیں ہوتے۔ ان کی ہرجائیوں جیسی
مثال ہوتی ہے آج ایک پارٹی کا ساتھ دیا۔ جب دوسری پارٹی نے عہدے یا مالی فائدہ کا لالچ دیا تو دوسری پارٹی
میں مل گئے۔ ایسے لوگ پبلک اور قوم کے بڑے دشمن ہیں اور ہرگز اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کو دوبارہ
منتخب کر کے بھیجا جائے۔

اس کے بعد تیسری جگہ جہاں پنچایتی نظام کی کامیابی کے لیے اخلاقی صفات کا ہونا ضروری ہے۔
وہ سیاسی پارٹی ہے دنیا کی تمام پنچایتی حکومتوں میں پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور ان پارٹیوں کے ذریعہ تمام کام
چلائے جاتے ہیں۔ پارٹیاں اگر اصول کے مطابق بنیں۔ اگر وہ اپنا ایک پروگرام طے کرلیں کہ ہم کو عہدہ ملا تو
ہم رعایا کے لئے یہ یہ بھلائی کے کام کریں گے تو یہ اپنا کام بہت خوبی کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ اور عہدہ نہ ملنے
کی حالت میں یہ نہایت ایمانداری اور معقولیت کے ساتھ حکومت کے کاموں پر تنقید بھی کر سکتی ہیں جس سے
حکومت کی بہت سی یک طرفہ پالیسیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر پارٹیاں کسی اصول کے مطابق نہ بنائی
جائیں بلکہ چند سیاسی لیڈر اور بدمعاش یا بے ایمان زمیندار سرمایہ دار اپنے نفع کی خاطر ان کے ڈھونگ
کو قائم رکھیں اور بے وقوف ایمان دار لوگوں کو اپنے جال میں پھانسے رہنے کے لئے چالیں چلتے رہیں یا لالچ
اور دھمکی سے لوگوں کو اپنا طرفدار بنائے رکھیں تو ایسی پارٹیاں رحمت کی جگہ لعنت اور خدائی قہر و عذاب
بن جاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے تمام ملک میں بے ایمانی، ریاکاری، فریب اور دغابازی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

کمزوروں اور بے وقوفوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ ملک کے اندر غلامی ترقی پاتی ہے۔ ملک کے باہر جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، دوسرے ملکوں کی آزادی چھینی جاتی ہے اور تمام دنیا ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے یہ لوگ تمام مقدس جذبات کو اپنے ناپاک ارادوں کے پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خاندان کی محبت، مذہب کی عقیدت، وطن پرستی، انسانیت دوستی ان سب اعلیٰ جذبات کو وہ اپنے گندے مقاصد کا آلہ کار بناتے ہیں۔ مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو فوج اور جنگ کے تباہ کرنے والے سامانوں کی خریداری پر صرف کرتے ہیں۔ لٹریچر، تاریخ، فلسفہ، سائنس کوئی چیز ان کے زہریلے اثر سے محفوظ نہیں رہتی اور دنیا بالکل دوزخ کا ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ پارٹی کی ایسی تنظیم افراد کی آزادیوں اور حقوق کے لئے سخت مہلک ثابت ہوتی ہے۔ کسی شخص کو آزادی کے ساتھ رائے دینے کا موقع نہیں رہتا۔ اخبار، پلیٹ فارم سب پر پارٹی کا قبضہ ہوتا ہے اور پارٹی کا یہ ظلم سخت سے سخت مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ ایسی پارٹیوں کو کبھی نہ بننے دیں اور ابتدا ہی میں ختم کر ڈالیں اور اگر اتفاق سے یہ اقتدار حاصل کریں تو اپنی پوری اجتماعی قوت سے کام لے کر ان کو توڑ کر چکنا چور کر دیں ان کی جگہ ایسی پارٹیاں بنائیں جو پارٹی ہونے کے باوجود کل ریاست بلکہ تمام انسانیت کے مفاد کو سب باتوں پر مقدم رکھیں۔ اپنے ملک و قوم کے مفاد کے خاطر دوسری قوموں کی جائز آزادیوں کو نہ چھینیں بلکہ جہاں کہیں مظلوم قومیں نظر آئیں ان کی آزادی اور خود مختاری تہذیب و ترقی کو اپنی زندگی کا ایک مقدس مشن بنالیں۔

پارٹی کے بیان کے سلسلہ میں ریاست کا دوسرا ادارہ جس میں خاص طور پر اخلاقی صفات ہونا ضروری ہیں وہ جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ان پر حکومت کے تمام انتظام کا دارومدار ہوتا ہے۔ پالیسیاں چاہے کیسی ہی اچھی کیوں نہ مقرر کی جائیں لیکن اگر جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں میں اپنے فرائض کا صحیح احساس اور وطن قوم اور انسانیت کی خدمت کا پورا جذبہ نہ ہوگا تو یہ پالیسیاں کبھی کامیاب اور سرسبز نہ ہو سکیں گی۔ اعلیٰ عہدہ داروں کی نیت میں سیری ہونا چاہیئے۔ جاہ و عزت اور مال و دولت کا ان کو بھوکا نہ ہونا چاہیئے۔ ان میں ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے ان میں حکم دینے اور حکم ماننے کی قابلیت ہونی چاہیئے۔ انھیں رشوت اور اس قسم کے تمام

غیر قانونی منافع سے بالاتر ہونا چاہیئے انہیں حکومت کے زمانے میں تجارت صنعت اور زراعت کے
کاروبار سے اپنی عملی دلچسپیوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اپنے سیاسی اقتدار سے ناجائز
فائدہ اٹھانے کا لالچ انہیں آجائے۔ اگر یہ ہوا تو حکومت چوروں گرہ کٹوں اور ڈاکوؤں کی حکومت ہو جائیگی
عموماً جماعت عاملہ اور اعلیٰ عہدہ داروں کو گمراہ اور بے ایمان کرنے کا سبب بے ایمان سیاسی پارٹیاں ہوتی
ہیں۔ اگر سیاسی پارٹیاں ایمان دار ہوں اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں مستعد ہوں تو جماعت عاملہ
اور عہدہ دار بھی بے ایمانی نہیں کر سکتے۔

آخر میں ہمیں ادنےٰ عہدہ داروں کی اخلاقی صفات کو دیکھنا چاہیئے۔ یہی لوگ ہیں جو درحقیقت
حکومت کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ جو حکومت کے ہاتھ پاؤں کان اور آنکھیں ہوتے ہیں یہ اگر کوتاہی کریں
ان میں اگر اپنے پبلک فرض کا احساس نہ ہو۔ ان میں اگر عزت نفس، ضمیر کی صداقت اور اپنے عہدہ کے وقار
اور تمکنت کی پاس داری نہ ہو تو سارے نظام کے چوپٹ ہو جانے کا اندیشہ رہے۔ پولس کانسٹبل، پٹواری،
نہر کا امین مدرس اور منشی فوج کا سپاہی اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسر ہی درحقیقت حکومت کے ستون
ہوتے ہیں۔ اگر یہ ستون کمزور اور کھوکھلے ہیں تو حکومت کی عمارت بھی کبھی مضبوط اور پائدار نہیں ہو سکتی
ان میں اخلاقی صفات کا ہونا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ اعلیٰ عہدہ دار آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ پارٹیاں
بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن ان لوگوں کی جماعت قائم رہتی ہے۔ ان کی روایات مسلسل اور یکساں رہتی ہیں
دوسروں کے بعد ریاست کے نظام میں بنیادی حیثیت انہیں لوگوں کی ہے اور ریاست کی تندرستی اور
طاقت کا انحصار انھیں کے اوپر ہے۔ ان میں اعلیٰ اخلاقی صفات کا پیدا کرنا گویا کل قوم کی اخلاقی حالت کو
سدھارنا ہے۔ ان میں جذبہ خدمت، ایمان داری اور احساس فرض پیدا ہو جائے تو ریاست کی ترقی کی
ایک سب سے بڑی رکاوٹ کا ازالہ ہو جائے۔ اور اگر یہ بگڑے ہوئے ہوں تو آوے کا آوا بگڑ جائے۔
ان کی اصلاح کی صورتیں یہ ہو سکتی ہیں کہ اعلیٰ عہدہ دار اپنے عمل سے اچھی مثال ان کے سامنے رکھیں برائی کی سخت
گیری سے گرفت اور بھلائی کی قدر دانی کریں۔ لٹریچر اور تعلیم میں ایک عام اخلاقی فضا پیدا کی جائے اور ملازموں
کو معقول تنخواہیں دی جائیں تاکہ بغیر بے ایمانی کے ان کا گذر چل سکے۔

غرضکہ پنچایتی نظام کی کامیابی کے لئے پبلک زندگی میں ووٹر سے لے کر حاکم اعلیٰ تک سب میں عمدہ اخلاقی صفات کا ہونا نہایت ضروری ہے ۔

آخر میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا خاص طور پر ضروری ہے۔ نجی فائدہ اور پبلک فائدہ ادنیٰ وفاداری اور اعلیٰ وفاداری جن کے فرق کو میں نے بیان کیا تھا ان کے کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ تنگ کے مقابلہ میں کشادہ ادنےٰ کے مقابلہ میں اعلیٰ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی نے تمام قوموں اور ملکوں کو ایک ہی رشتہ میں پرو دیا ہے۔ ساری دنیا ایک برادری یا خاندان بن گئی ہے دنیا کے سب رہنے والے جسم کے مختلف حصے بن گئے ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کا ایک حصہ مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کا اثر دنیا کے دوسرے حصوں پر نہ پڑے۔ اس لئے تمام ایسی پالیسیاں جن میں تنگ نظری سے کام لے کر فرقوں نسلوں مذہبوں اور قوموں کی ادنےٰ محبتوں کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ محبت اور اس کی صلح و آشتی کو قربان کیا جاتا ہے۔ چلنے والی چیزیں نہیں ہیں فتنہ و فساد سے جتنا دوسروں کو نقصان پہنچے گا اتنا ہی خود اپنی ذات کو بھی پہنچے گا اس لئے تمام انسانوں کو مل کر اور متحد ہو کر سائنس کی تحقیقات سے مدد لینے اور فطرت کی قوتوں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی جگہ دنیا سے بیماری غریبی گندگی بدصورتی بے علمی اور ناسمجھی کو دور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے دو پاؤں کے انسان نما درندوں کو واقعی انسان بنایا جا سکتا ہے ۔

تقریر اور اخبار

(از جناب محمد عاقل صاحب)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کا لوہا آدمیوں کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک سنڈے مسٹنڈے دیو جیسے قوی ہیکل پہلوان کو دیکھ کر خواہ مخواہ رعب پڑتا ہے۔ اس کی جسمانی قوت کے سامنے سب لوگ کمزور بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس کی طاقت کو پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم اسے دوست بناتے ہیں تاکہ اس کی طاقت سے فائدہ حاصل کر سکیں اور اس کی دشمنی سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کی طاقت ہمارے خلاف استعمال نہ ہو۔ ہماری ہڈیوں کا چکنا چور، ہمارے بدن کو لہولہان نہ کر دے۔ ہمارے روٹی کپڑے اور مکان، ہمارے زر و مال اور اندوختے کو ہم سے نہ چھین لے۔ اپنی جسمانی قوت سے ایک طاقتور شخص اپنی مرضی کے مطابق لوگوں سے کام کراتا اور اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے سے روکتا ہے۔ غرضکہ رہنمائی اور سرداری کی سب سے پہلی اور سب سے پرانی صفت جسمانی قوت ہے۔ اس کے بعد اور قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے کچھ لوگ دوسروں کے مقابلہ میں سربلند اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً علم کی طاقت ہے کہ اس سے آدمی ہوا، بھاپ، بجلی سے کام لے کر اپنی طاقت کو بہت بڑھا لیتا ہے اور سب لوگوں سے جس طرح چاہتا ہے، ناچ نچاتا اور ناک رگڑواتا ہے۔ تو جیسے دنیا کی ان چیزوں کو طاقت حاصل ہے ویسے ہی تقریر اور اخبار بھی دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہیں۔

پہلے تقریر کو لیجیے۔ تقریر آواز کے زیر و بم، لہجہ کے اُتار چڑھاؤ کی کرشمہ سازی ہے۔ آواز میں ایک قوت ہوتی ہے۔ شیر کی دہاڑ، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک سے ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مور کی چنگھاڑ، کویل کی کوک، اور پپیہے کی پی کہاں میں ایک درد اور کیفیت ہوتی ہے جو دل کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انسان کی آواز میں یہ سب چیزیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ ایک وقت میں اسے کڑک اور گرج بھی بنایا جا سکتا ہے اور دوسرے وقت میں آہ اور کراہ بھی۔ ایک وقت میں اس میں لطافت اور وقار

بھی بھری جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں پریم اور محبت بھی۔ ایک وقت میں کسی کام کے کرنے کے لئے جتنی ترغیب اور تحریص کی ضرورت ہے وہ سب اس میں جمع کی جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں کسی کام سے روکنے کے لئے جتنی کراہیت اور بیزاری پیدا کرنا ضروری ہے وہ سب پیدا کی جا سکتی ہے۔ غرضکہ انسانی آواز کی قوت اس کی جسم کی قوت سے بھی بہت بڑی ہے۔ جسم کی قوت سے ایک وقت میں ایک آدمی زیادہ سے زیادہ تین چار آدمیوں پر غالب آ سکتا ہے۔ لیکن آواز کا جادو جہاں تک آواز پہنچ سکتی ہے سب کو اپنے اثر میں لا سکتا ہے۔

جس شخص کی آواز میں لوچ، بلندی اور کڑاکا ہوتا ہے، جس کے پاس الفاظ کا اچھا ذخیرہ ہوتا ہے وہ بڑے مجمع کے دل موہ لیتا ہے اور سیاسی زندگی میں اس کی رہنمائی کو لوگ ماننے لگتے ہیں۔ جس جماعت کے ساتھ وہ شامل ہو جاتا ہے اس کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔ عوام اس کے لفظوں پر ناچتے ہیں۔ جب چاہتا ہے انھیں ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے انھیں محبت سے بھر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے نفرت سے۔ جب چاہا انھیں ابھار کر قتل و غارت گری پر آمادہ کر دیا اور جب چاہا ان میں امن و سکون کی تمنا پیدا کر دی۔ عوام کے دل اس کے ہاتھ میں ایک ستار کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں جن پر جس قسم کا راگ جب چاہتا ہے چھیڑ دیتا ہے اور دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کئے رہتا ہے۔ دنیا کی بہت سی بڑی بڑی جنگیں۔ بڑے بڑے انقلاب، بڑی بڑی تعمیری اور تہذیبی کوششیں مقرروں کی آواز کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔ پرانے زمانے میں شاعر جب تحریر کا رواج عام نہیں ہوا تھا اپنی خطابت کی قوت سے ہی مشہور ہوا کرتے تھے اور ہمارے ملک کے شاعروں میں تو یہ بات آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان ملکوں میں جہاں پرانے زمانے میں پنچایتی حکومت قائم تھی (مثلاً یونان اور روم میں) خطابت کو سیاسی زندگی میں بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی اور آج بھی ہماری سیاسی زندگی میں تقریر کی اہمیت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دنیا کے مذہبی دور میں منبر و محراب سے ہی کام لیا جاتا تھا اور اس کے ذریعہ ہزاروں گمراہوں کو نیکی کا راستہ اور ہزاروں نیک لوگوں کو گمراہ کیا جاتا تھا۔ آج بھی ایک مذہبی مبلغ کے لئے مقرر ہونا بہت ضروری ہے۔ خوش بیان وکیلوں کی پیروی سے مقدمے عدالتوں میں جیتے جاتے ہیں۔ سفیروں اور ایلچیوں کی تقریروں سے دو حکومتوں کے درمیان تعلقات

اچھے یا برے کرائے جا سکتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں اور مدبروں کی تقریروں سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ نئی نسلوں میں تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بھی تقریر ہی ہوتی ہے اور ایک فصیح معلم کا درجہ بہت بڑا سمجھا جاتا ہے۔ غرضکہ تقریر کی حکومت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس کی طاقت بہت زبردست ہے۔

لیکن خطابت کی حریف ایک دوسری طاقت بھی ہے جسے صحافت کہتے ہیں۔ اسے چھاپہ کی ایجاد نے پیدا کیا ہے۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے ایک شخص کے لکھے ہوئے کو صرف ایک شخص ہی پڑھ سکتا تھا۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کے لئے پڑھنا ممکن نہیں تھا سوائے اس صورت کے کہ لکھی ہوئی تحریر کو مجمع میں سنایا جائے یعنی میں تحریر اور تقریر دونوں جمع ہو جاتی تھیں۔ تحریر کے حلقہ کو بڑھانے کے لئے لوگ اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی نقل کرا کے تقسیم کرتے تھے لیکن یہ کام بہت مشکل، مہنگا اور دیر طلب ہوتا تھا۔ اپنی تحریر کو ہر دفعہ نقل کرانے میں پہلے کے برابر محنت کرنا پڑتی تھی اور کاتب کی غلطیوں کی صحت ضروری تھی۔ لیکن چھاپہ کی ایجاد نے اس کام کو بہت سہل بنا دیا ہے۔ چھاپہ کا علم تو آدمیوں کو بہت پرانے زمانے سے ہے۔ مہر ایک طرح کی چھاپ ہے جس کا استعمال نہایت قدیم زمانہ میں مثلاً سمیروں کے یہاں شروع ہو گیا تھا۔ اسی طرح سکہ بھی چھپی ہوئی چیز ہے۔ جاہل آدمیوں نے ہر عہد میں دستخط کے لئے لکڑی یا دھات کی مہروں کا استعمال کیا ہے۔ چین میں دوسری صدی عیسوی میں نہایت مشہور تصنیفوں کی طباعت شروع ہو گئی تھی لیکن اچھی سیاہی اور مناسب کاغذ کی دقتوں کی وجہ سے چھاپہ کی ایجاد سے لوگ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے تھے۔ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی تک باقاعدہ چھپائی شروع نہیں کی جا سکی تھی۔ اور اخبار جو ہمارے زمانے کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کی عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں پنچایتی حکومت بڑے بڑے ملکوں میں صرف پریس کی ترقی کی وجہ سے ممکن بن سکی ہے۔ قدیم یونان کی پنچایتی حکومت جس کے کام کی آج تک بڑی دھوم ہے، صرف چھوٹے شہروں تک محدود تھی۔ یونان کے شہری صرف گفتگو اور تقریر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے اور ان کو کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تقریر میں مہارت حاصل ہوتی تھی وہ رعایا کے رہنما بن جاتے تھے اور جو وہ چاہتے تھے رعایا اسی کے مطابق اپنی رائے دیتی تھی۔ ان کا سیاسی اثر بہت بڑھ جاتا تھا اور یہی لوگ عملاً حکومت کرتے تھے۔ روم میں ہر چند شہریت کے حق کو وسیع اور عام کر دیا گیا تھا لیکن اس سے

فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے تھے جو روم کے قریب رہتے تھے باقی سب لوگ عملاً شہری حق سے محروم تھے۔

پنچایتی حکومت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو سیاسی واقعات سے باخبر رکھا جائے تمام مسائل سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ وقت کے وقت جو نئے سیاسی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں رعایا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو فوراً ان کی اطلاع دی جائے۔ ملک کے رہنماؤں کی ان مسائل کے بارے میں جو رائے ہے اس سے بھی سب کو واقف کرایا جائے۔ مختلف پالیسیوں کی طرفداری یا مخالفت میں جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ سب رائے دینے والوں کے سامنے رکھا جائے۔ رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کو غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں شریک کیا جائے۔ لوگ پہلے واقعات کا پورا علم حاصل کریں اور پھر ان پر اپنی رائے اور مرضی کا اظہار کریں۔ جب تک پریس کو ترقی نہیں ہوئی تھی ان سب کاموں کو کرنے کے لئے صرف تقریر کا ایک موثر ذریعہ موجود تھا۔ روم میں نقیب عوام کی مجلس کے منعقد ہونے کا اعلان کرتے تھے یا عام گذرگاہوں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے اشتہار چپکا دئے جاتے تھے۔ جہاں تک آدمی کی آواز کو جلد سے جلد پہنچایا جاسکتا تھا۔ وہی پنچایتی حکومت کی حد بن جاتی تھی۔ کیونکہ آواز سننے والے لوگ ہی پنچایتی کارروائی میں شریک ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پنچایتی حکومتوں کا رقبہ اس زمانے میں بہت چھوٹا ہوا کرتا تھا۔

لیکن پریس اور وسائل خبر رسانی کی ترقی نے اخبار، پوسٹرس، ہینڈبل کے ذریعہ بڑے بڑے ملکوں بلکہ ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ اب ایک خبر کو ایک وقت میں ساری دنیا میں مشتہر کیا جاسکتا ہے اور ساری دنیا والوں کی رائے کا اس کے بارے میں پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

پریس کی اس ترقی نے اخبار کے ایڈیٹروں اور مالکوں کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ کیونکہ اخبار صرف خبریں ہی شائع نہیں کرتے بلکہ انھیں ترتیب دیتے اور ان کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر کرتے ہیں بعض خبروں اور رایوں کو دبا بھی لیتے ہیں اور بعض کو نمایاں اور بعض کو کم نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ ان تمام ذریعوں سے وہ لوگوں کو اپنی رائے کے مطابق کام کرنے یا نہ کرنے کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ایک ترقی یافتہ اخبار تعلیم یافتہ ملکوں میں گاؤں گاؤں اور محلہ کے ہر شخص تک پہنچتا ہے اس لئے اس کی بات کے سننے والے بہت ہوتے ہیں۔ مقرر اخبار کی امداد کے بغیر صرف چھوٹے چھوٹے مجمعوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا

ہے۔ ایک مجمع کے سامنے وہ ایک دن تقریر کرتا ہے دوسرے دن کسی دوسرے محلہ یا گاؤں یا شہر میں اسے تقریر کے لئے جانا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی تقریر کا اثر لوگوں پر روزانہ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اخبار روزانہ اپنے پڑھنے والوں کو جو ہر گاؤں اور ہر محلے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اپنا خیال سمجھا سکتا ہے۔ مقررا در اخبار میں اگر ان بن ہو جائے تو اخبار کی کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے آج کل اخبار کی طاقت مقرروں سے بھی زیادہ زبردست ہو گئی ہے۔ ان کی خوشنودی سے بڑے فائدے اور ان کی خفگی سے بڑے نقصان اٹھانا پڑتے ہیں۔

طاقت اپنی جگہ پر نہ اچھی چیز ہے نہ بری۔ یہ ایک غیر اخلاقی صفت ہے۔ اس کی اچھائی اور برائی کا انحصا اس کے استعمال کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ ایک قوی شخص اپنی قوت کو کمزور کی مدد کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے اور اس کے دبانے اور نقصان پہنچانے کے لئے بھی۔ اس لئے طاقت کو ہر جگہ بالکل آزاد اور خود مختار نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ اس پر ایسی پابندیاں عاید کرنا چاہیئں جس سے اس کی بھلائی کے امکانات ترقی پاسکیں اور اسی کی برائی کو روکا جا سکے۔ ایک زمانے میں تقریر اور تحریر کی آزادی کو ایک مسلمہ حقیقت کا مرتبہ ملا ہوا تھا اور ہر ترقی پسند تحریک کے مطالبات میں انہیں پہلی صف میں جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب بہت سے اخبار نکلتے تھے اور صرف چند اشخاص نے اخبار کی ملکیت پر اجارہ حاصل نہیں کیا تھا۔ مگر اب اخباروں کا چلانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہونے لگی ہے اور جس شخص کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ ہوتا ہے وہ اپنے حریف کو اتنے ہی جلد ختم کر سکتا ہے۔ پھر آج کل اخبار کی کامیابی کے لئے خبروں اور تنقیدوں کے پڑھنے والوں کی ہمدردی اور خوشنودی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ دواؤں، تفریحوں اور دوسرے اشتہاروں کی آمدنی سے اخبار پڑھنے والوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اخبار کو چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اخبار کے مالک اور ایڈیٹر ملک کے نہایت خیر خواہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود اپنے ذاتی فائدے یا اپنے دوستوں کے فائدہ کے لئے ایک نقصان رساں پالیسی کی تبلیغ و اشاعت کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مقرر بھی اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اگر انھیں ریڈیو کی جدید ایجاد کی حمایت حاصل نہ ہو تو اخبار کے مقابلہ میں ان سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ

بہت ہی کم ہے۔

دنیا کے لئے یہ مسئلہ واقعی بہت اہم ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کرے کہ اس کا نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہو۔ ہماری تمام تہذیب و ترقی کا انحصار اسی مسئلہ کے معقول حل پر ہے
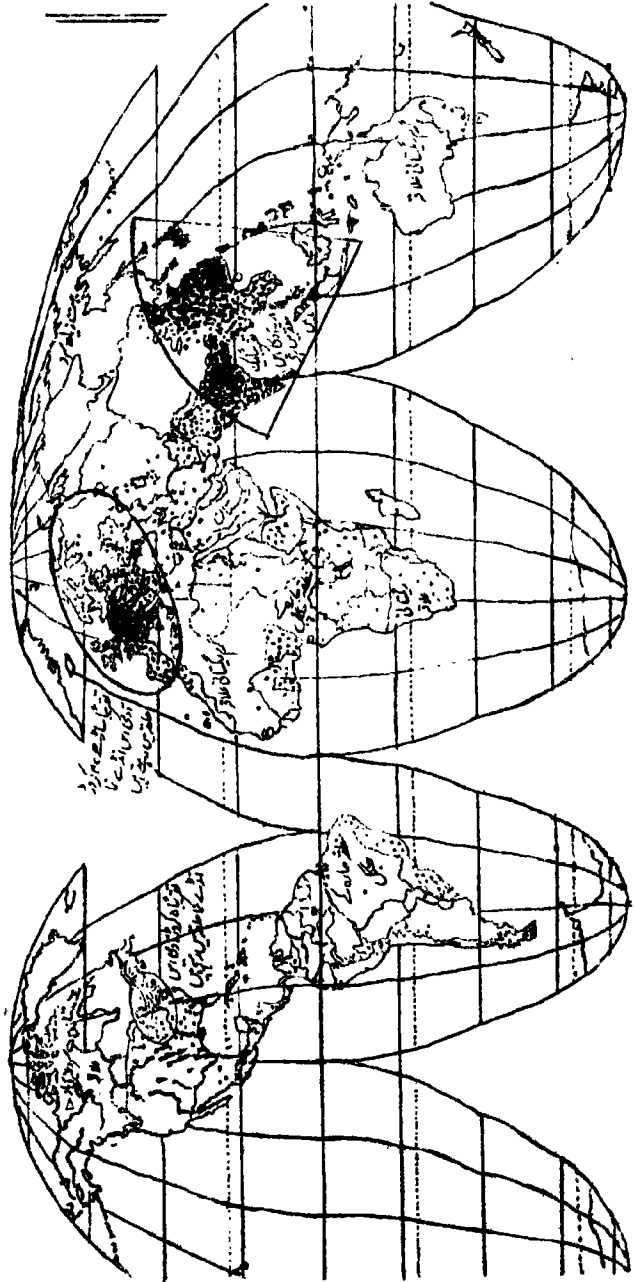
دنیا کی آبادی کی تقسیم

(نوٹ) اس نقشہ کا ہر نقطہ دس ہزار آدمیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ نقشہ میں جو حلقے بنائے گئے ہیں ان میں دنیا کی ۴/۵ آبادی بستی ہے۔ دنیا کی کل آبادی ایک ارب نوے کروڑ ہے ان حلقوں میں ایک ارب پچاس کروڑ آدمی بستے ہیں۔

امریکہ کا دستور اساسی

(از محمد عاقل صاحب)

امریکہ کے دستور کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اس کی جمہوریت ہے۔ یعنی حکومت کے ہر شعبہ میں عوام کی رائے اور مرضی کو پورا پورا دخل ہے۔ طرح طرح سے کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے کاروبار میں تمام رعایا زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکے۔ مقامی اداروں میں یہ کوشش سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ ریاستوں میں اس سے کم اور قومی حکومت میں اس سے بھی کم۔ ایسا قدرتی طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ مقامی اداروں میں تو ہر شہری حکومت کے کاروبار میں براہ راست شرکت کر سکتا ہے لیکن ریاست کے کاموں میں رقبہ کی وسعت اور تعداد کی کثرت کی وجہ سے ہر شخص براہ راست حکومت کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ قومی حکومت کے کام میں شریک ہونے کا موقع لوگوں کو اور بھی کم ملتا ہے۔

اس دستور کی دوسری خصوصیت اس کی لامرکزیت ہے یعنی قومی حکومت کے اختیارات بہت محدود ہیں اور ریاستوں اور مقامی اداروں کے اختیارات اور آزادیاں وسیع ہیں۔ امریکہ کا قومی دستور فیڈرل یا وفاقی دستور کہلاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ کا قومی اتحاد مکمل نہیں ہے بلکہ نامکمل ہے۔ امریکہ کی ریاستوں نے متحد ہو کر اپنے سارے اختیارات مرکزی حکومت کو سپرد نہیں کئے ہیں بلکہ صرف ان اختیارات کو مرکزی حکومت کو سونپا ہے جن کا ذکر دستور میں صراحتاً موجود ہے اور باقی ہر قسم کے اختیار کو انھوں نے اپنے لئے محفوظ رکھا ہے۔ دستور کی اس خصوصیت سے بھی پہلی خصوصیت یعنی جمہوریت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کو چونکہ جمہور سے براہ راست تعلق نسبتاً کم ہے اس لئے اس کے اختیارات بھی محدود کر دئے گئے ہیں۔

امریکہ کے دستور کی تیسری خصوصیت "تقسیم اختیارات" ہے یعنی جماعت قانون ساز، جماعت عاملہ اور عدالت تینوں کو ایک دوسرے کے اثر سے آزاد رکھا گیا ہے۔ جماعت عاملہ کے اراکین اور عدالت

کے حاکموں کا تقرر، جماعت قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ تینوں رعایا کی طرف سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس خصوصیت سے بھی جمہوریت کو ترقی ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت عاملہ جس قانون کو چاہے جماعت قانون ساز میں پاس نہیں کرا سکتی۔ نہ عدالت سے اپنے حسب منشار فیصلہ کرا سکتی ہے۔ اسی طرح جماعت قانون ساز اور عدالت بھی ایک دوسرے پر اور جماعت عاملہ پر ناجائز دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ نہ ان تینوں کی ملی بھگت سے رعایا پر ظلم و ناانصافی عرصہ تک جاری رکھی جا سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی چوتھی خصوصیت (Initiative) (Referendum) اور (Recall) کے اختیارات ہیں جن کے ذریعہ امریکہ کی بعض ریاستوں کی رعایا کو حق حاصل ہے کہ اپنے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی موجودگی کے باوجود خود براہ راست قانون سازی کے کام میں شریک ہو سکتی ہے۔ (Initiative) سے مراد یہ ہے کہ رعایا کی ایک مقررہ تعداد اگر چاہے تو کسی قانون کو اپنے نمائندوں کی معرفت نہیں بلکہ خود براہ راست مجلس قانون ساز میں پیش کر سکتی ہے (Referendum) سے مراد یہ ہے کہ بعض قوانین، خصوصاً ایسے جن سے دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کرنا منظور ہوتی ہے ان کے آخری فیصلہ کے لئے رعایا سے براہ راست ووٹ لیا جاتا ہے اور رعایا کی اکثریت کے ووٹ سے وہ منظور یا نامنظور کئے جاتے ہیں۔ (Recall) کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی منتخب شدہ افسر سے رعایا کی اکثریت ناخوش ہو جائے تو اس شخص کی مدت تقرر کے ختم ہونے سے پہلے رعایا اس کو برطرف کر سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی نمایاں خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب ہم دستور کی موجودہ شکل کو دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہم ریاستوں کے دستور اساسی کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ تاریخی حیثیت سے یہ زیادہ قدیم اور جس زمانہ میں قائم کی گئی تھیں اس عہد کے جمہوری خیالات کو نہایت تکمیل کے ساتھ ظاہر کرتی ہیں۔

ہر ریاست کے دستور میں ذیل کے اجزائے حکومت پائے جاتے ہیں:۔

(۱) سب سے اول اس کا ایک دستور اساسی ہوتا ہے جسے اس کے تمام شہریوں نے بنایا ہے اور جس میں ترمیم اور تنسیخ ان کے ووٹ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسرے دو ایوانوں کی ایک مجلس قانون ساز۔ ان دونوں ایوانوں کے ارکین کا انتخاب ایک

سے چار سال کی مدت کے لئے تمام بالغ آبادی کرتی ہے اعلیٰ ایوان کا نام سینیٹ ہوتا ہے اور اس کا حلقہ انتخاب زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے ارکین کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ دونوں کے اختیارات تقریباً مساوی ہوتے ہیں۔ گو اکثر ریاستوں میں بجٹ پر بحث پہلے ایوان ادنیٰ میں ہوتی ہے اور پھر سینیٹ میں۔ بعض ریاستوں میں عہدہ داروں کا تقرر گورنر سینیٹ کی رائے معلوم کرنے کے بعد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ریاستوں میں جب اعلیٰ افسروں پر فرائض منصبی ٹھیک طریقہ پر انجام نہ دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جاتا ہے تو سینیٹ کو عدالت کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔

(۳) ریاستوں کی حکومت کا تیسرا جزء گورنر ہے جسے عموماً دو سال کے لئے تمام شہری منتخب کرتے ہیں۔ گورنر جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور مجلس قانون ساز کے پاس کئے ہوئے قوانین کو مسترد کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن اگر دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت اس قانون کو دوبارہ پاس کردے تو اس کا یہ حق زائل ہوجاتا ہے۔

(۴) ریاستوں کی حکومت کا چوتھا جزء انتظام کرنے والے افسر ہوتے ہیں جن میں سے بعض تو علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں اور بعض بورڈ بنا کر۔ ان کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ کم مدت کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ افسر صرف قانون کے پابند ہوتے ہیں اور مجالس قانون ساز کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں گورنر بھی صرف چند معاملات میں ہی ان کی نگرانی کرتا اور انھیں ہدایت دے سکتا ہے ورنہ یہ بیشتر رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔

(۵) ریاستوں کی حکومت کا پانچواں جزء ادنیٰ افسر ہوتے ہیں جنھیں یا تو گورنر مقرر کرتا ہے یا مجلس قانون ساز یا اعلیٰ افسر اور ان کے بورڈ۔

(۶) ریاستوں کی حکومت کا چھٹا جزء جج ہوتے ہیں جنھیں یا تو کل ریاست کے لئے سب شہری منتخب کرتے ہیں یا مقامی علاقوں کے لئے مقامی لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان کے تقرر کی مدت بھی عموماً مختصر ہوتی ہے ان عہدہ داروں کی تنخواہیں عموماً کم ہی ہوتی ہیں۔

یہ تو ریاستوں کی حکومت کا حال ہوا۔ لیکن امریکہ کے اپنے والوں کو تین مختلف قسم کی حکومتوں کے احکام ماننا ہوتے ہیں۔ وفاقی حکومت، ریاستوں کی حکومت، اور مقامی حکومت یعنی لوکل سلف گورنمنٹ آئیے اب مقامی حکومتوں یا لوکل سلف گورنمنٹ کا مطالعہ کریں۔

امریکہ کی جمہوری حکومت نہایت مکمل شکل میں اسی جگہ نظر آتی ہے۔ امریکہ کے سیاسی اداروں کی جو لوگ بہت تعریف کرتے ہیں وہ انہی مقامی اداروں کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ مقامی حکومت کی مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں ہیں۔ شمال مشرق میں کچھ اور شکل ہے، شمال مغرب میں کچھ اور۔ اسی طرح جنوب اور وسط مشرق اور وسط مغرب کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ شمال مشرق یعنی نیو انگلینڈ کے علاقہ میں قدیم وضع کی ٹاؤن شپ پائی جاتی ہے جن میں ہر سال قصبہ کی تمام آبادی کا ایک جلسہ ہوتا ہے اور اس میں سالانہ آمد و خرچ کا حساب پیش کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال کے Selectmen یعنی عہدہ داروں سے ہر شخص کو جواب طلب کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور نئے عہدہ داروں یعنی سرپنچوں کا انتخاب سب شہریوں کے ووٹ سے کیا جاتا ہے۔ ٹاؤن شپ سے زیادہ وسیع رقبہ کاؤنٹی کا ہوتا ہے اور یہ ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرح بڑی سڑکوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور اپنے علاقوں کے ججوں کا بھی انتخاب کرتی ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں ٹاؤن یا ٹاؤن شپ نہیں ہوتیں بلکہ وہاں حکومت کی ابتدا کاؤنٹی سے ہوتی ہے۔ کاؤنٹی کے افسروں کا انتخاب بھی تمام شہری براہ راست کرتے ہیں۔ وسطی اور مغربی ریاستوں میں ٹاؤن شپ اور کاؤنٹی دونوں پائی جاتی ہیں۔ لیکن امریکہ کے تمام علاقوں کی مقامی حکومتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سب میں حکومت کے معاملات کا تصفیہ تمام شہری براہ راست خود ہی کرتے ہیں۔ افسروں کا تقرر مرکزی حکومتیں نہیں کرتیں بلکہ لوگ انھیں خود منتخب کرتے ہیں اور وہ اپنی رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔ مقامی معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ شہروں کے انتظام میں بھی جمہوری نظام سے پوری طرح کام لیا جاتا ہے۔

اب اخیر میں ہم قومی یا فیڈرل حکومت کے دستور اساسی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تیسری حکومت ہے جس کے احکام امریکہ کے رہنے والوں کو ماننے پڑتے ہیں۔ فیڈرل یا قومی حکومت کے اجزا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سب سے اول قومی کانگریس یعنی مجلس قانون ساز جس کے دو ایوان ہوتے ہیں۔ پہلے ایوان یعنی (House of Representatives) کے اراکین کا انتخاب دو سال کے لئے ہوتا ہے اور ہر بڑے ضلع کا ایک ایک نمایندہ منتخب کرکے بھیجا جاتا ہے۔ ریاست کے انتخاب میں حصہ لینے کے جو لوگ مستحق ہوتے ہیں وہی لوگ اس انتخاب میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ جنوب کی اکثر ریاستوں میں حبشیوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے ایوان کا نام سینیٹ ہے اور اس میں ہر ریاست کی طرف سے دو نمایندے چھ سال کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ سینیٹ کے نمایندوں کی ایک تہائی تعداد کا انتخاب ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ ابتدا میں قومی سینیٹ کے اراکین کو ریاستوں کی مجالس قانون ساز منتخب کرکے بھیجا کرتی تھیں۔ لیکن ۱۹۱۳ء سے ہر ریاست کے شہری براہ راست انھیں منتخب کرکے بھیجنے لگے ہیں۔ سینیٹ کا کام یہ بھی ہے کہ پریسیڈنٹ جن افسروں کا تقرر کرتا ہے یہ ان کے تقرر کی منظوری دیتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکوں سے جو معاہدے کئے جاتے ہیں ان کی منظوری کے لئے سینیٹ کے دو تہائی ووٹ حاصل کرنا ضروری ہیں اعلیٰ افسروں پر بددیانتی یا غفلت بہ کار منصبی کے سلسلہ میں جو مقدمے چلائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے سینیٹ عدالت کا کام انجام دیتی ہے۔

(۲) قومی حکومت کا دوسرا جز پریسیڈنٹ ہے جو جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور اسے چار سال کے لئے وہ لوگ منتخب کرتے ہیں جنھیں خاص طور پر اسی کام کے لئے ہر ریاست کے شہری چنتے ہیں۔ ان انتخاب کرنے والے لوگوں کی تعداد (House of Representatives) کے ارکان کی تعداد کے برابر ہوتی ہے لیکن چونکہ انتخاب کے وقت انھیں اپنے منتخب کرنے والوں سے یہ وعدہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ منتخب ہو کر اسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیں گے جسے ان کے منتخب کرنے والے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ عملی طور پر پریسیڈنٹ کا انتخاب امریکہ کی کل بالغ آبادی ہی کرتی ہے۔ پریسیڈنٹ کو اختیار ہوتا ہے کہ ان قوانین کو جنھیں کانگریس نے منظور کیا ہے مسترد کر دے لیکن اگر دونوں ایوان اس قانون کو دوبارہ دو تہائی اکثریت کے ساتھ پاس کر دیں تو پھر یہ مسودہ قانون پریسیڈنٹ کی مخالفت کے باوجود قانونی جامہ پہن لیتا ہے۔

(۳) قومی حکومت کا تیسرا جز عدالت ہوتی ہے جس میں سپریم کورٹ اور وہ تمام فیڈرل کورٹ شامل ہیں جو قانون کے ذریعہ وجود میں آئیں۔ ججوں کا تقرر عمر بھر کے لئے پریسیڈنٹ سینیٹ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

کرتا ہے۔ صرف سینیٹ کے سامنے مقدمہ چلا کر ان کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ادنےٰ فیڈرل کورٹ ملک کے ہر حصہ میں قائم ہیں اور ان کے فیصلوں کی اپیلیں سپریم کورٹ میں کی جاتی ہیں۔

امریکہ کے دستور کا حال جو ابھی بیان کیا گیا ہندوستان کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ہم بھی ہندوستان میں ایک فیڈرل یا وفاقی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن امریکہ کے وفاق کی بنیادیں مضبوط ہیں کیونکہ اس کے مقامی اداروں میں جمہوریت نہایت مکمل شکل میں پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنا ایک علیحدہ مستقل وجود رکھتے تھے اور بعد میں مل کر انھوں نے وفاق کی شکل اختیار کی۔ لیکن ہندوستان کی حکومت ایک طویل عرصہ سے منفرد اور مرکزیت پسند رہ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں جمہوریت اوپر سے چھن چھن کر نیچے پہنچ رہی ہے۔ ہمارے یہاں آل انڈیا ادارے تو سیاسی حیثیت سے خاصے ترقی یافتہ ہیں لیکن مقامی ادارے ابھی تک مرکزی اداروں کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ ان میں ذاتی ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ ان میں ابھی تک حکومت خود اختیاری نے پوری طرح جڑ نہیں پکڑی ہے۔ امریکہ کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں قومی حکومت میں جمہوریت کے اجزا نسبتاً کم نظر آتے ہیں اور ریاستوں میں بہت زیادہ۔ مثلاً مرکزی سینیٹ کے اراکین کے تقرر کی مدت طویل یعنی چھ سال ہے۔ ریاستوں کی سینیٹ کی صرف دو سال۔ فیڈرل جج عمر بھر کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں ریاستوں کے جج مختصر مدت کے لئے۔ فیڈرل حکومت کے افسروں اور ججوں کا تقرر پریسیڈنٹ کرتا ہے لیکن ریاستوں میں ان کا انتخاب رعایا خود کرتی ہے۔

ہم بھی اگر ہندوستان میں اپنی دستوری حکومت کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی سیاسی تعلیم اور جمہوری تنظیم کے لئے مقامی اداروں کی ترقی اور اصلاح کی سب سے زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

غریبی

(محمد عاقل صاحب)

جارج برنارڈ شا نے اپنے ایک ڈرامے میں جس کا نام میجر باربرا ہے غریبی کی ایک نہایت بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ڈرامے کا ایک کیرکٹر سوال کرتا ہے "کیا غریبی ایک جرم ہے"؟ دوسرا کیرکٹر جواب دیتا ہے "سنگین ترین جرم! تمام دوسرے جرم اس کے مقابلہ میں نیکیاں ہیں۔ تمام دوسری بے عزتیاں اس کے مقابلے میں عروج اور کامرانی کے اعلیٰ مراتب ہیں۔ غریبی، بڑے شہروں پر ایک بلا کی طرح چھا جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہیبت ناک وبائیں پھیلتی ہیں۔ جو لوگ اس کو دیکھ، سن یا سونگھ سکتے ہیں ان کی روحیں فوراً مردہ ہو جاتی ہیں۔ جسے ہم جرم کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کہیں قتل ہو گیا، کہیں چوری، کہیں دھول دھپا ہو گیا، کہیں گالی گلوج۔ ان سب کا کوئی دیر تک باقی رہنے والا اثر نہیں ہوتا۔ یہ زندگی کی معمولی بیماریاں یا حادثے ہیں۔ لیکن لاکھوں غریب، ذلیل، گندے آدھے بھوکے، آدھے ننگے جو لوگ ہوتے ہیں وہ ہمارے جسم اور روح کو برابر زہر دیتے رہتے ہیں۔ وہ سماج کی تمام خوشیوں کو مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادیوں کو قربان کر دیں اور ایسی غیر فطری سختیوں اور بے رحمیوں کا انتظام کریں جن کی وجہ سے غریب لوگ ہمارے خلاف کبھی سر نہ ابھار سکیں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہی اور ذلت کے گہرے گڑھے میں نہ گھسیٹ لیں جرائم سے صرف بے وقوف ڈرتے ہیں۔ ہم سب کو جس چیز کا خوف ہے وہ غریبی ہے۔"

اسی ڈرامے میں ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے "جب ہم ایک شخص کو کنگال دیکھتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ کنگال ہے تو ہوا کرے ہمیں اس سے کیا، تو ہم ان نتیجوں کی طرف دھیان نہیں دیتے جو ہماری اس بے توجہی اور لاپرواہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم جب ایک شخص کو کنگال رہنے دیتے ہیں تو گویا ہم اسے اجازت دیتے ہیں کہ وہ کمزور، جاہل، بیماریوں کا سوتا، بدصورتی اور گندگی کی ایک ڈراؤنی مورت بن جائے۔ ہم اسے اس بات کا پروانہ دیتے ہیں کہ وہ کمزور ہڈی والے بچوں کی نسل کو بڑھائے۔ وہ بازار میں اپنی محنت

کا معاوضہ کم طلب کرے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اپنی طرح کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور کرے۔ وہ ہمارے صاف اور ستھرے شہروں کو اپنے گندے اور کم حیثیت گھروندوں کے ذریعہ زہر اور جراثیم کا خزانہ بناسکے ہم اس کی لڑکیوں کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو گندی بیماریوں میں مبتلا کرسکیں اور اس کے لڑکے اپنے باپ کی غریبی کا بدلہ اس طرح لیں کہ قوم کی مردانہ خصوصیات کو تپ دق کے مریضوں جیسی شکلیں بناکر، بزدلی، بدنصیبی، منافقت، سیاسی نااہلیت اور ظلم اور خوراک کی کمی کے اور جس قدر بھی دوسرے نتایج ہوسکتے ہیں ان سب میں تبدیل کردیں۔"

برنارڈ شا کے ڈرامے کے ان دو اقتباسوں سے غریبی کی خرابیوں کا ایک اندازہ کیا جاسکتا ہے غریبی دنیا میں ہمیشہ سے رہی ہے لیکن پرانے زمانے میں غریبوں کے مسئلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو آج کل اسے حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی نئی نئی ایجادوں، علم کی بے شمار ترقیوں اور جمہوری اصولوں کے عام رواج نے انسانوں کی امنگوں اور حوصلوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ جو چیزیں قدیم زمانے میں نادر اور کمیاب سمجھی جاتی تھیں اب ان کا شمار زندگی کی معمولی ضرورتوں میں ہونے لگا ہے۔ دولت کے پیدا کرنے کے امکانات کو خوب ترقی ہوگئی ہے۔ اب پرانی محرومیاں اور مجبوریاں باقی نہیں رہی ہیں بلکہ اب تو شکایت اس بات کی کی جاتی ہے کہ دولت کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے۔ گیہوں گوشت، لوہا، کوئلہ، تانبا، ربر اور معدنی تیل کے پیدا کرنے والے یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ انھیں اپنے مال کے لئے خریدار نہیں ملتے۔ یہی حال موٹر کاروں، گراموفونوں، سینے کی مشینوں، ریڈیو وغیرہ بنانے والوں کا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مال بہت زیادہ بن گیا ہے۔ غرض ایک طرف تو کھلیان بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گوداموں اور دوکانوں میں مال کے انبار لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ پکے ہوئے کھیتوں میں خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ہل چلا دئے جاتے ہیں، چائے کی پیٹیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے، گوشت کا کھاد بنادیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان بدنصیبوں اور محروموں کا مجمع ہوتا ہے جو دولت کے اس تمام انبار کو دیکھتا ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس مجمع میں کچھ اپاہج، معذور، نااہل اور نالائق لوگ بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو تندرست، توانا، جفاکش اور سطحی درجہ کی ذہانت، مہارت اور کیرکٹر رکھنے

والے ہوتے ہیں۔ انہیں اگر کام کا موقع دیا جاتا تو یہ ہرگز کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں پیچھے نہ رہتے اور اپنی محنت سے دولت کی مقدار میں ضرور اضافہ کرتے لیکن یہ لوگ موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام میں بے کار رہتے یا کم اجرت پر کام کرنے یا حکومت سے بے روزگاری کی امداد یا اسی قسم کی کوئی اور مدد لے کر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور یہ لوگ باوجود اس کے کہ انہیں چیزوں کی ضرورت یا خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے پھر بھی ان سے محروم رہتے ہیں۔ ایک طرف دولت کی مقدار کو بڑھانے کے لئے نہایت کثیر امکانات کا موجودہ ہونا اور مال بنانے والوں کا یہ شکایت کرنا کہ مال ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف غریبی، ضرورت اور محرومی —— یہ بیسویں صدی کا وہ پیچیدہ معمہ ہے جس کا فوری اور قابل اطمینان حل سوچنا ہماری نسل کے لئے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

آبادی کا ایک کثیر حصہ اس مال سے جو موجود ہے کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس سوال کا نہایت سہل جواب جس پر سب متفق ہو سکتے ہیں تو یہ ہے کہ اس کے پاس خریدنے کی قوت نہیں ہوتی۔ وہ جب بازار میں جاتا ہے تو اس کی جیب خالی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی جیب کیوں خالی ہوتی ہے اس کے پاس خریدنے کی قوت کیوں نہیں ہوتی اس کے جواب بہت سے ہو سکتے ہیں اور اس میں رائے کا اختلاف بھی خوب پیدا ہو سکتا ہے۔ قوت خرید کی کمی یورپ کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے اور ایشیا کے زراعتی اور پس ماندہ ملکوں میں بھی۔ یہ آزاد اور خود مختار ملکوں میں بھی ملتی ہے اور محکوم نوآبادیوں میں بھی قوت خرید کی کمی کا جو لوگ شکار ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہونے کے لئے پیدائشی طور پر ناموزوں ہوتے ہیں یعنی ایسے لوگ جن کے جسم یا دماغ پیدائشی طور پر کمزور یا ناقص ہوتے ہیں یا کسی اور وجہ سے یہ لوگ اپاہج، معذور اور نااہل بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد مجموعی طور پر بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو نسلی، پیدائشی یا طبعی طور پر تو نااہل نہیں ہوتے بلکہ اپنے حالات اور ماحول کی خرابی کی وجہ سے اپنی قوت خرید کو بڑھانے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔

پھر حالات کی خرابی بھی مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی مثال کو اگر سامنے رکھا جائے

تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں کی غریبی ساری دنیا سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اس ملک میں دولت کے قدرتی وسائل بہت کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن پھر بھی لوگ غریب ہیں اور ان کی قوت خرید کی کمی کا رونا تمام دنیا روتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کے لئے کیوں یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قوت خرید کو بڑھا کر دولت کے اس انبار سے فائدہ اٹھائیں جسے خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں لوگ بہت سی باتوں کو پیش کرتے ہیں کوئی کہتا ہے یہاں مذہبیت کا بڑا زور ہے۔ یہاں کے لوگوں کو دنیا کی چیزوں کا بالکل شوق نہیں ہے۔ یہ تو سب اللہ والے اور مہاتما ہیں۔ یہ تو دوسرے جنم یا عاقبت کی خوشیوں کی فکر میں رہتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اس لئے دولت پیدا کرنا ہی نہیں چاہتے کوئی کہتا ہے کہ اس ملک کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کا پالنا ہندوستان کے لئے ناممکن ہے۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسے آدھا پیٹ بھر کر سب لوگ کھا لیتے ہیں۔ کسی اور چیز کے خریدنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ کوئی کہتا ہے یہاں کے کسانوں کو ملک کے زیادہ تر حصہ میں پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک بے کار رہنا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہاں کی آدھی آبادی یعنی عورتیں کام ہی نہیں کرتیں۔ کوئی نو عمری کی شادی لیریا، مقدمہ بازی کے شوق وغیرہ کو ہندوستان کی غریبی کا سبب قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کو عقلمندی کے ساتھ صرف کرنا نہیں جانتے۔ انھیں مناسب غذا کا علم نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ملک کی دولت جو باہر جاتی ہے اس کا پورا معاوضہ مادی شکل میں ملک کو نہیں ملتا۔ یہ کام چونکہ عرصہ سے جاری ہے اس لئے ملک غریب ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے حکومت کی طرف سے صنعتوں کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ غرض یہ مختلف اسباب ہندوستان کی غریبی کے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے۔ لیکن معاشی زندگی نے موجودہ زمانہ میں جو شکل اختیار کرلی ہے اس کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے غریبی کے مسئلہ کو زیادہ وسیع نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کی ترقی نے تمام ملکوں کی معاشی زندگی کو ایک ڈوری میں پرو دیا ہے۔ اب کسی ایک ملک کی غریبی کے مسئلہ کو بہت بڑا سے دنیا سے الگ تھلگ سمجھ کر غور نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جو لوگ ہندوستان کی زیادہ آبادی کی شکایت کرتے ہیں انھیں جاننا چاہیئے کہ ہندوستان اب صرف اپنی ندامتی پیداوار پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور

نہیں رہا ہے۔ کل دنیا کی پیداوار اس کا پیٹ بھرنے کے لئے موجود ہے۔ دنیا کی مجموعی پیداوار موجودہ زمانے میں اتنی بڑھ گئی ہے یا اسے نہایت آسانی کے ساتھ اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آبادی کو بصورت مجموعی ضرورت سے زیادہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور بہت سے دوسرے زرخیز علاقے ایسے ہیں جہاں کی آبادی ضرورت سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ضرورت سے کم ہے۔ یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی یا گھٹ رہی ہے یا ایک جگہ پر قائم ہے۔ دنیا کی منڈیاں ملکی نہیں رہی ہیں بلکہ عالمگیر ہو گئی ہیں اور ان منڈیوں میں غذا کی چیزوں کی قیمتیں بڑھ نہیں رہی ہیں بلکہ گھٹ رہی ہیں۔ اس لئے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان کی زراعتی پیداوار یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں ہے تو بھی اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی آبادی کے لئے غذا کا مہیا کرنا مشکل یا ناممکن ہے۔ مسئلہ صرف قوت خرید کے پیدا کرنے کا ہے۔

جب اس نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کے مسئلہ کو دیکھا جاتا ہے تو اس ملک کے غریبوں کا مسئلہ تمام دنیا کے غریبوں کے مسئلہ کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ جو بات دوسرے ملکوں کے غریبوں کی قوت خرید کے اضافہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے وہی ہندوستان کی غریبی کو دور کرنے میں بھی حائل ہے۔ چاہے مشرق ہو چاہے مغرب، چاہے صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ملک ہوں چاہے زراعت پیشہ پس ماندہ ملک — مسئلہ ہر جگہ یہی ہے کہ اگر دنیا سائنس کی ایجادوں، علم کی ترقیوں اور دولت کے اضافہ کے غیر محدود امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تو اسے اپنی معاشی اور سماجی تنظیم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا ہوں گی جو نئے حالات اور نئے مطالبوں کے مطابق ہوں۔ ہماری موجودہ سماجی اور معاشی تنظیم سائنس کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سائنس اور سماجی تنظیم کا باہمی اختلاف اور معاشی تنظیم کا اندرونی تضاد روز بروز زیادہ پیچیدہ اور خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری سماجی تنظیم ہماری معاشی ترقی کو بالکل اسی طرح روکنا چاہتی ہے جیسے کوئی شخص ایک تندرست بچے کی قدرتی نشو و نما کو ایک لوہے کا شکنجہ کس کر روکنے کی کوشش کرے۔

موجودہ معاشی اور سماجی تنظیم میں پیدائش دولت کا پورا انتظام آجروں اور ان کے ساہوکاروں کے فائدہ کے لئے چلایا جاتا ہے۔ اس میں قصداً اور ارادتاً عوام کی بہبودی کے مقصد کو نظر کے سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ

آجروں اور سرمایہ داروں کے نفع کا خیال سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ مزدور کی اجرت یا اس کا روزگار سے لگا رہنا یا آبادی کی عام مرفہ الحالی اور بہبودی یہ چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جس وقت سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں معاشی تنظیم کی نگرانی ہوتی ہے یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں ان کو نفع ملنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے وہ فوراً اس کام کو بند کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے اس فیصلہ کا اثر جماعت پر کیا ہوگا، کتنی پریشاں حالی، مصیبت اور تکلیف میں لوگ مبتلا ہو جائیں گے۔ انہیں تو صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ان کی حساب کی کتابوں میں مزدوروں کی اجرت، کچے مال کی قیمت اور دوسری لاگتوں کو منہا کرنے کے بعد نفع کی رقم باقی بچتی ہے یا نہیں اگر یہ نفع باقی نہیں بچتا ہے تو ان کے نزدیک پیدائش دولت کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اگر قیمتوں کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے نفع کو کم دیکھتے ہیں تو قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ قیمت رسد اور طلب کی کمی اور بیشی کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہے اس لئے اپنی قیمتوں کے بڑھانے کے لئے انہیں اپنی اشیا کی رسد میں مصنوعی کمی پیدا کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور پیداوار کے ضائع کرنے کی وہ صورتیں اختیار کی جاتی ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس ذاتی نفع کے لالچ میں یہ خود غرض لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو مزدور ان کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں وہی چیزوں کے خریدار بھی ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان کی اجرتوں کو گھٹاتے یا انہیں برطرف کرتے ہیں تو اپنے خریداروں کی قوت خرید کو کم کرتے اور اپنے مال کی بکری میں خود ہی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی جماعتی پیدائش اور اس پر انفرادی قبضہ زیادہ دنوں تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ جماعتی پیدائش کے لئے جماعتی تصرف ضروری ہے اور جماعت کے مفہوم میں کسی ایک طبقہ یا ملک کی آبادی شامل نہیں ہے بلکہ کل دنیا کی آبادی پر یہ بات صادق آتی ہے۔ دولت کو بڑے پیمانہ پر پیدا کرنے کا کام جب شروع کر دیا جاتا ہے تو پھر گاہکوں کی تلاش صرف ایک ملک تک محدود نہیں رکھی جاتی بلکہ ساری دنیا کی آبادی کو اس کے حلقہ میں شامل کرنے کا حوصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب سب ملکوں کے لوگوں کے لئے روزگار مہیا کر کے ان کی قوت خرید میں اضافہ کیا جائے۔ پوری دنیا کی خوش حالی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ ہو گئی ہے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طبقہ یا ملک تو خوش حال رہے اور دوسرے پہلے کی طرح غریب کے غریب رہیں۔ سب کو مل کر کام کرنا اور سب کو ایک ساتھ گرنا یا ابھرنا ہے۔ پیدائش

دولت کی تنظیم کے کام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے خودغرض لوگوں کے ہاتھ سے نکالا جائے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو ذاتی نفع کے لئے نہیں بلکہ خدمت کے جذبہ کے ماتحت کام کریں اور ان کا مقصد چند افراد کی مرفہ الحالی اور بہبودی نہ ہو بلکہ ان کا نصب العین کل جماعت انسانی کی بہبودی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ خدمت کے جذبہ کے ماتحت اتنا ہی سخت اور مسلسل کام ایک عرصہ تک خلوص کے ساتھ جاری رکھ سکیں جتنا وہ نفع ذاتی کے لالچ کے ماتحت جاری رکھتے ہیں؟ کیا ان میں وہ نظم و ضبط اور مستعدی پیدا کی جا سکتی ہے جو بڑے پیمانہ پر کام چلانے کے لئے ضروری ہے؟ یہ انسانی سیرت اور نفسیات کے پوشیدہ امکانات کا سوال ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں اگرچہ ان کی تعداد ابھی بہت زیادہ نہیں ہے جو بے غرض خدمت اور ایثار و قربانی کی زندگی کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمر بھر جاری رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد کو تعلیم و تربیت اور ماحول کو پورے طور پر بدل دینے سے کس حد تک بڑھایا جا سکتا ہے یہ تجربہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

بے روزگاری

(محمد عاقل صاحب)

بے روزگاری کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ کن لوگوں کا شمار بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے ہندوستان کے نوجوانوں کو یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے کے بعد چونکہ اب یقینی طور پر سرکاری نوکریاں نہیں ملتیں اور کسی دوسرے پیشہ سے لگنے کے لئے نہ ان کی تربیت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس اس کے وسائل ہوتے ہیں اس لئے اس ملک میں بے روزگاری کا مطلب عام طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری لیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ لفظ کسانوں کی بے کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہر سال پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک کاشتکاروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر وہ کسی معقول کام سے لگ سکیں تو ان کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی کام کرنے کے لئے نہیں ہوتا اس لئے ان کا شمار بھی بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے بے روزگاری کی اس صورت کی طرف ہندوستان کے رہنماؤں نے خاص طور پر توجہ کرنا شروع کر دی ہے اور دیہی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔

لیکن بے روزگاری کے جس مسئلہ کا دنیا میں چرچا ہے اور جو بڑے بڑے عالموں کو چکر میں ڈالے ہوئے ہے اس کا تعلق تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری یا کاشتکاروں کی چند مہینوں کی بے روزگاری سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری سے ہے۔

آئیے اس سلسلہ میں لگے ہاتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ آدمی روزگار سے کیوں لگنا چاہتا ہے۔ قدرت نے دنیا کا کارخانہ کچھ اس وضع کا بنایا ہے کہ محنت کئے بنا آدمی کو اس کی ضرورت کی چیزیں میسر نہیں آتیں۔ روزگار (یعنی محنت مزدوری کرنے کا وسیلہ یا موقع) آدمی صرف اس لئے ڈھونڈتا ہے کہ اسے آمدنی حاصل ہو اور وہ چین اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ کھانے کو مناسب غذا ملے، رہنے کو مکان ملے، پہننے کو ایسا کپڑا ملے جو

جسم کو ڈھانپ سکے۔ سردی گرمی سے بچا سکے اور صفائی اور سلیقہ کے جس معیار کا اس کے طبقہ میں چلن ہے اُسے پورا کر سکے اور اسی طرح کی اور دوسری آرام اور راحت کی چیزیں اپنے لئے حاصل کر سکے۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہیں جو خود محنت نہیں کرتے اور دوسروں سے محنت کرا کے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ہم یہاں بحث میں لانا نہیں چاہتے۔ انھیں اگر چھوڑ دیا جائے تو پھر ہر ملک میں آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ملے گی جسے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محنت اور روزگار کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔

اب چونکہ آدمی کا پیٹ ہر روز غذا مانگتا ہے اور اس کی ضرورتیں اسے روزانہ ستاتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے روزگار کو بھی مستقل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر روزگار مستقل نہ ہوا ـــ ایک دن تو محنت مزدوری مل گئی اور دوسرے دن کام نہ ملا ـــ تو ایک دن تو آدمی کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی لیکن دوسرے دن فاقہ کی نوبت آجائے گی۔ اور اگر کہیں یہ بے کاری کئی دن تک جاری رہی پھر تو آدمی کا جینا مشکل ہو جائے گا۔

دنیا کے اکثر ملکوں کی حکومتیں رعایا کے لئے روزگار فراہم کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں اس لئے ان ملکوں میں چند سرکاری اور غیر سرکاری مستقل ملازموں کو چھوڑ کر محنت کرنے والی بقیہ آبادی کے لئے روزگار مستقل اور یقینی نہیں ہوتا۔ لوگ عمر بھر کے لئے ملازم نہیں رکھے جاتے بلکہ صرف اس وقت تک کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جب تک ان کی محنت سے کارخانہ کے مالک کو نفع ملتا رہتا ہے۔ جس دن یا جس لمحہ کارخانہ کے مالک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مزدور کے رکھنے میں اس کا کوئی نفع نہیں ہے وہ اسی وقت اس کو برطرف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد مزدور کہاں جائے۔ کیا کرے' اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کس طرح پالے' کارخانہ کے مالک کو اس سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس خرابی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے؟ کیا مزدوروں کے لئے روزگار کو یقینی اور مستقل نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا انھیں بھی دوسرے سرکاری ملازموں کی طرح مستقل طور پہ ملازم نہیں رکھا جا سکتا تاکہ یہ سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کرتے رہیں اور کام کے معاوضہ سے اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کریں؟ کیا ہر مزدور کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سرکار سے روزگار کا مطالبہ کرے اور جب اس کے لئے روزگار مہیا نہ ہو سکے تو

حکومت اس کی کفالت کی ذمہ دار بن جائے ؟

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ موجودہ نظام میں مزدوروں کا روزگار کیوں یقینی نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں موجودہ صنعتی نظام کی تین خرابیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ مختلف پیشوں کے ماہروں میں پورا توازن اور اشتراک عمل پیدا نہیں کیا جاسکتا

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جاسکتا

اس کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس نظام میں روزگار کے چڑھاؤ اور اتار کا ایک مستقل چکر برابر چلتا رہتا ہے

سب سے پہلے پہلی خرابی کو لیجئے یعنی مختلف تجارتوں کے ماہروں میں توازن اور اشتراک عمل نہیں پایا جاتا۔ صنعتوں کی نئی تنظیم کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تقسیم عمل کو خوب ترقی ہوگئی ہے ایک مال کو ایک تنہا آدمی تیار نہیں کرتا بلکہ ہزاروں ماہر مل کر اسے تیار کرتے ہیں۔ اور ہر ماہر اپنی اپنی جگہ پر اس مال کے صرف ایک حقیر حصہ کو تیار کرتا ہے اور تیار کرکے اگلے ماہر کے سپرد کردیتا ہے جو اپنے کام کا حصہ پورا کرکے اسے پھر آگے بڑھا دیتا ہے۔ ان کاموں میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو ایک ہی کارخانہ کے مالک کی نگرانی اور انتظام میں کئے جاتے ہیں۔ ان میں تو توازن اور اشتراک عمل پیدا جاسکتا ہے لیکن کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو مختلف مالک اپنے اپنے کارخانوں میں کراتے ہیں اور اپنی بنائی چیز کو مصنوعہ مال کی شکل میں بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ ایسے کاموں میں باہمی توازن قائم نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً سوتی کپڑے کو لیجئے کپاس کے پیدا کرنے والے کپاس کو اوٹنے اور روئی کی گانٹھیں بنانے والے روئی کو گودام میں اکٹھا کرنے والے اسے ریل اور جہاز پر لاد کر دوسرے علاقوں میں بھیجنے والے اس کا سوت کاتنے والے اس کو بننے اور رنگنے والے کارخانے بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے جداگانہ مالکوں کی نگرانی میں مال تیار کراتے اور منڈی میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ انھیں سوتی کپڑے کے آخری خریداروں یا اپنے ذاتی مال کے خریداروں کی مانگ اور اپنے حریفوں کی پیداوار کا کوئی پختہ علم نہیں ہوتا۔ اس امید پر کہ ہمارا مال تو بک ہی جائے گا وہ ایک طرح سے جوا کھیلتے رہتے ہیں اور چونکہ ہر شخص کو کارخانہ کھولنے کی آزادی ہے اس لئے اکثر ایسا ہوتا

ہے کہ کبھی کپاس کے کھیت زیادہ بو دیئے جاتے ہیں، کبھی روئی اوٹنے اور گانٹھ بنانے کے کارخانے زیادہ بن جاتے ہیں، کبھی روئی کے گودام زیادہ تعمیر کردیئے جاتے ہیں، کبھی روئی کے تاجروں کی دوکانیں زیادہ کھل جاتی ہیں، کبھی ریل کی ویگنیں اور جہاز زیادہ بن جاتے ہیں، کبھی روئی کے کاتنے والے کارخانے زیادہ ہوجاتے ہیں کبھی روئی کو بننے والے۔ غرضیکہ جب یہ تناسب بگڑتا ہے تو بہت سے کارخانے یا تو بند کردیئے جاتے ہیں یا انھیں اپنے کام کو بہت گھٹانا پڑتا ہے اور دونوں صورتوں میں آفت مزدوروں پر آتی ہے اور انھیں بلاکسی ذاتی خطا اور قصور کے برطرف کردیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ تقسیم عمل کی ترقی کی وجہ سے مزدوروں کو کام کے صرف ایک مخصوص حصہ میں مہارت پیدا ہوجاتی ہے اس لئے وہ پرانے زمانے کی طرح ذاتی طور پر لوگوں کی ضرورت کی چیزیں بناکر بازار میں فروخت نہیں کرسکتے نہ دوسرے پیشہ کے کاموں میں آسانی سے لگ سکتے ہیں، مجبوراً ان میں سے اکثر کو تھوڑے یا زیادہ عرصہ کے لئے بے روزگار ہوجانا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب پورے اشتراک عمل کے نہ ہونے کا یہ بھی ہوتا ہے کہ صنعت کے طریقے بھی بہت جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ نئی مشینیں، نئی اشیاء خام، نئی منڈیاں، تنظیم کے نئے نئے طریقے برابر دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مزدوروں میں چونکہ پرانے قسم کی مہارت پائی جاتی ہے اس لئے وہ نئے کام کے لئے اگر بالکل بے کار نہیں تو بہت کم مفید رہ جاتے ہیں اور انھیں نئے طریقوں سے واقفیت پیدا کرنے میں کچھ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اس عرصہ کے لئے بے روزگاری کا شکار بننا پڑتا ہے۔

یہ تو مختلف تجارتوں کے ماہروں میں مناسب اشتراک عمل نہ ہونے کی وجہ سے جو بے روزگاری پیدا ہوتی ہے اس کی مثالیں ہوئیں۔ اب موجودہ نظام کی دوسری خرابی کو لیجئے یعنی اس نظام میں آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

تقسیم عمل کے اس پیچیدہ نظام میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، چیزیں خریداروں کی فرمائش پر پیدا نہیں کی جاتیں بلکہ خریداروں کی مانگ کے بارے میں پیش بینی سے کام لے کر چیزوں کو پیدا کیا جاتا ہے یعنی چیزیں پہلے بنائی جاتی ہیں اور ان کے خریدار بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔ کارخانوں کے مالک ایسا کرنے کے لئے بالکل مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص آدمی کی فرمائش پوری کرنے کیلئے چیزیں نہیں بناتے بلکہ وہ لاکھوں خریدار

سکے لیے ایک ہی قسم کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک کارخانہ کے مالک نے اس بات کا پیشگی اندازہ کیا کہ فلاں قسم کے سوٹ کا کپڑا اس کے گاہکوں میں خوب بک سکتا ہے تو اسے سوت کے اس کپڑے کو بڑے پیمانہ پر تیار کرنے کے لئے پہلے اپنی فیکٹری کے لئے ایک بڑی عمارت کھڑی کرنی ہوگی، کارخانے کے لیے مشین تیار کرانا ہوگی، کپڑے کے لیے اون یا روئی پیشگی فراہم کرنا ہوگی اور ہزاروں قسم کی اور دوسری چیزیں جن کی کپڑے کی تیاری میں ضرورت ہوتی ہے ان سب کو پہلے ہی سے فراہم کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر یہ کپڑا تیار ہوگا۔ اب اگر اتفاق سے اس کا اندازہ غلط ہوا یا جس وقت کام شروع کیا گیا تھا اس وقت کے حالات کے مطابق تو صحیح تھا لیکن اب کپڑے کی تیاری کے بعد ریشم کے ایک اور کپڑے کے بازار میں آجانے کی وجہ سے وہ اندازہ غلط ہوگیا تو اس کا مال گوداموں میں بھرا رہے گا اور بازار میں نہ بک سکے گا یا بکے گا تو لاگت سے کم دام پر فروخت ہوگا۔ جب مال بازار میں نہ بکے گا تو یا تو اسے کارخانہ بند کرنا پڑے گا یا اپنی پیداوار کو گھٹانا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں اسے اپنے مزدوروں کو برطرف کرنا پڑے گا اور یہ بیچارے بغیر کسی خطا اور قصور کے بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔

موجودہ نظام صنعت کی جن دو خرابیوں کو اوپر بیان کیا گیا ان کی وجہ سے تو بے روزگاری صرف خاص خاص کارخانوں کے مزدوروں تک محدود رہتی ہے۔ لیکن تیسری خرابی یعنی کاروبار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بے روزگاری کا اثر بہت دور دور تک پھیل جاتا ہے۔ ہر دسویں برس یا اس کے آس پاس کے سالوں میں پلیگ، ہیضہ یا انفلوئنزا کی وباؤں کی طرح بے روزگاری کی وبا بھی پھیلتی ہے اور لاکھوں کروڑوں مزدور بغیر اپنے کسی ذاتی قصور کے خواہ مخواہ بے روزگار ہو جانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہی بے روزگاری ہے جس کے اسباب اور علاج ڈھونڈنے سے بڑے بڑے عالم معذور نظر آتے ہیں اور جو اپنے نتیجوں کے لحاظ سے انسانی جماعت کا ایک نہایت مشکل مسئلہ بن گئی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ روزگار کی ترقی کے زمانے میں تو کاروبار کی خوب گرم بازاری ہوتی ہے۔ مزدوروں کی خوب مانگ ہوتی ہے۔ کام بہت ہوتا ہے اور مزدور کم۔ ان کو طرح طرح کے لالچ دئے جاتے ہیں۔ ان کی اجرتیں بڑھائی جاتی ہیں۔ حوصلہ، امنگ اور امید کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہر طرف چہل پہل ہوتی ہے۔ روپیہ خرچ کرنے کے ہزاروں

نئے نئے طریقے نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ ادھار پر قسطوں پر چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ نقد قیمت کی ادائگی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ ضرورت بے ضرورت ساہوکار اپنی طرف سے روپیہ ادھار دینے کے لئے ہمیشہ تیار نظر آتا ہے۔

لیکن یکبارگی عین اس وقت جب اس کا کوئی سان گمان بھی نہیں ہوتا آسمان سے غیبی گولہ گرتا ہے بنک فیل ہو جاتے ہیں۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں مزدور برطرف کر دئے جاتے ہیں۔ جو باقی رہتے ہیں ان کی اجرتوں میں تخفیف کی جاتی ہے مزدوری کی تلاش میں جہاں کہیں جاؤ کورا جواب ملتا ہے کہیں سے قرض نہیں ملتا مجبوراً زندگی کے رہنے سہنے کے طریقوں کو بدلنا پڑتا ہے۔ گھر کا سامان فروخت کیا جاتا ہے اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کا پیٹ بھرا جاتا ہے۔ خوراک لباس اور علاج کی کمی سے بیماری اور موت کی شرح بڑھتی ہے۔ بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ بے شرم اور بے رحم بننا پڑتا ہے۔ عورتیں آوارگی کے پیشے اختیار کرتی ہیں مرد چور اور ڈاکو بن جاتے ہیں۔ ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جو اولاد پیدا ہوتی یا والدین کے ساتھ رہتی ہے وہ بھی بدترین اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ نیک دل لوگ مزدوروں کی انجمنیں اور حکومتیں بے روزگاروں کی امداد کرنے لگتی ہیں۔ ان کے لئے عارضی طور پر سرکاری تعمیر کے کام شروع کر کے روزگار کی صورت نکالی جاتی ہے انھیں وظیفے دئے جاتے ہیں اور دعا کی جاتی ہے کہ مصیبت کا یہ زمانہ کسی طرح جلد ختم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ کساد بازاری ختم ہوتی ہے۔ کاروبار میں دوبارہ تیزی پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر وہی پرانی ہما ہمی اور چہل پہل نظر آنے لگتی ہے اور کاروبار کے وہی پرانے طریقے پھر زندہ ہو جاتے ہیں اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

لیکن بے روزگاری کا یہ دور کچھ خرابیوں کا ایسا ترکہ بھی چھوڑ جاتا ہے جن کی حیثیت مستقل ہوتی ہے اور جن کو لاعلاج سمجھنا چاہیئے۔ کچھ مزدور مناسب غذا اور آرام کے نہ ملنے سے ایسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً تپ دق وغیرہ جو ہمیشہ کے لئے ان کو کام کرنے سے مجبور کر دیتی ہیں کچھ مزدوروں کا دل کام کی طرف سے ہمیشہ کے لئے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ مستقل طور پر آوارہ اور جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور پر اس زمانہ کے اثرات بہت خراب پیدا ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ صنعتی نظام کی ان خرابیوں کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے ؟

ہم نے صنعتی نظام کی جن خرابیوں کا ابھی ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر انتظام کی خرابیاں ہیں۔ تقسیم عمل کی ترقی نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار کریں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں۔ بلکہ نجی طور پر کاروبار کو شروع کرنے کی جو آزادی لوگوں کو اس وقت ملی ہوئی ہے اس کی وجہ سے بہت بدانتظامی پیدا ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب لوگوں کو ایک مرکزی نگرانی کے ماتحت لایا جائے تاکہ ایک مناسب منصوبے اور پلین (PLAN) کے مطابق معاشی زندگی کے سب شعبوں کی تنظیم کی جا سکے۔ گاہکوں کی مانگ کا پہلے صحیح اندازہ کیا جائے اور مال اتنا ہی بنایا جائے جس کی کھپت ہو سکے۔ پھر مختلف کارخانوں کی متعلقہ پیداواروں میں بھی ایک باہمی تناسب پیدا کیا جائے تاکہ کسی چیز کے زیادہ یا کسی کے کم پیدا ہونے سے گڑبڑی پیدا نہ ہو۔ اسی طرح ملک کے زر اور اعتبار کے نظام کو بھی اس طرح چلانے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ کاروبار کی خوب چہل پہل اور دوسری مرتبہ کاروبار میں بالکل ابتری پیدا نہ ہو بلکہ کاروبار ہمیشہ ہم آہنگی کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں مسلسل ترقی جاری رہے۔

یہ سب کام ظاہر ہے ایک ایسا با اقتدار ادارہ ہی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے جس کا حکم ماننے کے لئے سب لوگ مجبور ہوں یعنی یہ کام ریاست اور حکومت کے کرنے کا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کا انتظام چلانے والے لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان کے اندازے کا ہمیشہ صحیح ہونا اور اس کے منصوبوں کا پورا ہونا بالکل یقینی نہیں ہوتا اس لئے حکومت کے افسروں کے غلط تخمینوں کے اثرات سے رعایا کو محفوظ رکھنے کے لئے بے روزگاروں کی امداد کو حکومت کے فرائض میں لازمی طور پر داخل کر دیا جائے۔ آج کل جس طرح کارخانوں کے مالکوں کے غلط تخمینوں کا خمیازہ بے چارے مزدوروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس کا تدارک جس قدر جلد ممکن ہو سکے کرنا ضروری ہے۔

(محمد عاقل صاحب)

کاروبار شروع کرنے اور چلانے کے لئے تھوڑی بہت پونجی کی ضرورت قریب قریب ہر شخص کو پڑتی ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنا پورا کام اپنے روپیہ سے ہی چلا سکتے ہوں۔ اکثر صورتوں میں لوگوں کے پاس یا تو روپیہ بالکل نہیں ہوتا یا جتنا چاہیے اتنا نہیں ہوتا۔ مثلاً کسان کو اپنا کام چلانے کے لئے ہل بیل اور بیج کی ضرورت ہے۔ جب تک فصل تیار ہو اس کے اس وقت تک کے لئے کھانے کو اناج، پہننے کو کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے روپیہ چاہیے۔ دکان دار کو کاروبار پھیلانے کے لئے سامان چاہیے کارخانے کے لئے کچے مال مشین اور مکان کی ضرورت ہے۔ پھر مزدوروں کو مزدوری دینے، بنے ہوئے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور ایسے ہی اور بہت سے دوسرے کاموں کے لئے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ روپیہ وقت پر مل جاتا ہے تو کام بن جاتا ہے۔ کاروبار میں اچھا نفع ہوتا ہے۔ نہیں تو نفع بہت کم ہوتا ہے یا گھاٹا رہتا ہے یا کاروبار بالکل بیٹھ جاتا ہے۔ روپیہ کی ضرورت اکثر صورتوں میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ لوگ اس وقت جتنا روپیہ لیتے ہیں آئندہ اس سے زیادہ ادا کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں اور کاروبار سے جو نفع ہونے والا ہوتا ہے اس کا ایک حصہ خوشی سے روپیہ قرض دینے والوں کو ادا کرنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف ایسے بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو جتنا روپیہ کماتے ہیں وہ سب خرچ نہیں کر ڈالتے بلکہ اس میں سے کچھ بچا کر رکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پونجی بڑھانے کے لئے روپیہ نہیں بچاتے بلکہ فوراً خرچ کرنے کی جگہ آہستہ آہستہ عاقبت اندیشی کے ساتھ خرچ کرنے کے لئے روپیہ پس انداز کرتے ہیں۔ ان کا مقصد دوسروں کو قرض دینا نہیں ہوتا بلکہ خود قرض کی بلا اور مصیبت سے بچنا ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو قرض دینے کے لئے روپیہ بچا کر رکھتے ہیں اور اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے اپنی پونجی بڑھاتے ہیں پھر ان میں بھی کچھ لوگ تو چھوٹے پیمانے پر لین دین کا کام کرتے ہیں اور اپنے کسی دوسرے مستقل پیشہ کے ساتھ لین دین کے کام کو بھی ملا لیتے ہیں اور کچھ نسبتاً بڑے پیمانہ پر کام کرتے

ہیں اور لین دین کے کام کو ہی اپنا مستقل پیشہ بنا لیتے ہیں اور صرف لین دین ہی کی دکان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان آخرالذکر لوگوں کو جن کا مستقل پیشہ لین دین ہوتا ہے بنکر اور ان کی دکان یا کوٹھی کو بنک کہتے ہیں۔

ہندوستان میں بنک کی ترقی کی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہایت پرانے زمانے میں بنکنگ کا روبار شروع ہو گیا تھا۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا لیکن اس زمانے میں کسی جماعت نے اس کام کو مستقل پیشہ کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا لیکن پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بنکروں کے بارے میں پکی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو روپیہ قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے۔ ان بنکروں کو سرسیٹھی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا، راجہ گریہا، سراوستی، کوسامبی اور آدنتی میں بہت سے نہایت باافر سرسیٹھی یعنی بنکر رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ صرف بیوپاریوں کو ہی قرض نہیں دیتے تھے بلکہ ان تاجروں کو بھی جو سمندری سفر کر کے غیر ملکوں کو جاتے تھے یا جو جنگلوں میں قیمتی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکلتے تھے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی جنگ اور مالی پریشانی کے وقت یہ لوگ روپیہ قرض دیتے تھے۔ کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں یہ تبلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جا سکتی ہے۔ دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ ارتھ شاستر اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستر میں کسی خاص ذات کے لئے ساہوکاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لیکن دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف ویشوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک بنک کے کاروبار کا کوئی مسلسل حال نہیں ملتا۔ البتہ بارہویں صدی عیسوی میں ہنڈیوں کے رواج کی شہادت ملتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان مورخوں کی تصنیفوں مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتانیوں اور صرافوں کا نام آتا ہے جو نہ صرف تجارتی مرکزوں کو روپیہ فراہم کرتے تھے بلکہ ابتدائی مسلمان بادشاہوں کو روپیہ کی جو ضرورت ہوتی تھی اسے بھی پورا کیا کرتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں آئین اکبری اور ٹریورنیر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیسی

ساہوکار روپئے کے لین دین کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان کے کاروبار میں درشنی اور میعادی ہنڈیوں کو بہت اہمیت حاصل تھی حکومت کی طرف سے ان ساہوکاروں کو محصل، خزانچی اور صراف کے عہدوں پر مقرر کرنے کا رواج بھی بہت عام ہوگیا تھا اور قدرتی طور پر ان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا سترھویں اور اٹھارویں صدی کے جگت سیٹھوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے دنیا کے بڑے سے بڑے بنکر کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

لیکن انگریزی سلطنت کے قائم ہونے سے دیسی بنکروں کی اہمیت کم ہونا شروع ہوگئی اور مغربی طرز کے بنک ہندوستان میں قائم ہونے لگے لیکن ابھی تک ہندوستان میں مغربی طرز کے بنکوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ دیسی بنکوں، ساہوکاروں صرافوں اور مہاجنوں سے لین دین کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور دیہاتوں میں خصوصیت کے ساتھ ان کا ہی پورا عمل دخل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ مغربی طرز کے بڑے بنکوں سے براہ راست لین دین نہیں کر سکتے ان کے لئے بھی دیسی ساہوکار دلال اور درمیانی آدمی کا کام انجام دیتے ہیں۔

مغربی طرز کے بنکوں اور دیسی بنکوں میں فرق یہ ہے کہ دیسی بنک کا کام چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہے اور مغربی بنک کا بڑے پیمانہ پر۔ دیسی بنک اور ساہوکار زیادہ تر اپنے ذاتی یا خاندانی سرمایہ سے کام کرتے ہیں اور مغربی طرز کے بنک مشترکہ سرمایہ سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ دیسی بنک میں امانتیں رکھنے کا رواج یا تو بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے اور جو امانتیں رکھی جاتی ہیں ان میں بھی ایسی امانتیں جن پر بیاج دیا جائے بہت کم ہوتی ہیں یعنی ان امانتوں کو کاروبار میں لگانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ صرف حفاظت کے لئے رکھائی جاتی ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں میں امانتوں کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ امانتوں پر بیاج بھی چاہتے ہیں اس لئے یہاں امانتوں کو کاروبار میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔

بنک کے بارے میں ان ابتدائی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب ہم دیکھیں گے کہ بنک کے کام کیا کیا ہوتے ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں کے دو نہایت اہم کام ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کاروبار چلانے کے لئے لوگوں کا روپیہ امانت رکھتے ہیں اور ان کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ کاروباری لوگوں کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے بنک سے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ ان کے اور دوسرے بھی کام ہوتے ہیں لیکن یہ کام نہایت

اہم ضروری ہیں۔ بنکوں کو اپنے ان کاموں سے نفع اس طرح ملتا ہے کہ یہ کم شرح سود پر روپیہ امانت رکھتے ہیں اور زیادہ شرح سود پر کاروباری لوگوں کو قرض دیتے ہیں اب ہم ان دونوں کاموں کے بارے میں ذرا تفصیل کے ساتھ کچھ باتیں بیان کریں گے۔

جو لوگ اپنا روپیہ بنک میں امانتاً رکھنا چاہتے ہیں بنک والے ان کے لیے عموماً دو طرح کے حساب کھولتے ہیں ایک کو امانت کا حساب کہتے ہیں اور دوسرے کو چالو حساب کہتے ہیں امانت کے حساب سے روپیہ واپس لینے کے لئے امانت رکھنے والے کو ایک ہفتہ، ایک مہینہ تین مہینہ یا چھ مہینہ پہلے اطلاع دینی ہوتی ہے جس سے یہ فائدہ ہے کہ بنک امانت کا روپیہ اطمینان سے کاروبار میں لگائے رکھتا ہے اور اطلاع ملنے پر ضروری رقم کاروبار سے نکال کر واپسی کے واسطے مہیا کر لیتا ہے اور وقت آنے پر ادا کر دیتا ہے۔ امانت کے حساب کا روپیہ واپس لینے کے لئے چونکہ کچھ عرصہ قبل اطلاع دینی شرط ہے اس لئے اسے دوسرے لوگوں کو اطمینان سے قرض دیا جا سکتا ہے اور جو کچھ بطور سود بنک کو حاصل ہو اس کا ایک حصہ امانت کی رقم جمع کرنے والے کو بھی دیا جاتا ہے۔ اور اطلاع کی میعاد جس قدر وسیع ہو امانت کے حساب کا روپیہ زیادہ مستقل کاروبار میں لگ سکتا ہے اور امانت رکھنے والے کو زیادہ شرح سود دی جا سکتی ہے۔

دوسرا حساب چالو حساب کہلاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینے کے واسطے پہلے سے کوئی اطلاع دینی ضروری نہیں جس وقت جتنا چاہیں روپیہ واپس لے سکتے ہیں چونکہ چالو حساب کے لئے روپیہ کی کثیر مقدار کو ادائگی کے واسطے ہر وقت تیار رکھنا پڑتا ہے اور اس کا کاروبار میں لگانا خلاف احتیاط ہے اس لئے اس حساب میں جمع کرنے والوں کو بنک کوئی سود نہیں دیتے۔ مگر چالو کھاتے میں بھی لوگ بکثرت اس وجہ سے روپیہ جمع کرتے ہیں کہ اول تو اس کی حفاظت کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں دوسرے بنک مفت خزانچی کا کام دیتا ہے اور روپے کے لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرنے والوں کا تو اس سے فائدہ سمجھ میں آ گیا لیکن بنک کو خود چالو حساب کھولنے سے کیا فائدہ ہے اس کا بیان کرنا باقی رہا۔ امانت کے حساب میں روپیہ تو بنک اس لالچ سے لیتے ہیں کہ اس سے کاروبار چلا کر سود پاتے ہیں جس کا ایک حصہ جمع کرنے والے کو دے کر باقی خود اڑاتے ہیں مگر

چالو حساب تو سو ا بے کار پڑے رہنے یا واپس ہونے کے اور کسی کام آتا ہی نہیں اور نہ اس پر بنک کو کچھ سود ملتا ہے پھر وہ خواہ مخواہ کی اس دردسری کو اپنے ذمہ کیوں لیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چالو حساب کا سب روپیہ بے کار نہیں پڑا رہتا بلکہ صرف ایک حصہ بے کار رہتا ہے اور باقی کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار میں روپیہ لگا دینے کے بعد چالو حساب رکھنے والوں کے مطالبوں کو بنک کس طرح پورا کرتا ہے اس کا اندازہ چک کے اصول کو سمجھنے سے ہوگا۔ جو لوگ بنک کے چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرتے ہیں انھیں روپیہ واپس لینے کے لئے بنک سے مطبوعہ فارموں کی کاپیاں ملتی ہیں جن کی باقاعدہ خانہ پری کر کے حسب ضرورت رقم واپس لی جاتی ہے۔ یہی فارم چک کہلاتے ہیں۔

چک روپیہ جمع کرنے والوں کی طرف سے بنک کے نام ایک حکم ہوتا ہے کہ ہمارے حساب میں سے فلاں رقم ہم کو یا فلاں شخص کو یا حامل ہٰذا کو ادا کر دو۔ بنک چک لکھنے والے کی تحریر اور دستخط سے اس کی صحت کا اطمینان کر کے اور چک کی پشت پر روپیہ لینے والے کے دستخط کرا کے لکھی ہوئی رقم ادا کرتا اور چک بطور رسید رکھ لیتا ہے۔ اب روپیہ جمع کرنے والے کی سہولت کا اندازہ کیجیے اس کو صرف ایک چکوں کی کتاب رکھنا پڑتی ہے اور جب جتنا روپیہ لینا یا کسی کو دینا منظور ہو فوراً بنک کے نام چک لکھ دیتا ہے اور اس کا کام بن جاتا ہے۔

کسی ملک میں بنک کے رواج ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ بنک میں رکھیں۔ جو لوگ خود کوئی کاروبار چلانا نہیں چاہتے وہ تو اپنا روپیہ بطور امانت جمع کرتے ہیں تاکہ سود بھی ملتا رہے مگر جو لوگ کاروبار میں مصروف ہیں وہ بھی اپنا روپیہ بنک کے چالو کھاتے میں رکھتے ہیں۔ بنک بلا معاوضہ ان کا خزانچی بن جاتا ہے اور چک کے ذریعہ روپیہ کی ادائگی اور وصول یابی میں بے حد سہولت ہوتی ہے۔

اگر ایک سادہ مثال سامنے رکھی جائے تو بات جلد سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کرو کسی شہر میں صرف ایک بنک ہے اور وہاں کے سب تاجر چالو کھاتے میں اپنی اپنی طرف سے کافی رقمیں جمع کر دیتے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی اپنے پاس سے کسی کو نقد رقم ادا نہیں کرے گا بلکہ جب کوئی کسی کو روپیہ دینا چاہے گا اس کے لئے چک لکھ دے گا جس کے پیش کرنے پر درج کی ہوئی رقم بنک ادا کر دے گا۔ لیکن بنک سے نقد

روپیہ لینے کی نوبت کم آئے گی۔ کیونکہ ان تاجروں میں سے جن کا بنک کے چالو کھاتہ میں حساب کھلا ہے جب کوئی کسی کے لئے چک لکھے گا تو لکھی ہوئی رقم ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل کر دی جائے گی یعنی چک لکھنے والے کی طرف سے ادائگی اور چک پانے والے کی طرف سے وصول یابی بنک کے حساب وکتاب میں درج کر دی جائے گی اور یہ سب تحریری کارروائی ہوگی اور بنک کے نقد روپیہ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ صرف چک میں لکھی ہوئی رقم اس کے لکھنے والے کے حساب سے خارج کر کے اس کے پانے والے کے حساب میں درج ہو جائے گی۔ اس طرح پر یہ سب تاجر لاکھوں روپیہ کی تجارت کرتے رہیں گے مگر بہت کم روپیہ نقد استعمال کرنے کی نوبت آئے گی صرف چکوں کی رقمیں بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے ادھر گھومتی رہیں گی۔

اب اگر بنک ایک کی جگہ دو یا زیادہ ہوں اور ان میں آپس میں یہ سمجھوتہ ہو جائے کہ ایک بنک دوسری بنک کے چکوں کو قبول کرتا رہے گا تو اول تو بہت سے چکوں کی رقم برابر ہونے کی وجہ سے حساب بیباق ہو جائے گا اور اگر کچھ زائد مطالبہ باقی رہے گا تو صرف اتنا ہی ایک دوسرے کو ادا کرنا پڑے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ بنک امانت کے حساب کے کل روپیہ اور چالو کھاتہ کے ایک حصہ کو طرح طرح کے کاروبار میں لگا کر خوب سود وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کی عموماً احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ چالو کھاتے کا روپیہ ایسے کاروبار میں نہ لگایا جائے جس کے وصول ہونے میں دیر لگنے کا اندیشہ ہو ورنہ لوگوں کا اعتبار جاتا رہے گا اور بنک کا دیوالہ نکل جائے گا۔

اب تک تو ہم نے یہ بات بیان کی کہ اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لئے بنک روپیہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے بتلایا کہ ایک تو امانت کے حساب میں بنک اپنے یہاں روپیہ جمع کرتے ہیں دوسرے چالو کھاتے میں جمع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیسرا کھاتہ سونگ بنک کے حساب کا بھی ہوتا ہے۔ چوتھے ایسی رقمیں بھی ہوتی ہیں جو بنک کی معرفت لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا چاہتے ہیں بنک کے پاس لوگوں کا زیور وغیرہ بھی حفاظت کیلئے رکھا جاتا ہے۔ روپیہ کمپنی کے حصہ خریدنے اور دوسرے مختلف کاروبار میں لگانے کے لئے آتا رہتا ہے۔ بہرحال یہ تو اس کی آمدنی کے مختلف ذرائع ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا

چاہیے کہ بنک کس قسم کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگاتا ہے یعنی کن لوگوں کو کن شرطوں کے ساتھ روپیہ قرض دیتا ہے۔

جن کاموں میں بنک روپیہ لگا سکتے ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان مختلف کاموں کی وجہ سے بنکوں کے نام بھی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ جو بنک زمین کو رہن رکھ کر بہت برسوں کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں وہ رہنی بنک کہلاتے ہیں۔ جو زراعت کی ضرورت کے لئے روپیہ دیتے ہیں اور یہ روپیہ بھی زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے وہ زراعتی بنک کہلاتے ہیں۔ جو نئے صنعتی کارخانوں کے قائم کرنے یا پرانے کارخانوں کے پھیلانے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ صنعتی بنک کہلاتے ہیں اور جو تجارت کی آسانی یعنی مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے یا مال کو ایک وقت بچا کر دوسرے وقت بیچنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ تجارتی بنک کہلاتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بنک ہوتے ہیں جیسے رہنمو بنک امداد باہمی کے بنک مبادلہ کے بنک، ہنڈیوں کے دلال، بٹہ گھر، قبولیت گھر وغیرہ۔

بہرحال ان بنکوں میں جن بنکوں کی بہت زیادہ کثرت ہے اور جو ایک حد تک ان میں سے بہت سے کاموں کو اپنے اصل کام کے ساتھ ملا بھی سکتے ہیں وہ تجارتی بنک ہیں۔ ان بنکوں میں اپنے گاہکوں کو قرض دینے کی عام صورت یہ ہوتی ہے کہ جو تاجر بھروسہ کے ہوتے ہیں ان کی ہنڈیاں بٹہ کے ساتھ خریدی جاتی ہیں۔ ہنڈی، بٹہ، سکارنا اور خریدنا یہ اصطلاحیں ایسی ہیں جنھیں لوگ عام طور پر جانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو سمجھانا ضروری تھا مگر گنجائش کی تنگی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے۔

اوپر کی تمام بحث سے یہ ظاہر ہوا کہ کس طرح بنک کے ذریعہ سے روپیہ بچانے والے اور روپیہ قرض لینے والے بنک کی معرفت ایک دوسرے سے نزدیک آجاتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ہمارے دیس ہندستان میں بنک بہت کم ہیں جبکہ امریکہ میں بنکوں کی تعداد ۱۹۲۱ء میں ۲۲ ہزار ۱، تھی ہندوستان میں صرف ۰۰۰ بنک پائے جاتے تھے۔ امریکہ کے بنک میں امانتیں فی کس ایک ہزار ۱۴۴ روپیہ کی تھیں لیکن ہندوستان میں یہ رقم صرف ساڑھے چھ روپیہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں صنعت و حرفت تجارت اور زراعت نے جتنی چاہیے اتنی ترقی نہیں کی ہے جو کچھ میں نے اس وقت بیان کیا ہے بنک کے کام کی صرف ایک جھلک سمجھے بہرحال پھر کبھی اس سے زیادہ بہتر اور مفصل طریقہ پر سنئے گا۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ایک زمانہ تھا جب ہر ملک کی سیاست کا اپنا الگ چشمہ یا دریا تھا، جو کسی ایک طرف اپنے خاص زور سے بہا کرتا تھا اب دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ سب دریا مل کر ایک بہت بڑا دھارا بن گئے ہیں جس کے کناروں پر سمجھئے ہم سب آباد ہیں۔ کبھی یہ دھارا خاموشی سے چلتا ہے کبھی کناروں کی ٹکر یا پانی کے زور سے اس میں بھنور پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر دنیا کا وہی حال ہوتا ہے جو آدمی کے گلے میں پھندا پڑ جانے سے جب تک یہ بھنور رہتا ہے، لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اس لئے کہ دریا کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا ہے، اس کے کنارے کٹ کٹ کر گرنے لگتے ہیں اور پوری بستیوں کے بہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اس وقت سیاست کے دریا میں دو بھنور ہیں ایک تو ہسپانیہ اور دوسرا چین ان کے علاوہ ایک اور بھنور تیزی کے ساتھ بنتا دکھائی دیتا ہے، اور وہ پولینڈ کی یہودی آبادی کا معاملہ ہے بارسلونا کی فتح کے بعد سمجھئے کہ ایک گرہ تو کھل گئی یعنی ہسپانیہ کی خانہ جنگی اب ختم ہونے کو ہے اس سے لوگوں کو اطمینان ہونا چاہئے تھا لیکن لوگوں کو دیکھئے اور زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید چین کی لڑائی ختم ہو تب بھی لوگ خوشی منانے کے بجائے اپنی اپنی خیر منائیں گے۔ یہ بات تو اُلٹی ہے مگر بے سبب نہیں

ہسپانیہ میں اب تک دو فریق ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اور یورپ کی بعض قومیں اس لڑائی میں حصہ لے رہی تھیں بعض الگ تھیں۔ اب جنرل فرانکو جیت گئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھیوں کی جیت ہوئی۔ ایک معاملہ جو اب تک ہسپانیہ کا معاملہ تھا۔ یورپی سیاست کا بہت ہی نازک مسئلہ بن گیا ہے۔ جنرل فرانکو کی خواہش تھی کہ تھوڑا تھوڑا ملک فتح کریں اور کمیونزم کے فساد سے پاک کر کے پھر آگے بڑھیں اس طریقے میں ایک خاص فائدہ یہ بھی تھا کہ جنگ کی حالت قائم رہتی، جنرل فرانکو کے تمام اختیارات محفوظ رہتے

ان کی پارٹی ان کے قابو میں رہتی۔ اور توپوں کے سوا سب کا منھ بند رہتا۔ لیکن یہ طریقہ سنور مسولینی کی مصلحت کے خلاف تھا انھیں ہسپانیہ بھیجنے کے لئے سپاہی مل جاتے تھے اٹلی میں جو سامان جنگ تیار ہوتا رہتا ہے اس کی نکاسی کی ایک صورت بھی تھی مگر اس طرح کے لین دین کی ایک حد ہوتی ہے اور سنور مسولینی نے اب محسوس کیا کہ وہ بہت کچھ دے چکے ہیں اور دام وصول کرنے کا وقت آگیا ہے اس وجہ سے انھوں نے فرینکو پر زور ڈال کر بارسیلونا فتح کروا یا اور اب یورپ والے اس فکر میں ہیں کہ دیکھئے وہ کیا مانگتے ہیں اور انھیں کیا دینا پڑتا ہے جنرل فرینکو تو خیر ان کے قرضدار ہیں اور انھیں کی مدد سے جیتے ہیں وہ جو کچھ دینے پہ تیار ہوں کم ہے لیکن ان کے پاس دینے کو کیا ہے پھر دوسری مشکل یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیں گے اس پہ فرانس انگلستان کو اعتراض ہوگا یہی سوچ کر سنور مسولینی نے پہلے ہی سے ٹیونس کورسکا اور جبوتی کا لمبا چوڑا اور صریحاً بے تکا مطالبہ پیش کر دیا ہے فرینکو کی مدد کرنے سے سنور مسولینی کو ہرگز یہ حق نہیں ہو جاتا کہ فرانس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین لیں۔ لیکن اس وقت ان کی فوجیں ہسپانیہ میں ہیں فرینکو سے ان کی گاڑھی دوستی ہے میجورکے جزیرے پر ان کا قبضہ ہے اور ایک اندھا دھند مطالبہ کرنے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ کہیں سے کچھ مار ضرور لیں یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اصل میں وہ کیا چاہتے ہیں اور اگر اس وقت کوئی برطانیہ اور فرانس کی وزارت خارجہ کو ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ سینور مسولینی کیا ارادے رکھتے ہیں تو اسے اچھا خاصا انعام مل سکتا ہے۔ سینور مسولینی نے فرانس کو گھیر لیا ہے لیکن وہ فرانس سے اکیلے لڑ نہیں سکتے اور سب جانتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے سہارے کے بغیر کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اس لئے لوگوں کو ہر ہٹلر کی اس تقریر کا جو ۳۰ جنوری کو ہوئی بہت انتظار تھا۔ مگر وہ اپنی پچھلی کرامات بیان کر کے رہ گئے یہ نہیں بتایا کہ اب کون سے کرشمے دکھائیں گے اور وہ بتاتے بھی کیوں۔ ہماری آپ کی طرح وہ بھی جانتے ہیں کہ ایسی باتیں پہلے سے بتائی نہیں جاتیں۔ اصل میں ہر ہٹلر خود اس تاک میں ہیں کہ سنور مسولینی کچھ کر بیٹھیں تو اس سے مناسب فائدہ اٹھایا جائے اسی خیال سے وہ سنور مسولینی کو برابر شہ دے رہے ہیں جرمن اخبار اس وقت سے جبکہ مسٹر کورسیکا ٹیونس اور جبوتی کا مطالبہ پیش ہوا ہے یہ کہہ رہے ہیں کہ اٹلی کو اس کا حق ملنا چاہیئے اور فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بونے کے دریافت کرنے پر انھیں یہ بتایا گیا کہ جرمنی کا اور فرانس کا ابھی شروع دسمبر میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ جرمنی ہر جھگڑے میں فرانس

کا ساتھ دے گا اور اس میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے کہ جرمنی کو ہمدردی اٹلی سے ہے اس جواب سے فرانسیسیوں کو مایوسی ضرور ہوئی لیکن اس کا بھی خیال رکھئے سینور مسولینی بھی پھنس گئے ہیں یعنی انھیں بہت جلد طے کرنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اسے جلد سے جلد وصول کرنے کی تدبیر کرنا ہوگی ان کی فوجیں اب چھ دو مہینے سے زیادہ ہسپانیہ میں رہیں تو ہسپانی خود بگڑ جائیں گے اور اگر یہ فوجیں ہٹائی گئیں تو پھر فرانس اور انگلستان پر کسی دھمکی کا اثر نہ ہوگا۔ انگلستان سے اس وقت ان کی جو دوستی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح معاملے کو ایسی صورت دی جائے کہ اٹلی اور فرانس دو مخالف فریق اور برطانیہ ان کے درمیان پنچ بن جائے اس کوشش میں ہر ہٹلر اپنی طرف سے یہ کر رہے ہیں کہ اٹلی کے مطالبوں کے ساتھ جرمن کی نوآبادیوں کا مطالبہ بھی پیش کر دیا ہے' اس امید میں کہ برطانیہ اپنی گردن سے پھندا نکال کر فرانس کے گلے میں ڈال دے گا یہ ہو گیا تو پھر کیا کہنے ہیں بڑی موٹی اسامی پھنسے گی۔

لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ فرانس میں موسیو بونے اور انگلستان میں سر سموئل ہور نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہیں' ایسے تیار کہ دنیا کی کوئی ریاست انھیں شکست نہیں دے سکتی۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ اور فرانس کے درمیان پورا اتحاد عمل ہوگا۔ فرانس اور برطانیہ کے ان اعلانوں سے منشا یہ ہے کہ سینور مسولینی احتیاط سے قدم بڑھائیں اور اس کے علاوہ وہ اس کو ہر ممکن کوشش کریں گے کہ دو تین مہینے تک لڑائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ اس عرصے میں انھیں امید ہے کہ جنرل فرانکو سمجھ جائیں گے کہ اگر وہ اپنے قرضے کی ادائگی سے اور سینور مسولینی کے پنجے سے چھوٹنا چاہتے ہیں تو انھیں برطانیہ اور فرانس کے سامنے جھکنا چاہیئے یہ چال خود جنرل فرانکو کو نہ سوجھی تو ان کی پارٹی کے لوگ انھیں سوجھا دیں گے بشرطیکہ انھیں موقعہ ملا اور برطانیہ اور فرانس انھیں اس کا پورا موقعہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے تو سنور مسولینی کی بڑی جگ ہنسائی ہوگی اور ان کی سیاست ایسی ڈبکی کھائیگی کہ پھر شاید ابھر نہ سکے ان کی چار برس کی جوڑ توڑ کے باوجود جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد ہو گیا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے بدلے جرمنی نے اٹلی کو جنوب مشرقی یورپ سے کھسکا دیا۔ اور ہسپانیہ میں بھی چپکے چپکے ایسا سودا کیا کہ اسے بہت کھل گیا اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا اب سمجھئے سنور مسولینی کو آخری موقعہ ہے۔ وہ کچھ

مار گئے تو خیر ورنہ پھر انہیں یا تو حکومت اور ریاست سے علیحدہ ہونا پڑے گا جو کہ ان کے لئے موت سے بھی بدتر ہے، یا کسی طرح قلابازی کھا کر جرمنی کا پہلو چھوڑ برطانیہ کی گود میں پہنچنا ہوگا مسٹر چیمبرلین تو گود پھیلائے چھتری لگائے گھومتے ہی ہیں وہ سنور مسولینی کو بڑے شوق سے گود میں بٹھا لیں گے۔

ہر ہٹلر کی سیاست کا حال یہ ہے کہ وہ ایسی کایا پلیٹ کے لئے بھی تیار ہیں مغربی یورپ میں کہیں داؤ نہ چلا تو وہ مشرق میں کہیں پر وار کریں گے کئی سال ہوئے انھوں نے پولینڈ سے تعلقات بڑھا کر اسے فرانس اور برطانیہ سے علیحدہ کیا اور روس سے بچنے کے لئے ایک آڑ بنا یا یہ دوستی اب تک قائم ہے پولینڈ اور جرمن کے سفیروں اور وزیروں کی ملاقاتیں اب پہلے سے بھی زیادہ ہوتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جرمن سیاست نے پولینڈ کو ہنگری سے خفا کر دیا ہے اور ہنگری کو سلوا کیا سے ابھی کچھ دن ہوئے لڑا بھی دیا۔ تاکہ مشرقی چکوسلواکیا جو میونخ کانفرنس کے بعد سے کارپیتھو یوکرائن کہلاتا ہے نہ ہنگری میں شامل ہو سکے اور نہ پولینڈ میں۔ اور یہ دونوں آپس میں اسے بانٹ بھی نہ سکیں شمال میں جرمنی کا میمل کے شہر پر قبضہ ہونے والا ہے اور ایسا ہو گیا تو پولینڈ بالکل جرمنی کے قابو میں ہو جائے گا لطف تو یہ ہے کہ جرمنی روس سے بھی سمجھوتا کرنے والا ہے اور اس کے لئے زمین تیار کرنے کی غرض سے اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے معاہدوں کے ان حصوں کو جن میں کومیونزم کے خلاف جنگ کرنے کی نیت ظاہر کی گئی ہے ملتوی قرار دے گا یعنی جرمنی کی تحریک پر اٹلی اور جاپان اور حال ہی میں ہنگری نے کومیونزم کے خلاف جو اتحاد کیا ہے اس کا ڈنک نکل جائے گا روس اور پولینڈ کے درمیان تو ایک معاہدہ ابھی ہو چکا ہے جرمنی اس میں شریک ہو جائے گا اور کسی سے بگاڑے بغیر روس سے بنا لے گا۔

اس میں بھید یہ ہے کہ ہر ہٹلر اوکرائن کے اس حصے کو اپنے چنگل میں کرنا چاہتے ہیں جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ میں شامل ہو گیا تھا اور کرائن کے دو حصے اور ہیں جن میں ایک روسی ریاست میں ہے اور دوسرا رومانیہ میں ملا دیا گیا ہے پولینڈ کے اکرائنی تعداد میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہیں حکومت ان کے ساتھ واقعی بہت برا برتاؤ کرتی ہے اگرچہ . . . . . جب اسے اکرائنی علاقہ دیا گیا تھا تو پولینڈ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اکرائنوں کو سوراج دے گا اس نے پوری کوشش کی ہے کہ اکرائنی سوراج کے قابل نہ رہیں۔ ان

کے اسکول بند کر دیے ہیں انہیں ملازمتوں سے الگ رکھا ہے۔ اور انہیں کسی حق اور کسی طرح کی آزادی کے لائق نہیں مانا ہے ایسے ظلم کی مخالفت کی جائے تو اسے کون غلط یا برا کہہ سکتا ہے۔ اور ہر ہٹلر اگر اکرائنو کا حق دلوانا اپنے ذمے لیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ابھی تک وہ کھلم کھلا کچھ نہیں کہہ رہے ہیں لیکن پچھلے دسمبر میں پولینڈ کی پارلیمنٹ میں اکرائنی سوراج کا ایک بل پیش ہو چکا ہے جن میں قریب قریب وہی مطالبے ہیں جو چکوسلواکیا کی جرمن آبادی کی طرف سے شروع شروع میں ہر ہنلائن نے کئے تھے اوکرائنی قوم بڑی بہادر اور جنگجو ہے اگر کہیں لڑائی چھڑ گئی تو پھر کیا ہے ہر ہٹلر بیچ بن جائیں گے اور یا تو کسی کو صلح کرانے کے لئے بھیج کر جیسا کہ مسٹر چمبرلین نے لارڈ رنسی کو بھیجا تھا یا پولینڈ پر دباؤ ڈال کر دیسا ہی فیصلہ کرینگے۔ جیسا کہ مسٹر چمبرلین نے چکوسلواکیا کے معاملے میں کرایا تھا برطانیہ اور فرانس جنھوں نے چکوسلواکیا کو بچانے کی کوشش نہیں کی بھلا پولینڈ کی خاطر کیوں کچھ کریں گے رہا روس سو اس کو تو برطانیہ اور فرانس ایسا دنکا چکے ہیں کہ وہ ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ اور پولینڈ کے قبضے سے اوکرائن نکل گیا تو اس میں اس کا اتنا نقصان نہیں جتنا کہ جرمنی سے لڑنے میں پولینڈ سے دوستی قائم رکھنے میں جرمنی کا فائدہ یہ ہے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے گی پولینڈ پر ویسا ہی دباؤ ڈالا جا سکے گا جیسا کہ برطانیہ اور فرانس نے چکوسلواکیا پر ڈالا تھا اور جرمن کے لئے نتیجہ اتنا ہی مفید ہوگا

جہاں سیاست کی اتنی گہری چالیں چلی جا رہی ہوں وہاں بازی کا بگڑ جانا اور مخالفوں کا ایک دوسرے سے لڑ جانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن وہی لوگ جو جنگ کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ فروری مارچ کے مہینے لڑنے کے لئے موزوں نہیں۔ آپ شاید اس سے مطمئن نہ ہوں ہمارے خیال میں تو یہ دو مہینے بھی غنیمت ہیں دنیا بہتیروں کو اتنی مہلت بھی نہیں دیتی۔

مطبوعات موصولہ

۱۔ مذہبی کتابیں

حسن بیان | یہ قرآن پاک کا ترجمہ ہے جو جناب غلام حسن نیازی صاحب پشاوری نے خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس میں مطالب قرآن بھی مختصر طور پر شامل ہیں۔

فلسفہ تعلیم اسلام (جلد اول) | از جناب سید حمید صاحب شاہی امام جامع مسجد دہلی۔ مصنف نے اس کتاب کے سبب تالیف کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس کے مطالعہ سے عقاید و احکام اسلامیہ کے خط و خال کی رعنائی، علوم حاضرہ اور کشفیات جدیدہ کی روشنی میں۔ زیادہ روشن اور زیادہ واضح نظر آنے لگے"۔

۱۔ پاک زندگی
۲۔ صلواۃ وسلام | از مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ رسالہ "صلوٰۃ وسلام" مولانا کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ مقدس ومطہر میں درود وسلام پیش کرنے کے سلسلہ میں کی گئی تھیں اور رسالہ "پاک زندگی" مولانا کے تین مضامین (فطرت سلیمہ، حیات طیبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا مجموعہ ہے۔

تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول | مؤلف جناب ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی اس میں "خاندان ولی اللّٰہی دہلی وعلمائے دہلی وصوبہ یوپی مرحومین وموجودین کے تراجم ہیں" اس کتاب کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

اسلام اور عروج سائنس و تمدن | مصنفہ مولوی عبدالکریم صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی ترجمہ شیخ عبدالمجید صاحب بی۔ اے۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اسلام ترقی سائنس کا جو تمدن کا جزو لاینفک ہے مانع نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔۔ عہد سلف کے مسلمان، جدید سائنس و تمدن کے رہنما اور مصلح ہیں۔ زمانہ مابعد میں اسلامی دنیا پر جو ذہنی جمود

طاری ہوگیا .... اس کے اسباب چند تاریخی واقعات ہیں .... اسلامی عقائد و تعلیمات کسی صورت میں اس سیاسی زوال و معاشرتی پستی کے ذمہ دار نہیں ۔"

ایمان مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کا آرگن ۔ "سیرت کمیٹی کی آخری غرض یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں اور زبانوں میں حضور کے حالات کی اشاعت کی جائے ۔" سیرت کمیٹی کی کارگذاریاں نہایت اہم اور شاندار ہیں ۔ قاضی عبدالمجید صاحب قریشی سکرٹری سیرت کمیٹی کا یہ بیان ہے کہ کمیٹی نے اپنا تمام کام چندہ لینے کی بجائے اخبار ایمان اور کتب سیرت کی آمدنی سے انجام دئے ہیں اور اس آمدنی میں سے دس ہزار روپیہ نقد فقط تبلیغ اسلام کے لئے وقف کیا ہے ۔

قادیانی قول و فعل مولفہ جناب سلاح الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ۔ الیاس برنی صاحب کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" کے جواب میں "بشارت احمد" ایک کتاب شائع ہوئی تھی اس کی تنقیح کے سلسلہ میں یہ کتاب تالیف کی گئی ہے ۔

قواعد عربی (حصہ اول) از مولوی حکیم محمد ہیبۃ اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد دکن یہ کتاب حیدرآباد کی جماعت ہائے پنجم و ششم کے لئے لکھی گئی ہے ۔ اس میں انگریزی خواں طلبہ کی آسانی و سہولت کو خاص طور پر مد نظر رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کو عربی گرامر سے بجائے وحشت کے انس پیدا ہو ۔

تفسیر سورہ والتین تالیف جناب مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ترجمہ جناب امین احسن صاحب اصلاحی ۔

اسلامی ڈائری قریشی بک ہاؤس ایجوکیشنل بک سیلر اور پبلشر گورو بازار امرتسر نے اسے شایع کیا ہے ۔ "اس میں حضور سرور کائنات کی پاکیزہ سوانح حیات خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ، مجاہدین اسلام کے حالات زندگی موجودہ اسلامی سلطنتوں کے حالات اور دنیائے اسلام کی آبادی بلحاظ ملک و ملت کے علاوہ اتحاد اسلامی اور اصلاح ملک کے لئے مضامین درج کئے گئے ہیں ۔"

۷۔ سیاسی کتابیں

مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل از میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں لاہور۔ یہ میاں صاحب کی وہ تقریر ہے جس کا بیشتر حصہ انجمن حمایت اسلام کی طلائی جوبلی کی تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ بہت عالمانہ تقریر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس کے اندر بہت کچھ پیام امید اور درس عمل موجود ہے۔

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ از جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ اس کتاب میں ہندوستان کی اسلامی سیاست کی مفصل تاریخ "مسلم لیگ" کے نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ مرتبہ محمد امین صاحب زبیری اس رسالہ میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۶ء تک ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو ان مسلمان نوجوانوں کے لئے مرتب کیا گیا ہے جن کی آرا و افکار کا رجحان ایسی سیاست کی طرف ہو جاتا ہے جو بظاہر نہایت خوش آیند اور دلپذیر ہوتی ہے لیکن اس میں مسلمان قومیت کا پتہ نہیں ہوتا۔"

مسلمانان ہند کی سیاست وطنی مرتبہ جناب محمد امین صاحب زبیری۔ اس کتاب میں رسالہ انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ" کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور مسلمانان ہند کی اسی سال کی سیاسی تاریخ کو مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

گفتگوئے مصالحت اس رسالہ میں اختر بک ڈپو بمبئی نے اس خط و کتابت کو شائع کیا ہے جو مسٹر محمد علی جناح نے پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں جاری رکھی تھی۔ رسالہ کے آخر میں مسلمانان ہند کے چودہ مطالبات اور ان کی تاریخ بھی ضمیمہ کے طور پر درج کر دی گئی ہے۔

متحدہ قومیت اور اسلام از مولانا سید حسین احمد صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند قومیت اور وطنیت کے سلسلہ میں مولانائے موصوف اور علامہ اقبال مرحوم کے درمیان جو بحث چھڑی تھی یہ رسالہ اسی بحث کی ایک کڑی ہے۔ اس رسالہ کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے کہ اکثر مقامات پر ابحاث کو کلیات کی صورت میں پیش

کیا گیا ہے۔ مگر دراصل ان کا تعلق جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مفصل بیان اور جناب میر احسان کی تحریر سے ہے"

۳۔ دیوان اور نظموں کے انتخابات

ریاض رضوان | یہ جناب ریاض خیر آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت ریاض کی غزلیات اور دیگر اصناف سخن کا ایک جامع مجموعہ ہے۔ اس میں ملک کے ممتاز لوگوں کی تقریظ، پیش لفظ، تقریب، مقدمہ اور اعتراف اور آخر میں ضمیمہ بھی شامل ہیں۔

۱۔ اشعار میر
۲۔ اشعار ذوق | از جناب عبدالمنان صاحب بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ۔ ان دو کتابوں میں میر اور ذوق کے منتخب کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کے لئے بیدل صاحب نے نہایت جامع مقدمہ تصنیف فرمایا ہے۔ "اشعار میر" میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو کا "تعارف" بھی شامل کیا گیا ہے۔

دیوان بیدر | مرتبہ جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔ یہ مدارس یونیورسٹی اسلامیک سیریز کی دوسری کتاب ہے اور اس میں شاہ میر محمدی صاحب بیدر کے دیوان کو ڈیڑھ پونے دوسو برس کے گمنامی کے بعد ملک سے دوبارہ روشناس کرایا گیا ہے۔ دیوان کے ساتھ محوی صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

نذر ولی | از طالبات جامعہ عثمانیہ اس میں اردو کے مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی کے بارے میں جماعت ایم۔ اے کی طالبات کے مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔

گریہ وتبسم | یہ صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور "ادارہ ادبیات اردو" جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ مطبوعات کی پندرھویں کڑی ہے۔

۱۔ ماہر القادری کے سو شعر
۲۔ آہ کے سو شعر | "آہ کے سو شعر" نہایت دیدہ زیب طریقہ پر شائع کئے گئے ہیں۔ ماہر صاحب کے شعروں کا انتخاب بھی خوب کیا گیا ہے۔

۴- افسانے

فاؤسٹ | مترجمہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز دہلوی۔ یہ بیئرڈ پرسٹن اور ہنری سے درج کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے۔

سعیٔ ناکام | از ا۔ س۔ یہ ایک کم عمر مؤلفہ عزیزہ امتہ الرفیق کے ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہینز اینڈرسن کے ان چند افسانوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو بچوں کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

شہزادہ زرتاش | از جناب سید حمید علی صاحب۔ یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جسے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے۔

بالشتیوں کی دنیا | از جناب سید فخرالدین صاحب رکن ادارہ "ہند"۔ یہ انگریزی زبان کی مشہور کتاب "گلیورس ٹریول" کا ترجمہ ہے۔

۵۔ متفرق کتابیں

مکاتیب مہدی | مرتبہ جناب مہدی بیگم صاحبہ یہ اردو زبان کے بلند پایہ انشا پرداز ایم۔ مہدی حسن مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے اس کتاب کے لئے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

مخزن اخلاق | از مولانا رحمت اللہ صاحب سجانی۔ اس کتاب میں "ساڑھے پانچ ہزار ادبی و اخلاقی اقوال و اسباق" کو جمع کیا گیا ہے۔

تحریک ترقی مملکت آصفیہ | از جناب خواجہ حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) جشن سیمیں مبارک کی تقریب کے سلسلہ میں نواب سہراب نواز جنگ انجہانی کے ورثا نے حیدرآباد کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی تدابیر کے عنوان پر مضمون لکھنے کے لئے پانچ سو روپیہ کا انعام مقرر کیا تھا۔ خواجہ حمید صاحب کے مضمون کو اس انعامی مقابلہ میں کامیابی ہوئی تھی اسی مضمون کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔

جدید اردو ادب کا بانی (سر سید احمد خاں) | از جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی۔ بی۔ اے۔ آنرز (علیگ) اس رسالہ میں سر سید کی تصنیفی زندگی کے مختلف ادوار کو پیش کیا گیا ہے۔

طب قدیم اور طب جدید | از جناب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب اس میں طب یونانی اور طب ڈاکٹری کا مقابلہ کیا گیا ہے

ہٹلر اعظم | از پروفیسر چندر شیکھر شاستری۔ سیاسی لٹریچر کمپنی دہلی نے اس کتاب کو شایع کیا ہے۔ اس میں نہایت تفصیل کے ساتھ جرمنی کے زمانہ قدیم سے اواخر ۱۹۳۳ء تک کی تاریخ اور جرمنی کی موجودہ سیاسی حالات درج ہیں آخر میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۳ء تک کے اہم واقعات ڈائری کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ جرمن الفاظ کے صحیح تلفظ کے لئے بھی ایک گلاسری درج کر دی گئی ہے۔

بھگت سنگھ | از جناب دیاکشن گنجور صاحب۔ اس میں سردار بھگت سنگھ کی زندگی کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اچاریہ نرندر دیو ایم۔ ایل۔ اے۔ نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔

ہندوستان کی اقتصادی تاریخ | از خواجہ عبدالمجید صاحب۔ اس مختصر کتاب میں ہندوستان کی اقتصادی تاریخ بیان .... کی گئی ہے۔ فہرست مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ تمہید سیاست مدن زراعت بیشہ ملک، ہندو عہد کے اقتصادیات، اور مسلمانوں کی حملہ آوری، بحری تجارت کا حال اور مقامات روم کی تجارت، عربوں کی بحری تجارت، مسلمانوں کے زمانہ کی تجارت، سکہ اور تبادلہ، یورپین قوموں کا ابتدائی دور ۱۸۵۷ء (؟ ؟) کے بعد کی تجارت، حکومت کا تجارت کے ساتھ طرز عمل، تجارت اور ٹوران (؟) ان عنوانات پر نہایت سرسری بحث کی گئی ہے۔ زبان اچھی ہے۔

تعلیم بالغان | از ایس۔ ایم۔ شاہ ولی یمینی بی۔ اے آنرز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ۔
یہ بالغوں کو تعلیم دینے کا نیا قاعدہ ہے۔ جس کا تجربہ بہت سے لوگوں پر مختلف جگہوں پر کیا جا چکا ہے اور مصنف کا دعویٰ ہے کہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے اس کے ذریعہ سے دو مہینے کے عرصے میں بالغ اردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے تیار کرنے میں مصنف کے قول کے مطابق بالغوں کی نفسیات کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب | از آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے ڈون اسکول دہرہ دون۔ یہ ایک کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب نے کس طرح عزت نگر میں بالغوں کے لئے اسکول کھولا اور آہستہ آہستہ سارے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب سابق پرنسپل کتاب کی تقریب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں آغا محمد اشرف اپنی زبان کی سلاست لہجہ کی شیرینی، بے ساختہ پن ظرافت اور چلتے وقت تمام ہندوستا

کے سننے والوں سے "آداب عرض" کہنے کی وجہ سے بے حد ہر دل عزیز تھے صاحبزادہ صاحب کے اس بیان سے ہم بھی متفق ہیں۔ آغا صاحب کی تصنیف کی ہوئی کتاب سے ان کی ریڈیو کی خصوصیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے اس مختصر کتابچہ کو شایع کیا ہے۔

دیو مالا | از سید ابن حسن صاحب جارچوی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ سلسلہ تعلیم بالغاں کی کتاب نمبر ۲ ہے جسے حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" اردو بازار دہلی نے شایع کیا ہے۔ اس میں دیودں کے قصے بیان کئے گئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ زبان بھی بہت اچھی ہے۔

کسان رت | مصنفہ سید مطلبی سید فرید آبادی۔ یہ ایک منظوم "ڈراما یا سانگ" ہے۔ اور غالباً دہلی کے آس پاس کے دیہاتوں میں سانگ لکھنے کا جو طریقہ رائج ہے اسی کے انداز میں اسے لکھا گیا ہے۔ سید مطلبی صاحب شمالی ہندوستان کی دیہاتی شاعری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کے بارے میں بجا طور پر یہ توقع قائم کی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے "عوام" تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جاننے والے یا بالکل ان پڑھ" لوگوں کے لئے اس میں ضرور بہت زیادہ دلچسپی کا سامان ہوگا لیکن جن لوگوں کے ذوق خواص اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ادب تیار کرنے کی وجہ سے بگڑ گئے ہیں ان کے لئے یہ کتاب شاید زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہوگی۔

نوجوان اور مفلسی فلسفہ جدید | از سید صابر حسین صاحب جعفری ایم۔ اے ایل ایل بی مرشد آباد ہاؤس۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ۔ اس دلچسپ کتاب کا ڈیڈیکیشن "مایوس آرزوؤں کے نام" کیا گیا ہے۔ "اظہار" سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد "تعارف" ہے۔ اور پھر ۲۴ جون ۱۹۳۷ء سے ۲ مئی ۱۹۳۸ء تک کی ڈائری ہے۔ اس کتاب کا بحث "تعلیم یافتہ نوجوان کی سخت زندگی اس کے تلخ تجربات اس کے جذبات اور احساسات کا سفاکانہ خون ہے۔" "ادائگی مطلب کے لئے صاف زبان استعمال کی گئی ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتی ہے۔"

یہاں ناموزوں نہ ہوگا اگر "اظہار" کی عبارت کو بجنسہٖ نقل کر دیا جائے:۔

"نوجوانی اور مفلسی ان کا جمع ہونا ایک نئے فلسفہ کی تخلیق کا سبب ہوتا ہے جوانی کی ڈھلتی ہوئی

خواہشیں اور مفلسی کی تاریک مایوسی جب ہم آغوش ہوتی ہیں تو نقاب پوش حقیقت تھرتھرانے لگتی ہے اور زندگی اپنے فطری انداز میں رقص کرتی نظر آتی ہے۔

"نوجوان کا ابلتا ہوا شباب، پرارمان سینہ، بڑھتے ہوئے قدم، مفلسی کی سردی، بدبو اور بدہیئتی۔ لڑکھڑاہٹ، نقاہت اور مایوسی میں تبدیل نہیں کرسکتیں بلکہ اس کے گرد ایک رومانی ماحول پیدا کردیتی ہیں جس میں خودی پروقار انداز میں بڑھتی اور پھیلتی ہے۔

"تہذیب اور تمدن کی بڑھتی دنیا میں افسردہ تمنائیں، مایوس آرزوئیں "مایوس سکون" کی متلاشی نہیں ہوتیں بلکہ جرأت سے اپنے ماحول کو اپنی محنت اور کھُردری کاوشوں سے اپنے مطابق بدلنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

کیا اچھا ہو کہ اس کتاب کو سمجھ دار اور سوچنے کے عادی دماغ ہی پڑھیں۔"

صحیفۂ عشق از علامہ اخلاق دہلوی، ایچ، یو، کے، پی، اے، یو" ادبی سوسائٹی نئی دہلی ملتانی ڈھانڈا۔ اس رسالے میں عشق کے رموز و اسرار کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال کی شاعری مرتبہ جناب عبدالمالک صاحب آروی۔ یہ وہ مقالہ ہے جو یوم اقبال کی تقریب میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔

مرثیۂ اقبال از جناب اسد ملتانی صاحب۔ مرثیہ کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

وہ شعر و فلسفہ کا بحر بیکراں اقبال — جنون عشق و محبت کا راز داں اقبال

وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال — وہ شاعروں میں حقیقت کا ترجماں اقبال

وہ جسم قوم میں مثل دماغ و دیدہ و دل — وہ روح فطرت اسلام کی زباں اقبال

یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پاگیا ہے وفات — ______

نہیں نہیں، کبھی اقبال مر نہیں سکتا — ______

اگرچہ آج جہاں سے گذر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

۶۔ رسالے

ادب لطیف سالنامہ | نہایت پاکیزہ ادبی مضامین کا دیدہ زیب اور دلنواز مجموعہ، چودھری برکت علی بی اے اور میرزا ادیب بی اے کی ادارت میں مکتبہ اردو لاہور سے شایع ہوا ہے۔

رہنمائے تعلیم لاہور تپ دق نمبر | تپ دق کے بارے میں اس نمبر میں نہایت مفید معلومات کو جمع کیا گیا ہے۔

ایشیا | یہ سہ ماہی رسالہ جناب ساغر نظامی صاحب کی ادارت میں ادبی مرکز میرٹھ سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ ہندوستانی ادب، مشرقی تہذیب اور مشرق کی انقلابی روح کا علمبردار ہے۔

سب رس (دکن نمبر) | ادارہ ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کا ماہنامہ جس کے اس نمبر کو دکن کے ماضی وحال سے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کردیا گیا ہے۔

اردو کا قاعدہ: مرتبہ جناب ڈاکٹر صاحبزادہ سید ظفر صاحب کسی نقطے کو لے کر حروف کی ادا سکھائی دیتی ہے۔ ان سے شکل بنانا، ملانا اور ان کی مدد سے لکھنا پڑھنا بالغوں کو سکھایا جاتا ہے۔ اسی اصول پر سب بھی بتایا گیا ہے۔ اس قاعدے کے تین حصے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد ہر شخص آسان جملے لکھ اور پڑھ لیتا ہے اس کے پڑھانے کے لئے الگ ایک کتاب "مدرس کا قاعدہ نما" لکھا ہے۔ اسے ماہرین تعلیم نے بہت پسند کیا ہے

قیمت حصہ اول ۔/۸

" " دوم ۱/

" " سوم ۱/

مدرس کا قاعدہ نما ۲/

اردو سکھانے کا آسان طریقہ ۴/

سائنٹیفک ایڈورٹائیزنگ: مصنف پروفیسر برہمانند گپتا۔ اس کتاب میں ایڈورٹائزنگ کی سائنس سائیکالوجی اور فلاسفی، اشتہار بنانے کے اصول، قاعدے اور طریقے نیز اشتہاری مہم جاری کرنے کے ڈھنگ اور اس کو کامیاب بنانے کے راز بیان کئے گئے ہیں۔

آسیب الفت: از سید سجاد حیدر یلدرم۔ اس میں عشق و محبت کے عنصر کو آسیب اور بھوتوں کی روحوں کے تخیل سے ملایا گیا ہے۔ **قیمت** ۱۲/

اخلاق کی کتابیں: مرتبہ علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ۔ اس کے چار حصے ہیں۔ اس میں بیگم مرحومہ نے بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کے لئے خالص مذہبی نقطۂ نظر سے اسباق لکھے ہیں۔ جگہ جگہ قرآن و حدیث کی آیتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ مثال کے لئے مسلمانوں کے صحیح اور تاریخی واقعات لکھے ہیں۔

اخلاق کی پہلی کتاب قیمت ۳/

" دوسری کتاب ۱۲/

" تیسری کتاب ۱۲/

" [illegible]

جدید مطبوعات جامعہ

مضامین محمد علی۔ مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان اٹھے۔ قیمت مجلد عہ/

دنیا کی کہانی۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائی اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر وہ سب سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ قیمت عہ/

شہری آزادی۔ از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ ایک کتابچہ ہے جس میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے ان حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۶/

ہندوستان میں برطانوی حکومت۔ از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھیے جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸/

ہندوستانی دیہی قرض۔ مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں قرض کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے اور ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات بھی کی گئی ہے۔ قیمت ۴/

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ بمبئی۔ لکھنؤ

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیر ادارت : شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔

عمدہ تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپے (۶)، ششماہی تین روپے آٹھ آنے

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۶ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر "کلیم" مہر جانتی نواس دریا گنج دہلی

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

زیرادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	مارچ ۱۹۳۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صر	پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن محبوب المطابع برقی پریس دہلی	فی پرچہ ۸ ر

ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ اور فیڈریشن

(ذیل کے مضمون میں دیسی ریاستوں اور فیڈریشن کے مسئلہ سے متعلق واقعات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنقید اور تعمیری تجاویز کو کسی اور صحبت کے لئے ملتوی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح وفاقی مالیات کی مبسوط بحث کو بھی کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے)

ہندوستان کے مسئلہ کا کوئی بیان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس میں ہندوستانی ریاستوں کا حال بھی شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان کے مجموعی رقبہ میں تقریباً ، لاکھ مربع میل یعنی کل رقبہ کے ایک تہائی سے زیادہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں شامل ہے۔ یہ ریاستیں برطانیہ کے زیر حکومت نہیں ہیں بلکہ برطانیہ کی باجگزار ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۷۰۰ ہے اور ان میں ہر قسم کی ریاستیں شامل ہیں ــــ ایک طرف اگر حیدرآباد اور کشمیر کی بڑی ریاستیں ہیں (جن میں سے ہر ایک انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ سے زیادہ بڑی ہے) تو دوسری طرف ایسی ریاستیں بھی ہیں جن کا رقبہ صرف چند ایکڑ ہے اور ان کے مالک یا حصہ دار ایسے چھوٹے چھوٹے سردار ہیں جن کو عدالت کا حق بھی نہیں دیا گیا ہے۔ مگر بصورت مجموعی ریاستوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کی کمیٹی نے جس کا تقرر دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی ریاستوں اور حکومت بالادست کے تعلقات کی تحقیقات کرے اور برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے مالی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے ۱۹۲۹ء میں اپنی رپورٹ تیار کی اور یہاں جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان سے زیادہ کے مطالعہ کے لئے اسی رپورٹ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

کمیٹی نے ہندوستانی ریاستوں کو جس حالت میں وہ آج موجود ہیں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم کیا ہے :-

ریاست کی نوعیت	تعداد	رقبہ مربع میلوں میں	آبادی	آمدنی
۱- ایسی ریاستیں جن کے حکمراں اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان راجگان کی رکن ہیں	۱۰۸	۵ لاکھ ۱۴ ہزار ۸۸۶	۵ کروڑ ۹۸ لاکھ ۴۷ ہزار ۱۸۶	۴۲ کروڑ ۱۶ لاکھ
۲- ایسی ریاستیں جن کی نمائندگی ایوان راجگان میں انھیں کے زمرہ کے ۱۲ رکن کرتے ہیں......	۱۲۷	۷۶ ہزار ۸۴۶	۸۰ لاکھ ۴ ہزار ۱۱۴	۲ کروڑ ۸۹ لاکھ
۳- چھوٹی ریاستیں جاگیریں وغیرہ	۳۲۷	۶ ہزار ۴۰۶	۸ لاکھ ایک ہزار ۶۷۴	۷۴ لاکھ

حیدرآباد کا رقبہ ۸۲ ہزار ۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ہے یعنی تقریباً برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے اور پرتگال یا آسٹریا کے مقابلہ میں اس کی آبادی دوگنی ہے۔ حیدرآباد ریاست کی آمدنی تقریباً ۶½ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ انتہائی شمال میں کشمیر کی ریاست کا رقبہ حیدرآباد کے برابر ہے اور اس کی آبادی ۳۲ لاکھ ہے۔ جنوب میں میسور کی آبادی ۶۶ لاکھ ہے اور رقبہ ۳۰ ہزار مربع میل سے کچھ کم ہے گویا یہ آئرش فری اسٹیٹ سے رقبہ میں بڑی اور آبادی میں دوگنی ہے۔ اور زیادہ جنوب میں ٹراونکور اور کوچین کی بہت زیادہ آباد ریاستیں ہیں جن میں علی الترتیب ۵۱ لاکھ اور ۱۲ لاکھ کی آبادی ہے۔ بڑودہ کے گائکوار کا علاقہ بمبئی کے شمال میں کئی منتشر علاقوں پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی ۲۴ لاکھ ہے۔ ہندوستان کے نقشوں میں جو زرد رنگ نظر آتا ہے (یعنی کل رقبہ کا ⅖ وہ برطانوی علاقہ نہیں ہے بلکہ وہ ریاستوں کا علاقہ ہے۔ نگاہ کو سب سے بڑا مسلسل غیر برطانوی علاقہ راجپوتانہ کا نظر آتا ہے لیکن راجپوتانہ ایجنسی میں بہت سی جدا جدا ریاستیں شامل ہیں۔ ان میں حروف تہجی کی ترتیب سے چند قابل ذکر ریاستیں یہ ہیں۔ الور، اودے پور، بندی، بیکانیر، ٹونک، جودھ پور، جے پور، کوٹہ اور زیادہ مشرق میں گوالیار ہے

جس کی آبادی پینتیس[۳۵] لاکھ ہے۔ سنٹرل انڈیا ایجنسی میں بھوپال، اندور، اورچھا اور ریوا مانوس نام ہیں۔ راجپوتانہ کے جنوب مغرب میں اور ساحل کے حاشیہ پر بہت بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اجتماع نظر آتا ہے جو سب ویسٹرن سٹیٹس ایجنسی (کچھ اور کاٹھیاواڑ) میں شامل ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور بہاؤنگر، کچھ، جونا گڑھ اور ناوانگر کی ریاستیں ہیں۔ ۵۶۲ ریاستوں کی میزان میں ۲۰۰ سے زاید کاٹھیاواڑ اور گجرات میں ہیں۔ پنجاب میں پٹیالہ سکھوں کی خاص ریاست ہے جو ہمالیہ کے دامن سے شروع ہو کر شملہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ آگے مغرب میں بہاول پور کی مسلمان ریاست ہے۔ بلوچستان میں خان قلات کی ریاست ہے جو کل منو کے ۳/۴ حصہ پر حاوی ہے۔ بمبئی میں کولھاپور کی بڑی مرہٹہ ریاست ہے۔ یو۔پی میں رام پور اور بنارس کی بڑی ریاستیں ہیں جن میں آخر الذکر کو موجودہ شکل ۱۹۱۱ء میں دی گئی ہے۔ بنگال اور آسام میں کوچ بہار، تری پورہ اور منی پور کی ریاستیں ہیں۔

ہم نے اس فہرست میں رقبہ کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور اس میں بہت سی اہم ریاستیں بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو سکے گی کہ ان میں سے خاص خاص ریاستیں تعداد میں کس قدر زیادہ اور مختلف ہیں۔

ہندوستانی ریاستوں کی خصوصیات

ہندوستانی ریاستوں میں جغرافی، معاشی اور سیاسی حالات کا نہایت نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سی ریاستیں برطانوی ہندوستان سے قریبی طور پر وابستہ ہیں۔ وسائل آمد و رفت ریاستوں کی حدود میں سے گذرتے ہیں۔ بمبئی سے دہلی تک کے سفر میں سفر کا بڑا حصہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں صرف ہوتا ہے۔ برطانوی ہندوستان اور ریاست کی حدیں طبعی خصوصیات نہیں رکھتیں۔ ان میں نسل اور زبان کا فرق بھی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً سکھ پنجاب کی ریاستوں سے زیادہ پنجاب کے صوبہ میں پائے جاتے ہیں۔ مرہٹے مرہٹہ راجوں کے مقابلہ میں بمبئی کے صوبہ میں زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس کناری زبان بولنے والی بیشتر آبادی میسور کے مہاراجہ کے ماتحت ہے اور قلیل تر آبادی مدراس اور بمبئی کے احاطوں کے کچھ حصوں میں رہتی ہے۔

ان ریاستوں کی حکومت بھی بہت مختلف ہے۔ ۳۰ ریاستوں میں مجلس قانون ساز ہے جس کا کام محض

مشاورتی ہے۔ ۱۰ میں ہائی کورٹ ہیں۔ ۳۴ نے عدالت کو عاملہ سے جدا کرلیا ہے۔ ریاست کے انتظام کے طریقوں میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ ریاستیں بہت ترقی یافتہ ہیں کچھ بہت پس ماندہ ہیں لیکن ایک بات تمام ریاستوں میں مشترک ہے کہ وہ برطانیہ علاقہ میں شامل نہیں ہیں اور ان کی رعایا برطانوی رعایا نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے جو تعلقات حکومت بالادست سے ہیں، ان کا تعین معاہدہ یا کسی تحریری دستاویز یا رواج اور سمجھوتہ کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان تعلقات کی صورت چاہے جو بھی ہو لیکن خارجی معاملات اور ان کے علاقہ کے تحفظ کی آخری ذمہ داری تاج برطانیہ کی ہی ہے۔ ۴۰ ایسی ریاستیں ہیں اور یہ سب کی سب بڑی اہمیت رکھتی ہیں جن کے تعلقات حکومت بالادست سے باقاعدہ معاہدوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ زیادہ تر ریاستوں کے تعلقات سندوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ سند سے مراد حکومت بالادست کی طرف سے بعض مراعات یا حقوق و اختیارات کا تسلیم کرنا ہے۔ بقیہ جتنی ریاستیں ہیں ان کے مرتبہ کو بھی کسی نہ کسی شکل میں تاج برطانیہ نے تسلیم کرلیا ہے۔

حکومت بالادست سے تعلقات ہر ریاست اپنے اندرونی معاملات کا انتظام خود کرتی ہے، اپنے قوانین خود بناتی ہے اور اپنے محاصل کو خود ہی عاید، وصول اور خرچ کرتی ہے۔ ہر ریاست میں بلا استثنا ایک برطانوی ریذیڈنٹ یا ایجنٹ ہوتا ہے جس کا کام حکمرانوں کو مشورہ دینا اور برطانوی ارباب حل و عقد کو معاملات کی رپورٹ بھیجنا ہوتا ہے۔ تاج برطانیہ کو سخت بدانتظامی کی حالت میں یا ایسے حالات میں جہاں اس کی ضرورت ہو ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ایسی صورتوں میں حکومت بالادست، حکمراں کے خاندان کے حقوق، ریاست کے حدود کے تحفظ اور ہندوستان کے امن و امان کو عموماً ملحوظ نظر رکھتی ہے۔ بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندوستانی رجواڑوں کی طرف سے مطالبہ تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ چیزیں من مانی نہ رہیں اور اس پر عملدرآمد کرانے کے لئے ایک باقاعدہ مشینری بنادی جائے۔ لیکن بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو فارمولا کی شکل میں بیان کرنا ناممکن خیال کیا اور ریاستوں کو مشورہ دیا کہ ان کی عدم وضاحت میں ہی ریاستوں

کا فائدہ ہے۔

ایک دوسرے مسئلہ کے بارے میں بھی بٹلر کمیٹی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ راجاؤں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت بالا دست کو جو حقوق معاہدوں کے ذریعہ ملے ہوئے ہیں ان کو ایسے لوگوں کو سپرد نہ کرنا چاہیئے جن پر اس کا کوئی اختیار نہ ہو مثلاً کسی ایسی ہندوستانی حکومت کو جو ہندوستانی مجلس قانون ساز کو جواب دہ ہو۔ ہندوستان میں اگر ڈومینین طرز کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا انحصار نئے اور تحریری دستور پر ہوگا۔ اس لئے راجاؤں کو اس نئی حکومت کی نگرانی میں بغیر ان کی رضامندی حاصل کئے شامل نہ کیا جائے۔

ریاست کی حکومتوں کی طرف سے حکومت بالادست کو خراج وغیرہ

کچھ ریاستیں تاج برطانیہ کو خراج ادا کرتی ہیں جس کی رقم مختلف حالات میں بدلتی رہتی ہے اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ہندوستان کی حکومت کی آمدنی میں شامل کی جاتی ہے۔ یہ خراج بعض صورتوں میں تو علاقہ کے تبادلہ یا واپسی کی شرائط کی وجہ سے پیدا ہوا ہے یا حکومتوں کے مطالبوں کے تصفیہ کی وجہ سے۔ لیکن زیادہ تر صورتوں میں اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ ریاستوں کو پہلے فوج رکھنا پڑتی تھی جس کی ذمہ داری بعد میں انھوں نے ترک کر دی اور اس کے معاوضہ میں روپیہ دینا شروع کر دیا۔ ایسی بھی مثالیں ہیں جن میں ایک ماتحت ریاست ریاست بالادست کو خراج ادا کرتی ہے مثلاً کاٹھیاوار اور گجرات کی بہت سی ریاستیں بڑودہ کو خراج ادا کرتی ہیں اور گوالیار، وسط ہند کی بعض ریاستوں سے خراج وصول کرتی ہے۔

اکثر ریاستیں جو اندرون ملک ہیں اپنے حدود پر درآمد برآمد کے محصول لگاتی ہیں البتہ میسور کا شمار اہم مستثنیات میں ہے۔ اکثر ریاستوں میں مال گذاری کے بعد آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ درآمد اور برآمد کے محصول ہوتے ہیں۔ ان درآمد اور برآمد کے محاصل کی میزان بصورت مجموعی ۲ ۱/۲ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب ہوتی ہے۔ اپنے حدود پر محصول عاید کرنا بادشاہت کی علامت ہے اس لئے اس بات پر ریاستیں زور دینا چاہتی ہیں۔

ریاست کے خارجی معاملات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تمام تر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اس لئے بین الاقوامی معاملات میں ہندوستانی ریاستوں کے علاقہ کی حیثیت بالکل برطانوی علاقہ سے مشابہ ہے اور ان کی رعایا کی وہی حالت ہے جو برطانوی رعایا کی ہے۔ کوئی ہندوستانی ریاست سیاسی یا سرکاری گفت و شنید کسی غیر ملکی حکومت سے نہیں کرسکتی۔ ہندوستان اس میں شک نہیں انجمن اقوام کا رکن ہے اور جینوا میں اس کی نمائندگی ایک ایسا وفد کرتا ہے جس میں عام طور پر ہندوستانی ریاست کا ایک حکمراں بھی شامل ہوتا ہے۔

کئی وجوہ کی بنا پر برطانوی چھاؤنیاں ہندوستانی ریاستوں مثلاً سکندرآباد، بنگلور اور مہو میں رکھی گئی ہیں۔

حکومت ہند، ہندوستان کی حفاظت کے سلسلہ میں ریاستوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ جہاں تک ان کی مالی حالت اجازت دے وہ اپنی سرکاری فوجیں رکھیں تاکہ وہ ہندوستان کی فوج کے ساتھ بیرونی حملوں اور اندرونی بلووں کے موقعوں پر اشتراک عمل کرسکیں۔ ان کے معائنہ کرنے والے عملہ کی تنخواہ حکومت ہند ادا کرتی ہے۔

ریاستیں اپنی پولس کے لئے خود ذمہ دار ہیں۔

وقتاً فوقتاً تاج برطانیہ اور ریاستوں کی حکومت کے درمیان، ریاستوں کے علاقوں میں خاص مراعات حاصل کرنے کے لئے معاملات طے پاتے رہتے ہیں۔ مثلاً ریاست کے ان ٹکڑوں میں جہاں سے ہوکر ریل گذرتی ہے حکومت ہند اپنے سول اور فوجداری قانون پر عملدرآمد کرتی ہے۔ مگر کچھ سرکاری ریلیں ایسی ہیں جو اہم راستوں پر بنیں ہیں ان پر ریاستوں کی عملداری کو قائم رہنے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال جودھپور اور بیکانیر کی لائن ہے۔ مندرجہ بالا انتظام کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو برطانوی ہندوستان میں گرفتار کیا جائے اور اس پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے ہندوستانی ریاست میں ریلوے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی بریت کے لئے یہ عذر پیش نہیں کرسکتا کہ اس نے جرم کا ارتکاب برطانیہ کے علاقہ کے حدود میں نہیں کیا ہے۔ اسی قسم کے سمجھوتے چھاؤنی اور بعض اوقات برطانوی ریذیڈنسی کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ حکومت ہند یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ یورپین برٹش رعایا کا مقدمہ ریاستوں کی

عدالتوں میں نہ چلایا جائے۔ ایسے مقدمے یا تو ہندوستانی ریاستوں میں جو برطانوی عدالتیں قائم ہیں ان میں پیش کئے جاتے ہیں یا برطانوی ہندوستان کی عدالتوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

جہاں تک پوسٹ اور ٹیلیگراف کا تعلق ہے، برطانوی ٹیلیگراف کا انتظام ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اکثر ریاستوں میں اسی قسم کے سمجھوتے ڈاک خانوں کے متعلق بھی ہیں لیکن پندرہ ریاستوں کے اپنے علیحدہ ڈاک خانے ہیں اور ان میں سے پانچ نے باقاعدہ معاہدہ کیا ہے جس کے ذریعہ یہ برطانوی محکمہ ڈاک کے ساتھ اشتراک عمل کرتی ہیں۔

صرف آٹھ ایسی ریاستیں ہیں جن کی اپنی جداگانہ ٹکسالیں ہیں جہاں روپیہ سازی کا کام کیا جاتا ہے۔ باقی ریاستوں کی ٹکسالوں میں صرف تانبے کے سکّے بنائے جاتے ہیں یا چاندی اور سونے کے سکّے خاص خاص تقریبوں کے موقع پر بنائے جاتے ہیں۔

چیمبر آف پرنسس (ایوان راجگان) مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں حکمرانوں کے مشترکہ معاملات کے بارے میں ان کی مشترکہ رائے اور مشورہ کا علم حاصل کرنے کے لئے کئی تجویزیں پیش کی گئی تھیں لیکن رپورٹ کے شائع ہونے سے پہلے اس تخیل کو کوئی عملی اور مستقل جامہ نہیں پہنایا جا سکا تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ایوان راجگان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ دراصل ایکٹ میں ریاستوں کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ دیسی ہندوستان کو برطانوی ہندوستان سے علیحدہ ایک چیز ظاہر کیا گیا تھا۔ ایوان راجگان ۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ایک شاہی اعلان کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ ڈیوک آف کناٹ نے دہلی کے قلعہ میں مغل بادشاہوں کے دیوان عام میں جلسہ کیا اور اس میں ملک معظم کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے راجاؤں کے حقوق اور مراعات کو قائم اور برقرار رکھیں گے۔

ایوان راجگان کی ساخت ایوان راجگان میں سب سے پہلے تو ایسی ۱۰۸ ریاستوں کے حکمراں ہیں جو اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان کے رکن ہیں۔ یہ ایسے راجہ ہیں جن کو گیارہ یا زائد توپوں کی سلامی کا حق خاندانی طور پر ملا ہوا ہے۔ ان میں ایسے راجہ بھی شامل ہیں جنھیں وائسرائے کی رائے میں کمل یا عملاً مکمل اختیارات

ریاست کے اندرونی انتظام کے ملے ہوئے ہیں۔ ایوان میں اس کے علاوہ بارہ اراکین اور ہوتے ہیں جنھیں ایسی ۱۲۷ ریاستوں کے راجہ چنتے ہیں جو اوپر کی ریاستوں میں شامل نہیں ہیں۔ ان نمائندوں کا انتخاب یہ راجہ یکجا جمع ہوکر کرتے ہیں۔ وایسرائے اس ایوان کا پریسیڈنٹ ہے اور اراکین میں ایک چانسلر اور ایک پرو چانسلر کا انتخاب سالانہ ہوتا رہتا ہے۔ ایوان کا ایک نہایت اہم ادارہ اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی یا مجلس انتظامیہ ہے جس کے سات ارکان ہوتے ہیں جس میں چانسلر اور پرو چانسلر شامل ہوتے ہیں۔ اس مجلس انتظامیہ کا کام وایسرائے کو ایسے مسائل پر مشورہ دینا ہوتا ہے جن کے بارے میں وایسرائے ان سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ "نیز یہ وایسرائے کے سامنے ایسے مسائل بھی پیش کرتے ہیں جن کا اثر ہندوستانی ریاستوں پر عام طور پر پڑتا ہے یا بصورت مجموعی تمام ریاستوں پر پڑتا ہے یا برطانوی ہندوستان اور ریاستوں دونوں پر پڑتا ہے۔"

ایوان راجگان کے اختیارات | ایوان راجگان ایک غور کرنے والا، مشورہ دینے والا ادارہ ہے اس کو کوئی انتظامی اختیار ملا ہوا نہیں ہے۔ اس کے اجلاس دہلی کے کاونسل ہاؤس کے اس عالیشان ہال میں ہوتے ہیں جو اس کے لئے خاص طور پر تعمیر کرا دیا گیا ہے۔ اس کے دستور کا جو اہم حصہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"ریاستوں کے انفرادی معاہدوں اور ان کے اندرونی معاملات، راجاؤں اور سرداروں اور ان کی ریاستوں اور ان کے خاندان کے افراد کے انفرادی حقوق، مفادات، اعزازات، اختیارات، مراعات اور شاہانہ حقوق اور حکمرانوں کے انفرادی اعمال وافعال پر ایوان میں کوئی مباحثہ نہیں کیا جائے گا۔

"ایوان کے قیام سے وایسرائے یا گورنر جنرل کے ساتھ کسی ریاست کے جو تعلقات اور مقررہ روابط ہیں ان کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ایوان کی کسی سفارش پر کسی ریاست کے حقوق یا عمل کی آزادی کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے گا۔"

دستور کی ان دفعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوان راجگان کے قیام سے کسی ریاست کے ساتھ

تاج برطانیہ کے جو انفرادی تعلقات تھے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی کا ویسرائے بذات خود انچارج ہے اور یہی وہ محکمہ ہے جو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی سفارشات کے بموجب اکثر اہم ریاستوں کو مرکزی حکومت سے براہ راست وابستہ کر دیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر صورتوں میں صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات گورنر جنرل کو منتقل ہو گئے ہیں۔ اکثر بڑے راجہ ویسرائے سے براہ راست ملاقات اور خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی میں زیادہ تر برطانوی افسر رکھے جاتے ہیں اور ان کا انتخاب انڈین سول سروس اور ہندوستانی فوج سے کیا جاتا ہے۔ ان سیاسی افسروں کو ریذیڈنٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر ایجنسی میں یعنی راجپوتانہ، وسط ہند، ریاست ہائے پنجاب، ریاست ہائے مغربی، ریاست ہائے مدراس اور بلوچستان میں ایک اے۔ جی۔ جی یا ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل ہوتا ہے جس کے ماتحت بہت سے افسر ہوتے ہیں جو اکثر ایک ایک ریاست یا کئی ریاستوں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ محکمہ سیاسیات کا حاکم پولیٹیکل سکریٹری ہوتا ہے جو ریاستوں کے معاملات میں ویسرائے کا مشیر ہوتا ہے۔

ایوان راجگان کی دستوری اہمیت | تاج برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات کی تاریخ میں ایوان راجگان کا قیام ایک اہم منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس ابتدائی پالیسی کی تنسیخ ہوتی ہے جس کی رو سے تاج برطانیہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا ہندوستانی ریاستوں کو مشترکہ مشوروں اور مشترکہ عملی کوششوں سے باز رکھا کرتی تھی اور ہر ریاست کے ساتھ انفرادی حیثیت سے تعلقات قائم کرنا پسند کرتی تھی۔ یوں تو ایوان راجگان کے قیام سے پہلے ہی اس اصول کو ترک کرنا شروع کر دیا گیا تھا اور راجگان آپس میں مشورے کرنے لگے تھے۔ لیکن ان مشوروں کو قانونی صورت جواز اس سے پہلے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایوان راجگان کے قیام سے اس چیز کو قانونی اور منتقل شکل مل گئی۔ ایوان کے ذریعہ ایسے اہم معاملات پر جن کا تعلق ریاستوں اور تاج برطانیہ سے تعلقات یا دوسرے برطانوی ہند کے معاملات سے ہوتا ہے ریاستیں باہم آزادی سے تبادلہ

خیال کر سکتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ بعض اہم ریاستیں مثلاً حیدر آباد اور میسور اس سے الگ رہی ہیں پھر بھی سترہ سالوں میں اس کا کام خصوصاً اس کی مجلس منتظمہ کا کام دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں میں اشتراک عمل نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ لیکن سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس ترقی کو اتنا کافی نہیں سمجھا تھا کہ جس کی بنا پر آل انڈیا فیڈریشن کی طرف قدم اٹھایا جا سکے۔ اس سلسلہ میں لارڈ اروِن نے ۱۹۲۹ء میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا:۔

"میری یہ رائے ہے اور میں اسے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ آئندہ کے لئے جو تجاویز بھی بنائی جائیں ان میں پالیسی اور انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہندوستان کے راجگان کی آزادانہ منظوری کا حاصل کرنا لازمی سمجھا جائے۔ ایسی تجویزوں سے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاہدے جن کو راجگان نہایت پختہ سمجھتے آئے ہیں آسانی کے ساتھ توڑے جا سکتے ہیں مسئلہ کا حل قریب نہیں بلکہ دور ہو جائے گا۔"

اوپر درج کئے ہوئے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول گول میز کانفرنس کے منعقد ہونے سے پہلے تک والیان ریاست کا آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونا بہت مشتبہ تھا لیکن پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے والیان ریاست کو بھی دعوت دی گئی اور اس کانفرنس کے دوران میں والیان ریاست کو وزیر اعظم مسٹر ریمزی میکڈانلڈ نے کچھ ایسی باتیں سمجھائیں جن سے وہ آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ انھیں غالباً یہ باور کرایا گیا تھا کہ تمہاری اندرونی خود مختاری میں کسی قسم کا فرق نہیں آئے گا البتہ فیڈریشن میں شریک ہوکر تم ایسے مسائل پر جو تمہارے لئے اور برطانوی ہندوستان کے لئے مشترک ہیں اور جن پر اب دیسی راج کو اختیارات بالادست حاصل ہیں اپنی مرضی اور رائے کو ایک آل انڈیا کنزرویٹو پارٹی بنا کر موثر طریقہ پر استعمال کر سکو گے والیان ریاست کو ایک عرصہ سے اس بات کی شکایت تھی کہ حکومت بالادست من مانے طریقہ پر ریاست کے معاملات میں اپنے اختیارات بالادست کا استعمال کرتی ہے اور ان کے حقوق کو مسترد کر رہی ہے جو انہیں ان معاہدات اور اعلانات کے ذریعہ حاصل تھے جو ملک معظم کی جانب سے وقتاً فوقتاً کئے گئے تھے۔ انہوں نے بٹلر کمیٹی کے سامنے اپنے اس مطالبہ کو رکھا تھا کہ پیرامونٹسی

کی مداخلت کی حدبندی اور تعریف وتحدید کردی جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ برطانوی ہندوستان میں پارلیمنٹ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن ان کی سرگرم کوششوں کے باوجود اور قانونی مشورے کے لئے کثیر رقم صرف کرنے کے بعد بھی بٹلر کمیٹی نے انھیں صرف یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کی عدم وضاحت میں ہی ان کا فائدہ زیادہ ہے اس کے خلاف والیان ریاست نے احتجاج کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں انھوں نے اس امید کے ساتھ شرکت کی تھی کہ اپنے اس مطالبہ کو پارلیمنٹ کے سامنے رکھ سکیں گے۔ چنانچہ والیان ریاست نے اس موقع پر جو تقریریں کیں ان سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی چند تقریروں کے اقتباس درج کئے جاتے ہیں:۔

مہاراجہ بیکانیر:۔ "معاہدات سے روسارِ ہند کے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں ان کی زیادہ وضاحت کے ساتھ تحدید کرنے کی ضرورت ہے۔ روسار اور ریاستیں اس امر کو معلوم کرنے کی فطرتاً خواہش مند ہیں کہ ان کا کیا مقام ہے"......."یہ ایک کھلی ہوئی شکایت ہے کہ ہمارے معاہداتی حقوق پر دست درازیاں ہوئی ہیں"......"وہ زمانہ گزر چکا جب کہ ایسے اہم معاملات کا تصفیہ کوئی ایک حکومت یک طرفہ طور پر کرلی تھی۔ لہٰذا ہم ایسی عدالت اعلیٰ کے قیام کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں جس کو ان تمام نزاعی امور کی سماعت اور فیصلہ کا اختیار ہو جو معاہدات کے تحت ہمارے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔"

مہاراجہ الور:۔ "ہم جدید اختیارات کے متلاشی نہیں بلکہ ہم ان معاہدات کی پابندی چاہتے ہیں جن کو ملکہ وکٹوریہ اور انگلستان کے تمام شاہان مابعد اور پارلیمنٹ اور زمانہ حاضر کے ویسرائے کے متعدد اعلانات اور تقریروں نے قابل احترام بنادیا ہے۔ سیاسی عملدرآمد کے موقع پر ہمارے معاہدات کے مقدس حدود میں مداخلت کی گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ حقوق جو معاہدات سے باہر ہیں اور جو ہماری رضامندی اور بعض وقت ہمارے علم و اطلاع کے بغیر حاصل کر لیے گئے ہیں از سر نو معرض بحث میں لائے جائیں اور باہمی رضامندی سے تصفیہ پائیں، ورنہ ہمارے معاہدات بے معنی

سمجھے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ عملدرآمد کے وقت مقدس معاہدات کی پابندی کی جائے۔"

مہاراجہ پٹیالہ:۔ "ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سوائے مشترکہ امور کے دیگر معاملات میں ہم اپنی اندرونی خودمختاری کو بحال و برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور برطانوی ہند کی حکومت کی مداخلت لو (عام اس سے کہ برطانوی ہند کا دستور کچھ بھی ہو) روا نہیں رکھیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ برطانوی ہند اپنے معاملات میں ہماری مداخلت کی روادار نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دنیا میں کوئی ایسا وفاق آج تک نہیں بنا جس میں وفاق میں شریک ہونے والی ریاستوں کو ان کے حقوق کا ابتدا ہی میں علم نہ ہو جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے یہ حقوق ابھی تک مشکوک ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے حقوق معاہدات اور تہ نامہ جات پر مبنی ہیں اور تاج سے ہمارا تعلق ایک قابل تعین رشتہ ہے جس کے شرائط رضامندی پر مبنی ہیں۔ بٹلر کمیٹی نے ہماری رائے پر اعتراض کیا ہے۔ کیا ہمارے مشیران قانون جو انگلستان کے قابل ترین قانون داں ہیں حق بہ جانب ہیں یا ارکان بٹلر کمیٹی۔ تاوقتیکہ ہم واقف نہ ہو جائیں کہ شرکت وفاق سے کیا کیا حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں ہم کیوں کر شریک وفاق ہو سکتے ہیں؟ پس جب ہم شرکت وفاق پر آمادگی اور رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں تو کیا ہمیں یہ کہنے کا استحقاق نہیں ہے کہ شرکت سے پہلے ہمارے حقوق کا تعین ہو جائے۔"

نواب صاحب بھوپال:۔ "یہ کہا گیا ہے کہ برطانوی ہند کی آزادی کا تخیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ دیسی ریاستیں بھی آزاد نہ ہوں۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک آزاد دیسی ریاست کے یہ معنی ہیں کہ پیرامونٹسی کے اس نظریہ کا خاتمہ کر دیا جائے جو ہمارے معاہدات کے خلاف ریاست ہائے ہند اور حکومت برطانیہ کے مابین پیدا کر دیا گیا ہے اور جس کو زمانہ حاضر میں اس قدر رواج دیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایوان روسا نے بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف کھلے الفاظ میں احتجاج کیا ہے۔ ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے وہ دعوے جن کو رپورٹ مذکور نے مسترد کر دیا ہے تفصیلی تحقیقات کے بعد جس کے

کہ وہ مستحق ہیں باقاعدہ طور پر فیصل نہ ہوں۔ بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد حکومت ہند نے "ریاستوں سے تعلقات" کے عنوان سے جو یک طرفہ بیان شائع کیا ہے اس سے روسا ہند بے حد غیر مطمئن ہیں .... ایک ایسی غیر جانبدارانہ عدالت ثالثی کی ضرورت ہے جو ان امور کا فیصلہ کرے جو ریاستوں اور تاج کے عہدہ داروں کے مابین تصفیہ طلب ہوں"

اوپر کے تمام اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیرامونٹسی اور معاہداتی تعلق وہ حقوق ہیں جن کی طرف سے وفاق میں شریک ہونے سے پہلے ریاستیں مطمئن ہو جانا چاہتی ہیں۔ مسٹر مانٹیگو سابق سکریٹری آف اسٹیٹ کے دورۂ ہند کے بعد سے والیان ریاست نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مسئلہ پیرامونٹسی کو حل کرنے کی پیہم کوشش کیں۔ برطانوی اور یورپین مقننین سے مشورے حاصل کئے اور ایوان راجگان نے مختلف قراردادوں کے ذریعہ اس خطرہ کو روکنے کی کوشش کی۔ آخر میں گول میز کانفرنس کی ہر سہ میقاتوں میں پر زور مطالبہ کیا کہ تاوقتیکہ اس مسئلہ کا تشفی بخش حل نہ ہو جائے وہ شرکت وفاق سے قاصر رہیں گی۔

ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ نے یہ طے کیا کہ پیرامونٹسی کا اثر و نفاذ مختلف ریاستوں کے حق میں مختلف حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہر ریاست فرداً فرداً اس مسئلہ کے متعلق حکومت ہند سے گفت و شنید کا آغاز کرے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کا جو قانون ہند بنایا گیا ہے اس میں وفاق کے قیام کو ریاستوں کی اختیاری شرکت کا پابند رکھا گیا ہے اور ہر ریاست کو فرداً فرداً دستاویز شرکت تیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جب ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کریں گی جن کے حکمراں کم سے کم ۵۲ ارکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے منتخب کرنے کے مجاز ہیں اور جن کی مجموعی آبادی تمام ریاستوں کی کل آبادی کی کم سے کم نصف ہے تب ہی آل انڈیا فیڈریشن وجود میں آسکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس اعتبار سے والیان ریاستہائے ہند اپنی مرضی سے ہی وفاق ہند میں شامل ہو سکتے ہیں انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جدید دستور اپنی طرف سے کسی ریاست کو وفاق میں شریک

نہیں کرتا۔ بلکہ اس میں صرف ریاستوں کی شمولیت کا طریق کار اور اس کے نتائج ظاہر کر دئے گئے ہیں۔ یہ ریاستوں کی مرضی پر ہے کہ چاہیں تو وفاق میں شامل ہوں نہ چاہیں تو نہ ہوں۔

وثیقہ شمولیت میں وہ تمام امور درج کر دئے جائیں گے جن پر کوئی والیے ریاست وفاقی حکومت کا اختیار تسلیم کرنے کے لئے رضامند ہوگا اور اس اختیار پر جو حد بندی وہ قائم کرنا چاہے گا وہ بھی معرض تحریر میں آجائے گی۔

ان وثیقوں کو تاج نامنظور کر دے گا جو اس کی رائے میں وفاق کے اصولوں کے منافی ہوں گے لیکن جب ایک مرتبہ وثیقہ قبول کر لیا جائے گا تو پھر وہ وفاقی حکومت کے عاملانہ اور قانون سازی کے اختیارات کے لئے فیصلہ کن لفظ بن جائے گا۔

وفاقی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جو ریاستیں وفاق میں اس وقت تک شامل نہ ہوئی ہوں گی وہ گورنر جنرل کی وساطت سے ملک معظم کی خدمت میں شمولیت کے لئے درخواستیں پیش کریں گی۔ مگر بیس برس کا عرصہ گذرنے کے بعد ایسی کوئی درخواست نہیں بھیجی جا سکے گی تاوقتیکہ وفاقی ایوان علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے یہ ایڈریشن نہ دیں کہ ملک معظم فلاں ریاست کو وفاق میں شامل کر لیں۔ ملک معظم کے وہ اختیارات جو گورنر جنرل مع کونسل ان کی طرف سے ریاستوں میں استعمال کرتا ہے فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد تاج کو منتقل ہو جائیں گے۔ گویا ایک طرف تو تاج کا تعلق برطانوی ہند اور وفاق سے ہوگا اور دوسری طرف ریاستوں سے۔ پہلے تعلق کے امور گورنر جنرل کے ذمے ہوں گے دوسرے کے نمائندہ ملک معظم کے سپرد ہوں گے۔ ملک معظم ایک ہی شخص سے دونوں کام بھی لے سکتا ہے۔

فیڈریشن کے قیام کے سلسلہ میں قانون حکومت ہند کی چند متعلقہ دفعات کا خلاصہ ذیل میں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دفعہ ۵ (۱) اگر پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ایک ایڈریس اس مضمون کا پیش کریں اور اگر وہ شرط جس کا ابھی ذکر کیا جائے گا پوری ہو جائے تو ملک معظم شاہی اعلان کے ذریعہ اس بات کو ظاہر

کر سکتے ہیں کہ فلاں تاریخ سے تاج برطانیہ کی ماتحتی میں فیڈریشن آف انڈیا کے نام سے مندرجہ ذیل کو متحد کیا جاتا ہے :-

(الف) صوبے جنھیں آئندہ سے گورنروں کے صوبے کہا جائے گا۔

(ب) ہندوستانی ریاستیں جنھوں نے فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کر لیا ہے یا جو بعد میں شامل ہونا قبول کریں گی۔ اور جو فیڈریشن اس طرح قائم ہو گی اس میں وہ صوبے بھی شامل ہوں گے جو آئندہ سے چیف کمشنر کے صوبے کہلائیں گے۔

(۲) جس شرط کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کریں :-

(الف) جن کے حکمراں کم سے کم ۵۲۔ اراکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے چننے کے مجاز ہوں اور

(ب) جن کی مجموعی آبادی کل ریاستوں کی آبادی کی کم سے کم نصف ہو۔

دفعہ (۶) (۱) جب ملک معظم کسی ریاست کے تیار کئے ہوئے دستاویز شرکت کو قبول کریں گے تو سمجھا جائے گا کہ وہ ریاست فیڈریشن میں شامل ہو گئی ہے۔

ریاست کے لئے فیڈریشن میں شامل ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ :-

(الف) ملک معظم، گورنر جنرل، فیڈرل لیجسلیچر، فیڈرل کورٹ اور دوسرے فیڈرل اداروں کو اپنے علاقہ میں ان فرائض کو پورا کرنے دے گی جنھیں وہ فیڈریشن کے سلسلہ میں اور دستاویز شرکت کے معاہدہ کے مطابق اس کے علاقہ میں انجام دینا چاہیں گے۔

(ب) اس پابندی کو قبول کرے گی کہ دستاویز شرکت کی حد تک قانون حکومت ہند کی دفعات کو اپنے علاقہ میں نافذ کرنے کی ضمانت کرے گی۔

(۲) دستاویز شرکت میں ان امور کو بیان کیا جائے گا جن کے بارے میں والی ریاست اس بات کو قبول کرے گا کہ فیڈرل لیجسلیچر اس کی ریاست کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور اس میں اگر ضرورت

سمجھی جائے گی تو ان حدود کا بھی ذکر ہو گا جس کی فیڈرل لیجسلیچر ریاست کے لئے قوانین بناتے وقت یا اپنے اختیارات عاملہ کو استعمال کرتے وقت پابند ہو گی۔

(۳) (دستاویز شرکت میں ترمیم کے بارے میں)

(۴) اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے، اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ ملک معظم کسی دستاویز شرکت یا اس کی ترمیم کو منظور کرنے کے لئے پابند ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ اس کو قبول کرنا مناسب خیال کریں یا یہ کہ اس دفعہ سے ملک معظم کو اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ وہ کسی ایسی دستاویز شراکت کو منظور کر سکتے ہیں جس کی شرائط اس ایکٹ میں درج کی ہوئی فیڈریشن کی اسکیم کے منافی ہوں۔

لیکن اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ اگر ملک معظم نے کسی دستاویز کی شرائط کو قبول کر لیا ہو تو فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد اس دستاویز کی یا اس کی شرائط کی صحت میں شبہ اور سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور اس ایکٹ پر عمل درآمد اس خاص ریاست کے لئے دستاویز شراکت کی شرائط کے مطابق ہی ہو گا۔

دفعہ (۷) | (۱) اس ایکٹ کی شرائط کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ملک معظم کی طرف سے گورنر جنرل براہ راست یا ماتحت افسروں کے ذریعہ انجام دے گا۔ لیکن اس دفعہ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل لیجسلیچر کو ماتحت افسروں کو اختیارات عطا کرنے سے منع کیا گیا ہے نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ ہندوستانی قانون نے جو حق کسی عدالت یا جج یا افسر کو یا کسی مقامی یا کسی دوسرے صاحب اقتدار شخص کو دے رکھا ہے وہ گورنر جنرل کو منتقل ہو جائے گا۔

دفعہ (۸) | (۱) اس ایکٹ کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:-

(الف) وہ تمام معاملات جن کے بارے میں فیڈرل لیجسلیچر کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہو (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ)

(ب) ملک معظم کی طرف سے بحری، بری اور ہوائی فوجوں کا بھرتی کرنا اور ملک معظم کی ان فوجوں

پر جن کا ہندوستان کی فوجوں میں شمار ہے حکومت کرنا۔

(ج) ان حقوق اور اختیارات کا استعمال جن کا قبائلی علاقوں کے لیے استعمال کرنے کا حق ملک معظم کو معاہدہ، عطیہ، رواج، رواداری یا کسی اور دوسرے طریقہ پر ملا ہوا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ

(ا) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو صوبوں کے ان معاملات پر نہیں ہے جن کے بارے میں صوبوں کی مجلس قانون ساز کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے۔

(اا) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاستوں کے معاملات پر نہیں ہے اور ان معاملات میں بھی جن کے لئے فیڈرل مجلس قانون ساز کو ریاست کے لئے قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے، اس اختیار کا استعمال ہر ریاست میں ان حدود کا پابند ہوگا جن کا ذکر وثیقہ شمولیت میں ریاست نے کیا ہوگا۔

(۲) اس ایکٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاست کے عاملانہ اختیار ان معاملات میں جن کے قوانین بنانے کا فیڈرل لیجسلیچر کو اختیار ہوگا حسب سابق باقی رہیں گے سوائے ان صورتوں کے جہاں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ایسے ہوں گے کہ وفاقی قانون کے مطابق ان سے ریاست کے حکمران کے اختیارات کا ازالہ ہو جائے گا۔

دفعہ (۹) گورنر جنرل کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے (سوائے ان صورتوں کے کہ جہاں وہ اس ایکٹ کے ماتحت اپنے فرائض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا) وزیروں کی ایک کونسل ہوگی جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے اس کی بنا پر گورنر جنرل کو کسی معاملہ میں جہاں اسے اس ایکٹ کے ماتحت اپنی انفرادی رائے کے استعمال کرنے کا حق دیا گیا ہے، انفرادی

رائے کے استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہوگی۔

دفعہ (۱۰) (۱) وزرا کا انتخاب اور ان کو طلب گورنر جنرل خود ہی کرے گا انھیں قسم بھی وہی دلائے گا اور جب تک اس کی خوشی ہوگی وہ انھیں اپنا وزیر بنائے رکھے گا۔

(۲) جو وزیر چھ مہینے تک مسلسل فیڈرل لیجسلیچر کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کا ممبر نہیں ہوگا وہ جب یہ مدت گذر جائے گی وزیر نہ رہ سکے گا۔

(۳) وزیروں کی تنخواہیں فیڈرل لیجسلیچر وقتاً فوقتاً مقرر کرتی رہے گی اور جب تک فیڈرل لیجسلیچر انھیں مقرر نہ کرے گی یہ کام گورنر جنرل کرتا رہے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ کسی وزیر کی تنخواہ اس کے دوران ملازمت میں بدلی نہیں جا سکتی۔

(۵) وزراء کے انتخاب، طلب اور برطرف کرنے اور ان کی تنخواہ کے مقرر کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی ذمہ داریاں اس کی اختیار تمیزی کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۱۱) اگرجوں کے معاملات، مدافعت اور معاملات خارجہ کے بارے میں (فیڈریشن اور ملک معظم کے ڈومینینس سے باہمی تعلقات کو چھوڑ کر) گورنر جنرل اپنے فرایض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے بارے میں بھی وہ اپنے فرائض اور تعلق کو اسی طرح پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۲) (۱) اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی مندرجہ ذیل خاص ذمہ داریاں ہوں گی:-

(الف) ہندوستان کے امن وامان کو برہم کرنے والے خطروں کا تدارک

(ب) فیڈرل گورنمنٹ کے مالی استحکام اور اعتبار کا تحفظ

(ج) اقلیتوں کے جایز مفاد کا تحفظ

(د) جو لوگ پبلک سروسوں میں ہیں یا رہ چکے ہیں ان کے یا ان کے متعلقین کے ان حقوق کی ضمانت جو اس ایکٹ کے ماتحت انھیں دیئے یا ان کے لئے محفوظ کئے گئے ہیں اور ان کے قانونی

مفاد کا تحفظ۔

(ھ) سلطنت متحدہ میں آباد برطانوی رعایا کے خلاف اگر کوئی نقصان رساں امتیازی برتاؤ کیا جائے تو اس کا تدارک عاملانہ اختیارات سے کرنا۔

(و) سلطنت متحدہ برطانیہ یا برما سے برآمد ہونے والے مال کے خلاف اگر امتیازی یا تعزیری محصول لگائے جائیں تو ان کا تدارک کرنا۔

(ز) ہندوستانی ریاستوں کے حقوق اور ان کے حکمرانوں کے حقوق و اعزازات کا تحفظ کرنا۔

(۲) جہاں کہیں گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کا سوال پیدا ہوگا گورنر جنرل اپنے فرائض کو اپنی انفرادی رائے کے مطابق پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۸) (۱) ایک فیڈرل لیجسلیچر ہوگی جس میں ملک معظم کی نمایندگی گورنر جنرل کریں گے اور دو ایوان ہوں گے جنھیں کونسل آف اسٹیٹ اور فیڈرل اسمبلی کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

(۲) کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہندوستان کے ۱۵۶ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۰۴ نمایندوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہندوستان کے ۲۵۰ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۲۵ سے زیادہ نمایندہ نہیں ہوں گے۔

(۳) برطانوی ہندوستان کے نمایندے کو رائے دینے کی اہلیت رکھنے والے لوگ اس ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ اول کے مطابق منتخب کرکے بھیجیں گے۔ ریاستوں کے نمایندوں کا انتخاب اور تقرر ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ دوم کے مطابق کیا جائے گا۔

دفعہ (۹۹) اس ایکٹ کے اندر رہتے ہوئے فیڈرل لیجسلیچر تمام ہندوستان یا اس کے ایک حصہ یا فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور صوبہ کی لیجسلیچر صرف صوبہ یا اس کے ایک حصہ کے لئے بنا سکتی ہے۔

دفعہ (۱۰۰) (۱) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا اختیار ان تمام معاملات کے بارے میں ملا ہوا ہے

جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی پہلی فہرست میں کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ ۲۵۰

(۲) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا حق صوبوں کے ساتھ ان مشترکہ معاملات کے بارے میں بھی ملا ہوا ہے جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی تیسری فہرست میں کیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۰۱) | اس ایکٹ کی کسی بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل لیجسلیچر کو فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے وثیقہ شراکت کے علاوہ اور دوسرے معاملات کے لئے بھی قانون بنانے کا حق ملا ہوا ہے۔

دفعہ (۱۲۲) | صوبہ اور فیڈریشن میں عاملانہ اختیارات کو اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ ان سے فیڈرل لیجسلیچر کے قوانین کے لئے ان صوبوں اور ریاستوں میں جن میں یہ نافذ کئے جائیں عزت اور احترام پیدا ہو۔

دفعہ (۱۲۵) | (۱) والیان ریاست یا ان کے افسروں کو فیڈرل لیجسلیچر کے ان قوانین کو جو معاہدے یا ریاست کے وثیقہ شراکت کی رو سے ان کی ریاست کے لئے بنائے جا سکتے ہیں اپنے علاقہ میں نافذ کرنا ہوگا۔

(۲) اس دفعہ کے ماتحت جو معاہدے ہوں گے ان میں گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی دیا جائیگا کہ وہ اپنے اختیار تمیزی سے اس بات کی طرف سے اپنا اطمینان کرتا رہے کہ ریاست میں جس قانون کے نافذ کیے جانے کا معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل درآمد فیڈرل حکومت کی پالیسی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر اسے اطمینان نہ ہو تو اپنے اختیار تمیزی سے کام لیتے ہوئے وہ ایسی ریاست کے نام جن ہدایتوں کو ضروری اور مناسب سمجھے روانہ کر سکتا ہے۔

دفعہ (۱۲۸) | (۱) ہر فیڈریشن میں شریک ریاست اپنے عاملانہ اختیارات کا استعمال اس طرح کرے گی جس سے فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کو جہاں تک وہ فیڈرل لیجسلیچر کے مطابق اس ریاست میں جاری کئے جا سکتے ہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

(۲) اگر گورنر جنرل کو یہ معلوم ہو کہ فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کا رئیس اپنے فرائض کو پورا

نہیں کر رہا ہے تو گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر والی ریاست کی معروضات سننے کے بعد اس کے نام جو مناسب سمجھے ہدایتیں جاری کر سکتا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کا مسئلہ بجائے خود بحث میں آجائے تو اس صورت میں یہ معاملہ فیڈریشن یا والئی ریاست کی طرف سے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ (۲۰۵) اس ایکٹ میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کی بنا پر ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کی جو ذمہ داریاں یا حقوق ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آتا البتہ فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے لئے یہ حقوق اور ذمہ داریاں ان ریاستوں کے وثیقہ شرکت کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۲۰۶) (۱) اگر ملک معظم کے نمائندہ کو ریاستوں سے متعلق اپنے فرائض منصبی پورا کرنے کے سلسلہ میں مسلح فوجوں کی امداد کے لئے درخواست کرنا پڑے گی تو گورنر جنرل کا فیڈریشن کے عامل کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں یہ فرض ہوگا کہ اس درخواست کے مطابق مسلح فوجوں کا استعمال کرے۔ لیکن ان فوجوں کو اس طرح استعمال کرنے کے سلسلہ میں جو خالص زاید خرچ ہوگا اسے ملک معظم کا وہ خرچ سمجھا جائے گا جو تاج برطانیہ کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں کیا گیا۔

(۲) گورنر جنرل اس دفعہ کے ماتحت اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے اپنے اختیار تمیزی سے کام لے گا۔

دفعہ (۲۰۷) ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کے جو فرائض ہیں ان کے بارے میں ملک معظم کا نمائندہ یہ انتظام کر سکتا ہے کہ صوبہ کے گورنر اور اس کے وہ افسر جو صرف صوبہ کے معاملات کے سلسلہ میں کام کرتے ہیں تاج برطانیہ کے مندرجہ بالا فرائض کو بھی انجام دینے لگیں۔

ضمیمہ

قانون حکومت ہند کی وفاقی مدات

(۱) ملک معظم کی بری، بحری اور فضائی افواج جن کے خرچ کا بار ہندوستان کے فوجی محکمہ کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اور ایسی افواج جن کی بھرتی ہندوستان میں کی جائے لیکن اس میں وہ فوجیں جو ہندوستانی ریاستوں یا صوبہ کی حکومتوں کی مسلح پولس کے لئے بھرتی کی جائیں شامل نہ ہوں گی ـــــ اس کے علاوہ تمام ایسی مسلح افواج جو ملک معظم کی افواج تو نہیں ہیں لیکن جو ملک معظم کی ان بحری، بری اور فضائی افواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کا خرچ ہندوستان کا فوجی محکمہ برداشت کرتا ہے ـــ مرکزی محکمہ تفتیش۔ مدافعت، معاملات خارجہ یا دیسی ریاستوں کے سلسلہ میں فرائض منصبی کو پورا کرنے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر لوگوں کو حراست میں رکھنا۔

(۲) بحری، بری اور فضائی افواج کے لئے سرکاری تعمیرات ـــ چھاؤنیوں کی لوکل سلف گورنمنٹ (اس میں ہندوستانی ریاستوں کے چھاؤنیوں کے علاقہ شامل نہیں ہیں) ـــ ان علاقوں میں اور برطانوی ہندوستان میں مکانوں کی گنجائش کی نگرانی کرنا اور ان علاقوں کی حدبندی کرنا۔

(۳) خارجی معاملات۔ دوسرے ملکوں سے معاہدے اور سمجھوتے کرنا ـــ ملک سے خارج کرنا جس میں ملک معظم کے دوسرے مقبوضات کے مجرموں کا حوالہ کرنا بھی شامل ہے۔

(۴) گرجے کے معاملات جس میں یورپینوں کے قبرستان بھی شامل ہیں۔

(۵) کرنسی، سکہ سازی اور زر قانونی۔

(۶) فیڈریشن کا قرضہ عامہ۔

(۷) ڈاک اور ٹیلیگراف جس میں ٹیلیفون، وائرلیس، براڈ کاسٹنگ اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع رسل و رسائل بھی شامل ہیں۔ ڈاک خانہ کے سیونگس بنک۔

(۸) فیدریشن کی سرکاری ملازمتیں اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن

(۹) وفاقی پنشنیں یعنی ایسی پنشنیں جو فیڈریشن کی طرف سے واجب الادا ہوں گی یا فیڈریشن کی آمدنی سے ادا کی جائیں گی۔

(۱۰) تعمیرات، زمینیں، مکانات جو ملک معظم کے قبضہ میں فیڈریشن کے سلسلہ میں ہوں گے (یہ بحری، برّی، اور ہوائی فوج کی تعمیرات کے علاوہ ہوں گے) لیکن جو جائداد صوبہ میں واقع ہوگی وہ صوبہ کے قانون کی پابند ہوگی سوائے اس صورت کے کہ فیڈریشن اس کے بارے میں اپنا کوئی قانون خاص طور پر بنائے۔ رہیں فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی ایسی جائدادیں جن پر پٹہ یا معاہدہ کی بنا پر قبضہ کیا گیا ہے سو وہ پٹہ یا معاہدہ کی شرائط کی پابند ہوں گی۔

(۱۱) امپیریل لائبریری، انڈین میوزیم۔ امپیریل جنگی میوزیم۔ وکٹوریہ میموریل یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ جس کی نگرانی اور خرچ فیڈریشن کے ہاتھ میں ہو۔

(۱۲) مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے جو فیڈرل ایجنسیاں اور ادارے قائم کیے جائیں :۔
یعنی تحقیقات علمی، پیشہ اور فن کی تعلیم یا خاص علوم کی ترقی کے لئے۔

(۱۳) بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

(۱۴) سروے آف انڈیا۔ جیولوجیکل، بوٹانیکل اور زوآلیجکل سرویز آف انڈیا۔ فیڈرل میٹی اورولاجیکل محکمے۔

(۱۵) قدیم اور تاریخی آثار۔ آثاری مقامات اور باقیات

(۱۶) مردم شماری

(۱۷) ہندوستان میں داخلہ، ترک سکونت یا اخراج اس میں ان لوگوں کی نقل و حرکت

کی نگرانی بھی شامل ہے جو ہندوستان میں سکونت کی وجہ سے برطانوی رعایا نہیں بن سکے ہیں جو فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی رعایا ہیں یا جو سلطنت متحدہ میں سکونت رکھنے والی برطانوی رعایا ہیں۔ ہندوستان سے باہر کے ملکوں کی زیارت اور حج۔

(۱۸) بندرگاہ کا قرنطینہ۔ ملاحوں کے اسپتال اور بندرگاہوں کے قرنطینہ سے متعلق اسپتال۔

(۱۹) کروڑگیری کے ان حدود کے اندر و باہر درآمد و برآمد جن کی تعریف و تحدید فیڈرل گورنمنٹ کردے۔

(۲۰) وفاقی ریلیں۔ بہت چھوٹی ریلوں کو چھوڑکر باقی سب ریلوں میں مندرجہ ذیل باتوں کی نگرانی:۔ تحفظ جان و مال کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کرایہ اور محصول۔ اسٹیشن اور سروس ٹرمنل کے محاصل۔ مسافر اور مال کا منتقل کرنا۔ مسافر اور مال کے لئے ریلوے کے منتظموں کی ذمہ داری۔ چھوٹی ریلوں کے لئے تحفظ جان و مال اور ان ریلوں پر سفر کرنے والے مسافروں اور مال کے لئے منتظموں کی ذمہ داری۔

(۲۱) سمندری سفروں کے لئے جہازوں کو بھرنا اور جہازرانی جس میں جوار بھاٹے کی امید پر جہاز بھرنا اور جہازرانی کرنا بھی شامل ہے۔ محکمہ بحر کے اختیارات کے حدود۔

(۲۲) بڑی بندرگاہ یعنی اس بندرگاہوں کی حد بندی اور ان کے بااختیار افسروں کے اختیارات اور دستور کا تعین۔

(۲۳) آبی حدود سے باہر ماہی گیری اور ذخائر ماہی

(۲۴) فضائی بیڑہ اور فضائی جہازرانی۔ ایروڈروم کا قائم کرنا۔ فضائی آمدورفت اور ایروڈروم کی نگرانی۔

(۲۵) روشنی کے مینارے جس میں روشنی کے جہاز، اشارہ کرنے والی روشنیاں اور بحری ہوائی جہازوں کے تحفظ کے لئے دوسرے انتظامات شامل ہیں۔

(۲۶) ہوا اور سمندر میں مسافروں اور مال کا لے جانا

(۲۷) کاپی رائٹ، ایجادیں، ڈیزائن، ٹریڈ مارک اور مال کے امتیازی نشانات

(۲۸) چک، ہنڈیاں، پرامیسری نوٹ اور اسی طرح کے دوسرے آلات اعتبار

(۲۹) ہتیار، آتشین ہتیار، بارود۔

(۳۰) پھٹنے والی چیزیں۔

(۳۱) افیون جہاں تک اس کی کاشت کا افیوں سازی کا یا برآمد کے لئے فروخت کرنے کا تعلق ہے۔

(۳۲) پٹرولیم اور دوسرے مائیات اور اشیا جن کو خطرناک حد تک آتشگیر سمجھا جاتا ہے جہاں تک ان کے قبضے، ذخیرہ رکھنے اور منتقل کرنے کا تعلق ہے۔

(۳۳) کارپوریشنز یعنی تجارتی کمپنیوں کا بنانا، ان کی نگرانی اور ان کے کاروبار کو ختم کرنا۔ اس میں ساہوکارے، بیمہ اور کاروبار کے لئے روپیہ فراہم کرنے والی کمپنیاں شامل ہیں۔ لیکن فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی وہ کمپنیاں شامل نہیں ہیں جو ریاستوں کی نگرانی اور ملکیت میں ہیں اور جن کا کاروبار صرف ریاست کے اندر محدود ہے۔ یا امداد باہمی کی انجمنیں اور ایسی کمپنیاں جو تجارتی ہوں یا نہ ہوں جن کے مقاصد صرف ایک واحد تک محدود نہیں ہیں۔

(۳۴) صنعتوں کی ترقی اگر فیڈرل قانون کے ذریعہ صنعتوں کو ترقی دینا مفاد عامہ کے مصالح کے مطابق سمجھا جائے۔

(۳۵) معدنوں اور تیل کے چشموں کی حفاظت اور ان کے مزدوروں کی نگرانی۔

(۳۶) معدنوں اور تیل کے چشموں اور معدنی ترقی کی نگرانی جس حد تک مفاد عامہ کے پیش نظر اور فیڈرل قانون کے ماتحت ان کو فیڈرل نگرانی میں لانا مصلحت کے مطابق ہو۔

(۳۷) بیمہ کے بارے میں قانون اس بیمہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جسے فیڈریشن میں شریک ریاستیں انجام دیں۔ بیمہ کے کاروبار کی نگرانی فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے کاروبار کو مستثنیٰ کرنے کے بعد۔ سرکاری بیمہ اس بیمہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جو فیڈریشن میں شریک ریاستیں کریں یا جسے

صوبوں میں پراونشل قانونی فہرست میں شامل کرکے یا دونوں قانونی فہرستوں میں بہ یک وقت شامل کرکے صوبوں کی طرف سے کیا جائے۔

(۳۸) ساہوکارہ یعنی کمپنیوں کی طرف سے جو ساہوکارے کا کاروبار کیا جائے اس سے وہ کمپنیاں مستثنےٰ ہیں جن کی نگرانی یا ملکیت فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو حاصل ہے اور جو صرف ان ریاستوں کی حدود کے اندر ہی اپنا کام کرتی ہیں۔

(۳۹) کسی دوسرے گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ میں برطانوی ہندوستان کے کسی حصّہ کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع لیکن اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ کسی ایک حصہ کی پولس دوسرے حصہ میں اس صوبہ کی حکومت یا چیف کمشنر کی مرضی کے بغیر اپنے حدود اور اختیارات کو وسعت دے سکے۔ ایک واحدے کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع ریلوے کے علاقوں کے دوسرے واحدوں تک۔

(۴۰) اس قانون اور اس کے ضمن میں جو دوسرے آرڈر ان کونسل بنائے جائیں ان کی نگرانی میں وفاقی مجلس قانون ساز کے انتخابات۔

(۴۱) وفاقی وزراء کونسل آف اسٹیٹ کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، فیڈرل اسمبلی کے اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کی تنخواہیں۔ فیڈرل مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تنخواہیں، بھتے اور حقوق۔ اور جہاں تک اس قانون کا حصہ دوم اجازت دیتا ہے ان اشخاص کو سزا دینا جو مجلس قانون ساز کی کمیٹیوں کے سامنے شہادت دینے یا دستاویزیں پیش کرنے سے انکار کریں۔

(۴۲) اس فہرست میں جو امور درج ہیں ان کی خلاف ورزی کے الزامات

(۴۳) فہرست میں جو امور درج ہیں ان کے سلسلہ میں تحقیقاتیں اور اعداد و شمار

(۴۴) کروڑ گیری کے محاصل جس میں برآمد کے محاصل بھی شامل ہیں

(۴۵) تمباکو اور دوسری اشیار پر جو ہندوستان میں بنائی جائیں یا پیدا کی جائیں محاصل اکسایز لیکن ان میں مندرجہ ذیل شامل نہیں ہیں :-

(i) الکوہل کے ایسے مخمر دبات جو انسانی صرف کے لئے تیار کئے جائیں
(ii) افیوں، بھنگ اور دوسری نشہ آور دوائیں اور منشیات اور غیر نشہ آور دوائیں
(iii) دوا اور سنگار کے لئے ایسی تیار کی ہوئی چیزیں جن میں الکوہل موجود ہو یا ایسی کوئی چیز ہو جس کا اوپر (ii) میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۴۶) کارپوریشن ٹیکس

(۴۷) نمک

(۴۸) سرکاری لاٹریاں

(۴۹) نیچورالائیزیشن

(۵۰) ہندوستان کے اندر کسی ایک گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ سے دوسرے صوبہ کے لئے نقل سکونت

(۵۱) اوزان کے معیار کا تعین

(۵۲) رانچی کا یورپینوں کے لئے دماغی ہسپتال

(۵۳) فہرست میں درج کئے ہوئے جملہ امور کے بارے میں وفاقی عدالت کے علاوہ باقی تمام عدالتوں کے حدود اور اختیارات کا تعین اور اس حد تک جس کی قانون کے نویں حصہ میں صراحت کے ساتھ اجازت ہے وفاقی عدالت کے حدود کی توسیع اور اس کو مزید اختیارات کا عطا کرنا۔

(۵۴) زراعتی آمدنی کے علاوہ باقی تمام آمدنیوں پر محصول

(۵۵) زراعتی زمین کو چھوڑ کر افراد اور کمپنیوں کی باقی تمام جایدادوں کی قیمت پر محصول۔ کمپنیوں کے سرمایہ پر محصول۔

(۵۶) زراعتی زمین کے علاوہ باقی سب طرح کے ترکہ اور وراثت پر محصول

(۵۷) ہنڈیوں، چیکوں، پرامیسری نوٹ، بل آف لیڈنگ، اعتبار ناموں، بیمہ کی پالیسیوں، عیوضی

اور رسیدوں پر اسٹامپ کے محاصل کی شرحیں۔

(۵۸) ریل یا ہوا سے جو مسافر یا مال لے جائے جائیں ان پر ٹرمنل ٹیکس۔ ریلوی محصولوں اور کرایوں پر محصول۔

(۵۹) اس فہرست میں درج کئے ہوئے امور پر فیس لیکن اس میں عدالت کی فیسیں شامل نہیں ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا

(از جناب محمد سرور صاحب استاد تاریخ و اسلامیات جامعہ)

(یہ مضمون اس جلسہ میں سنایا گیا تھا جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تعزیت کے لئے جامعہ میں منعقد کیا گیا تھا)

پرسوں جمعرات کی صبح کو ایک طویل علالت کے بعد غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے انتقال فرمایا، ان کی موت کا صدمہ کون ہے جس نے محسوس نہ کیا ہو، ان کے عقیدت مند، ان کے بہت سے کاموں کو سراہنے والے اور بعض پر اعتراض کرنے والے ان کے مخالفین اور ان کے سخت دشمن سب کے سب اس حادثہ سے متاثر ہیں، کوئی زیادہ متاثر ہے اور کوئی کم، دنیا کے حالات سے خبر رکھنے والا کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جس نے مصطفےٰ کمال پاشا کی وفات کی خبر سنی ہو اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کا نقشہ نہ کھچ گیا ہو، مصطفےٰ کمال کو ماننے والے بہت سے تھے اور ان کو ناپسند کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن مرحوم کی بڑائی یہ ہے کہ ان کے دوست تو عقیدت کیش تھے ہی ان کے سخت سے سخت دشمن بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں ان کے کام اہم تھے اور بڑے کاموں کا انکار مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ صفت ہے جس کے کمال کا مظہر مصطفےٰ کمال کی ذات ہے۔

مصطفےٰ کمال پیدا ہوئے تو ترکی قوم مر رہی تھی۔ ان کی پرورش کا زمانہ قوم کی زندگی اور موت کی کشمکش میں گذرا جوان ہوئے تو قوم اس جان ہار کشمکش سے نڈھال ہو کر موت کی راہ تک رہی تھی اس نازک وقت میں مصطفےٰ کمال نے قوم کو سنبھالا اس کے مردہ جسم میں نئی روح ڈالی اس کی موت کو زندگی سے بدلا، اور نئی روح کو نیا قالب دیا، وہ بوڑھی قریب المرگ قوم اب جوان ہے اور آج جب وہ مر گئے تو اپنے پیچھے ایک زندہ اور توانا قوم چھوڑ گئے ہیں۔

عثمانی ترک ریوڑ چراتے چراتے بادشاہ بن گئے۔ سلطان سلیم اور سلیمان کا دوران پر ایسا بھی گزرا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی سات زمین اور سات سمندران کے قبضہ میں تھے زمانہ بدلا تو یہ بھی بدل گئے سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی۔ علم و تدبیر کے مالک خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے، عوام بے چارے بے زبان تھے۔ حکومت نا اہلوں کے ہاتھ میں تھی ظلم و جبر جس کا شعار تھا اور کمزور بری طرح پیسے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں وطن پروروں کی ایک جماعت نے اپنی قوم کی بری حالت کو درست کرنے کی کوشش کی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کی مساعی کامیاب ہوگئیں، لیکن جب سلطان خلیفہ بنا تو اس نے اپنے ان دوستوں کی قیود کو گراں جانا اور ایک ایک کر کے اصلاح کے سب کام روک دئے اور وطن پروروں کے لیڈر مدحت پاشا کو بری طرح قتل کرا دیا۔ اس کے بعد یہ ظالم سلطان ۳۳ برس تک برسر اقتدار رہا اس طویل زمانہ میں کون ظلم تھا جو اٹھا نہ رکھا گیا ہو، ضمیر و زبان کی آزادی جرم تھی۔ رشوت اور خوشامد حکومت کا دستور تھا نا اہل لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے قتل ہوتے یا جلا وطن۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ آزادی پیدا کرنے والی کتابیں ملک میں نہ آ سکتی تھیں۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی اس گری ہوئی حالت کو دیکھ کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے، مصر برطانیہ نے دبا لیا، ٹیونس فرانس نے بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہوگئیں۔ روس آئے دن قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا تھا۔ خود سلطنت کے اندر جو عیسائی اقلیتیں تھیں وہ یورپی حکومتوں کی شہ پا کر ہر وقت آمادۂ فساد رہتی تھیں۔ سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ قرضے لے لے کر حکومت کا کاروبار چلایا جاتا۔ اور ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سونپ دیا جاتا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو اجنبی آباد تھے وہ ملک کے قوانین سے بالا تھے۔ ان کی سرزمین نہ ترکی پولیس روک سکتی تھی اور نہ ترکی حکومت وہ ٹیکسوں سے محفوظ تھے اور اگر ان میں سے کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچ جاتی تو اس کی حکومت ترکی کو اعلان

جنگ دیئے پر اتر آتی۔ استبداد اور ذلت کی اس سے بڑھ کر کونسی حد ہو سکتی ہے۔ سلطان عبدالحمید کے یہ تو مظالم تھے لیکن وہ ظل اللہ کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ محراب منبر سے اس کی درازئ عمر کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، مذہبی طبقے ان مظالم کی تائید میں تھے اور اطاعتِ خلیفہ کو اطاعت اللہ قرار دیتے تھے۔

اس ظلم و جور ذلت اور بے بسی کی فضا میں مصطفےٰ کمال نے آنکھیں کھولیں باپ کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اٹھ گیا تھا ماں نے مذہبی تعلیم دلوانے کی کوشش کی لیکن مصطفےٰ کمال کی سرکش طبیعت استاد کی سختی کی متحمل نہ ہو سکی چنانچہ وہ بھاگ نکلا کچھ زمانہ ننھیال میں آوارگی میں گذرا پھر ایک فوجی مدرسہ میں داخلہ ہوا اور بھگوڑا طالب علم اس مدرسہ میں آکر سب سے قابل اور محنتی بن گیا مدرسہ سے فارغ ہو کر مصطفےٰ قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں پہنچا اور اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں میں نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

نوجوان مصطفےٰ نے عجیب طبیعت پائی تھی اپنے ساتھیوں سے بہت کم تعلق رکھتا تھا اکثر خاموش رہتا سرکشی کا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا نہ کسی کو دوست بنانا پسند کرتا اور نہ کسی کا دوست بنتا۔ ریاضی سے بہت لگاؤ تھا زندگی کے ہیجانی لمحوں میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا۔ لیکن واقعیت پسند کو جذبات کی یہ حرکت اچھی نہ لگتی بے چینی کا زمانہ تھا نوجوان کے خیالات میں انقلاب ہو رہے تھے، حکومت کی سختیاں اس انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے کا کام کر رہی تھیں۔ نوجوان گروہ ملک کی تباہی اور قوم کی ذلت سے بیزار اور اصلاحِ حال کے لئے بے قرار تھا باتیں قانون نے بند کر دی تھیں لیکن دلوں پر بہر حال پابندیاں عائد نہ کی جا سکتی تھیں۔ برملا بات کہنے کی اجازت نہ تھی لیکن چوری چھپے کی سرگوشیوں کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ جہاں چند پڑھے لکھے جمع ہو جاتے قوم کی بدحالی اور حکومت کے ظلم و جور کا ذکر ہوتا سازشیں کی جاتیں خفیہ جماعتیں بنتیں اور انقلاب ان تمام روگوں کا علاج تجویز کیا جاتا قسطنطنیہ کا فوجی کالج بھی اس رو سے نہ بچ سکا۔

مصطفےٰ کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ان خفیہ جماعتوں سے ہوا وہ اور اس کے ساتھی اساتذہ کی نظر سے دور انقلاب کے منصوبے سوچتے تجویزیں بناتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی طرحیں ڈالتے

تھے ان کی یہ سرگرمیاں بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکیں اور راز فشا ہوگیا مصطفےٰ اور اس کے ساتھی پکڑے لیے گئے۔ مقدمہ چلا قصور ثابت تھا سلطان نے رحم کھایا کسی سخت سزا دینے کے بجائے اسے وطن سے دور کر دیا۔ فوج میں لفٹننٹ بنا کر دمشق بھیج دیا۔ یہاں آکر اسے اپنی سیاسی جدوجہد کے لیے زیادہ آزادی ملی۔ وطن نامی انجمن بنائی گئی اور فوج کے نوجوان افسروں کو اس میں شریک کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مصطفےٰ سلطنت کے یورپی صوبہ سالونیکا میں گیا حکومت کے جاسوسوں کو بھی اس کی خبر مل گئی اور مصطفےٰ بڑی مشکل سے گرفتار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ بعد یہ دمشق سے تبدیل ہوکر سالونیکا پہنچ گئے جو اس وقت انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا اور مصطفےٰ کمال انجمن اتحاد وترقی کے سرگرم رکن بن گئے اور انور اور جمال کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں انجمن اتحاد وترقی نے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کرے پارلیمنٹ بنائی گئی۔ اور ترکی نے استبداد کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا۔ عبدالحمید نے اپنا اقتدار بحال کرنے کی پھر کوشش کی تو انھیں معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ بوڑھے سیاست داں برطرف ہوئے۔ اور انجمن ترقی واتحاد کے نوجوان سلطنت کی باگ ڈور کے مالک بنے۔

یہ نیا دور شروع ہی ہوا تھا کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا ترک بے بس تھے فوج کی کوئی کل درست نہ تھی سمندری بیڑہ بھی نہ تھا کہ طرابلس کو مدد بھیجی جا سکتی۔ انور اور مصطفےٰ کسی نہ کسی طرح کر کے طرابلس پہنچے۔ عربوں کی مدد سے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی لیکن یہ جنگ شروع ہی تھی کہ بلقانی ریاستوں نے قسطنطنیہ پر ہلہ بول دیا ترک تیار نہ تھے لڑے تو وہ ضرور لیکن ہر محاذ پر شکست کھائی جن پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں سے ترکوں نے ذلتوں پر ذلتیں اٹھائیں ہزاروں گھر تباہ ہوئے ترک آبادی تلوار اور آگ کی مدد سے بلقان سے ختم کی گئی انور اور مصطفےٰ طرابلس سے واپس وطن پہنچے اور ترکی کے تاریخی شہر ایڈریانوپل کی شکست سے جو دھبہ لگا تھا کم سے کم ان دونوں کی ہمتوں کو اس کی کالک کو دور کرنے میں بڑا کام کیا آخر بڑی مشکلوں کے بعد جنگ کی آگ بجھائی۔ اب سلطنت کی سیاہ وسپید کے مالک انور طلعت اور جمال تھے نام کو پارلیمنٹ تھی لیکن دراصل سلطنت

کے بہ تینیں کرتا دھرتا ہے انھوں نے مصطفےٰ کمال سے جان بوجھ کر اعراض برتا اور اسے صوفیا کی ترکی سفارت کے ساتھ ملحق کر دیا۔ مصطفےٰ جیسی سرکش طبیعت اس حق تلفی کو کیوں محسوس نہ کرتی۔ لیکن ملک میں انور طلعت اور جمال کی ہوا بندھ گئی تھی اور قوم ان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ سرکش طالب علم جو ملّا کی سختی سے بھاگا تھا جس کو سلطان عبدالحمید کے مظالم نے کالج ہی میں باغی بنا دیا تھا اور جس نے فوجی افسر ہونے کے بعد اس انقلابی تحریک کو اپنی جان پر کھیل کر منظم کیا تھا اور پھر طرابلس اور بلقان میں بہت سے معرکے سر کئے تھے اب اپاہج بنا کر صوفیہ میں ڈال دیا گیا۔ سرکشی۔ بغاوت، بے چینی اقدام ہمت اور ولولوں کے جذبات کی تسکین سے محروم ہو کر معلوم نہیں مصطفےٰ کمال کے دل میں ان تینوں کے خلاف نفرت اور بغض کی آگ کتنی سخت بھڑکی ہوگی پنجرہ میں بند شیر غصہ میں آکر کیا کچھ نہیں کرتا۔ مصطفےٰ کمال کو دل کی یہ آگ کسی نہ کسی طرح سے ٹھنڈی کرنی ہی پڑی۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا مصطفےٰ کمال انور سے خفا تھے جرمنوں سے انھیں نفرت تھی۔ جنگ زوروں پر ہو رہی تھی اور مصطفےٰ کمال تھے کہ بے بس دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ حکومت کو انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور دوستوں سے بھی کہلوایا۔ لیکن انور جو اب وزیر جنگ تھے انھیں صوفیہ ہی میں رکھنے پر مصر رہے ۱۹۱۵ء میں مصطفےٰ کمال سخت بیمار ہوئے، موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار قسطنطنیہ پہنچے بیماری وہی تھی جس نے آج ۲۳ برس کے بعد ان کی جان لے کر چھوڑی قسمت اچھی تھی موت کے منہ سے بچ نکلے اور صحت یاب ہوئے تو انھیں درہ دانیال کی حفاظت پر معین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں اور اگر ان کا یہ حملہ کامیاب ہوتا تو جنگ ۱۹۱۵ء ہی میں ختم ہو جاتی۔ ترکی کے راستے روس کو اپنے حلیفوں سے مدد مل جاتی تو وہ یوں اتنی آسانی سے جرمنی کے ہاتھوں نہ مرتا ادھر فرانس کے محاذ پر جرمن فوجوں کا زور کم ہو جاتا اور لڑائی ۱۹۱۸ء تک طول نہ کھینچتی مصطفےٰ کمال کی بے نظیر شجاعت اور مہارت کیا تھی ایک معجزہ تھا کہ ترکوں کی بے بس اور تھکی ہوئی قوم نے دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کو شکست دی اور انگریزوں کو مجبوراً درہ دانیال سے پسپا ہونا پڑا۔ اب ترکی کے بچے بچے کی زبان پر مصطفےٰ کمال کا نام تھا۔ لیکن حکومت کے

مختار مطلق اپنے اس حریف کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن اب جرمنوں کے قدم پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ ترک ہر محاذ پر شکست کھا رہے تھے عربوں نے بغاوت کر دی تھی عراق اور فلسطین کی طرف سے برطانوی فوجیں بڑھی چلی آ رہی تھیں انور کے تمام منصوبے ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے مصطفےٰ کمال کو پروانہ ملا کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جاؤ۔ یہ سمجھ گئے کہ حریف درہ دانیال کے عظمت کے چاند کو اس شکست سے گہن لگانے کے درپے ہیں فلسطین پہنچے تو حالت دگرگوں ہو چکی تھی دشمن کا روکنا ناممکن ہو گیا تھا انھوں نے ادھر ادھر سے ہٹنا شروع کیا فلسطین چھوڑا دمشق چھوڑا حلب کے ایک دروازے سے نکلے تو دوسری دروازے سے انگریزی فوجیں اور باغی عرب داخل ہوئے۔ فتح کے نشے میں سرمست ہو کر آگے بڑھ جانا آسان ہے لیکن پے در پے شکستوں اور پیہم پسپائیوں کے بعد فوج کے اوسان بحال رکھنا مصطفےٰ کمال ہی کا کام تھا پیچھے ہٹتے ہٹتے یہ موجودہ ترکی کی سرحد پر پہنچ گئے اس جگہ پہنچ کر انھوں نے کہا کہ اب کوئی قدم پیچھے نہیں اٹھے گا وطن مقدس کی سرزمین دشمنوں کے قدموں سے ناپاک نہیں ہونے دی جائے گی لیکن اس وقت عارضی صلح کا اعلان ہوا جنگ رک گئی اور مصطفےٰ کمال واپس قسطنطنیہ بلائے گئے

سلطان وحید الدین نے اپنے بچاؤ کے لئے برطانیہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ دشمنوں کی ظفرمند فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ اور ان کے جنگی جہاز ابنائے باسفورس میں لنگر انداز تھے قوم صدیوں کی جنگ سے پہلے ہی بدحال تھی اس چار برس کی مصیبت نے اس کی زندگی کا آخری خطرہ تو وہ بھی ختم کر ڈالا ہر طرف مایوسی تھی بڑے بڑے ہمت ہار چکے تھے انجمن اتحاد و ترقی کا تو کوئی نام لینے والا بھی نہ تھا۔ پرانے عافیت پسند سیاست داں پھر برسر اقتدار آئے تھے مصطفےٰ کمال نے سلطان وحید الدین کا دل ٹٹولا لیکن وہ راضی بہ تقدیر ہو چکے تھے پرانے سیاست دانوں کو سمجھایا کہ یوں ہمت ہار دینا ترکی کو دشمنوں کا تر نوالہ بنا دینا ہے عارضی صلح سے مطمئن ہو کر خاموش بیٹھ جانا دشمنوں کو نگل جانے کی دعوت دینا ہے لیکن ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ لیکن نوجوان موجود تھے جن کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا۔ مصطفےٰ نے ان لوگوں کو یک جا کیا۔ ان کی آگ کو ہوا دی یہ نوجوان سر جوڑ کر بیٹھے اور قوم کو موت

سے بچانے کے لئے دار و سوچنے لگے۔ مصطفےٰ کمال کے دل میں تو یہ خیالات تھے لیکن ان کی زبان بالکل بند تھی سلطان نے ان کی خاموشی سے دھوکا کھایا۔ اور انھیں مشرقی مقبوضات کا قائداعلیٰ بناکر انگورہ کی سمت روانہ کیا تاکہ وہ عارضی صلح کے مطابق فوج کو برخاست کرکے ہتھیار جمع کرلیں مصطفےٰ کمال کو یہ موقع خدا نے دیا۔ اور انھوں نے فوجوں کو برخاست کرنے کی بجائے ان کو منظم کرنا شروع کردیا۔ اپنے گرد لوگوں کو جمع کیا انھیں بتایا کہ اگر ہم نے اس وقت اپنے آپ کو فاتح دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تو ہمارا حشر بہت برا ہوگا۔ یہ پکار جادو کی تاثیر رکھتی تھی تھکے ہارے تازہ دم ہوگئے جن کی ہمتیں بالکل جواب دی چکی تھیں وہ مرنے مارنے پہ تل گئے۔ سلطنت کی ہر سمت سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ فوجی افسر پرانے سپاہی ماہر۔ اخبار نویس شاعر ادیب جس کو موقعہ ملا مصطفےٰ کی طرف کھنچا چلا آیا۔

سلطان وحیدالدین چونکا اور اتحادی گھبرائے لیکن مصطفےٰ کمال ان کے چنگل سے نکل چکا تھا۔ وعدہ وعید اور دھمکیوں سے اس تیز بیں شخص کو پھانسنا آسان نہ تھا۔ سلطان نے اتحادیوں کے کہنے میں آکر انھیں اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا۔ شیخ الاسلام نے انھیں کافر بنایا۔ خلیفہ کے جاں نثار اور اسلام کے سورما ان مجاہدوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ کئے۔ کہ عین اسی وقت درسائی کے عہدنامہ کا اعلان ہوا۔ اس کی رو سے ترکی کے سب عربی صوبے اس سے چھین لئے گئے قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔ سمرنا کا علاقہ یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کے لق و دق صحرا ترکی قوم کے نذر ہوئے اس خبر نے مصطفےٰ کمال کی قوت کو جو ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ترک قوم زخمی شیر کی طرح جھپٹ پڑی اور مصطفےٰ کمال کی تحریک مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی سواس کے مقام پر ترکی اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ کے احکامات کو اس بنا پر ماننے سے انکار کردیا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دے چکا ہے۔

یونانی سمرنا پر قابض ہوئے تو اسے تباہ و برباد کردیا۔ وہاں سے یہ لوگ آگے بڑھے۔ برطانیہ کی شہ تھی۔ یونانی اسپارٹہ کے خواب ستا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے اور ترکی فوجوں کو ہٹاتے یہ نئے پایہ تخت انگورہ تک کے سامنے پہنچ گئے سقاریہ کے میدان میں ترک اور یونانی ایک دوسرے کے

مقابل ہوئے ۱۲ دن کی سخت جنگ کے بعد ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ترکوں نے سمرنا تک کا علاقہ ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ اب ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور برطانوی فوجوں کے روبرو ترک سپاہی کھڑے نظر آئے لائڈ جارج برطانیہ کے وزیر اعظم تھے وہ لڑنے کو تیار تھے لیکن قوم نے ساتھ نہیں دیا آخر صلح کی بنیاد ڈالی گئی اور لوزان کے معاہدہ میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔

قسطنطنیہ پر از سر نو پرچم ہلال لہرانے لگا آبنائے باسفورس سے دشمنوں کے جہاز نکل گئے ایشیائے کوچک کا علاقہ ترکوں کے پاس تھا ہی یورپی علاقہ بھی لے کر چھوڑا۔ اجنبی مراعات ختم کی گئیں یورپ کا مرد بیمار تندرست و توانا ہو گیا۔ یہ ایک معجزہ تھا جو بات کسی کے خیال میں بھی نہ آسکتی تھی اسے مصطفےٰ کمال نے واقعہ کر کے دکھایا۔ اور ترکی نے نئی زندگی پائی۔

نئی زندگی نیا جسم چاہتی ہے۔ ترک دشمنوں سے تو بچ نکلے تھے لیکن ان کا جسم قومی انحطاط دزوال کے مواد سے بھرا پڑا تھا۔ سالہا سال کی پے در پے جنگوں نے ملک کا برا حال کر ڈالا تھا تجارت اور صنعت باہر والوں کے ہاتھ میں تھی۔ زراعت کرنے والے بندوقیں اٹھائے پھرتے تھے امیر طبقے مال مست تھے اور زندگی کی مشکلوں کو داد عیش دے کر بھلایا کرتے تھے حکمران طبقوں کو صدیوں کی ظالم حکومت نے بے کار کر دیا تھا تعلیم نام کو بھی تھی علماء ہر ترقی کے دشمن اور ہر پرانی چیز کے شیدا اور اس کو باقی رکھنے کے لئے وطن قوم اور مذہب کو بیچنے کے لئے تیار۔ صوفیا خانقاہوں اور تکیوں میں وظائف کرنا زندگی کا عزیز ترین مشغلہ سمجھتے تھے۔ نئی زندگی جو برسوں کی جان توڑ کوششوں۔ خونریزیوں سازشوں بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کو ملی تھی کس طرح اس قوم کے فرسودہ اور لاغر جسم میں سماسکتی تھی اگر زندگی کی بقا منظور تھی تو جسم کا بدلنا بھی ضروری تھا مصطفےٰ نے جس سنگدلی اور سفاکی سے طرابلس اور بلقان کی جنگیں لڑیں درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی وہی روح اب نئے جسم کی تعمیر میں کار فرما تھی۔ قوم کی بے حسی اور بے بسی جب سپاہی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کرے تو اس سے اعتدال پسند مصلح اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے قائد کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔

مصطفےٰ پاشا نے جس سختی کے ساتھ دشمنوں کے سر کچلے اس سختی کو اپنے ان دوستوں کے خلاف استعمال کرنے میں بھی اسے کوئی باک نہ تھا جو اس کے نزدیک وطن کے لیے دشمنوں سے کم خطرناک نہ تھے۔

ترکی قوم کو مصطفےٰ کمال نے نئی زندگی دی اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا اس نے اس نئی زندگی کو نیا قالب بھی دیا۔ جس کے حسن و قبح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید یہ زیادہ نامناسب بھی نہیں ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال یہ نیا قالب ترکی کے لیے تیار کرتا۔ تو قوم کی صدیوں کی فرسودہ روایات، غلط مذہب کی غلط حدود مذہبی طبقوں کی جہالت اور عوام میں ان کی ہر دلعزیزی یہ سب چیزیں اس نئی زندگی کو کب کا ختم کر ڈالتیں۔ مصطفےٰ کمال نے اس نئی زندگی کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ وہ ابھری پرانی زنجیروں کو توڑ کر غلط راہ پر چل نکلی لیکن اس بے راہ روی سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ غلط راہ پر چلتے چلتے صحیح راہ پر آجانا کوئی بڑی بات نہیں لیکن جو زمین پر پاؤں نہ لگا سکے وہ چلے گا کیا۔ مصطفےٰ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا۔ یہ لوگ ظل اللہ کے نام سے پکارے جاتے تھے خشکی و تری میں ان کا سکہ چلتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجنبی کے سایہ سے کانپا کرتے اور وقت پر دشمنوں کے ہاتھوں بک جایا کرتے تھے۔

علماء کا زور توڑا جن کی زندگی قوم کے لئے وبال جان بن چکی تھی اور ان کا مذہب ترقی کا دشمن ہو چکا تھا۔ تعویذ دینے والے پیر قبر پرست مجاور زاویہ نشین صوفی اور بھیک منگے فقیر، جو قوم کے خون کو جونک کی طرح چوس رہے تھے ختم ہوئے عوام بے حس اور جاہل تھے ان کو وطنیت کا نشہ اور علم کی روشنی دی خلیفہ اور علماء کا مذہب اسلام تھا لیکن ان کے سب کام غیر اسلامی تھے انھوں نے اس اشتہار کو بے کار سمجھ کر حکومت کو مذہب کے اس مفت کے دم چھلے سے نجات دی اور اپنی اس بے دینی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مشنریوں کا سد باب کیا۔ ان کے ابتدائی مدرسے بند گئے اور ان کا تمدنی اقتدار جو قوم کے ضمیر کو برسوں سے خراب کر رہا تھا یوں ختم کیا روس سے قومی بیر چلا آتا تھا اس نے سے دوستی کی لیکن اس دوستی کے باوجود اس کے اثرات کو ملک

کے حدود میں قدم نہ رکھنے دیا۔ یونان پٹ چکا تھا۔ لیکن اس سے بھی صلح صفائی کر کے راہ و رسم بڑھائی برطانیہ سے اچھے تعلقات قائم کئے فرانس پر زور ڈال کر اپنے مطالبات منظور کرائے ترک زراعت سے غافل تھے انھیں زراعت میں لگایا اور زراعتی تعلیم کو عام کرنے کے لئے نئے طریقے پر زراعت کرنے کا شوق دلایا۔ صنعت و حرفت کا ترکوں میں نام تک نہ تھا قانون کے زور سے انھیں ان کاموں میں لگایا۔ تعلیم کو ترقی دی بچوں اور نوجوانوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا عورتیں زندگی سے دور گھر کی چہار دیواری میں وقت ضائع کرتی تھیں انھیں کاروبار زندگی میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو مقدس سمجھا جاتا تھا ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ ترکی ٹوپی بدلی پردہ رخصت کیا عاجزی اور نیازمندی کے سلام بدل دئے موسیقی کو جو ردنے دھونے کے جذبات کو ابھارتی تھی زندگی بخش بنا دیا۔

مصطفےٰ کمال سرکش تھے اور بہت سخت قسم کے سرکش ان کے ارادے اٹل تھے اور جو ان کی راہ روکتا ان کے انتقام کی آگ کے نذر ہو جاتا۔ وہ باغی تھے بچپن سے، جوانی میں حریفوں کی رقابت نے انھیں اور باغی بنا دیا۔ اور جب حقیقی معنوں میں کام کرنے کا وقت آیا تو خلیفہ کی حرکتوں نے بغاوت کی اس آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اگر اس سرکش اور باغی کو صحت بخش مذہبی ماحول ملتا اور اس ماحول میں انھیں اپنی غیر معمولی قوت جرت اور دیگر صلاحیتوں کو بر سر کار لانے کے موقعہ ملتے رہتے تو یہ باغی اور سرکش مرد مومن بنتا۔ اور ترکی کو نئی روح کے ساتھ ایک ایسا قالب عطا کرتا جو ۱۳۰۰ برس پہلے کی یاد تازہ کر دیتا۔

مصطفےٰ کمال کی بڑائی اس کی اپنی بڑائی ہے اور اس کی کمزوریاں ذلیل اور پست ماحول کا نتیجہ مصطفےٰ کمال اگر اتنا سرکش اتنا باغی اتنا خودسر اور اتنا خوں خوار نہ ہوتا۔ تو یہ صدیوں کے قوم کے پرانے قالب کو جو تقدس اور خدائی کا درجہ حاصل کر چکا تھا کبھی نہ بدلنے پاتا۔

اس مرد غازی کی ایک ضرب کلیمی نے ملت اسلامی کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا ہے اور اس کا پیدا کیا ہوا ولولہ آج ہر نوجوان کو اپنے اپنے ماحول میں اس ضرب کلیمی کو آزمانے

کی دعوت دے رہا ہے۔

غازی مصطفےٰ کمال صحیح معنوں میں بڑے آدمی تھے انھوں نے صدیوں کے جمود کو توڑا وہ جمود جس نے اسلام کی اصل روح کو مسخ کردیا تھا ان کی بغاوت اوران کے کفر نے آئندہ نسلوں کو کافر ہونے سے بچالیا۔ ورنہ اگر یہی حالت رہتی تو نئی نسلوں کا انقلاب ان کی امنگیں ان کی آرزوئیں ان کی بے قراریاں اسلام کے اس فرسودہ اور بے روح قالب کو دیکھ کر کب مطمئن ہوتیں مصطفےٰ کمال کے کفر نے نہ معلوم کتنوں کو مومن بنادیا اس لئے یہ کافر واقعی مردمومن تھا۔ جو خود جلا اور اپنی ذات سے افق اسلام کو روشن کرگیا۔

ایران میں ریلوے

(از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

(ماہ گزشتہ وزارت طرق ایران کی مفصل روئداد بابت راہ آہن سرتاسر ایران" موصول ہوئی جو دس جز کی ہے اور بڑی تقطیع پر با تصویر نہایت عمدہ چھاپی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون اسی روئداد کا نہایت مختصر خلاصہ ہے۔ اسلم)

ستر سال سے اہل ایران کی دلی خواہش تھی کہ ان کے ملک میں ریلوے جاری کی جائے۔ جب سے ان کے تعلقات فرنگستان سے قائم ہوئے اور مغربی ممالک کے ساتھ ارتباط میں افزونی ہوئی اسی وقت سے یورپین تمدن کے مظاہر میں سے جو چیز ان کے لئے زیادہ جاذب نظر ہوئی وہ یہی ریلوے تھی۔ ایران کے مفکرین برابر اس بات پر زور دیتے رہے کہ ملک کی ترقی کے لئے موجودہ تمدن کے ضروری عناصر میں سے سب سے مقدم ریلوے کا اجراء ہے۔

مرحوم صنیع الدولہ جو گزشتہ صدی کے ایران کے نامور رجال سیاسی میں سے تھے ملکی ترقی کے وسائل کا محور ریلوے ہی کو سمجھتے تھے۔ اس بارہ میں انھوں نے اپنی تجاویز بھی شائع کی تھیں۔ مشروطیت کے بعد مجلس ملی کے دورۂ چہارم میں ایک نمائندہ نے کہا تھا

"جس دن ایرانیوں کی یہ پرانی آرزو بر آئے گی، اور انجنوں کی سیٹی اور ان کے آمد و رفت کے شور و غل کی آواز اہل ملک کے کانوں میں گونجنے لگے گی وہ دن ملت کے لئے سب سے بڑا خوشی کا دن ہوگا۔ اور پھر ہم ایران کی گزشتہ عظمت کے اعادہ کی امید رکھ سکیں گے"

لیکن انتظامی اور اقتصادی بدحالیوں نے ایران کو اس درجہ پر پہنچا رکھا تھا کہ اس کے باشندوں کی یہ آرزو اس بچہ کی خواہش سے زیادہ نہ تھی جو چاہتا تھا کہ ایک بڑے اژدھے کو اپنے کھلونوں کی ڈبیا میں بند کرلے۔

ایرانی ریلوے کی تاریخ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا باوجود اس یقین کے کہ ہر قسم کی ملکی ترقیوں کے لئے ریلوے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے اپنی زبون حالی کی وجہ سے ایران اس قابل نہ تھا کہ خود اس کو تعمیر کر سکتا۔ دول مغربیہ جو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں اور اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے کو اپنے استعماری اور نامشروع سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے مفید سمجھتی تھیں اپنے نفوذ اور اثر کو بڑھانے کے لئے اس میں ریلوے نکالنے کے اجارے طلب کرنے لگیں سنہ ۱۸۶۵ء سے یورپ کے لوگ ایران کے ایک ایک حصہ میں اجرا ریلوے کے لئے درخواستیں لے کر آنے شروع ہوئے جن میں روس۔ انگلستان۔ فرانس اور جرمنی وغیرہ مختلف ممالک کے نمایندے تھے۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں انگریزوں نے یہ تجویز کی کہ بحیرہ روم سے ایک ریلوے لائن نکالیں جس کو وادی فرات و دجلہ سے لاکر ایران کے جنوبی حصے سے گزرتے ہوئے مکران کے راستہ سے ہندوستان تک پہنچا دیں۔ برطانی پارلیمنٹ نے اس کے لئے ایک مخصوص کمیشن متعین کیا جس نے بیرن جولیس رویٹر کی قیادت میں دربار ایران سے اس کو منظور کرایا۔ اس اجارہ میں صرف ریلوے ہی کا اجرا نہ تھا بلکہ ایران کی پوری تجارت بحر خزر سے خلیج فارس تک کا امتیاز بیرن موصوف کے نام ستر سال کی طویل مدت کے لئے واگذار کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس تجویز سے انگریزوں کا مقصد صرف روسیوں کو دھمکانا تھا۔ جونہی انھوں نے افغانستان کے معاملہ میں سمجھوتہ کر لیا کہ اس میں مداخلت نہیں کریں گے انگریزوں نے بھی اپنی یہ سیاسی نمائش ختم کر دی۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی سنہ ۱۸۷۳ء میں یہ اجارہ رسماً باطل ہو گیا۔

سنہ ۱۸۷۴ء میں ایک روسی انجینیر فالکنہائن نے جس نے گرجستان میں ریلوے تعمیر کی تھی ایران میں آ کر جلفا سے تبریز تک ریلوے نکالنے کی اجازت چاہی۔ اور اس کے پیچھے اس نے بہت کچھ صرفہ بھی کیا مگر دربار ایران کو معلوم ہو گیا کہ یہ کام وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی حکومت کے لئے لینا چاہتا ہے۔ اس کے پاس جو نقشے تھے ان سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ مقصود یہ ہے کہ جلفا سے تبریز اور وہاں سے بغداد تک ریلوے لائن نکال کر دولت علیہ عثمانیہ پر جارحانہ اقدام میں آسانی پیدا کی جائے۔ اس لئے اس کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں ایک فرانسیسی کمپنی کے منیجر موسیو الیوں نے جو اسلامبول میں سکونت رکھتا تھا رخصت سے

تہران تک ریلوے نکالنے کا ٹھیکہ لیا۔ مگر واپس چلا گیا۔ پھر ایک آسٹرین انجینیر ہروان شیر وے نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا مگر اس نے بھی کچھ نہ کیا۔

۱۸۸۰ء میں امریکا کے سفیر متعینہ ایران نے امریکن سرمایہ اور انجینیروں سے ریلوے جاری کرنے کے لئے مختلف حصہائے ایران میں ٹھیکے لئے مگر وہ بھی کچھ کر نہ سکا۔

۱۸۸۲ء میں موسیو بوآتال نے جو تہران میں برق کا اجارہ دار تھا رخشت سے تہران تک ریلوے بنانے کی اجازت حاصل کی۔ اور اس کے ساتھ بعض دیگر نقاط کو بھی پیوست کرنے کا اجارہ لیا۔ پانچ لاکھ فرانک کی رقم بھی اس غرض کے لئے بنک میں جمع کی مگر کام نہ ہوا۔

بوآتال مذکور کو اس زمانہ میں مردم شماری کی روئداد سے معلوم ہوا کہ درگاہ حضرت عبد العظیم کی زیارت کے لئے سالانہ کم وبیش تیس لاکھ آدمی جایا کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے تہران سے درگاہ مذکور تک جو چند میل ہے ریلوے بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ پھر اس کو ایک بلجین کمپنی کے ہاتھ فروخت کرا دیا۔ اس نے برد کل سے سامان لاکر یہ لائن تیار کی۔ ایران کی یہی پہلی ریلوے لائن تھی جس کا افتتاح ۱۸۸۸ء میں بڑے تزک واحتشام سے کیا گیا تھا۔ اسی کمپنی نے ایک دوسری ریلوے کا بھی ٹھیکہ لیا مگر نہ بنا سکی۔

اسی زمانہ میں حاجی محمد حسین امین الضرب نے تجارتی آسانی کے لئے دریائے مازندران سے تہران تک ریلوے لائن کا اجارہ حاصل کیا اور اپنے اور دیگر ایرانی تجار کے سرمایہ سے شاہ بندر محمود آباد سے جو بحر خزر کے ساحل پر ہے شہر آمل تک ۱۰ کیلومیٹر ریلوے لائن بنائی۔ صرف ایک انجن تھا اور ۱۲ ڈبے جن پر چھت نہیں تھی۔ ایک ہی انجن ڈرائیور تھا جو جرمن تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ایک حبشی کو لائے جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں انجن اور لائن دونوں کو خراب کر دیا۔ آخر کار ریل کا لوہا اٹھا لیا گیا اور دوسرے کاموں میں لگا یا گیا۔

۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک مختلف کمپنیاں ایران کے مختلف حصوں میں ریلوے کے ٹھیکے لیتی رہیں مگر کسی نے کچھ نہ کیا۔ مسٹر شوسٹر امریکن وزیر خزانہ ایران نے بھی ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ امریکن سرمایہ سے ریلوے لائین تعمیر کرائیں گے مگر ان کے چلے جانے کی وجہ سے یہ تجویز بھی عمل میں نہ آسکی۔

۱۹۱۱ء میں روسی بنک نے تجارتی نہیں بلکہ روس کی فوجی غرض سے جلفا سے تبریز تک اجازت لے کر

ریلوے لائن تعمیر کی جس کا طول ۱۹۰ کیلومیٹر ہے یہ ایران کی تیسری ریلوے لائن تھی ۱۹۲۱ء میں جنگ عظیم کے بعد سوویٹ روس اور ایرانی معاہدہ کی رو سے جب یہ لائن ایرانی حکومت کے ہاتھ میں آئی اس وقت اس کی گاڑیاں، پٹریاں، انجن اور اسٹیشن سب ازکار رفتہ تھے۔ رضا شاہ نے ہر چیز کو از سر نو درست کرایا۔ اور موجودہ زمانہ کے مروجہ مصالحہ سے اس کو ایسا ٹھیک بنادیا کہ اب اس کی سالانہ آمدنی تقریباً پچاس لاکھ ریال ہوتی ہے علاوہ بریں تبریز سے ایک شاخ شرف خانہ تک ۵۳ کیلومیٹر کی اور بھی بڑھا دی ہے۔

اسی زمانے میں روسیوں نے اپنے جنگی نظام کے سلسلہ میں قفقاز سے ایک ریلوے لائن نکالی تھی۔ جو ایران کے شمال مغربی حصہ میں سے گزرتی ہوئی ترکی حدود میں پہنچی تھی۔ اس کا تقریباً سو کیلومیٹر حصہ ایرانی سرزمین میں پڑتا تھا جو اب ایران کے قبضہ میں ہے۔ مگر یہ لائن جنگ کے دوران میں اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ اب اس کی پٹریاں اکھاڑ کر ایک جگہ جمع کر کے رکھدی گئی ہیں۔

مشرق میں انگریزوں نے جو لائن ہندوستان سے دزداب تک نکالی ہے اس کا ایک حصہ جو بولان سے زاہدان تک ہے ایران کے ہاتھ آیا ایک دوسری لائن انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں بوشہر سے برازجان تک بنائی تھی۔ روزانہ ایک ٹرین اس پر آتی جاتی تھی۔ مگر آج کل وہ خراب وخستہ حالت میں معطل پڑی ہے۔

ایران کی ریلوے لائنوں کی یہ مختصر تاریخ ہے جس کو دیکھ کر ناظرین حیران ہوں گے کہ جبکہ ساری دنیا میں ریلوے عام ہوگئی تھی کیا وجوہات تھے کہ ایران جیسے زرخیز ملک میں اس کا اجرا نہ ہوسکا۔ اس کا سبب حقیقت میں خود ایران کی کمزوری اور بے مائگی تھی۔ قاچاری عہد میں ملک کی انتظامی اور اقتصادی حالت اس درجہ گر گئی تھی کہ بیرونی کمپنیاں یہاں اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں اور ان کو مطلق اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ ہم روپیہ اور محنت صرف کر کے کوئی نفع اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ بدنظمی اور غارتگری کا دور دورہ تھا۔ خود حکومت کی آمدنی سالانہ ۱۵ کروڑ سے لے کر ۲۰ کروڑ تومان سے زیادہ نہ تھی۔ ضروری اخراجات کے لئے بھی قرضے لینے پڑتے تھے۔ علاوہ بریں روس اور انگلستان کی باہمی رقابت ایک بڑا سبب تھی جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے کہ ایسا کام کرے جس سے اس کو اس ملک سے خاص فائدہ حاصل ہو یا اس کا نفوذ اور اثر بڑھ جائے۔

اس لیے لطبعاً ایک دوسرے کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالتے تھے جن کی وجہ سے کوئی بھی اس کی طرف اقدام نہیں کرتا تھا۔ ان سب پر مزید طبیعی موانع تھے کوہستانی سلسلوں اور سر بفلک پہاڑوں کے سینوں کو چیرنا اور جگروں کو تراشنا آسان نہ تھا۔

ٹرانس پرشین ریلوے

جنگ عظیم کے بعد رضا شاہ پہلوی کی ہمت اور ملت کی کوشش سے جب ایران کا سیاسی اور اجتماعی افق اجنبیوں کے سائس اور غیروں کی مداخلت سے صاف ہوا ساری قوم میں جوش عمل اور ترقی کا ولولہ موجزن ہو گیا رفتہ رفتہ ملک کی انتظامی حالت اور اقتصادی کیفیت ٹھیک ہوئی اور سالانہ آمدنی ایک ہزار ملین تومان سے آگے نکل گئی اس وقت بلند حوصلہ شاہ نے ملت کی اس اہم اور مفید ترین ضرورت کی طرف توجہ فرمائی اور بحر خزر (قزوین) سے لے کر خلیج فارس تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کا مقصد سامنے رکھا۔

پہلی کدال خود شاہ نے ۱۳۰۶ شمسی (۱۹۲۵ء) میں اپنے ہاتھ سے مار کر اس کام کا آغاز کیا اور پھر آخری پیچ بھی اپنے ہاتھ سے لگا کر ۱۳۱۷ شمسی (۱۹۳۸ء) اس کو مکمل کر دیا۔ اور یہ لائن بارہ سال کی پیہم کوشش اور محنت سے جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے تھے ایران کے جنوبی سرے سے شمالی سرے تک جاری ہو گئی۔ اور اہل ایران کی ہفتاد سالہ آرزو پوری ہو گئی۔ شمال اور جنوب دونوں جانب ان کا سلسلہ تجارت بحر خزر اور خلیج فارس سے مل گیا۔ اور اپنی آزاد بندرگاہوں سے مغربی اور مشرقی ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات وابستہ ہو گئے۔

یہ لائن بحر خزر کے ساحل بندر شاہ سے شروع ہو کر مازندران کے زرخیز میدانوں سے گذرتی کوہ البرز کے درہ تنگ تالار پہنچ کر وہاں سے فیروزکوہ کے بلند اور دشوار گزار پہاڑوں کے سیکڑوں ٹنلوں میں سے داخل ہوتی اور نکلتی ہوئی تہران پھر قم کے راستہ سے لرستان کے کوہستانی سلسلہ کو پار کرتی اندیمشک سے خوزستان کے سطح میدانوں میں آتی ہے۔ اور دزفول۔ اہواز اور دریائے کارون کے عظیم الشان پل سے گزرتی بندر شاہپور میں جو خلیج فارس کے ساحل پر ہے پہنچتی ہے۔ یہ کل مسافت ۱۳۹۴ کیلو میٹر ہے جو پہلے بہزار وقت و دشواری کم سے کم چالیس دن میں طے ہوتی تھی اور اب نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ صرف چالیس گھنٹوں میں اس سرے سے اس

سرے تک مال اور مسافر پہونچتے ہیں۔

اس تمام لائن کی تعمیر میں سوائے چند انجینروں اور نقشہ برداروں کے جو مختلف مغربی ممالک سے بلا کر رکھے گئے تھے ایران ہی کے جملہ کار پرداز اور مہندس تھے۔ اور تیس ملین لیرہ (پاؤنڈ) کے صرفہ سے جس کا بڑا حصہ قند اور چائے پر محصول بڑھا کر وصول کیا گیا تھا حکومت ایران ہی کے سرمایہ سے اس کی تعمیر ہوئی۔ ایک پائی بھی باہر سے قرض نہیں لیا گیا۔

جب سے اس کا اجرا ہوا ہے ملکی تجارت میں وہ فروغ ہوا ہے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ علاوہ تجارت کے انتظامی معاملات میں بھی اس کی بدولت سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ رہزنی اور بدنظمی کا خاتمہ ہو گیا ہے تمام اقطاع میں امن وامان کا دورہ ہے اور کاروباری زندگی اور باشندوں کی معاشی حالت میں نمایاں ترقی ہو گئی ہے۔

یہ لائن موجودہ عہد کے انجینرنگ کے عظیم الشان کارناموں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ ایسے ایسے سر بفلک پہاڑ راستہ میں پڑتے ہیں جن کے اوپر سے کبھی کوئی پرندہ بھی نہیں گزر سکا ہے۔ جب تک یہ تیار نہیں ہوئی تھی اس وقت تک خود ایران کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی یقین نہیں آتا تھا کہ البرز اور فیروز کوہ کے بلند پہاڑوں اور لرستان کے دشوار گزار کوہساروں سے گزرتی ہوئی ریلوے لائن ان کے ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پار کرے گی۔ اس میں دو سو چوبیس ٹنل بنانے پڑے ہیں جن کا مجموعی طول کل لائن کا ۴ فی صدی ہے۔ ان میں سے بعض بعض دو دو کیلومیٹر سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔ ان ٹنلوں کے علاوہ سینکڑوں پل بھی بنانے پڑے جن میں سے دریائے کارون۔ رود شور اور آبدیز وغیرہ کے پل بہت بڑے بڑے ہیں۔ شاہ بندر سے بندر شاہپور تک کل اسٹیشنوں کی تعداد ۹۰ ہے۔

یہ ساری لائن۔ اس کے انجن۔ اس کی گاڑیاں اور اسٹیشن یورپ کے جدید سے جدید ریلوے معیار کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ پانچ کارخانے بھی مختلف مقامات میں قائم کئے گئے ہیں جن میں نہ صرف بگڑے ہوئے انجنوں اور ویگنوں کی مرمت کی جاتی ہے بلکہ بنائے بھی جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ورکشاپ طہران کا ہے جو درجہ اول کا ہے۔ بقیہ اھواز، بندر شاہ۔ اندیمشک اور پل سپید میں۔ اراک اور دورود (بجریا) میں بھی دو کارخانے بن رہے ہیں جو عنقریب کام شروع کر دیں گے۔ ان کارخانوں میں ہر قسم کے جدید آلات،

جرثقیل اور برقی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔

ریلوے کے متعلق ہر قسم کی تعلیم دینے کے لئے متعدد مدارس بھی کھول دئے گئے ہیں جن میں ایرانی طلبا کو تعلیم دے کر تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ملک کی ریلوں کو خود چلا سکیں اور غیر ملکیوں کی حاجت نہ پڑے۔

اس لائن کی تکمیل کے بعد دوسری دو لائنوں کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

(۱) تہران سے تبریز تک

معلوم ہے کہ تبریز سے جلفا تک ریلوے موجود ہے۔ تہران سے تبریز کو ملحق کر دینے کے بعد براہ راست دارالسلطنت کا تعلق قفقاز کے ساتھ ہو جائے گا۔

(۲) گرمسار سے سمنان تک۔

خیال یہ ہے کہ یہ آخری لائن رفتہ رفتہ لاکر زاہدان سے ملادی جائے گی تاکہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی سلسلہ بڑھے۔

جملہ عالم اسلامی کے لئے مسرت کا مقام ہے کہ ترکی اور ایران ترقی کی شاہراہ پر سرعت کے ساتھ گامزن ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ کاش افغانستان کے متعلق بھی ہمارے کانوں میں دل خوش خبریں پہونچیں جو ہمارا سب سے قریبی پڑوسی ہے اور جس کی ترقی کا بہت کچھ اثر ہمارے اوپر پڑ سکتا ہے۔

اسلم جیراجپوری

ترکستان
دریائی خزر
تبریز
طہران
سمنان
افغانستان
اہواز
زاہدان
عراق
خلیج فارس
دریائی عمان
علامات
سرحدی خطوط
تیار ریلوے لائن
زیر تعمیر
سڑکیں
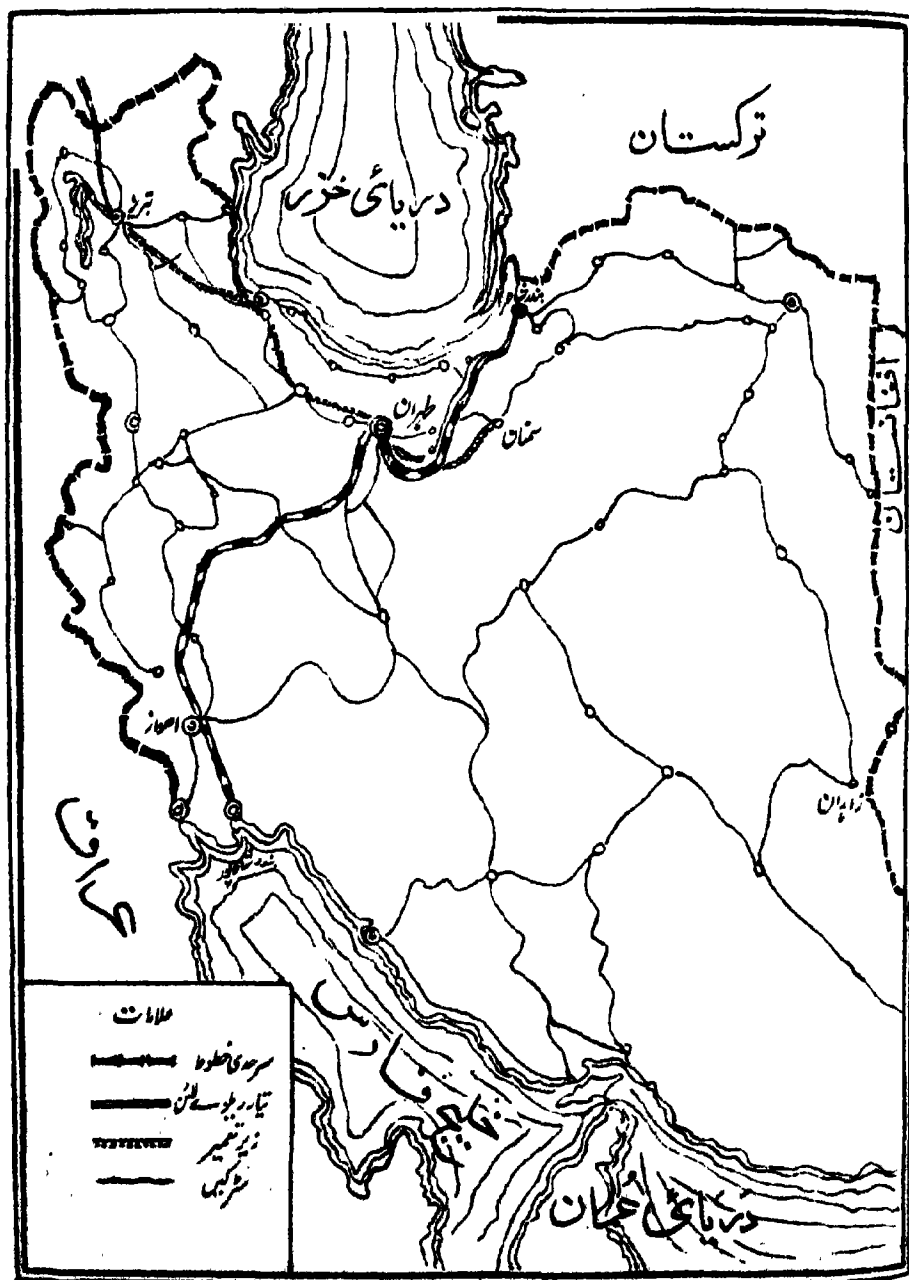
تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں

(از جناب عبد الغفور صاحب ۔ استاد دوں کا مدرسہ جامعہ)

تعلیم کے مفہوم کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف ضرورتوں کی وجہ سے آدمی مختلف جوابی عمل اختیار کرتا ہے۔ اور پھر یہ جوابی عمل نئی ضرورت سے کسی نئے جوابی عمل کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس طرح انسان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ تعلیم انسان کی انفرادی نشو و نما اور تمدنی ماحول کی باہمی اثر اندازی سے فروغ پاتی ہے۔

اب ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ تعلیم کا یہ عمل کیوں جاری رہتا ہے۔ کون سے ایسے عناصر ہیں جو تعلیم کے لئے بنیادی طور پر ضروری ہیں۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے عمل تعلیم کے سلسلہ میں کچھ اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اس کو زیادہ واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔

بچہ ایک نامی شخصیت رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ انفرادی طور پر بڑھنے اور ترقی کرنے کی چند موروثی اور جبلی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف وہ زندگی کی مختلف منزلوں میں ان ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر نسلی و تمدنی سرمایہ سے اپنے تجربہ اور معلومات کو برابر مالا مال کرتا جاتا ہے۔ وہ اپنے طور پر اپنی ان جبلی صلاحیتوں کے ذریعہ یہ تو جان سکتا ہے کہ سورج سے ہمیں گرمی اور روشنی پہنچتی ہے۔ آگ سے حرارت پہنچتی ہے۔ پانی ہماری زندگی کے لئے ایک لازمی چیز ہے۔ مگر وہ اپنے طور پر ان کی ماہیتوں کو نہیں سمجھ سکتا وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سورج ہمیں نہ صرف گرمی اور روشنی پہنچاتا ہے بلکہ وہ ہماری زندگی کے لئے خوراک بھی مہیا کرتا ہے اس میں وہ حیات بخش قوتیں پائی جاتی ہیں کہ اگر دنیا ان سے محروم کردی جائے تو وہ زندگی کی نعمتوں سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ سورج کے متعلق جدید علمی تحقیقات کو صرف از خود ہرگز نہیں سمجھ سکتا بلکہ ممکن ہے کہ اگر اس کو جاہل رکھا جائے تو وہ سورج کے متعلق وہی توہمات قائم کرے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے اس کے دوسرے بھائی قائم کرتے چلے آئے ہیں اسی قسم کی بہت سی باتیں

ہیں جنھیں آدمی اپنے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ وہ صرف نسلی تجربہ سے ان کے وسیع معنوں کو سمجھ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اپنے طور پر تجربہ کرنے اور سیکھنے کے لئے چند بنیادی محرکات رکھتا ہے مگر سماجی ورثہ ہی کی بدولت ان کی تہذیب و تربیت سے آدمی متمدن انسانوں کی زندگی گزار سکتا ہے اگر تمدنی اثرات سے بچپن ہی سے آدمی کو محروم کر دیا جائے تو وہ اس وحشی انسان سے بہتر زندگی کی اہلیت اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ جو چند بنیادی احتیاجات و محرکات کے اثر سے اپنی جسمانی احتیاجات کو پورا کرتا ہے اور بس۔ انسانی زندگی میں اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

اس قسم کے واقعات سننے میں آئے ہیں کہ کوئی بچہ اتفاق سے جنگل میں رہ گیا۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ جنگل میں انسانی آبادی اور اثر سے دور گزارا۔ اب وہ نہ زبان سمجھتا ہے نہ آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ اور نہ ان کی طرح رہتا سہتا ہے۔ اس میں اور دوسرے جانوروں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ دور کیوں جائیں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے موازنہ سے ہم اس فرق کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں اس کے افراد کے لئے ترقی کرنے اور بڑھنے کے لئے زیادہ مواقع اور سہولتیں ہوتی ہیں مگر غیر متمدن ممالک میں افراد سماجی افلاس کی وجہ سے پسماندہ رہتے ہیں۔

یہاں پر تعلیم و تمدن کے مسئلہ کو چھیڑنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان ارتقا کی ہر ایک منزل میں چند ابتدائی بنیادی صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان میں ہر وقت ترقی و تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے مگر جیسا ماحول ملتا ہے آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے ویسا ہی کام لیتا ہے۔

اگر ہم نئی پود کے بہی خواہ ہیں، اس کی بڑھتی ہوئی زندگی اور جسمانی و ذہنی نشو و نما سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ بچہ کی صلاحیتوں کا مطالعہ کریں اور ان کی امکانی تربیت پر سوچیں اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر متوسط قابلیت کے انسان میں بہتر سے بہتر زندگی حاصل کرنے کی صلاحیتیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ علم ترقی اور تہذیب و تمدن کسی خاص فرد یا جماعت کی امتیازی خصوصیت نہیں ہے بلکہ نسل انسان کے تمام متوسط درجہ کے انسانوں میں بلا کسی نسلی اور ملی تفریق کے تعلیم و تربیت کی صلاحیتیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں تو پھر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان کی صلاحیتوں اور ان کے تربیتی امکانات کو بغور مطالعہ کریں۔ اور ان حالات

کو سمجھنے اور ان کو پیدا کرنے کی کوشش کریں جن کے ذریعہ قوم کا ہر فرد بہتر سے بہتر شہری بننے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم سے اپنے آپ کو اور انسانیت کو فائدہ پہنچائے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ بچہ کی زندگی کی ہر منزل میں ایک نمو پذیر شخصیت تسلیم کریں اور اس نمو پذیر شخصیت کو جس قسم کی ذہنی اور جسمانی خوراک کی ضرورت ہو اس کا مناسب خیال رکھیں اس لحاظ سے اگر بچہ کی زندگی کو ایک ننھے پودے سے تشبیہ دی جائے تو اگرچہ یہ تشبیہ مکمل نہیں کہی جا سکتی پھر بھی ہمیں اس سے بہت کچھ اندازہ بچہ کی بڑھتی ہوئی شخصیت کا ہو جائے گا۔

جس طرح پودا پھلنے پھولنے اور بڑھنے پھیلنے کے لئے اپنے اندر صلاحیتیں رکھتا ہے مگر اس کی قدرتی صلاحیتیں صرف اس وقت معیار ترقی کو پا سکتی ہیں جب اس کو مناسب وقت پر مناسب مقدار میں دھوپ، پانی اور کھاد وغیرہ دیا جائے۔ پودے کے راستہ میں بڑھنے کے لئے جو رکاوٹیں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں ان کو دور کرتے رہیں۔ کم و بیش اسی طرح انسان کے بچہ کا حال ہے۔

تعلیم اور انسان کی نمو پذیری

بچہ کی ابتدائی خامیوں اور ناتوانی کو دیکھ کر تربیت کرنے والوں نے یہ غلط اندازہ لگایا ہے کہ بچہ چکنی مٹی کے مانند ہے۔ اس کو آدمی جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ اس کی ساری زندگی کا دار و مدار معلم یا مربی کے منشا پر ہوتا ہے۔ اور معلم کو اس سے سروکار نہیں کہ بچہ کے اندر بڑھنے کے لئے کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کیا کیا محرکات ہیں۔ کیا وہ اپنے طور پر بھی کبھی تجربے کرنا اور سیکھنا چاہتا ہے؟ کیا وہ بھی اپنی خواہشات کی ایک چھوٹی سی دنیا رکھتا ہے اور ان کو پورا کرنے کی اسے دُھن ہے۔ ہمارے معلم نے ابھی تک اس طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ تعلیم کو اس غرض سے نہیں دیکھتا کہ تعلیم بچہ کی زندگی کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کو بچہ اپنے طور پر بھی پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے طور پر بھی سیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ معلم کا کام یہ ہے کہ وہ بچہ کی اس ضرورت کو سمجھے۔ اس کی حدود کو بھانپ لے اور ان حدود کے اندر اندر بہتر سے بہتر طریقہ پر اس کی مدد کرے۔ وہ بچہ کے چنچل پن اس کی شوخی اس کی تیزی، طراری اور چلبلے پن

کو تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں نہ سمجھے۔ وہ اپنے ارادے اور بچہ کے ارادے کو دو متضاد چیزیں خیال نہ کرے۔ بچہ کی ذاتی اپج اور دلچسپیوں کا لحاظ کرے۔ معلم کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ بچہ بھی اپنی طرف سے سیکھنے اور تجربہ کرنے کا اقدام کر سکتا ہے۔ اس لئے بلا کسی امتیاز کے معلم بچہ کے تمام مشغلوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھے تعلیم اور بچہ کے مشاغل دو متضاد چیزیں نہیں ہیں ان میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ موجودہ تعلیم کی بڑی خرابی تو یہ ہے کہ اس میں بچہ کی زندگی کے دو حصے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو بچہ گھر پر گزارتا ہے۔ ساتھیوں میں کھیلتا ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی عملی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ دوسرا رخ اس کی زندگی کا یہ ہے کہ وہ مدرسہ جاتا ہے کتابیں پڑھتا ہے۔ مختلف مضامین سیکھتا ہے۔ اور مروجہ دستور کے مطابق زندگی کی تیاری کرتا ہے۔

بچہ کی شخصیت میں اس قسم کی دوئی ہرگز نہیں پائی جاتی۔ بچہ ایک مجموعی شخصیت رکھتا ہے گھر اور مدرسہ پر وہی شخصیت مجموعی طور پر بڑھتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر اثرات قبول کرتی ہے۔ اس لئے بچہ کے گھر اور مدرسہ میں قریبی تعلق ہونا ضروری ہے۔ بچہ کی تعلیم اس کے قریب ترین ماحول سے شروع ہونی چاہیئے۔ جیسے جیسے ذہنی وسعت پیدا ہوتی جائے گی ماحول کا دائرہ بھی بڑھتا جائے گا اور بچہ کی تعلیمی جولانگاہ بھی وسیع تر ہوگی۔ اس لئے معلم یا مربی کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی ضرورت کو سمجھے، ان کے قریب ترین مشاغل اور ذاتی دلچسپیوں سے واقف ہونے کی کوشش کرے اور ان کی روشنی میں بچہ کی تعلیم و تربیت کا ہر موقع پر اہتمام کرے۔

تعلیم کو ابھی تک بہت تنگ معنوں میں لیا گیا ہے۔ تعلیم کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ آدمی کو شہری زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ بچہ کے سامنے کسی نہ کسی طرح سماج کا نقطۂ نظر پیش کیا جائے چنانچہ اس بنا پر اس کے ساتھ نئے رنگروٹ کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ تمام قواعد اور ریاضتیں کرائی جاتی ہیں جو کسی نئے فوجی کو کرنی ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو شاید تعلیم اس سے بھی زیادہ محدود معنوں میں لی گئی ہے یعنی یہ کہ نوجوانوں کو نوکریوں کے لئے تیار کیا جائے اگر ملک کے کسی مخصوص طبقہ کے لئے فوجی تعلیم کی طرح اس مخصوص قسم کی تعلیم کا انتظام کرایا جاتا تو بھی ایک معنی رکھتا مگر یہاں تو اندھا دھند سارے ملک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اور نہ معلوم کب تک جاری رہے گا۔

اس ناقص نظام تعلیم سے جتنا قومی نقصان ہمارے ملک کو ہوا ہے اس کا اندازہ ہماری قوم کی ذہنی اور علمی کم مائیگی سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، غرض ہماری تعلیم میں کبھی اس قسم کی منظم کوشش نہیں کی گئی کہ تعلیم سماجی مصلحتوں اور انفرادی صلاحیتوں کی بنا پر دی جائے۔

سماجی حیثیت کو پھر بھی تسلیم کیا گیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کا استعمال غلط طریقے سے ہوا ہے اور اس میں بچہ کی ذات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بچہ کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو سماج کے عام سانچہ میں ڈھال دیا جائے۔ بچہ میں خود سماج سے متاثر ہونے اور اس کا نادیدہ نگاہ سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ مگر جس طریقہ سے سماج کے سرمایہ کو پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل پھیکا اور خشک ہے۔ اس میں بچہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ سماج کے کاموں میں سادہ طور پر شرکت کرے اور اس طرح سماج کی روح کو سمجھے بلکہ غیر فطری دباؤ کے ماتحت سماج کی بعض مسلمہ باتوں کو مجرد شکل میں بچہ پر تھوپ دیا جاتا ہے۔

جس طرح آدمی تیرنا تیرنے سے سیکھتا ہے اسی طرح سماجی زندگی کو سماج کے مشاغل اور اداروں میں براہ راست شرکت کرنے سے سیکھتا ہے۔ اور صرف اسی صورت میں بچہ حقیقی معنوں میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ غرض سماجی اداروں کے ذریعہ ہی بچہ کو علمی اور تمدنی سرمایہ سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ اس لئے جب مدرسہ میں الگ الگ مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچہ اس میں اپنی کچھ دلچسپی نہیں پاتا تو وہ یا تو پڑھنے سے جی چراتا ہے یا بیگار سمجھ کر استاد کے ڈر سے لگا رہتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو متواتر کئی گھنٹے بے معنی چیزیں رٹائی جائیں اگرچہ بالغ کے لئے یہ بامعنی ہیں لیکن بچوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس کی ضرورت کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے جب بچے پڑھنے سے پہلوتہی کرتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں پر شبہ کیا جاتا ہے مگر معلم یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ان کو آزادی دی جائے تو ان میں خود بخود داخلی منبط کی تربیت ہو سکتی ہے۔ اس لئے بچہ سے مکمل خاموشی، تابعداری اور فرمانبرداری کی امید اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کی قیمت پر کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی پابندیاں بہت نیک نیتی کی بنا پر کرائی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ یہ خیال

"جو راستاد بہ زدہر پدر" خلوص نیت سے رکھتے ہیں مگر بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق یہ نظریہ بچہ کی فطرت اور قدرتی صلاحیتوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم بچہ کی فطری نمو پذیری اور اس کے قوانین سے واقف ہوتے تو ہم تعلیم و تربیت کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو اپنے طرز عمل سے نقصان نہ پہنچاتے اور اس کے ارادوں۔ خواہشوں۔ فیصلوں، جذبات اور خیالات کا احترام کرتے۔ بچہ اپنی دوڑ دھوپ سے کھیل کود سے، اشیاء کے جوڑ توڑ سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات اور خواہشات رکھتا ہے۔ ارادے اور مقاصد رکھتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اپنے ماحول میں تصرف کرنا چاہتا ہے اور اس طرح سے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے اندر مخفی قوتیں ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں اظہار چاہتی ہیں۔ خارجی افعال کے ذریعہ اپنی تربیت و تکمیل چاہتی ہیں۔ اور یہ محرکات بچہ کے لئے اس قدر قدرتی ہیں جس طرح بھوک اور پیاس ہیں۔ یہ وہ محرکات ہیں جن کی تربیت سے آدمی مہذب انسان بن سکتا ہے اور جن کی طرف سے غفلت برتنے سے انسان وحشی سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کی صحیح تربیت سے انسان میں وہ خوبیاں اور مہارتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو متمدن زندگی کا لازمہ ہیں غرض یہ محرکات اور جبلی صلاحتیں ابتدائی حالت میں کتنی ہی خام اور ناتمام کیوں نہ ہوں ان میں ترقی اور اصلاح کی اس قدر گنجائش ہے جس کا اندازہ ہم اپنی اور دوسروں کی زندگی کے مشاہدہ سے کر سکتے ہیں آغاز میں دیکھئے تو انسان کا بچہ اپنی زندگی کے لئے دوسروں کا کس قدر محتاج ہوتا ہے مگر وہی عاجز و ناتواں مخلوق تربیت پا کر وہ کچھ کر سکتا ہے جس کا کہ آدمی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ غرض انسان جبلی طور پر بڑھنے۔ ترقی اور اصلاح کرنے کے لئے چند بنیادی محرکات اور صلاحتیں رکھتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدرتی محرکات کیا ہیں جن کو کام میں لا کر بچہ کی تربیت کی جا سکتی ہے۔

اگر یہ ممکن ہوتا کہ آدمی پیدائشی طور چند محدود محرکات رکھتا جن کے اثر سے انسان کا جوابی عمل متعین ہو جاتا تو انسان کی تعلیم و تربیت کے متعلق چند مخصوص بنیادی محرکات کی روشنی میں آسانی سے پیشبندی کی جا سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہنا آسان ہوتا کہ مخصوص حالات پیدا کرنے سے آدمی مخصوص قسم کا طرز عمل اختیار کرے گا مگر یہ بنیادی تحریکات کوئی ایسی شے نہیں ہیں جن کی طرف ہمیشہ کے لئے انسان کے طرز عمل کو

منسوب کیا جا سکے کیونکہ انسان کے یہ محرکات علم اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دوسری تحریک اپنے
اثرات کے اعتبار سے پہلی تحریک سے مختلف ہوتی ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ماخذ ایک ہی ہو۔ مثلاً
بچہ میں بھوک کے لئے کھانے کی خواہش ایک بنیادی تحریک ہے مگر وہ شروع میں کھانے کے لئے
جن چیزوں کو پسند کرتا ہے بڑھنے پر ان کو چھوڑتا جاتا ہے۔ بچپن میں بچہ کو اگر کریلا دیا جائے تو شاید
کڑواہٹ کی وجہ سے اسے تھوک کر منھ سے پھینک دے مگر جیسے جیسے مختلف کھانوں کا اسے
موقع ملتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کا ذوق بدلتا جاتا ہے اب یہ سوال نہیں ہوتا کہ آدمی بھوک
کی وجہ سے کھانا چاہتا ہے بلکہ وہ خاص قسم کا کھانا کھانا چاہتا ہے۔ مختلف کھانوں میں ایک خاص
قسم کا امتزاج چاہتا ہے۔ اس لئے ترقی و تبدیلی کے اعتبار سے انسان بہت سی وسعتوں کا مالک ہے۔
وہ تعلیم و تربیت کے لئے عجیب و غریب صلاحیتیں رکھتا ہے اس لئے چند نفسی سانچوں میں اس کو محدود کرنا
مشکل ہے۔ تاہم انسان کے ذاتی رجحانات کا اندازہ کرتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان خاص
موقعوں پر خاص محرکات سے غالباً کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرے گا۔

اس سلسلہ میں جس طرز عمل کے متعلق زیادہ صحت و یقین کے ساتھ پیش گوئی کی جا سکتی ہے اس کو
فعل اضطراری کہتے ہیں یعنی وہ فعل جو بہت حد تک غیر ارادی ہو گر ہمارے شعور سے خارج نہ ہو۔ ایسی
صورتوں میں آدمی کسی خاص مہیج کے لئے خاص جوابی عمل دینے پر مجبور ہوتا ہے جیسے تیز بجلی چمکنے میں ہماری
آنکھیں بند ہو جاتی ہیں لیکن ایسے اعمال انسان کی زندگی میں بہت تھوڑے ہیں بلکہ وہ بیشتر طور پر اپنے
ارادہ سے خاص حالات کے اندر کوئی خاص عمل یا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ اور طرز عمل میں بنیادی
محرکات کا اس طرح پابند نہیں ہوتا جیسے بیشتر جانوروں کے معاملہ میں ہم نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی
شیر یا چیتے کو چھیڑا جائے تو اس کے پہلے محرک یعنی غصہ کا جوابی عمل پنجہ مارنا ہوتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ اس کے
بہت مختلف ہوتا ہے اس کا یہ جوابی عمل صرف جبلی تحریک کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس میں عادات اور گزشتہ
تجربے کارفرما ہوتے ہیں چنانچہ ابتدا میں بہت کچھ کام بچے اپنے فوری جذبہ کے ماتحت کرتے ہیں۔ اسی طرح
بعض جاہل اور غیر مہذب لوگ بھی اپنے ابتدائی محرکات کے اثر سے بہت جلد کچھ نہ کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔ مگر مہذب

اور تجربہ کار آدمی بہت سے عادات پیدا کرتے ہیں۔ اپنے بہت سے جذبات پر قابو پاتے ہیں۔ بہت سی ناپسند عادتوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کا فیصلہ بیشتر جچا تلا ہوتا ہے۔ بچوں کو زندگی کا تجربہ کم ہوتا ہے۔ ان کی عادتیں ناپختہ ہوتی ہیں اور معلومات محدود اس لئے ان کے کاموں اور مشغلوں میں بے ساختگی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے عادات بھی کوئی مخصوص شکل اختیار کرنے لگتی ہیں وہ اپنے کاموں کو نتائج کی رو سے جانچنے اور عقل کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً جب چھوٹے بچے فٹ بال کھیلتے ہیں تو شروع میں گول کرنا اور دوسری جماعت کو ہرانا اپنا مقصد سمجھتے ہیں مگر ذرا سی دیر میں گول کرنے کا مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ گیند مارنا اپنا مقصد سمجھنے لگتے ہیں اپنی مقررہ جگہوں کو چھوڑ چھوڑ کر بال کے ارد گرد جم جاتے ہیں۔ اس مثال میں بچے گول کرنے کے مقصد کو بھول جاتے ہیں بلکہ چونکہ ان میں قوت ہے لہذا قوت کے اظہار سے اس طرح اطمینان حاصل کرتے ہیں کہ لات مارنے سے گیند کتنی دور تک گئی۔ جیسے جیسے ان کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کا خیال کرنے لگتے ہیں۔ منظم طور پر کھیلنے سے انھیں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے وہ کسی مقصد پر دیر تک قائم رہنے کے عادی ہونے لگتے ہیں۔ کسی مشغلہ پر دیر تک سوچ سکتے ہیں۔ اور زیادہ یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ یہ سب رجحانات۔ عادت اور تجربہ سے مناسب عمر میں بچہ میں نشو و نما پاتے ہیں۔

یہ بات کہ ابتدائی محرکات زندگی کے آخری محرکات نہیں ہیں بلکہ یہ چند اساسی رجحانات ہیں جن کی تشکیل آئندہ زندگی کے مواقع اور تجربات پر اپنا دارومدار رکھتی ہے۔ ایک چھوٹے بچہ کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔ بچوں کو ناآشنا چیزوں سے ایک قدرتی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک سمجھ دار دایہ چھوٹے بچہ کی اس خاصیت سے اس کے نہلانے اور صاف رکھنے میں اس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ دایہ ایک چھوٹے سے ٹب میں پانی ڈالتی ہے اس میں تھوڑا سا صابن گھول لیتی ہے۔ صابن کو گھولنے کے بعد ایک باریک نلکی سی اس میں بلبلے پیدا کرتی ہے۔ بچہ ان بلبلوں کو دیکھتا ہے اور بہت ذوق و شوق سے پانی کی طرف لپکتا ہے پانی کا درجہ حرارت معتدل ہے پانی میں وہ بلبلوں کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے اسے اس تجربہ سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس خوشی میں پانی کا خوف بچہ کے ذہن سے اتر جاتا ہے۔ شروع میں تو بلبلوں

کے لالچ سے بچہ پانی میں ہاتھ پیر مارتا ہے لیکن بعد میں پانی میں ہاتھ پیر مارنے سے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس طرح نہانے سے اسے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے اب وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مقررہ وقت پر نہانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کو صفائی اور غسل کرنے کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اس کو نہانے کو نہ ملے تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اس مثال میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح محرکات بدلتے جاتے ہیں۔ شروع میں آدمی جس تحریک سے کوئی کام کرنے لگ جاتا ہے بعد میں اس کام یا شغلہ کے دوران میں خود بخود ایسی تحریکیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جو کرنے والے کو اس کو جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہیں اس مثال سے ہم نے دیکھا کہ کس طرح جبلی محرکات عادات اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ شروع میں آدمی کے جوابی عمل بالکل شعوری محرکات سے طے ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے آدمی اپنی سیرت کی تدریجی تشکیل کے دوران میں ان ابتدائی محرکات کی تربیت کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ بعد میں جا کر نہ وہ صرف عادات اور فوری محرکات سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ وہ سوچ سمجھ کر بھی بہت کچھ اپنے طرز عمل کو طے کرتا ہے۔ چنانچہ جتنا زیادہ آدمی کام سمجھ بوجھ سے لیتا ہے اتنا اس کا کام زیادہ با تربیت اور جچا تلا ہوتا ہے۔ اس کے کام میں بے ساختگی اور من موجی پن کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر قدم کسی متعین منزل کی طرف بڑھا ہوتا ہے۔ اور اس کا ہر ایک کام کسی طے شدہ خاکہ کا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ محرک شعوری Impulse، خواہش، مقصد، ارادہ یہ سب محرک کی مختلف صورتیں ہیں جو سوچ بچار اور جبلی محرکات کے اثرات کی نسبتی کمی بیشی سے مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ہمیں ان مختلف الفاظ کی تشریح سے معلوم ہو جائے گا کہ سوچ بچار کس طرح جبلی محرکات کو بدلتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ محرک یا فوری جذبہ ہوتا ہے جس میں آدمی ایک دم بے ساختہ طور پر کسی کام کو کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے جیسے بچہ کھلونے کو دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکنے لگتا ہے اس صورت میں بچہ جو کچھ کرتا ہے اس سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر یہ آگاہی بالکل وقتی ہے۔ ذرا سی دیر میں اگر وہ چیز نظر سے غائب ہو جائے تو اسے بھول جاتا ہے دوسری بات ہے مقصد۔ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مقصد کی حالت میں طلب کی یہ کیفیت دیر تک رہتی ہے اس میں اس طلب کو پورا کرنے میں سوچ بچار کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس میں بچہ نہ صرف کسی چیز کو حاصل

کرتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں حاصل کرنے کے خاص خاص امکانات ہوتے ہیں۔ وہ ان امکانات کو سوچتا ہے۔ اور حصول مقصد کے لئے ذرائع سوچتا ہے مثلاً کسی چھوٹے بچہ کو اس کا باپ ایک خوبصورت تصویر دکھاتا ہے بچہ خوش ہوتا ہے اسے حاصل کرکے کچھ دیر تک اپنے پاس رکھتا ہے باپ اس کی توجہ کو ہٹاکر تصویر اٹھالیتا ہے اس اندیشہ سے کہ شاید بچہ تصویر خراب کرڈالے۔ بچہ کو تصویر یاد آتی ہے۔ اس کے لینے پر اصرار کرتا ہے روتا ہے۔ ماں کے پاس تصویر دلانے کے لئے دوڑتا ہے کسی اور قریبی رشتہ دار کو تصویر دلانے کے لئے آمادہ کرتا ہے اب یہ بچہ نہ صرف کسی فوری تحریک کے اثر سے کسی دیکھی ہوئی تصویر کو اٹھاتا ہے جیسے پہلے مثال میں ہم نے دیکھا بلکہ اس صورت میں تصویر غائب ہونے پر بھی تصویر کا تصور اس کے دماغ پر حاوی ہے۔ وہ تصویر دوبارہ حاصل کرنے کے لئے نئے طریقے سوچتا ہے۔ تصویر کی یاد بار بار سے ستاتی ہے۔ اس صورت میں بچہ زیادہ غور و فکر اور اپنے گزشتہ کامیاب تجربوں سے فائدہ اٹھاتا ہے مثلاً جب وہ دیکھتا ہے کہ انّا اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی۔ تو اماں کے پاس دوڑتا ہے۔ ان کو پریشان کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطالبہ اماں کے ذریعہ پورا کرانے میں کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ ارادہ کی صورت میں جوابی عمل اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہاں پر کسی کام کے کرنے کے لئے صرف ایک محرک نہیں ہوتا بلکہ کئی محرکات ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں مثلاً ایک بچہ مدرسہ بھیجا جاتا ہے راستے میں وہ دوسرے لڑکوں کو کھلے میدان میں مزے سے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ کھیلنے کے لئے جی بہت للچاتا ہے مگر کیا کرے مدرسہ نہ جائے تو والد ناراض ہوں۔ بچہ نیک طبیعت کا ہے۔ وہ والد کی ناراضگی کا بھی خیال کرتا ہے ادھر گلی ڈنڈے کی لالچ اور ساتھیوں کا بلاوا پھسلا رہا ہے۔ آخر کیا کرے۔ اس کشمکش کی حالت میں وہ تھوڑی دیر رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ والد کا ناراض کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مدرسہ ہی چلنا چاہیئے یہاں پر بچہ کو دو کاموں میں سے ایک کام کو ترجیح دینی پڑی۔ جب ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو اس صورت میں محض جبلی محرکات یا جبلی محرکات پر مبنی عادتیں آدمی کے طرز عمل میں فیصلہ کن نہیں ہوتیں بلکہ اسے کسی خاص رویتے کے اختیار کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سوچنے میں وہ اپنے گزشتہ عادات یا جبلی محرکات سے اثر قبول کرے کیونکہ آدمی جب کسی نئی مشکل سے دوچار ہوجاتا ہے

اور اسے حل کرنے کے لئے سوچتا ہے تو عام طور پر وہ اپنے گذشتہ علم اور تجربہ سے جس کی مدد سے وہ ایسے موقعوں پر کامیاب ہوا ہے کام لیتا ہے اور جب وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملتا تو اس کی روشنی میں احتیاط سے کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

تعلیم اور جبلت

گزشتہ سطروں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ جبلتیں بجائے خود ایسی محرکات نہیں ہیں جو ہمیشہ کے لئے ہماری زندگی پر حاوی ہوں۔ ان کے متعلق تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کے لئے ابتدائی محرکات کا کام دے سکتی ہیں۔ پھر جیسے جیسے تجربہ بڑھتا جاتا ہے ان کا اثر گھٹتا جاتا ہے آدمی نیا ذوق پیدا کرتا ہے۔ نئی عادتیں سیکھتا ہے۔ نئے مقاصد بناتا ہے۔ نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اس لئے شروع کی عادتیں مقاصد، مشاغل اور دلچسپیاں نئی حاصل شدہ دلچسپیوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور نئے پیدا شدہ محرکات آدمی کی زندگی میں مدد دیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آدمی کی اندرونی صلاحیتوں اور رجحانات پر بھروسہ کرکے ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ ان کی نشوونما خود رو ہو۔ کیونکہ یہ تبدیلی و ترقی کبھی خود بخود نہیں ہوا کرتی اس کے لئے خاص ماحول خاص اہتمام اور خاص طریقۂ کار کی ضرورت ہوتی ہے جب جا کے کہیں حسب منشا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس لئے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انسانی جبلت بالکل صحیح ہے اور اس کی آزادی ہی تعلیم و ترقی کے لئے کافی ہے وہ انسانی جبلت سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھتے ہیں جس طرح وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی فطرت بری ہے اس کو بدلنا چاہیئے۔ اور اس بنا پر بچہ کی خواہش اور منصوبہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور اس پر پابندی لگانا چاہتے ہیں اپنے خیالات میں زیادہ یاس مشرب ہیں اسی طرح اول الذکر لوگ زیادہ آس مشرب ہیں چنانچہ اول الذکر گروہ کا ایک ممتاز عالم روسو سماجی اثر پذیری کے خلاف بغاوت کرکے کہتا ہے۔ "خدا نے آدمی کو پیدا کیا مگر سماج نے آدمی کو بگاڑ کر شہری بنایا" لیکن ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال ہے کہ انسان نہ فطرتاً برا ہے کہ اس کی ہر ایک امنگ کو دبایا جائے اور نہ اتنا سلیم الطبع ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے طور پر بغیر

رہنمائی کے بہتر راہ نکال سکے اور اچھا اور کامیاب انسان بن سکے۔

انسان تہذیب و شائستگی کے لئے صلاحیتیں ضرور رکھتا ہے مگر تعلیم و تربیت کے بغیر وہ جلا نہیں پا سکتیں۔ چنانچہ ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں بچہ کو تعلیم و تربیت کا موقع نہیں ملا ہے وہاں باوجود آزادی کے جانوروں سے کچھ بہتر زندگی نہیں گذارتا اس لئے تہذیب و شائستگی، عمدہ خیالات، پاکیزہ عادتیں، اچھا ذوق، بلند مقاصد اور عمدہ مہارت اور کاریگری بغیر مناسب ماحول اور تعلیم تربیت کے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتے آج سماج تہذیب و ترقی کے جس معیار پر پہنچ گیا ہے اس نے اور بھی اس بات کو لازمی کر دیا ہے کہ انسان کی تربیت کے لئے ایسا مخصوص ادارہ ہونا چاہیئے جہاں پر وہ شہری زندگی کے لئے بہتر طریقہ پر تیاری کر سکے۔ یہ تربیت صرف کہنے سننے سے عمل میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے لئے تو ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں بچہ سماج کے مختلف مشاغل سے آشنا ہو جائے۔

اس لئے مدرسہ یا تعلیم گاہ ہمارے سماج کا بہترین نمونہ ہونا چاہیئے۔

بچہ کی قدرتی صلاحیتوں کی تربیت بذریعہ سماجی ماحول کے سلسلہ میں امریکہ کا ممتاز فلسفی اور ماہر تعلیمات جان ڈیوی کہتا ہے "بذات خود قدرتی جبلتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں کیونکہ انسان اپنی دلچسپیوں میں سماجی ماحول سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ عقاب اور شیر کی مثال میں غصہ کو براہ راست زندگی کے بچاؤ اور برقرار رکھنے کا مفید ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے مگر انسان کی زندگی میں یہ جبلت بالکل بے معنی سی چیز رہ جاتی ہے۔ اگر اس کو سماج کی اثراندازی سے الگ سمجھا جائے تو ایسی حالت میں غصہ بھڑاس کے بے کار اخراج سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ غصہ میں اس وقت معنی پیدا ہو جاتے ہیں جب وہ سلگنے والا رخ ہو۔ ایک اندرونی کوفت اور خلش ہو۔ ایک اکسانے والی تحریک ہو۔ ایک خوفناک انتقامی جذبہ ہو یا ایک بھڑکنے والا شعلہ ہو۔ اگرچہ یہ بامعنی مظاہر پیدائشی تحریکات کے ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ سماج کے جوابی طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں یہ اور اس قسم کے دوسرے اشتعال انگیز مظاہر محض جبلی نہیں ہیں بلکہ یہ عادتیں ہیں جو دوسروں کے تعلق سے بن گئی ہیں۔ اور یہ دوسرے لوگ بھی اپنی مخصوص عادتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی عادتوں میں غصہ کی اندھی قوت کو خاص مواقع پر استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں کچھ معنی پیدا ہو جاتے ہیں"

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری جبلتوں کی تربیت اور ہماری عادتوں کی تشکیل کس قدر سماجی اثرات کی مرہون منت ہے۔

قدرتی صلاحیتوں کے بارے میں اس قدر بیان کرنے کے بعد اب ہم ان کو صاف طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نفسیات کی اصطلاح میں ان تمام صلاحیتوں اور رجحانات کے لئے ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ جبلت کہلاتا ہے۔ صاف اور سادہ لفظوں میں "جبلت" سے مراد انسان کے وہ موروثی رجحانات ہیں جو خاص خاص مواقع پر کم سے کم تحریک سے خود بخود کوئی خاص جوابی عمل پیدا کرتے ہیں مثلاً بچہ کو یکایک زمین پر گرانے سے ڈر لگتا ہے اسی طرح کسی آدمی کی خودداری کو ٹھیس لگانے سے اس کو غصہ آتا ہے۔ اور وہ انتقامی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا اگر کسی کو قید تنہائی دی جائے تو وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی محبت کو ترستا ہے یہ اور اس قسم کی دیگر جبلتیں انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے ابھارنے سے آدمی کسی خاص طرز عمل کے اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جبلت کے سمجھانے کے لیے جب اس قسم کی مثالیں دی جاتی ہیں تو اس پر یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ اصلی اور پیدائشی رجحانات نہیں ہیں بلکہ یہ چند حاصل کردہ عادتیں ہیں جن کو انسان نے اپنے تجربہ سے حاصل کیا ہے مثلاً بچہ گرنے سے اس لئے ڈرتا ہے کہ شاید وہ اس سے قبل یہ تلخ تجربہ اٹھا چکا ہو۔ یا آدمی قید تنہائی اس لئے محسوس کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک ماں باپ بھائی بہن، عزیز اقارب اور دوستوں کے ساتھ رہ چکا ہے اور ان سے لطف اندوزی حاصل کی ہے اس لئے جب اسے ان کی صحبت کی خوشی سے محروم کیا جاتا ہے تو اس پر اداسی چھا جاتی ہے پروفیسر وڈ ورتھ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جبلت" کے سمجھنے میں اس قسم کی الجھنیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم عادات اور جبلتوں کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جبلت ہی ہے جو عادت کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے۔ یہ جبلت ہی پر تو عادت، تجربہ، اور تعلیم کا سارا قصر تعمیر کیا گیا ہے۔ کھانے کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک عادت ہے کیونکہ یہ تو ہر جاندار کی ایک لازمی ضرورت ہے مگر یہ عادت بھی ہے اس لئے

آدمی کو خاص وقتوں میں بھوک لگتی ہے۔ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص چیزیں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خاص خاص لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا ہے۔ غرض کھانا ایک طبعی ضرورت کے ساتھ ایک عادت بھی ہے اور آدمی میں ترقی اور اصلاح کی جتنی گنجائش ہے وہ کھانے میں بھی موجود ہے۔
اسی مطلب کو پروفیسر میکڈوگل نے اپنی کتاب Social Psycology میں یوں واضح کیا ہے کہ بالواسطہ یا براہ راست جبلتیں آدمی کے تمام اعمال کے لئے اولین محرک ہیں۔ کسی جبلت کی بے ساختہ تحریک یا جبلت کے ذریعہ حاصل شدہ عادت کی تحریک سے ہر ایک شغلہ شروع ہوتا ہے اور اختتام کو پہنچتا ہے۔ جبلی تحریکات آدمی کے مقصد کو متعین کر دیتی ہیں اور اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کو قوت دیتی ہیں۔

غرض انسان عام جانوروں کے برخلاف بہت سادہ جبلتیں لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قدم قدم پر اسے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی شائستگی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تطابق کی کتنی صلاحیت ہے۔ وہ کسی نئے کام کو کس قدر آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ موقع پڑ جانے پر وہ اپنی عادتوں کو کیسے بدل سکتا ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ کس طرح نباہ کرتا ہے اس کی شخصیت میں کس درجہ اثر اندازی اور اثر پذیری کی اہلیت پائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ

ان سادہ اور خام جبلتوں کی وجہ سے شروع میں انسان اپنے ماحول کے اندر بالکل بے بس ہو جاتا ہے اگر ماں باپ کا سہارا نہ ہو تو شاید چند گھنٹوں سے زیادہ دنیا میں نہ رہ سکے یہ دوسری بات ہے کہ بالقوی وہ اپنی انھیں خام صلاحیتوں کی بدولت بہت تھوڑے عرصہ کے اندر مناسب ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر سے تمدن کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر دوسرے جانوروں کا پہنچنا مشکل ہے حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جانور پیدائشی طور پر بہت سی مہارتیں جانتے ہیں مثلاً بعض بھڑوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی گزشتہ تجربہ یا نقل کے اپنے لئے ایک مخصوص قسم کا چھتہ تیار کرتی ہیں جس میں مادہ انڈے دیتی ہے اور اس طرح یہ خاص طرز کا گھونسلہ ایک نسل سے دوسری نسل تک بغیر وراثت کے اس طرح چلتا ہے کہ دوسری نسل کو پہلی نسل کی کاریگری کا کچھ پتہ نہیں لگتا اس لئے کہ دوسری نسل کے انڈے

سے برآمد ہونے سے قبل ہی پہلی نسل مرجاتی ہے۔

دور کیوں جائیں کتے کو دیکھئے بغیر کسی گزشتہ تجربہ اور مشق کے پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ یہی حال بطخ کا ہے۔ مگر انسان کی تربیت کے لئے قدرت نے اس کو ایسی خام صلاحیتیں بخشی ہیں جن کی صحیح تعلیم و تربیت سے وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہوجاتا ہے۔

غرض یہ کہ تعلیم و تربیت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس کے دو بڑے حصے کئے جاسکتے ہیں ایک تو انسان کی خام صلاحیتیں" یا "جبلتیں" جن میں عمر اور تجربے کو وقت بوقت تبدیلی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف سماج یا معاشرتی ماحول کا ہمہ گیر نظم جس سے جاہل اور عالم بھی متاثر ہوتے ہیں اور جن کے مقررہ اداروں، رسوم اور روایات و دستور کے سانچے میں قوم کے اخلاق و عادات، علم اور تجربہ ڈھل جاتے ہیں۔ اور انھیں کے ذریعہ افراد کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے۔ اس مطلب کو پروفیسر جان ڈوئی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی کتاب "Human Nature & Conduct" میں سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں "بچہ کی منتشر اور غیر مربوط تحریکیں کبھی بروئے کار نہیں آسکتیں جب تک ان کو سماجی نگرانی اور تعلقات سے رنگا نہ جائے۔ اس کی ابتدائی تحریکیں یا کاوشیں دراصل اپنے اسلاف اور بزرگوں کے مزید علم اور پختہ مہارتوں کو جذب کرنے کے لئے نقطہائے آغاز ہیں۔ یہ وہ ریشے ہیں جو اس غرض سے پھیلے ہوتے ہیں کہ وہ سماج کے دستور و آئین سے وہ خوراک حاصل کریں جس کے سہارے پر وہ آزاد و مستقل زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو موجودہ سماجی قوت کو انفرادی قابلیت میں تبدیل کرتے ہیں یہی تعمیر نو کے ذرائع ہیں۔

"پاکستان"

(اس مضمون کو جن بزرگ نے ہمارے پاس رسالہ جامعہ میں اپنے نام سے شایع کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا بعد میں ان کی یہ ہدایت ہمیں موصول ہوئی کہ یہ مضمون ان کے نام سے شایع نہ کیا جائے بلکہ ان کے چھوٹے بھائی کے نام سے شایع کیا جائے جو کالج میں تعلیم پا رہے ہیں ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے کہ ایک زیر تعلیم نوجوان کے نام کے ساتھ ان کے بڑے بھائی کے وہ خیالات خواہ مخواہ منسوب کئے جائیں جنھیں ان کی مصلحت اندیشی اپنے نام کے ساتھ شایع کرانا مناسب نہیں سمجھتی۔ ہم اس مضمون کو واپس کر دیتے لیکن چونکہ ہم اس کی کتابت کرا چکے تھے اس لئے مصنف کے نام کو مخفی رکھ کر اسے شایع کر رہے ہیں)

رسالہ جامعہ کی اشاعت بابت جنوری میں ایک صاحب نے جنھوں نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تحریک پاکستان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان تمام شکوک و شبہات کو قبل از وقت پیش کر دیا ہے جو اس تحریک کا ایک مخالف پیش کر سکتا ہے۔ سب سے اول آپ نے اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کی رائے میں ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی کے بعد ملکوں کی طبعی تقسیموں اور طبقات الارض کی تفریقوں کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ براعظم یورپ ماسوائے روس رقبہ میں ہندوستان کے برابر ہے۔ ذرائع آمد و رفت و وسائل خبر رسانی کی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کو یورپ سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ جہاں پر یورپ میں دو لاکھ میل سے زیادہ لمبی لائن ہے۔ ہندوستان میں ریلوں کی لمبائی ۴۰ ہزار کے قریب ہے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود یورپ کی تقسیم ۲۶ جغرافیائی تقطعوں میں ہو چکی ہے جہاں پر جدا جدا قومی

حکومتیں قائم ہیں۔ اگر ہندوستان میں کلکتہ سے پشاور تک اور بمبئی سے دہلی۔ پشاور۔ کوئٹہ اور کراچی تک آمد و رفت کی سہولتوں کو ترقی ہو چکی ہے تو یورپ میں پیرس سے قسطنطنیہ (اسلامبول) اور برلن سے روم تک کے طویل سفر بھی ہوائی اور خشکی کے راستوں سے کم از کم مدت میں طے ہو سکتے ہیں۔ دریائے ڈینیوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ ہے اور نصف درجن کے قریب ملکوں میں سے گذرتا ہے۔ جو اسے اپنی تجارت و وسائل آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ملک سیاسی طور پر جدا ہیں۔ لہٰذا وسائل آمد و رفت کسی ملک کے مخصوص محل وقوع کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔ پاکستان حقیقت میں ایک قدرتی خطۂ زمین ہے جو طبعی و جغرافیائی طور پر ہندوستان سے بالکل جدا ہے۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون اس سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کی قدرتی حد بندی جنوب و مشرق کی طرف ریگستان راجپوتانہ و دریائے جمنا کرتے ہیں۔ ان کی آب و ہوا ہندوستان کے مقابلہ میں گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہے۔ اس کے وسائل آمد و رفت ہندوستان سے بالکل جدا ہیں۔ این ڈبلیو آر ریلوے کی شاخیں اس سرزمین کے اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی ہیں جن سے پاکستان کے مختلف حصے یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے بحری تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ اس سرزمین کے تجارتی شہروں کا جو براہ راست تعلق کراچی کی بندرگاہ سے ہے وہ اور کسی دوسری بندرگاہ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لوگ اپنی طرز معاشرت۔ رسم و رواج۔ تمدن و تہذیب جسمانی وضع قطع لباس۔ تاریخی روایات فوجی رجحان میں ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ یوپی مدراس و بنگال کے باشندے پنجابی۔ سرحدی یا سندھی سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتے چہ جائیکہ ان کو ملا کر ایک متحد ہندوستانی قومیت قائم کی جائے۔ لہٰذا جدا محل وقوع و جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اور مخصوص حالات و روایات کے لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے بالکل الگ تھلگ واقع ہے۔

پاکستان کی جداہستی کے جواز میں دوسری دلیل امتیاز نسل ہے لیکن ہم اسے پیشتر ذکر کر چکے ہیں کہ دنیا میں خالص نسل رکھنے والے لوگوں کا

وجود نہیں۔ اگر یہ بات تسلیم ہے تو پھر فلسطین میں عرب یہودی آئرلینڈ میں آئرش اور السٹر کے رہنے والے۔ وسط یورپ میں سلافی اقوام۔ جنوبی یورپ کی لاطینی اقوام وغیرہ کیوں نسلی امتیازوں کی بنا پر جدا قوموں میں منقسم ہیں۔ آئرلینڈ کے باشندے مذہباً عیسائی ہیں۔ صدہا سال سے ایک ہی ملک میں آباد ہیں۔ سب انگریزی طرز کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن مخصوص نسلی امتیاز کی بنا پر جدا حکومتوں میں منقسم ہیں۔ السٹر کے رہنے والے اپنے آپ کو انگریزی نسل سے منسوب کرتے ہیں اور بقیہ آئرلینڈ کے رہنے والے اپنی قدیم سیلٹک نسل پر فخر کرتے ہیں۔ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ پولز۔ روسی۔ زیچ۔ سرب۔ کروٹ بلغار سب سلافی النسل اقوام ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مخصوص نسلی امتیاز کو قائم رکھتی ہیں قوموں کی تشکیل میں نسلی امتیاز کے جذبہ نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے پاکستان کے باشندے وسط ایشیائی اقوام سے نسبت رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً زمانہ ماضی میں اس سرزمین میں آباد ہوتی رہیں ہندوستان کے باقی حصوں میں آریہ نسل کے لوگ اصلی باشندوں سے مخلوط ہوئے لیکن یہاں بیرونی اقوام غالب حیثیت میں رہیں اور اصلی باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے یہی وجہ ہے کہ جسمانی مضبوطی۔ قدوقامت۔ رنگت۔ چہرے کی ساخت کے لحاظ سے یہاں کے باشندے بقیہ ہندوستان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

آپ نے مذہب کے اختلاف کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ اس سے مجھے اتفاق ہے لیکن زبان کے اختلاف کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا ہے کہ اس کی وجہ بھی مذہبی اختلاف ہے۔ کیا بنگال میں جہاں مسلمان آبادی کا ۵۰ فی صدی ہیں مذہبی اختلاف کے ہوتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ایک ہی نہیں ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مذہب زبان کے اختلاف کا باعث نہیں۔ پاکستان کے لوگ چونکہ نسل کے لحاظ سے بقیہ ہندوستان سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے زبان کا اختلاف اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان ہی ایسی سرزمین ہے جہاں پر کہ اردو سب باشندوں کے لئے مشترک زبان ہے اور اس کا اثر و رسوخ نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے یہاں پر ہندو اخبارات و رسائل کثرت سے اردو میں شائع

ہوتے ہیں پرائمری و مڈل مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ سرکاری دفاتر میں اعلیٰ ہی درباری زبان کا درجہ حاصل ہے بقیہ ہندوستان کی مانند یہاں پر بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل وغیرہ مختلف زبانوں سے مقابلہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی اس علاقہ کے باشندے بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں آپس میں زیادہ قریب ہیں۔ اسلام کے براہ راست غالب اثر کے باعث اس سرزمین میں ہندوؤں میں آریہ سماج تحریک کو فروغ حاصل ہوا جو اپنے آپ کو توحید پرست و اہل کتاب سمجھتے ہیں اور قدیم ہندو بت پرستی کے مخالف ہیں۔ سکھوں میں بھی اسی طرح اسلامی خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مورتی پوجا و بت پرستی کو اس سرزمین میں وہ وقار حاصل نہیں ہے جو اسے ہندوستان میں حاصل ہے۔

اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آپ نے یہ سوال کیا ہے کہ ہم اس اکثریت کو کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر اسی سوال کو ہم ہندوستان پر عاید کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو اکثریت کے پیش نظر کیا چیز ہے اس کا جواب ایک ہندو قوم پرست کی طرف سے یہ ہوگا کہ مکمل آزادی جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اسی طرح پاکستان کا ایک مسلمان قوم پرست یہ جواب دینے کا حق رکھتا ہے کہ وہ پاکستان کی مکمل آزادی چاہتا ہے جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو عنصر غالب رہے گا اور ہندو تہذیب کو فوقیت حاصل ہوگی لیکن یہ نتیجہ فی نفسہ مطلوب نہیں بلکہ خاص ماحول کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں فیڈرل نظامِ حکومت کے قیام سے مسلمان عنصر غالب رہے گا اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہوگا لیکن یہ نتیجہ بھی فی نفسہ مطلوب نہیں۔

آپ نے یہ تصور کرتے ہوئے کہ پاکستان میں مسلمان خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کریں گے جس میں غیر مسلم اقوام سے امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا۔ ان کی آبادی کو ظلم سے بتدریج کم کیا جائے گا ان کو فوجی و سول ملازمت کے حقوق سے محروم کیا جائے گا اس امر کا ثبوت دینے کی

کوشش کی ہے کہ مسلمان حکومت کے اہل نہیں۔ اور ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حمایت پر انصاف پسند حکومت قائم ہو سکتی ہے لیکن پاکستان میں محض اس لئے حکومت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمان غیر مسلم اقوام سے رواداری کا سلوک نہیں کریں گے اگر آج انگریز فیڈرل نظام حکومت میں چند تبدیلیاں کر دیں تو کانگرس کا انتہا پسند طبقہ بھی انگریز سے معاونت کرنے کو تیار ہے۔ کیا مرکزی ہند میں فیڈرل نظام حکومت سے وہ شکوک و شبہات مسلمانوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوں گے جن کا ذکر آپ نے پاکستان کی صورت میں کیا ہے اگر اسی طرح کا ایک نظام حکومت پاکستان میں قائم ہو جائے تو یہ غیر مسلموں کے لئے کیونکر مضرت رساں ہو گا۔

رہا یہ سوال کہ جب ہمارا مقصد مشترکہ فائدہ ہے تو پھر اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں پر پھر آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مطلوب مسلمان کی اکثریت کا تحفظ نہیں بلکہ پاکستان کا جدید انتظام حکومت ہے جس میں پاکستان کے باشندے کو ریلوے۔ ڈاکخانہ و تار برقی۔ جملہ ذرائع آمد و رفت۔ ہوائی۔ بری و بحری فوج۔ امورات خارجہ محصول اشیائے درآمد و برآمد۔ اندرونی و بیرونی تجارت۔ نقل و حرکت آبادی وغیرہ پر پورا پورا اختیار ہو گا پاکستان ہندوستان کا ایک جزو بن کر اپنی انفرادیت و اہمیت کو کھونا نہیں چاہتا یہاں کے باشندے اپنے مخصوص حالات کے مطابق ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر جذبہ وطن پرستی سلطنت روس۔ ٹرکی و آسٹریا ہنگری کو ایک درجن سے زیادہ آزاد حصوں میں تقسیم کرسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ براعظم ہندوستان میں یہ جذبہ کارفرما نہ ہو ان تینوں سلطنتوں میں صدہا سال تک مختلف مذاہب و نسلوں کے لوگ باہم شیر و شکر ہو کر رہے۔ اقتصادی و معاشی امور میں سب کا مفاد مشترک تھا۔ روس میں غیر روسی اقوام کل آبادی کا ۲۵ فی صدی حصہ تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے مغرب میں پولینڈ۔ ایستونیہ۔ لٹویہ۔ لتھونیہ اور فن لینڈ کی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ حالانکہ یہ پانچوں علاقے جغرافیائی لحاظ سے ملک روس کا جزو تھے اور کوئی قدرتی حدبندی ان کو علیحدہ

ملک روس سے جدا نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح سلطنت آسٹریا ہنگری کی مختلف اقوام جو سب کی سب رومن کیتھولک مذہب کی پیرو ہیں علیحدہ علیحدہ علاقوں میں مالک قرار دی گئیں۔ سلطنت ٹرکی میں چار سو سال تک عرب و ترک ایک ہی حکومت کے ماتحت رہے۔ ترکی اور عربی سوال کو کبھی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ان علاقوں میں جہاں عربوں کی اکثریت تھی ان کا حق خود اختیاری تسلیم کیا گیا۔

پاکستان کے بعد ہندوستان کا دوسرا حصہ جو جدید انتظام حکومت قائم کرنے کا حقدار ہے وہ مشرقی بنگال و آسام ہے۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فی صدی کے قریب ہے اس کے ۱۰۰ اضلاع میں سے ۱۶ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور تین اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت میں ہیں۔ دریائے گنگا مشرقی بنگال کو مغربی بنگال سے جدا کرتا ہے۔ آسام کا میدانی حصہ جس میں سلہٹ اور گوالپاڑہ کے اضلاع شامل ہیں دراصل مشرقی بنگال کا ہی ایک حصہ ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر بنگالی مسلمان ہیں جو مشرقی بنگال سے جاکر آباد ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی مرتبہ مشرقی بنگال سے اپنے اضلاع کے الحاق کی کوشش کی لیکن وہ محض اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے کہ گورنمنٹ صوبۂ آسام کی جداگانہ ہستی کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان دونوں اضلاع کی علیحدگی کی صورت میں آسام کے رقبہ و آبادی میں اس حد تک کمی ہونے کا اندیشہ تھا کہ یہ ملک ایک جدا صوبہ نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا اس مشکل کا حل اسی صورت میں ہے کہ مشرقی بنگال و آسام کے الحاق سے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے اور اس جدید صوبہ کی حدبندی انھی پرانے حدود پر قائم کی جائے جس طرح سنہ ۱۹۱۱ء سے پیشتر مشرقی بنگال و آسام کا صوبہ قائم تھا اس جدید صوبہ میں ۴ کروڑ کی آبادی میں سے مسلمانوں کی تعداد ۳ کروڑ کے قریب ہو جائے گی اگر پاکستان و مشرقی بنگال و آسام برِاعظم ہند کے جدا حصے تسلیم کرلئے جائیں تو مسلمانوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے۔ ان ہر دو علاقوں میں کل آبادی ۸ کروڑ کے قریب ہوگی جس میں سے مسلمان تعداد میں ۶ کروڑ کے قریب ہوں گے بقیہ ہندوستان میں دو و ڈھائی کروڑ کے

درمیان مسلمان رہ جائیں گے جو بطور اقلیت کے شمار کیئے جا سکتے ہیں اور ان کو وہی حقوق دیئے
جا سکتے ہیں جو ان ہر دو اسلامی صوبوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو دیئے جائیں گے۔

پاکستان کے قدرتی ذرائع بہت وسیع اور غیر محدود ہیں۔ برِ اعظم ہند میں پاکستان ہی ایک
ایسا حصہ ہے جہاں پر کہ موجودہ آبادی سے تین گناہ زیادہ آبادی سما سکتی ہے کشمیر، پنجاب و سندھ
میں بڑے وسیع قطعات اراضی زیر کاشت لائے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے جنگلات اس
کی عمارتی و صنعتی ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ چراگاہوں میں مویشی بکثرت پالے جا سکتے ہیں۔ معدنیات
کی بھی بہتات ہے جو بوقت ضرورت ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ دے سکتی ہیں۔ بجلی کی
طاقت اسقدر مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے کہ جس سے سینکڑوں کارخانے و کلیں چل سکیں۔ ذرائع آمدنی
میں ریلوے کی آمدنی ای آئی آر کے بعد ہندوستان کے ہر دوسری ریلوے لائن سے زیادہ ہے پاکستان
میں معاملہ زمین و آبپاشی کی آمدنی بنگال۔ یوپی۔ مدراس ہر ایک سے زیادہ ہے علیحدگی کی صورت
میں انکم ٹیکس و محصول بندرگاہ کی آمدنی جو خزانہ مرکزی میں جمع ہوتی ہے براہ راست پاکستان
کی آمدنی میں شمار ہوگی اور یہ زائد آمدنی صوبۂ سرحد و بلوچستان کے اخراجات کی کفیل ہو سکتی ہے
پاکستان میں وسائل دولت کو ترقی دینے کے لئے مزدوروں کی کمی نہیں۔ قومی حکومت کے قیام
سے صنعت و حرفت کو لازمی فروغ ہوگا کوئی ملک آغاز میں سرمایہ۔ تنظیم و ماہر مزدوروں سے
بیک وقت مستفید نہیں ہو سکتا۔ ٹرکی جدید جو آج اس قدر ترقی کر رہا ہے جنگ یورپ سے پیشتر
اقتصادی طور پر پاکستان سے بدتر حالت میں تھا۔ وسائل دولت غیر ترقی یافتہ حالت میں
تھے۔ ملک میں سرمایہ کی کمی تھی۔ تمام تجارت اجنبی اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا ملک میں خاطر
خواہ انتظام نہیں تھا۔ ترک اپنے اصلی وطن ایشیائے کوچک میں غیروں کے دست نگر
تھے زراعت۔ سپہگری یا ملازمت ان کا پیشہ تھا۔ ملک کی اندرونی تجارت پر یونانی ارمنی۔ یہودی
لوگوں کا قبضہ تھا۔ بڑے بڑے مشہور شعبہ جات جیسے ڈاکٹری معلمی۔ بنکنگ دوکان داری وغیرہ
غیر ترکی اقوام کے ہاتھ میں تھے۔ جس طرح آج پاکستان کا سرمایہ و تجارت ہندو کے قبضہ میں ہے

اسی طرح ٹرکی کا تمام سرمایہ و تجارت یونانی یہودی وارمی اقوام کے قبضہ میں تھی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ٹرکی قوم میں قومی احساس اس حد تک پیدا ہوا کہ ہر مشکل سے مشکل مسئلہ ان کے لئے آسان ہوگیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اگر پاکستان کے مسلمان اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے عزم بالجزم کریں تو وہ کامیاب ہو جائیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور پاکستان کو ہندوستان سے جدا کرنے کی صورت میں تبلیغ کے مواقعات کم ہو جائیں گے۔ یہ ایک فرضی تخیل ہے اسلام کی اصلی و حقیقی تبلیغ یہ ہے کہ ہر مسلمان صحیح رنگ میں مسلمان بن جائے۔ پاکستان کے مسلمان اگر اپنی علیٰحدہ و آزاد حکومت میں اسلامی روایات و اصولوں پر پورے طور پر عمل کریں گے تو یقیناً اس کا اثر براہ راست ہمسایہ اقوام پر پڑے گا۔ آج ہر کام میں تنظیم کی ضرورت ہے۔ انفرادی کوشش سے کوئی کام پورے طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر پاکستان کے مسلمان دنیوی و دینی رنگ میں جملہ اسلامی صفات کے حامل بن جائیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نمونہ کو دیکھ کر دنیا میں اشاعتِ اسلام کے کام کو فروغ حاصل ہو جائے' آپ نے مشکلات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ در اصل حالت مایوسی کا اظہار ہے پاکستانی مسلمان اپنے مستقبل کو امید افزا سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے۔ وہ اپنے دل میں آزادی کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسی آزادی کا خواہشمند ہے جو ہمیشہ کے لئے اس کو انگریز ہندو دونوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ اور اسے اپنی قسمت کا پورا مالک بنا دے۔ ہندوستان کا مسلمان آج دو مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ سیاسی طور پر وہ انگریز کا غلام ہے لیکن اقتصادی طور پر ہندو کا دست نگر ہے۔ اگر آج اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس کی آزادی اور دولت پر ہر دو اقوام نے قبضہ کیا ہوا ہے تو مسلمان کا مسئلہ بہت جلد حل ہو سکتا ہے۔

عہدِ وسطیٰ[1] میں یورپ کی حالت

سنہ ۱۱۰۰ء میں دنیا کے بارے میں یورپ کا تصور

چند بڑے عالموں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو یورپ کے باقی لوگوں کی کل دنیا سنہ ۱۱۰۰ء میں جس جگہ پیدا ہوئے تھے صرف اس کے آس پاس علاقہ یا زیادہ سے زیادہ قریب کے چند میلوں میں جو گاؤں آباد تھے ان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دور دراز مقامات کا سفر اکثر و بیشتر وہ نہیں کرتے تھے۔ سڑکوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو تھیں ان کی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کے بیشتر حصہ پر جنگل کھڑے تھے اور اکیلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ نہ ریلیں تھیں نہ جہاز تھے سوائے کمزور بادبانی کشتیوں کے اور موٹر بھی نہیں تھے۔ کبھی کبھار پیدل یا گھوڑے پر دوسرے گاؤں کا سفر کیا جاتا تھا اور اسے زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سفر کے لئے بھی بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی تھی اور بڑی تیاریاں کرنا پڑتی تھیں اور اس کا بعد میں برسوں تک تذکرہ جاری رکھا جاتا تھا۔

چند بڑے عالموں کو دنیا کے جن حصوں کا علم تھا انہیں حاشیہ کے نقشہ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ نقشہ کے اندر جو سیاہ حصہ ہے اس سے لوگ ابھی تک بالکل ناواقف تھے۔ ان کے دنیا کے تصور میں یورپ کا بیشتر حصہ ایشیا کا کچھ حصہ اور افریقہ کے شمالی اور مغربی ساحل کے قریب کی ایک تنگ اور لانبی کتر شامل تھی۔

---

[1] عہد وسطیٰ سنہ ۴۷۶ء سے شروع ہوتا ہے یعنی جب رومیوں کا تسلط یورپ پر ختم ہو گیا تھا اور سنہ ۱۴۵۳ء یعنی موجودہ عہد کی ابتدا تک جاری رہتا ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ء میں یورپ کی زندگی آئیے عہد وسطیٰ کے یورپ پر جادو کے جہاز پر بیٹھ کر سفر کریں۔ اس طرح ہم پورے براعظم کو بہت تھوڑے عرصہ میں دیکھ سکیں گے۔ مصر کے اسکندریہ سے ہم اپنا سفر شروع کریں گے اور یورپ سے ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ جائیں گے۔ ہم وینس سے گذریں گے جو نہروں کا شہر ہے۔ راستہ میں ہمیں بیسیوں چھوٹے چھوٹے قلعے نظر آئیں گے جن کے گرداگرد گاؤں بسے ہوں گے۔ پیرس پر بھی ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں گے جہاں کی گندگی اور تنگ گنجان آبادی سے ہماری طبیعت مکدر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ محسوس کریں گے کہ پیرس نے یورپ کا ایک اہم شہر بننا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم لندن پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم اسے بالکل نہ پہچان سکیں گے کیونکہ مکان بہت نیچے نیچے لکڑی کے بنے ہوئے اور پھوس کے چھپر کے دکھائی دیں گے۔ جب ہم شہر پر سے گذریں گے تو ہمارے منظر کو دھندلا کرنے کے لئے دھوئیں کی کوئی باریک سی لکیر بھی کہیں نظر نہ آئے گی۔ آمد ورفت کے شور کی گڑگڑاہٹ کا کہیں نام ونشان بھی نہ ہوگا۔ اسٹیشنوں پر ریلیں تیزی سے آتی جاتی نظر نہیں آئیں گی موٹروں کے ہارن کا شور بھی سنائی نہ دے گا۔ شہر بالکل خاموش اور سویا ہوا نظر آئے گا۔ بیل آہستہ آہستہ بھدی گاڑیوں کو کھینچتے دکھائی دیں گے۔ لدے ہوئے چھوٹے گدھے بھی دوڑتے نظر آئیں گے۔ لیکن نہ تو فولاد کی کلیں دھواں اگلتی ہوں گی نہ فیکٹریاں ہوں گی۔ نہ بجلی کے تار ہوں گے نہ ہوائی جہاز بلکہ جس یورپ کا مشاہدہ ہم اس زمانے میں کریں گے اس میں ہمیں شہر اور قصبے بہت کم نظر آئیں گے۔ یورپ کے اکثر لوگ ان چھوٹی بستیوں میں آباد نظر آئیں گے جنھیں مینر (MANORS) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مینر کی زندگی مینر میں مرکزی حیثیت زمیندار کی گڑھی کو حاصل ہوتی تھی۔ یہ گڑھی یا قلعہ بھورے رنگ کے پتھروں کا ایک بڑا مکان ہوا کرتا تھا جو عموماً کسی پہاڑی پر بنایا جاتا تھا۔ اس کے گرداگرد عمدہ کھیت اور گاؤں کے درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ درختوں کے درمیان مچھلی پکڑنے کے لئے ایک تالاب ہوتا تھا اور درختوں کی زمین میں زمیندار کے شکار کھیلنے کے لئے جانور ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا اس گڑھی سے قریب ہی ایک چھوٹے گاؤں کی مختصر جھونپڑیاں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں بہت کم حیثیت اور خراب ہوتی تھیں اور ان کے رہنے والوں کو اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ گڑھی کے رہنے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ گاؤں کے آگے غلہ

کے کھیت اور درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ ان کھیتوں سے آگے ہر طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں سے گذرنے کے لئے کوئی سڑک۔ بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ صرف بھدی لکیریں اور راستے ہوتے تھے۔

امیروں اور پادریوں کا طبقہ زمین کے بیشتر حصہ کا مالک تھا۔ کچھ کسان بھی ایسے تھے۔ جن کی گھر کی زمینداری تھی لیکن ان کے قبضہ میں رقبہ بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔ باقی سب لوگ گڑھی کے زمیندار کے ماتحت ہوتے تھے زمیندار کو اپنی رعایا پر بیچنے اور خریدنے کے علاوہ باقی سب طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد زمیندار کو زمین کے ساتھ رعایا بھی ترکہ میں ملا کرتی تھی اور زمیندار اپنی اس رعایا اور ان کی اولاد کو اپنے مرنے کے بعد اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے ترکہ میں چھوڑ جایا کرتا تھا۔

زمیندار کی رعیت میں جو لوگ شامل تھے نہ تو زمین کو خرید سکتے تھے نہ فروخت کر سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ زمین کو چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح یہ جس زمین پر پیدا ہوتے تھے اسی زمین سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے پابند تھے۔ انھیں اپنے زمیندار کی پوری طرح اطاعت کرنا پڑتی تھی اور زمیندار کی حفاظت کے معاوضہ میں اس کے کھیتوں کی جتائی، بزائی اور کٹائی کیا کرتے تھے۔ اپنی کچھ پیداوار کو وہ ذاتی استعمال کے لئے رکھ سکتے تھے لیکن زمیندار کا ان کی پیداوار یا جانوروں پر جو مطالبہ بھی ہوتا تھا اسے پورا کرنے کے لئے بالکل مجبور تھے۔ زمیندار برابر لڑتے رہتے تھے اور بعض وقت گڑھی کے محاصرہ کے بعد جب کسان گڑھی سے باہر نکلتے تھے تو دیکھتے تھے کہ زمیندار کے دشمنوں نے ان کے کھیتوں کو بالکل برباد اور ویران کر دیا ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ء کے قریب انگریزی قوم کی ایک مردم شماری کے اعداد	
	فی صدی
امیر اور پادری	۴
ایسے کسان جن کی گھر کی زمینداری تھی	۱۲
زمیندار کی رعیت	۷۰
واقعی غلام	۹
دیگر	۵

جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کسانوں کی تعداد زمینداروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوا کرتی تھی انھیں "رعایا" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور انھیں دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اول چھوٹے کسان جو دس بکڑے لیکر چالیس بکڑ تک کاشت کرتے تھے اور دوسرے کمین جو زمیندار کے لئے ہر طرح کا کام کیا کرتے تھے اور انھیں ایک یا دو ایکڑ زمین جوتنے بونے کے لئے دے دی جاتی تھی۔

زمین کی تقسیم اور کاشت کا طریقہ ذیل میں جو نقشہ دیا گیا ہے اس میں زمین کی تین قسمیں نظر آتی ہیں (۱) درختوں کی زمین اور ویران زمین (۲) چراگاہیں اور (۳) مزروعہ رقبہ ۔ درختوں کی زمین اور ویران زمین میں سے گھاس کاٹنے اور لکڑی جمع کرنے کی کسانوں کو اجازت تھی۔ ان کے مویشی، سور اور گھوڑے زمیندار کے زندہ دشمن کے ساتھ ان میں چیر سکتے تھے۔
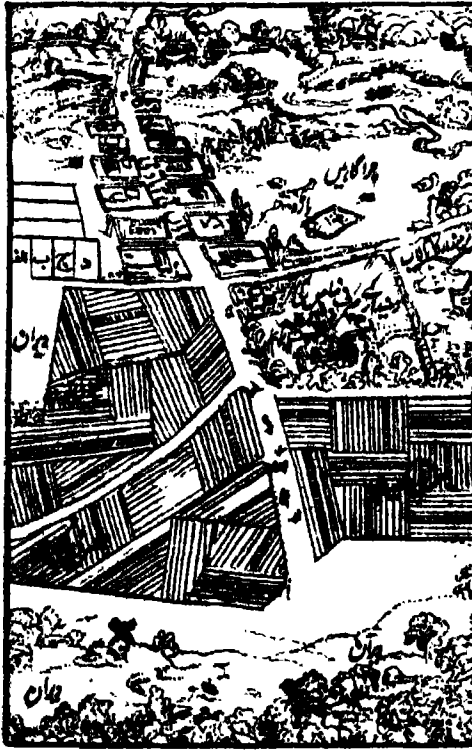
اس وقت کے کھیت آج کل کے بڑے کھلے ہوئے فارموں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ یہ لانبی اور تنگ کتروں میں بٹے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر لانبی کتر ایک شخص کے فارم کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ گاؤں کا رہنے والا ہر شخص ان کھیتوں کی جو سڑک کے دونوں طرف ہوتے تھے اور مغربی کھیت، مشرقی کھیت، شمالی کھیت کے ناموں سے موسوم کئے جاتے تھے ایک ایک کتر کو جوتا تھا مثلاً نقشہ میں سیاہ رنگی ہوئی کتروں کو تلاش کیجئے۔ مغربی کھیت میں ایسی سات کتریں ہیں، مشرقی میں آٹھ اور شمالی میں آٹھ۔ ان تئیس کتروں کی کاشت ایک ہی آدمی کو کرنا پڑتی تھی چنانچہ ایک شخص کی کاشت میں جو زمین تھی وہ تمام مینر میں بکھری ہوئی ہوتی تھی اور کسان کو اپنی پوری زمین کو جوتنے کے لئے ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک سفر کرنا پڑتا تھا ایک اور بات بھی تھی جو خاص طور پر

اس نقشہ میں انگلستان کے ایک مینر کے جن تین بڑے کھیتوں کو دکھایا گیا ہے ان کی ملکیت زمیندار کو حاصل تھی۔ ایسے کسانوں کے کھیتوں کو جو گھر کے زمیندار تھے الف، ب، ج، د کے عنوان سے علیحدہ دکھلایا گیا ہے انہیں کاشت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ باڑے میں بعض پالتو جانوروں کو رکھا جایا کرتا تھا۔

لائق ذکر ہے اور وہ یہ کہ ان کتروں میں سے کچھ کتروں کو بغیر جوتے ہوئے پرتی چھوڑ دیا جاتا تھا کچھ کتروں پر گیہوں بوتے تھے، کچھ پر جو اور جئی اور کچھ کو بغیر بوئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس چیز کو تین کھیتوں کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تین کھیتوں میں سے صرف دو کی بوائی کی جاتی تھی اور تیسرے کو آرام کرنے کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ایک ہی کھیت کو مسلسل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کی زرخیزی کو نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

رعایا کے لگان ادا کرنے کا طریقہ رعایا کو زمین کا بہت بھاری لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس نقد دام نہیں ہوتے تھے اس لئے انھیں خدمت کی شکل میں لگان ادا کرنا ہوتا تھا۔ زمیندار اپنے محل میں عیش سے رہتے تھے صرف کبھی کبھی شکار، ماہی گیری یا جنگ کرنے کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ وہ اپنے خرچ کو پورا کرنے کے لئے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا صرف خاص کے لئے رکھتے تھے اس کی بوائی، جتائی اور کٹائی ان کی رعایا کیا کرتی تھی اور یہ کام انھیں اپنی ذاتی زمینوں کی نگہداشت کے علاوہ کرنا پڑتا تھا۔ کام ان کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ہر ہفتہ میں کچھ دن انھیں زمیندار کے لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ رعیت کو تین دن کام کرنا ہوتا تھا اور کمینوں کو ایک دن جب بوائی اور کٹائی کا وقت آتا تھا تو کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ اس لئے بعض وقت انھیں اپنے کھیتوں کی طرف سے کچھ دن کے لئے مجبوراً غفلت کرنا پڑتی تھی اور یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ کسان کی ذرا سی غفلت سے فصل کو بڑا زبردست نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ بے چارے اپنے کام سے غفلت زمیندار سے محبت کی بنا پر نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھے یہ بغاوت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر یہ ایسا کرتے تو زمیندار اور اس کے سپاہی جن کے پاس ہتیار تھے ان نہتے لوگوں پر حملہ کر کے انھیں فوراً زیر کر لیتے تھے۔

انھیں زمیندار کے کھیتوں کی صرف جتائی ہی نہیں کرنا پڑتی تھی بلکہ اُسے مویشی، دودھ، مرغیوں انڈوں، شہد اور باغ کی پیداواروں کا ایک حصہ بھی دینا پڑتا تھا۔ ایک پادری ان لوگوں کی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بہت سے زمیندار اپنی رعایا کو محنت کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے اور انھیں روٹی تک کھانے کو نہیں دیتے تھے :-

آج کل بہت سے زمیندار ایسے ہیں کہ جب ان کو غریب کسان کی گائے لے لینے پر ملامت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس گاؤدی کو اس بات کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ میں نے بچھڑے کو اور خود اسے زندہ چھوڑ دیا۔ اگر میں چاہتا تو اسے اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اس کی بطخ لے لی ہے اور بطخ کے پر اس کے لئے چھوڑ دئے ہیں"

جب رعیت میں سے کسی شخص کی موت واقع ہو جاتی تھی تو زمیندار اس کے ترکہ میں سے بہترین حصہ کا مالک خود بن جاتا ہے۔ دوسرے درجہ کی چیزوں پر پادری قبضہ کر لیتا۔ بیوہ اور یتیم بچوں کو اکثر کچھ بھی نہ مل سکتا۔

جب رعیت میں سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا تو اُسکے باپ کو زمیندار سے اجازت لینا پڑتی تھی اسی طرح اگر کوئی کسان اپنی گائے یا بیل بیچنا چاہتا تو وہ زمیندار کی اجازت حاصل کئے بغیر ایسا نہ کر سکتا۔

رعیت کا افلاس | زمیندار کی رعایا کے رہنے کے لئے افلاس زدہ بدتر سے بدتر قسم کے چھوٹے جھونپڑے ہوتے تھے جنھیں ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں اور گارے سے بنایا جاتا اور پھوس سے چھایا جاتا تھا۔ ان میں صرف ایک کمرہ ہوتا تھا اور کوئی انگیٹھی یا چولھا نہیں ہوتا تھا خالی زمین پر پیال بچھا کر فرش بنا دیا جاتا تھا۔

جب مرد اور کچھ عورتیں کھیت سے کام کرکے واپس آتے تھے تو ان کے سامنے گھر کی ماں ابلی ہوئی بند گوبھی اور نمک سے محفوظ کیا ہوا سور کا گوشت رکھ دیا کرتی تھی۔ کھانے کے برتن میں ہر شخص اپنی انگلیاں ڈالتا تھا یا روٹی کے ٹکڑے کو چمچے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کبھی کبھار انھیں مچھلی مٹر یا اسٹرابیری وغیرہ بھی مل جایا کرتے تھے۔ دن میں یہی ان کا بڑا کھانا ہوتا تھا اور شاید اسی ایک کھانے پر ان کو گذر کرنا پڑتی تھی۔

کسانوں کے کپڑے بڑے گندے ہوتے تھے۔ ان کے دھونے کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ کپڑے دھونے کے معنی یہ تھے کہ جن کے کپڑے دھوئے جا رہے ہیں وہ بستر میں دبکے پڑے ہیں کیونکہ کسی شخص کے پاس دو جوڑے کپڑے ہونا بڑی عیاشی سمجھی جاتی تھی۔

رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے کسی روشنی کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا البتہ کبھی کبھار بکری کی چربی کی موم بتیاں جلائی جاتی تھیں۔ دن کی محنت سے تھک کر چور ہونے کے بعد جب لوگ واپس آتے تھے

تو ایک بھدی سی سیڑھی پر چڑھ کر اٹاری پر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہاں پیال کے ڈھیر پر گر کر صبح تک سوتے رہتے تھے۔

منیر کی خودکفالتی زندگی	ہم نے اوپر کے بیان میں صرف کسانوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن گاؤں والوں کو کھیتی کے علاوہ اور دوسرے کام کرنے والے لوگوں کی بھی ضرورت رہتی تھی۔ کسانوں کے اوزار بنانے

کے لئے ایک لوہار کی، ان کے غلہ کو زمیندار کی چکی پر پیسنے کے لئے ایک چکی والے کی ضرورت ہوتی تھی کسان کے لئے اور زمیندار کے لئے جب اُسے مچھلی کے شکار کا شوق نہ ہوتا تھا گاؤں کا ماہی گیر مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ بھیڑوں کے بالوں کو کاٹ کر گاؤں کی عورتیں دن کو کاتتی اور بنتی تھیں اور ان کے کپڑے بناتی تھیں۔ منیر کی ایک عدالت بھی ہوتی تھی جہاں زمیندار صدر کی حیثیت سے جج اور جوری دونوں کے فرائض انجام دیتا تھا۔

لیکن منیر میں ہر چیز مل سکتی تھی۔ مثلاً چکی کے پاٹوں کو فرانس جیسے دور دراز مقام سے جنگلوں اور سمندروں کو پار کر کے لایا جاتا تھا۔ زمیندار اپنے زرہ بکتر اور مضبوط تلوار کو اسپین سے حاصل کیا کرتے تھے۔

پھر طویل وقفوں کے بعد گاؤں میں نئی صورتیں بھی نظر آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک پھیری والا یا سفر پیشہ گویا آ نکلتا تھا۔ پھیری والے کی گٹھڑی کو کسان جادو کی گٹھری سمجھتے تھے کیونکہ یہ مشرق کے زیوروں ریشم کے کپڑوں اور گرم مسالوں سے بھری ہوئی ہوا کرتی تھی۔ انھیں اس بات کی بڑی تمنا ہوتی تھی کہ وہ باہر کی وسیع دنیا کی کوئی چیز خرید سکیں لیکن اپنے افلاس کی وجہ سے کوئی چیز نہ خرید سکتے تھے۔ زمیندار اور کبھی کبھی وہ کسان بھی جن کی گھر کی زمینداری تھی چیزیں خریدا کرتے تھے۔ رعیت غریب کو اگر پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تھا تو وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھی۔

بھاٹ قوال یا گویے ایک منیر سے دوسرے منیر کا برابر سفر کرتے رہتے تھے ایک عجیب غریب دنیا کے بہادروں کی لڑائیوں اور ان کی عشق و محبت کے گیت گایا کرتے تھے۔ جب لوگ انھیں سنتے تھے تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور لانبی سانس لیتے تھے کیونکہ یہ گیت انھیں رومانی افسانے معلوم ہوتے تھے لیکن بھاٹ ان غریب لوگوں کے درمیان زیادہ نہیں ٹھیرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زمیندار کی گڑھی

کے دعوت کے کمرہ میں اسے تمام رات گیت سنانا پڑیں گے۔

۱۱۰۰ء کے بعد مینر کی خود کفالتی زندگی کا خاتمہ تاجروں، میلوں، قصبوں اور شہروں کی ترقی

لیکن مینر کی یہ خودکفالتی زندگی مسلسل جاری نہیں رہ سکی۔ پڑوس کے گاؤں میں کبھی کبھی میلے منعقد کئے جانے لگے۔ اور زمیندار کی عنایت سے جسے تاجر تحفے تحائف اور خراج ادا کرتے تھے گاؤں والوں کو ان میں شریک ہونے کی اجازت ملنے لگی۔ میلہ کا زمانہ بڑی ہماہمی کا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو ایک ہی طرح کی زمین اور لوگوں کے چہرے دیکھتے دیکھتے تھک جاتے تھے میلہ میں خاصا تنوع اور دلچسپی ہوتی تھی۔ پھر ان کے تھکے ہوئے ہاتھوں اور جھکی ہوئی کمر کو بھی اس زمانہ میں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

مذہبی تہواروں کے موقع پر مینر کے لوگ قریب کے شہر کے بڑے گرجا میں جایا کرتے تھے۔ پادری کے خطبہ کے بعد سڑک کے دونوں کناروں پر گرجا گھر میں ڈرامے ہوتے تھے یا جلوس نکلتے تھے یا سڑکوں پر کھیل کود ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر پھیری والے اور دکاندار سڑک کے دونوں کناروں پر کپڑے کی عارضی دکانیں کھڑی کر لیتے تھے اور خریداروں کو للچانے کے لئے اپنے سامان کی نمائش کرتے تھے۔ زندگی کے ضروری سامان مثلاً گوشت، اون، نمک اور مچھلی کی بھی نمائش کی جاتی تھی اور تعیشات مثلاً شراب، گرم مسالے، ریشم کے کپڑے اور زیورات کی بھی نمائش ہوتی تھی۔

اگر مینر کے کسی آدمی کے پاس غلہ کی ایک زائد بوری یا ادنیٰ کپڑے کا اپنے ہاتھ کا بنا یا ہوا ایک صاف ٹکڑا ہوتا تھا تو وہ دکاندار سے اپنی بیوی کے لئے اتوار کے دن کے پہننے کے واسطے ریشم کا ایک ٹکڑا خرید سکتا تھا۔ دکاندار چیزوں کو صرف فروخت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں آئندہ کسی اور دوسری جگہ بیچنے کے لئے خرید بھی کرتے تھے۔

اگر دوکاندار کسی شخص کے کپڑے کو اس لئے نہیں خریدتے تھے کہ اس کی بناوٹ گھٹیا قسم کی تھی تو وہ میلہ سے یہ ارادہ کر کے لوٹتا تھا کہ آئندہ تہوار کے موقع پر جب دوبارہ میلہ لگے گا تو وہ اس سے بہتر کپڑا بن کر لائے گا۔ میلے میں جن چیزوں کو وہ دیکھتا تھا ان میں سے اکثر کو چونکہ وہ خریدنا چاہتا تھا اس لئے انھیں حاصل کرنے کے لئے محنت سے سخت محنت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ میلہ اس کی زندگی کی یکسانیت میں ایک

ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور جب میلہ دیکھ کر وہ مبیر کو واپس جاتا تھا تو مبیر کی زندگی اسے بے جان معلوم ہوتی تھی اور اس کے اندر یہ حوصلہ اور امنگ پیدا ہوتی تھی کہ کسی طرح اپنے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کرے۔

چنانچہ میلوں سے چیزوں کے بنانے میں دلچسپی بڑھ جاتی تھی اور ان سے دستی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ رعیت کے جو افراد عمدہ قسم کا کپڑا بننا یا دھات کو کوٹ پیٹ کر عمدہ زیور بنانا یا لکڑی کے ٹکڑوں کو چھیل کر عمدہ صندوق بنانا سیکھ لیتے تھے تو ان چیزوں کے معاوضہ میں وہ ان دوسری چیزوں کو خرید سکتے تھے جن کی طلب انھیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس تجارت سے ان کے پاس ایک ذاتی پونجی روپیہ پیسہ کی شکل میں اکٹھی ہو سکتی تھی اور جب کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو پھر وہ زمیندار کے بالکل پابند اور محکوم نہ رہتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے دستکار اور ان کی پنچایتیں

انگلستان میں آج کل تقریباً ہر چیز مشینوں کے ذریعہ بنائی جاتی ہے۔ لیکن عہد وسطیٰ میں ہر چیز سادہ اوزاروں کے ذریعہ ہاتھ سے بنائی جاتی تھی۔ دستکار یعنی ماہر کاریگر لوگوں کے پہننے کے لئے کپڑا بنتے اور سیتے تھے۔ وہ دھاتوں کو کوٹ پیٹ کر لڑائیوں میں کام آنے والے زرہ بکتر اور تلواریں بناتے تھے۔ وہ ہلوں، کدالوں اور انگیٹھیوں کو بناتے تھے۔ غرضکہ صنعت کے سب کام دستکار اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

دستکاری کے یہ کام فیکٹریوں میں نہیں کئے جاتے تھے بلکہ کاریگر انھیں اپنے گھروں پر کیا کرتے تھے۔ جب دستکاروں کی مہارت میں ترقی ہو جاتی تھی اور اپنی دستکاری سے ہی پورے طور پر گذر کرنے کے لائق ہو جاتے تھے تو وہ اپنے گاؤں سے قصبوں اور شہروں کو منتقل ہو جاتے تھے جہاں ان کے مال کے خریدنے اور قدر کرنے والے لوگ زیادہ تعداد میں موجود ہوتے تھے یعنی ایسے لوگ موجود ہوتے تھے جن کے پاس قیمتی زیورات اور کپڑوں کے خریدنے کے لئے روپیہ ہوتا تھا جو اپنے خاندان کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے عمدہ یادگاریں قائم کیا کرتے تھے یا جو اپنے عالیشان مکانوں کی زینت اور زیبائش کے خواہشمند ہوتے تھے۔

خردہ فروشی کی ایسی دوکانیں جس میں مال کو جمع رکھا جائے اس زمانہ میں بالکل معدوم تھیں درمیانی تاجروں کا بھی تقریباً کوئی وجود نہیں تھا۔ دستکار اپنے مال کی تجارت خود ہی کیا کرتے تھے۔ جیسے ہی ایک چیز بن کر تیار

ہوتی تھی فوراً فروخت کر دی جاتی تھی اور دوسری چیز کا بنانا شروع کر دیا جاتا تھا۔

جب چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں تو ہر ایک بنائی ہوئی چیز دوسری سے مختلف ہوتی ہے مشین کی بنائی ہوئی چیزوں کی طرح ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح کاریگروں کے کام کی رفتار بھی یکساں نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کاریگر دوسروں کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ قسم کا کام انجام دے۔ اس لئے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کسی مصنوعہ چیز کی قیمت کیا ادا کی جائے۔

اس قیمت کی نگرانی کرنے کے لئے کاریگروں نے اپنی انجمنیں بنانا شروع کر دیں جنھیں گلڈس (جرگوں یا پنچایتوں) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ پنچایتیں قاعدے بناتی تھیں کہ مال کس قسم کا بنایا جائے مال کی کتنی قیمت لی جائے۔ ایک لڑکے کو پنچایت کا پورا رکن بنانے سے پہلے کتنے سالوں تک امیدوار رکھ کر کام سکھایا جائے۔

عہد وسطےٰ کے دستکاروں کی فہرست سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ اس زمانہ میں پیشوں میں کس قدر تنوع پایا جاتا تھا اور تقسیم عمل نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ جو لوگ غذا کی صنعت میں لگے ہوئے تھے ان کے نام حسب ذیل تھے۔ قصائی اور کھالوں کو بنانے والے پن چکی پر آٹا پیسنے والے اور نانبائی شراب کھینچنے والے اور باورچی یہ سب لوگ ایسے تھے جو اپنے اپنے فن کے ماہر ہوتے تھے۔ اسی طرح دھاتوں کی صنعت میں بھی خاصی تقسیم عمل پائی جاتی تھی کچھ لوگ نعلبند ہوتے تھے کچھ لوہار، چاندی کے کاریگر، سنار، تانبے کا کام کرنے والے ٹین کا کام کرنے والے وغیرہ۔ پھر مختلف قسم کے اوزار بھی مختلف کاریگر بنایا کرتے تھے۔ مثلاً چاقو چھری اور چمچے بنانے والے، بھیڑوں کا اون کاٹنے والی قینچیاں بنانے والے، تلواروں کو مزین کرنے والے، نیام بنانے والے، فولاد کی زنجیریں بنانے والے، مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹے بنانے والے، تالے بنانے والے، چاقو پر سان رکھنے والے وغیرہ۔ لوگوں کے لئے کپڑا مہیا کرنے کے واسطے ریشم، اون، کتان اور کینوس کے بننے والے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی سلائی کے لئے بھی مختلف خاص پنچایتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً درزی، لیسیں بنانے والے وغیرہ عمارت سازی کی پنچایت میں بھی مختلف ضمنی تقسیمیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً معمار، سنگتراش، کھپریل بنانے والے، بڑھئی، ٹین

کی چادر بنانے والے وغیرہ مغز منگہ پیشوں کا ایک خاصا پیچیدہ نظام پیدا ہوگیا تھا۔

بعض قصبوں اور شہروں میں چند دستکاریاں خاص طور پر ترقی کر لیتی تھیں مثلاً اٹلی کے شہر فلورنس، میلان، جینوآ اور وینس خوب صورت دستکاری کے لئے مشہور تھے۔ یہ دولتمند شہر تھے اور یہاں کے لوگ یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور یہاں کے دولتمند لوگ نادر اور بیش قیمت چیزوں کے کاریگروں کی خاص طور پر سرپرستی کرتے تھے۔ مثلاً وینس اپنے شیشہ کے برتنوں، پیتل کے کام، بیلوں، چمڑے کے کام، مخمل، ساٹن، زربفت وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ آج بھی وینس کے شیشہ کے پرانے برتنوں کے کام کو اس فن کے ماہر بہت اچھا سمجھتے ہیں اور اس کا شمار نوادر میں کیا جاتا ہے۔ وینس والوں نے ایک خاص رنگ کو بھی دریافت کیا تھا جسے "وینس کے سرخ رنگ" کے نام سے عہد وسطےٰ میں شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اوپر کے تمام بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پینڈوں کے مقابلے میں شہروں کی زندگی میں خاصا تنوع پیدا ہو گیا تھا۔ ان چیزوں کے بنانے کے لئے بہت سے گھروں اور دوکانوں کو برابر مصروف رہنا پڑتا ہوگا اور جس قسم کا کام یہ دستکار لوگ کرتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو نہایت فارغ البالی اور آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

عہد وسطےٰ کے آخری دور میں یورپ کے بڑے شہر
۱۔ انگلستان کے قصبے اور شہر۔ لندن

لندن کی حالت عہد وسطےٰ میں وہ نہیں تھی جو اب ہے اس شہر کی آبادی منتشر تھی اس کی سڑکیں بہت تنگ تھیں۔ کچھ سڑکوں کو تو بے ڈھنگے طریقہ پر پتھر سے پاٹ دیا گیا تھا لیکن کچھ ایسی تھیں جو پٹی ہوئی بھی نہیں تھیں سڑک کے بیچ میں ایک نالی بہتی تھی لیکن جب بارش ہوتی تھی تو نالی کا پانی اتنا چڑھ جاتا تھا کہ سڑک کے بھر جانے کے بعد مکانوں کے اندر پہنچنا شروع کر دیتا تھا۔ شہر کے کچھ حصے ایسے تھے جو بھک منگوں سے بھرے ہوئے تھے اور چور بھی بہت تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں پولس سپاہی نہیں ہوتے تھے اس لئے رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر چلنا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور لوگ بہت کم اس قسم کی جرأت کیا کرتے تھے۔

جب آہستہ آہستہ بہت سے سالوں کے گذرنے کے بعد انگلستان کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی تو لندن کے شہر نے بھی بڑھنا شروع کیا اور یہ تجارت اور دستکاری کا ایک بہت مصروف مرکز بن گیا۔ تنگ سڑکوں کے دونوں طرف لوگوں کے مکان اور دستکاروں کی دوکانیں بن گئیں۔ دوکانیں مشرقی شہروں کی دوکانوں کی طرح بالکل کھلی ہوئی ہوتی تھیں خریدار جب سڑکوں پر سے گذرتے تھے تو استاد دستکار اور اس کے آدمیوں سے ان کے کام کے دوران میں گپ شپ کیا کرتے تھے۔ مال کی خرید و فروخت کھلے بازار میں کی جاتی تھی اور قیمتوں کے مول تول کے سلسلہ میں بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔

میلوں کے موقعوں پر غیر ملکوں کے تاجر بھی انگلستان میں خرید و فروخت کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ میلے مقررہ اوقات میں منعقد کئے جاتے تھے کبھی سال میں ایک مرتبہ کبھی اس سے زاید۔ گاؤں اور قصبوں کے میلوں کے مقابلہ میں یہ میلے بڑے ہوتے تھے اور ان میں اشیا کا تنوع بھی زیادہ ہوتا تھا غیر ملکوں کے تاجر اس بات سے واقف ہوتے تھے کہ یہ میلے کب منعقد ہوں گے اور انگلستان میں انہی میلوں کے زمانے میں اپنا سامان یورپ اور ایشیا کے دور دراز ملکوں سے لے کر آتے تھے۔ ان میں سے بعض میلے مثلاً ونچسٹر کا میلہ تجارت کے بین الاقوامی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ فرانس اور ہالینڈ کے تاجر ان میلوں میں ارادہ کر کے شریک ہوتے تھے۔ ان میلوں میں اون، شراب، گرم مصالحے گوشت کپڑے، لباس اور مختلف قسم کے زیوروں کی تجارت بڑے پیمانہ پر ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں انگلستان میں شہر تیزی سے ترقی کر رہے تھے ۱۳۷۷ء میں لندن کی آبادی ، ۳۰ ہزار تھی ، یارک کی ۱۲ ہزار ، برسٹل کی دس ہزار پلیمتھ کی آٹھ ہزار کوونٹری کی ، ۷ ہزار ، ناروچ کی ۷ ہزار ، اور لنکن کی ۵ ہزار ۔ ۱۳۷۷ء میں انگلستان کی جو مردم شماری کی گئی اس میں ۹ شہروں میں ۵ ہزار سے زاید آبادی تھی گیارہ قصبوں میں تین ہزار اور چار ہزار نو سو ننانوے کے درمیان ، ۱۹ قصبوں میں ایک ہزار اور ۲ ہزار نو سو ننانوے کے درمیان اور تین قصبوں میں ایک ہزار سے کم آبادی تھی۔

۲۔ فرانس کے قصبے اور شہر | شاید آپ نے لندن کو جس کی آبادی ، ۳۰ ہزار تھی ایک بڑا شہر سمجھا ہو لیکن

پیرس کی آبادی سنہ ۱۲۰۰ء میں ۲ لاکھ تھی اور یہ لوگ بیسیوں پیشوں میں مصروف تھے۔ پیرس کا محل وقوع بہت اچھا ہے یہ دریائے سین کے کنارے واقع ہے اور مغرب سے اس دریا میں تین اور دریا آکر ملتے ہیں۔ اس زمانے میں دریا بہت آسان ذریعہ نقل وحمل کا سمجھے جاتے تھے اس لئے سلطنت روما کے زوال کے بعد فرانس کے بادشاہوں نے پیرس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس شہر نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی اور دریائے سین کے دونوں طرف پھیل گیا۔

ہر سال پیرس میں ایک بڑا میلہ ہوتا تھا جو دو مہینے تک جاری رہتا تھا۔ ان میلوں میں شریک ہونے کے لئے تاجر مل کر بڑی بڑی کمپنیاں بنا لیتے تھے۔ غیر ہموار سڑک پر مال کو لے جانا چونکہ مشکل ہوا کرتا تھا اس لئے لوگ کشتیوں پر سامان لایا کرتے تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے دریائے سین اور اس کے معاونوں میں چلا کرتے تھے لیکن پیرس کی تجارت غیر ملکوں کے ساتھ بہت کم تھی خود فرانس کے دریاؤں کے کنارے جو قصبے آباد تھے انھیں سے پیرس کے لوگ تجارت کرتے رہتے تھے۔ پیرس کی صنعت وتجارت اتنی بڑھتی گئی کہ سنہ ۱۳۰۰ء کے آخری سالوں میں اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہوگئی۔

۳۔ اٹلی کے شہر | اٹلی میں کئی شہر ایسے تھے جو بحر روم میں اپنے محل وقوع کی بنا پر بڑی بڑی بندرگاہیں بن گئے تھے۔ مثلاً وینس اٹلی کے ساحل کے قریب بحر ایڈریاٹک کے چھوٹے جزیروں پر بسا ہوا تھا۔ دوسرے شہروں سے یہ مختلف تھا۔ اس کے گرد اونچی فصیلیں کھنچی ہوئی نہیں تھیں بلکہ اس کا تحفظ سمندر کے ذریعہ ہوتا تھا۔ تنگ بھدی سڑکوں پر چلنے کی جگہ لوگ اس کی نہروں میں کشتیوں پر سوار ہوکر سفر کیا کرتے تھے۔ ان چھوٹے جزیروں میں مکان اور دکانیں تو بنائی جا سکتی تھیں لیکن کاشت اور باغبانی کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے لوگوں کو اپنی گذر اوقات کے لئے کھیتی کی جگہ اور دوسرے کام کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ وہ ماہی گیری تجارت اور صنعت کے کاموں سے لگے ہوئے تھے۔

مشرق سے تجارت کرنے کے لئے شہر کے بہت سے تاجر جہاز بنوایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں وینس والوں کے پاس کئی ہزار جہازوں کا بیڑا تھا۔ ان جہازوں سے انھوں نے بحر روم کے تمام سمندری ڈاکوؤں کو ختم کر دیا تھا اور تجارتی جہازوں کے لئے راستہ محفوظ کر دیا تھا۔ اسی بنا پر وینس اور یورپ کے دوسرے

علاقوں کے درمیان تجارت کو خوب ترقی حاصل ہو گئی تھی۔

ایک پرانی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۱۸ء میں بلجیم کے ایک شہر برگس کے سالانہ میلہ میں وینس کے پانچ جہاز سامان سے لدے ہوئے آئے ان جہازوں میں ہندوستان سے ریشم اور گرم مسالے، مراکش سے شکر دوائیں اور دار چینی مصر سے سیاہ مرچ اور مسالے، روس سے روئیں دار کھالیں اور موم اور تاتاریوں کے علاقہ سے سونا، ریشم اور روئیں دار کھالیں لائی گئی تھیں۔ جب یہ جہاز وینس اور مشرق کو واپس گئے تو کچے مال سے لد کر گئے۔ مثلاً کھالیں، سریس، نمک، گوشت، مچھلی، سن، عمارتی لکڑی، ٹین، اور سیسہ۔ مغربی کاریگروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کی بھی وینس میں مانگ تھی۔ کچھ تو وینس میں ہی بک جایا کرتی تھیں باقی اسکندریہ کے بڑے شہر کو جہازوں میں روانہ کر دی جاتی تھیں جہاں ایک سالانہ میلہ میں مشرقی تاجر جمع ہوا کرتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں اس مال کا کچھ حصہ خشکی کے راستہ سے ہندوستان تک کو بھیجا جانے لگا تھا۔

وینس والے شمالی یورپ کی بندرگاہوں سے کچا مال جہاز پر لادنے کے لئے خریدتے تھے اور مشرقی بندرگاہوں میں جا کر ان کو فروخت کرتے یا ان کے معاوضہ میں دوسرا سامان حاصل کیا کرتے تھے۔ جہاز بھر کر سامان خریدنے کے معنی یہ تھے کہ لوگ ایک بڑی رقم کو خطرے میں ڈالا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کی کشتیاں سال سال بھر تک وینس واپس نہیں آتی تھیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ راستہ میں انھیں سمندری ڈاکو یا طوفان تباہ کر دیا کرتے تھے۔

اس قسم کی تجارت کو چلانے کے لئے وینس کے لوگوں کو بڑے روپیہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس روپیہ کو فراہم کرنے کے لئے وینس کے تاجر متحد ہو کر ساہوکارے کی کمپنیاں بنا لیتے تھے اور جب کسی تاجر کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنے طور پر جہاز پر مال لاد سکے تو ان ساہوکارے کی کمپنیوں سے روپیہ قرض لے لیا کرتا تھا۔ چنانچہ جتنی وینس کی تجارت کو ترقی ہوتی رہی اتنی ہی اس کی دولت اور ساہوکارے کے کام کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ ۱۶۰۰ء میں وینس میں ایک ایسا بڑا بنک موجود تھا جو نہ صرف وینس کے تاجروں کو روپیہ قرض دیتا تھا بلکہ یورپ کے دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس سے لین دین کا کاروبار کیا کرتے تھے۔

اس طرح وینس کے ساہوکاروں کا اقتدار آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ لوگ اپنے کاروبار میں روز بروز زیادہ روپیہ لگانے لگے اور بنکوں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ روپیہ والے آدمیوں کو وہی طاقت حاصل ہوگئی جو پہلے مینر کے زمینداروں کو ملی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ تجارت کو ترقی ہو رہی تھی اور لوگوں نے ادھر اُدھر سفر کرنا شروع کر دیا تھا بڑے ساہوکار مثلاً میڈیسی وغیرہ کو بہت شہرت اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ جو طاقت پہلے امراء کے ہاتھ میں تھی وہ اب تاجروں کے ہاتھوں میں پہنچنا شروع ہوگئی تھی۔

جرمنی کے شہر | اسی زمانہ میں جرمنی کے کئی شہر بھی اپنی دستی صنعتوں اور تجارت کی وجہ سے دولتمند اور طاقتور بنتے جا رہے تھے۔ جنوب کے کچھ شہر تھے جو اٹلی، فرانس یا بحر اٹلانٹک کو جانے والی شارع عاموں پر واقع تھے تاجر قدرتی طور پر مال کو خریدنے اور بیچنے کے لئے ان شہروں میں ٹھیرا کرتے تھے ان میں سے کچھ شہر مثلاً نورنبرگ اور آسبرگ بہت بڑے تجارتی مرکز بن گئے تھے۔ نورنبرگ میں بہت سے دولتمند آدمی کپڑے کی صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ کپڑے کی صنعت کے ساتھ دوسری اور صنعتیں بھی ترقی کر رہی تھیں۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں آگسبرگ بھی جرمنی کا نہایت اہم شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ایک محلہ ایسا تھا جو تمام یورپ میں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مکانوں کی چھتیں تانبے کی ہوتی تھیں اور مکان پتھر سے بنائے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے سیاحوں کا بیان ہے کہ اس وقت جو لوگ سربرآوردہ اور ممتاز سمجھے جاتے تھے وہ اپنے مکانوں میں لگے ہوئے تانبے اور پیتل کی نمائش کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے بڑے پھاٹک تمام دن کھلے رہتے تھے تاکہ آنے جانے والے لوگ ان کے مکان کو دیکھ کر ان کی بڑائی کا اندازہ کر سکیں۔

ان کے علاوہ شمالی جرمنی میں بحر بالٹک اور بحر شمالی کے ساحل پر اور بھی کئی بڑے شہر تھے مثلاً ہیمبرگ، بریمن اور لوبک۔ جرمنی کے یہ شہر انگلستان، فرانس، اٹلی اور اسپین کے شہروں کی طرح پتھر کی بڑی فصیلوں سے گھرے ہوتے تھے جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر گول یا چوکور مضبوط دمدمے ہوا کرتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے شہر بالکل قلعہ جیسے ہوتے تھے۔ ان شہروں میں صرف بڑے بڑے

پھاٹکوں کے ذریعہ سے داخل ہو سکتے تھے جو رات کو بند کر دئے جاتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے آخری زمانہ میں صلیبی جنگوں سیاحوں اور تاجروں کے اثر سے تبدیلیاں

اس زمانہ میں جب کہ یورپ والے دنیا سے الگ تھلگ اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور شہروں میں زندگی بسر کر رہے تھے، ایشیا کے اکثر حصوں میں دولت و ثروت کے بڑے بڑے مرکز موجود تھے۔ مشرق بعید میں جس کو اس زمانہ میں یورپ کے لوگ "کیتھے" کے نام سے موسوم کرتے تھے زرخیز زراعتی زمینیں، بڑے تجارتی شہر، منڈیاں، مدرسے اور خوب صورت عمارتیں پائی جاتی تھیں۔ عراق، ایران اور ترکی میں بھی تجارت اور صنعت کی بڑی گرم بازاری تھی۔

آج چین ہندوستان اور ایران کو "پس ماندہ" ملکوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن ۱۱۰۰ء میں یورپ کے "پس ماندہ" لوگوں کو ایشیا والوں نے شائستگی اور تہذیب کے ہزاروں سبق سکھائے تھے۔ ایشیا کے مہذب لوگ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ کے وحشیوں کو جن کے یہاں نہ منظم حکومت تھی نہ امن و امان، جہاں خانہ جنگیوں اور شراب کی بدمستیوں کا دور دورہ تھا، جو فن معوری فن عمارت سازی اور فن پارچہ بافی وغیرہ میں بہت پیچھے تھے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کی ناپاکی تو ضرب المثل بن گئی تھی۔ ایک نقصہ مشہور ہے کہ ایک مشرقی بندرگاہ میں ایک انگریز جہاز سے سمندر میں گر گیا۔ جب اسے بمشکل تمام سمندر سے نکال کر ساحل پر لایا گیا تو ایک ایشیائی حضرت نے ان پر پھبتی کہی "میاں خدا کی مہربانی کا شکر ادا کرو عمر بھر نہانا نصیب نہیں ہوا تھا خدا نے تمہیں نہلا دیا"

صلیبی جنگیں

۱۱۰۰ء کے بعد ایشیائی تہذیبوں کے بارے میں یورپ کے گوشہ نشین لوگوں کو دو ذریعوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ پہلا ذریعہ صلیبی جنگیں تھیں اور دوسرا ذریعہ یورپ کے وہ سیاح تھے جنھوں نے ایشیا کا سفر کیا اور واپسی پر اپنے سفر ناموں کو یورپ میں شایع کیا۔ ۱۰۵۰ء کے بعد یروشلم پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور انھوں نے عیسائیوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ دو سو سال تک یعنی ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۱ء تک کیتھالک چرچ کے پادری اور یورپ کے امرا اور بادشاہ اپنے لوگوں کو فلسطین پر دوبارہ قبضہ جمانے کے لئے ابھارتے رہے۔ فلسطین پر حملہ کرنے کے لئے سات مہموں کو

تنظیم دی گئی اور کسانوں اور زمینداروں کے مسلح جتھے فلسطین کے لئے روانہ کئے جاتے رہے۔ اس دو سو سال کے عرصہ میں یورپ کے بہت سے امیروں تاجروں کاریگروں اور کسانوں کو فلسطین میں رہنے کا موقع ملا۔ اس کا اثر انگلستان، فرانس اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں پر بہت اچھا پڑا۔ مشرق قریب اور مشرق بعید کی تہذیبوں کا علم انھیں روز بروز زیادہ حاصل ہوتا رہا اور یورپ اور ایشیا کے شہروں میں تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔

فلسطین دنیا کے بہترین تجارتی علاقہ میں واقع تھا۔ اس کے مشرق میں ایران، ہندوستان اور چین تھا اور مغرب میں مصر، قسطنطنیہ، وینس، فرانس جرمنی اور انگلستان۔ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں اس کی حیثیت ایک تجارتی چوراہے جیسی تھی۔

یورپ کے سیاح اور تاجر دوسرا ذریعہ جس سے یورپ کی واقفیت دنیا کے بارے میں بڑھی وہ یورپ کے راہبوں اور تاجروں کے سفر تھے جو انھوں نے ایران، ہندوستان اور چین میں کئے۔ سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد سے اگرچہ یورپ کے کچھ عیسائیوں نے یروشلم میں رہنا شروع کر دیا تھا لیکن ایشیا کے باقی ماندہ حصہ کے بارے میں ان کی واقفیت پھر بھی بہت کم تھی۔ انھیں صرف تاجروں کی زبانی ہندوستان اور چین کے قصے سننے کا کبھی کبھی موقع مل جایا کرتا تھا لیکن سنہ ۱۱۶۰ء اور ۱۳۳۰ء کے درمیان ایک یہودی پیشوا، کئی عیسائی راہبوں اور متعدد تاجروں نے ایشیا کے طویل اور پر صعوبت سفر اختیار کئے۔ کچھ تو ایشیا میں ہی رہ پڑے اور وہیں مر گئے کچھ یورپ واپس آئے اور انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے حالات قلمبند کئے۔ ان کے بیان کئے ہوئے قصے پھیلنا شروع ہوئے اور دوسرے لوگوں کو سفر کی خواہش پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ بہت سے یورپ کے سیاح اور تاجر ایشیا جانے لگے اور اس طرح یورپ کی دنیا کی سرحدیں وسیع ہونا شروع ہو گئیں۔

ان سیاحوں کو خشکی اور سمندر پر ہزاروں میل کے سفر نہایت مشکل حالات میں کرنا پڑے۔ ہر طرف وہ دشمنوں سے گھرے ہوتے تھے۔ اکثر راستہ انھیں پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ کھانے اور پینے کو نہیں ملتا تھا۔ عجیب وغریب تجربات ہوتے تھے۔ ایشیا میں پہنچ کر انھوں نے ایک نئی دنیا

کو دیکھا جس کا تمدن و تہذیب ان سے بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے سفر کے حالات کو یا تو خود لکھا یا دوسروں سے لکھوایا۔ ان سیاحوں میں مارکوپولو کے سفر کے حالات سب سے زیادہ مکمل ہیں۔ اگر ہم مشرق کی تہذیبوں کو اس زمانہ کے یورپینوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں تو ان سیاحوں کے سفر ناموں کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔

یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کا اضافہ | صلیبی جنگوں اور راہبوں اور تاجروں کی سیاحت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عہد وسطیٰ میں یورپ کی تجارت بڑھنا شروع ہوگئی۔ یورپ کے قصبے اور شہر ترقی کرنے لگے۔ صنعت و حرفت میں اضافہ ہوا اور یورپ کی شکل وہ بننے لگی جو آج پائی جاتی ہے۔ خشکی اور سمندر کے ذریعہ یورپ کے اندر اور یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت میں اضافہ ہوا۔ مشرق سے خصوصاً ہندوستان اور چین سے یورپ کے لوگوں نے تعیشات حاصل کرنا شروع کیں۔ مثلاً گرم مسالے بخور، عطریات، قیمتی پتھر، قالین اور بیش قیمت کپڑے۔ مغربی ایشیا کو یورپ والے غلہ، تیل، شہد، سیسہ، لوہا، فولاد، ٹین۔ گندھک، کپڑا، چمڑا، اون، صابن، بال دار کھالیں اور غلام روانہ کرنے لگے۔ اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا رہا تجارت بہت عام اور متنوع ہوتی گئی۔ تاجروں کو بہت منافع حاصل ہونے لگا اور وہ ہمیشہ اپنے کاروبار کو زیادہ وسیع کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ وہ اپنے جہازوں کو اپنے مال کے لئے نئی منڈیاں دریافت کرنے کے لئے بھیجنے لگے۔ چنانچہ کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں جو سفر کیا تھا وہ بھی تجارت کے نئے راستے کی تلاش میں ہی کیا گیا تھا۔

سفر اور تجارت کی دشواریاں | اگرچہ تجارت میں اضافہ ہوا تھا لیکن مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں ایسی ایسی مشکلوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کے بارے میں آج ہمیں یقین کرنے میں بھی تامل ہوگا۔ مثلاً سڑکیں بڑی خراب تھیں اور ان پر سفر کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

عام طور پر تاجر اور دوسرے سیاح گھوڑوں کی پیٹھ پر سفر کیا کرتے تھے۔ سڑکیں جنگلوں اور پہاڑوں پر سے ہوکر گذرتی تھیں۔ جنگلوں کے درمیان کہیں کہیں شہر اور گاؤں نظر آتے تھے اور ان کے بیچ میں فاصلے بہت زیادہ ہوا کرتے تھے۔

اکثر گاؤں ایسے تھے کہ جن میں تین چار گھر ہوتے تھے یہاں تک کہ جو گاؤں شہر پیرس کے قریب تھے وہاں بھی مکانوں کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہ تھی۔ اسپین میں آدمی ۵۰ میل تک سفر کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اسے ایک گھر بھی نظر نہ آتا تھا۔ موجودہ زمانے میں تو سیاح کو آدمیوں سے بچنے میں مشکل اور خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن سن ۱۰۰۰ء میں سیاحوں کے لئے مشکل اور سلامتی اس بات میں نظر آیا کرتی تھی کہ کسی طرح دو بارہ آدمیوں کے درمیان پہنچ جائیں۔"

پھر ڈاکوؤں کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا کبھی تو یہ واقعی ڈاکو ہوتے تھے اور کبھی زمیندار ان کو اپنے علاقہ میں روک کر ان سے کچھ اینٹھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہ بات ایشیا میں بھی پائی جاتی تھی اور یورپ میں بھی۔ شارع عاموں پر اس میں شک نہیں سرائیں اور رباط ہوا کرتے تھے۔ بعض وقت ان کی حالت بہت اچھی ہوتی تھی لیکن اکثر یہ بہت گندی اور غیر آرام دہ ہوا کرتی تھیں لیکن جب مسافر گھوڑے کی پیٹھ پر لمبا سفر کر کے آتے تھے تو انھیں یہی غنیمت معلوم ہوتی تھیں۔

غرضکہ سن ۱۴۰۰ء اور سن ۱۵۰۰ء کے درمیان دنیا کے دور دراز علاقوں نے ایک دوسرے سے نزدیک ہونا شروع کر دیا تھا۔

خلاصہ: عہد وسطےٰ میں اکثر مردوں اور عورتوں کی زندگی مینر کے اندر محدود ہوا کرتی تھی۔ یہاں چھوٹی جماعتیں بنا کر وہ رہتے تھے اور باقی تمام دنیا سے تقریباً بے نیاز ہوتے تھے۔ وہ اپنے لئے غلہ اور مویشی خود ہی پیدا کر لیتے تھے۔ اپنا آٹا خود ہی پیس لیتے تھے۔ اپنا دھاگا خود ہی کاتتے اور اپنا کپڑا خود ہی بنتے تھے اپنے جوتے خود ہی بناتے تھے اور جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان میں سے اکثر خود ہی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

پھر سن ۱۱۰۰ء کے بعد دنیا کے کچھ حصوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہونا شروع ہوئی۔ لوگ چونکہ زیادہ چیزیں خریدنا اور بیچنا چاہتے تھے اس لئے چیزیں زیادہ بنائی جانے لگیں۔ قصبے تجارتی مرکز بن گئے اور جب لوگ ان کی طرف زیادہ کھنچنے لگے تو ان کی ترقی اور بھی زیادہ ہونے لگی۔ عہد وسطےٰ کی تنگ دنیا وسیع ہونے لگی۔ دنیا کے دور دراز علاقے ایک دوسرے

کے قریب آنے لگے اور ایک دوسرے پر روز بروز زیادہ انحصار کرنے لگے۔ تجارت اور شہروں کی ترقی اور دنیا کا ایک وسیع تخیل پیدا کرنے میں ان تاجروں اور سیاحوں کا بہت بڑا حصہ ہے جنھوں نے مشرق کی سیاحت اور سفر کئے۔

موجودہ عہد سے اگر مقابلہ کیا جائے تو اس زمانے کی زندگی بہت سادہ تھی۔ چونکہ چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں تجارت اور سفر میں دقتیں تھیں۔ آبادی بکھری ہوئی تھی۔ اس لئے اس عہد کی زندگی موجودہ زمانہ کے صنعتی ملکوں کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ہماری دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جسے کبھی اپنی کسی عادت نے مجبور اور پرانی عادت نے پریشان نہ کیا ہو اور جسے اس پر تعجب نہ ہوا ہو کہ بری عادت کتنی جلدی اور اچھی عادت کتنی دیر میں پڑتی ہے۔ حقہ یا سگریٹ کے دو چار کش، افیون و شراب کے دو چار گھونٹ ان نشوں کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ سویرے سونے اور سویرے اٹھنے کی عادت ڈالتے ڈالتے عمر گذر جاتی ہے یہاں تک کہ وہ غضب کی نیند آتی ہے کہ آدمی قیامت تک اٹھتا ہی نہیں۔ انسان کی طبیعت کو پرکھنے والے پنڈت اور ودوان جی کہتے ہیں کہ تماشا دیکھنے کا شوق بھی ایسی عادت ہے جو ایک بار پڑ جائے پھر چھڑائے نہیں چھٹتی اور پھر لطف یہ کہ جیسا تماشا ویسی ہی اس کی عادت سینما اور تھیٹر کے شوق کو برا کہنے والے بہت سے ہیں لیکن دونوں سے پوچھیے تو معلوم ہوگا پھر مرغ اور مینڈھے اور ہاتھی کی لڑائی دیکھنے کے سامنے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس لئے کہ وہ آدمی کو بالکل ہی اپنا غلام بنا کر چھوڑتی ہے۔ اس قسم کی سب سے بری لت آدمیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہے ایک زمانہ تھا جب روم میں لوگ آدمیوں کے لڑنے، ان کے زخمی ہونے اور مرنے کو ٹکٹ لے کر دیکھا کرتے تھے جیسے ہم آج کل فلم دیکھتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ بڑے رحم دل لوگ ایک مرتبہ آدمی کا خون بہتے دیکھ لیتے تو پھر ایسا چسکا پڑ جاتا کہ انھیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آدمیوں کو لڑا کر تماشا دیکھنے کی رسم روم سے باہر نہیں پھیلی اور اب جو ایسی لڑائی دیکھنا چاہتا ہے اسے اپنی سلامتی کی فکر بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو تماشا دیکھنے کی لت نہ جانے کیا کیا اندھیر ڈھایا کرتی۔

لیکن اب بھی آپ جدھر نظر اٹھائیے تماشا دیکھنے کا شوق موجیں مار رہا ہے۔ جب کبھی اس کا خیال آتا ہے کہ لڑائی ہوئی تو ان کے اپنے سروں پر ہی بم پھٹیں گے تو لوگ کانپ اٹھتے ہیں پر چاہتے سب یہی ہیں کہ کوئی نہ کوئی تماشا دیکھنے کو ملے۔ اگر ہماری آپ کی قسمت سے ایسا ہو جائے کہ مسٹر چیمبرلین سے دو دو باتیں کرنے کا موقعہ ملے اور ہمارے دل میں جو بات ہے ہم ان سے کہیں کہ آپ نے ہٹلر اور مسولینی کے سامنے جھک کر دنیا کی آزاد قوموں کی بے عزتی کرائی اور آزاد جمہوری حکومت کے اصول کو خطرہ میں ڈال دیا تو وہ پہلے تو ہمارے اوپر الزام لگائیں گے کہ آپ حضرات بنتے ہیں آزادی اور جمہوریت کے شیدائی۔ مگر دل میں نرے تماشائی ہیں اور آپ کچھ بھی کہیں میں ایسا نہیں ہوں کہ آپ کی باتوں کے پھیر میں آکر آپ کو خوش کرنے کے لئے تماشا دکھانے لگوں۔ اگر تم نے مسٹر چیمبرلین کو کسی طرح یقین دلا دیا کہ ہمیں خونی تماشا دیکھنے کی لت تھی اور نہ ہے تو وہ فوراً بحث کا پہلو ذرا بدل کر جواب دیں گے کہ آپ سے میری مراد خاص طور سے آپ لوگ نہیں تھے۔ اس لئے کہ آپ تو برطانیہ کے وفادار شانتی کی پوجا کرنے والے شہری ہیں۔ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا۔ جو سمجھتے ہیں کہ یورپ کی سیاست ایک گاڑی ہے جس میں ہم گھوڑوں کی طرح جتے ہوئے ہیں اور ہم میں سے کامیاب وہی ہوگا جو اس گاڑی کو اپنی طرف کھینچ لے جائے اس کھینچا تانی میں گاڑی الٹے یا تمام گھوڑوں سمیت کسی گہرے غار میں گر جائے۔ آپ لوگوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے پورا زور نہیں لگایا اور ہٹلر اور مسولینی کو گاڑی بہت دور تک جدھر وہ چاہتے تھے کھینچ لے جانے دی۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ گاڑی کو نہیں دیکھتے کہ کتنی نازک ہے راستہ کو نہیں دیکھتے کہ کیسا اونچا نیچا اور خطرناک ہے فاشسٹ گھوڑے ہنہناتے ہیں تھرکتے اور آپ ہی آپ دولتیاں چلاتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بڑا کام کیا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ گھوڑے کا کام کودنا ہے کرتب دکھانا ہے یا گاڑی کھینچنا اور میں نے اگر ہٹلر اور مسولینی کو ذرا ڈھیل دیدی اور سیاست کی گاڑی کو ٹوٹنے اور الٹنے سے بچا لیا تو اس میں دنیا کا فائدہ تھا۔ یا نقصان بے شک

لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا کام بھی بنے اور نام بھی رہے لیکن میں تو وہی کر سکتا ہوں جو مرے بس میں ہے ہٹلر اور مسولینی میرے مقابلے میں نوجوان ہیں انھیں تماشا کرنے اور تماشا دیکھنے کا شوق ہے میں جو کچھ کر سکتا ہوں خاموشی سے کر لیتا ہوں مسٹر چیمبرلین کا یہ جواب سنکر آپ شاید چپ ہو جائیں اور چیمبرلین تھکے ماندے نہ ہوتے اور انھیں نزلہ کی شکایت نہ ہوتی تو ممکن ہو کہ آپ کو قائل ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ دو چار باتیں ایسی بھی کہہ جائیں جنھیں وہ عام طور پر دل میں چھپا رہے ہیں شاید وہ یہ کہدیں کہ آپ لوگ جو میرے اوپر الزام لگاتے ہیں کہ میں نے آزادی اور جمہوریت کی ناؤ ڈبو دی بڑی نادانی کی بات کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ہسپانیہ میں دخل نہیں دیا۔ مگر جرمن اور اٹلی کو دخل دینے سے نہیں روکا بھلا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں دخل دیتا تو کس بنا پر سوشلزم سے آپ جانتے ہیں مجھے ہمدردی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکثر لوگ جو سوشلسٹ بنتے ہیں ایک نئے فیشن کی پیروی کر رہے ہیں جو سچے سوشلسٹ ہیں وہ گنتی میں بہت کم ہیں انھوں نے مجھے وزیر اعظم نہیں بنایا اور میں ان کو خوش کرنے کا ذمہ دار نہیں۔ تو میں کیوں آپ ہی آپ برطانیہ کو ایک سوشلسٹ ملک سمجھ کر ہسپانیہ کے جھگڑے میں الجھ جاتا رہا یہ اعتراض کہ میں نے جرمنی اور اٹلی کو دخل دینے سے کیوں نہیں روکا سو آپ ہی بتائیے کہ میں آزاد اور خود مختار ملکوں کو کس طرح روک سکتا تھا میں نے جو کچھ طے کیا برطانیہ کے لئے ہی طے کیا اور فرانس پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا کہ وہ بھی ہسپانیہ کے جھگڑے سے الگ رہیں۔ اس لئے کہ فرانس اور برطانیہ سے اتحاد ہے اور ہم دونوں کو ایک ہی پالیسی پر چلنا چاہیئے، جرمنی اور اٹلی نے فرینکو کا ساتھ دیا اور اس کی اتنی مدد کی کہ وہ آخر میں جیت گیا۔ آپ کی طرح میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ آپ سے بہت بہتر جانتا ہوں کہ جرمنی اور اٹلی دونوں جیسا موقعہ ہوتا ہے ویسی ہی بات کہتے تھے کل وہ قسمیں کھاتے تھے کہ ہم کو ہسپانیہ کے معاملہ سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم فرینکو کے ہم مذہب ہیں اور اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی وہ کھلم کھلا مدد کرتے اور فرینکو کی فتح کو اپنی فتح سمجھتے۔ میں نے جہاں تک کہ سیاست کے آداب

اس کی اجازت دیتے ہیں ان پر ظاہر کر دیا کہ میں انھیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں۔ اگر آپ خیالی باتوں میں نہ پڑے ہوتے اور دنیا کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ میں نے بڑی مصلحت سے کام لیا اس لئے کہ آپ جھوٹے کو اس کے منھ پر جھوٹا کہہ دیجئے تو سچا نہیں بن جاتا بلکہ اور زیادہ صاف اور صریح جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کرنا میرا کام نہیں میرا کام تو صرف برطانیہ کا فائدہ اور بھلائی کرنا ہے اور آپ اس میں دیکھیں گے کہ میں کبھی نہیں چوکا۔ فرینکو کے ہوائی جہازوں نے بیسیوں تجارتی ہوائی جہازوں پر بم بازی کی اور میں کچھ نہیں بولا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس میں برطانیہ اور برطانیہ کے شہریوں کو خاص نقصان نہیں ہوتا لیکن ستمبر ۱۹۳۷ء میں جب ایک بار گی آب دوزوں نے بحر روم اور اٹلانٹک میں حملے کرنا شروع کر دئے تو میں نے فوراً پہرے ہر طرف بٹھا دئے۔ اور یہ خطرہ بہت جلد دور ہو گیا۔ اب ہسپانیہ کی لڑائی ختم ہو رہی ہے تو میں اس کا انتظام کر رہا ہوں کہ برطانیہ اور ہسپانیہ کے جیسے تعلقات جنگ سے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہو جائیں اور برطانیہ کو بحر روم میں جو اطمینان پہلے تھا۔ اب پھر حاصل ہو جائے آپ نے دیکھا کہ میں نے کس استادی سے ایک برطانوی جہاز بھیج کر منورکا کے جزیرے پر جنرل فرینکو کا قبضہ کرا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ جزیرے ہسپانیہ کے دکھن میں ہیں اور جزائر سے جو جہاز جنوبی فرانس کی بڑی بندرگاہ مارسی کو جاتے ہیں وہ ان کے پاس سے گزرتے ہیں اس کے بہت قریب ایک اور جزیرہ میجورکا ہے جسے اٹلی نے زبردستی ایک ہوائی مرکز بنا لیا ہے اور جہاں اس کے جنگی جہاز بھی اب رہنے لگے ہیں میں نے اٹلی سے محبت کئے بغیر ایک چال چلی کہ جس سے اٹلی کا پتہ کٹ گیا اور فرینکو پر مفت کا ایک احسان ہو گیا۔ میں ایسی ہی کچھ چالیں اور سوچ رہا ہوں فرینکو کی حکومت کو میں نے تسلیم کر لیا ہے اور آپ ذرا صبر کریں پھر دیکھیے گا کہ فرینکو باتیں چاہے اسی زبان میں کرے جس میں کہ ہٹلر اور مسولینی بولتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کرے گا مجھ سے صلاح مشورہ کر کے کرے گا یہی میں چاہتا ہوں مسٹر چیمبرلین کی ان دلیلوں کا اب آپ کیا جواب دیں گے۔ سوائے اس کے کہ دیکھیے فرینکو کی سیاست اب کتنے پلٹے کھاتی ہے۔

ایک ہسپانیہ کا معاملہ نہیں ہے ساری فاشسٹ سیاست کا ہے جرمنی اور اٹلی نے اس میں اپنا فائدہ دیکھا تو وہ فرینکو کو آپ سے پھرا دیں گے اس لئے کہ وہ ابھی تک بالکل انھی کے ہاتھ میں ہے۔ اور شاید فرینکو بھی اپنا فائدہ دیکھے۔ آپ کی سیاست نے دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ آپ کا اور فرانس کا دن ڈوبنے کو ہے۔ اب تو فرینکو موقع بے موقع ضد کرے گا اور جرمنی اسے اکساتا رہے گا جرمنی نے اب پولینڈ اور اوکرائن کو تاکا ہے۔ وہ ضرور اس کی کوشش کرے گا۔ کہ فرینکو سے اس کا یارانہ رہے اور جب وہ اوکرائن کو دبوچے تو آپ بالکل بے بس ہوں۔

مسٹر چیمبرلین یہ بات سنکر ضرور مسکرائیں گے شاید انھیں ہنسی بھی آجائے وہ کہیں گے کہ آپ صرف اخبار پڑھتے ہیں۔ اور میرے سامنے جرمنی کی نئی اور پرانی تمام کارروائیوں کا دفتر کھلا رکھا ہے آپ اس لئے پریشان ہیں کہ جرمنی بہت زیادہ ملک فتح کرے گا اس کی دولت بہت بڑھ جائے گی اور یورپی سیاست کی باگ ڈور بالکل اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ مگر آپ کو اس کا خوف ہے تو آپ نے مجھ ہی کو سارے یورپ کا چوکیدار کیوں سمجھ لیا ہے اور آخر آپ سے میں کے مرتبہ کہوں کہ میں صرف برطانیہ کی سلامتی کا ذمہ دار ہوں۔ اگر روس پولینڈ اور رومانیہ میں اتنی طاقت نہیں کہ جرمنی کو روک سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ جرمنی کو روکا نہیں جا سکے گا اور یوکرائن حاصل کرنے سے جرمنی کی طاقت بہت بڑھ جائے گی لیکن پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ جرمنی کو اوکرائن اسی طرح خالی دھمکی دے کر مل جائے گا۔ جیسے کہ چیکوسلواکیا ملا تھا روس پولینڈ اور رومانیہ اس کی ضرور مخالفت کریں گے اور ہٹلر بھی یہ خوب جانتے ہیں کہ اوکرائن کا مال مفت ہاتھ آنے والا نہیں۔

پھر آپ اس کا بھی خیال رکھئے کہ میں نے سولینی کو بگڑنے نہیں دیا۔ اور جب وہ چاہیں مجھ سے دوستی و اتحاد کر سکتے ہیں انھوں نے اپنے داماد وزیر خارجہ چیانو کو ابھی پولینڈ بھیجا ہے بلقان کی ریاستوں کو بھی وہ جرمنی کی بڑھتی طاقتوں سے ڈرا رہے ہیں اور اگر میں نے ان کے ساتھ روپیے سے سلوک نہ کیا تب بھی وہ جرمنی کے حوصلے دیکھ کر آپ ہی میری طرف جھکیں گے۔ اوکرائن

پر حملہ کرنے سے فاشسٹ سیاست کی کشتی اس طرح ڈگمگائے گی کہ ہر ہٹلر خود پانی میں گر جائیں تو کچھ تعجب نہیں۔ یہ سب باتیں آپ کو خود سوچنا چاہئے میں آپ کچھ نہیں کہونگا۔ ورنہ آپ مجھ پر اور اعتراض جڑ دیں گے مجھے اپنے بڑھاپے اور تجربے پر ناز ہے اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہنے کا موقع نہیں لیکن جب آپ اور تمام مسلوں پر مسٹر چمبرلین کی رائے سن چکے ہیں تو آپ کے منھ سے چین کا نام ضرور نکل جائے گا ممکن ہو مسٹر چمبرلین یہ لفظ سنیں ہی نہیں۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے کہدیں۔ کہ اس معاملے میں آپ نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ بھی غلط ہے آپ سیاست کی زبان نہیں سمجھتے آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ چینی اور جاپانی لڑ کس بنا پر رہے ہیں۔ میں نے اب تک اپنی سیاست کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے اس پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ برطانوی سیاست کا مقصد کیا ہو سکتا ہے غور کرنے کے لئے وقت بھی بہت ہے چین اور جاپان کا جھگڑا کچھ جلد طے ہونے والا نہیں۔

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیرادارت: شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بہ تازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (۶ر) ششماہی تین روپے

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۹ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر کلیم ۱۴ ہمانی نواس دریا گنج دہلی

جدید مطبوعات جامعہ

مضامین محمد علی۔ مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھے۔ قیمت مجلد عہ

دنیا کی کہانی۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائی اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر وہ سب سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ قیمت عار

شہری آزادی۔ از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ ایک کتابچہ ہے جس میں بیرونی ممالک کی حکومتوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے ان حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جس سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۶ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت۔ از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک برباد ہوا ہے اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

ہندوستان میں دیہی قرض۔ مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے اور ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات درج کی گئی ہے قیمت ۴ر

مکتبہ جامعہ

نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱- سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲- مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳- ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴- جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلہ خیالات کر سکیں گے۔

زیر ادارت:۔ پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۴	اپریل ۱۹۳۹ء	جلد ۳۱

فہرست مضامین

جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل

(از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی)

ہمارا زمانہ صحیح معنوں میں ایک تعلیمی انقلاب کا زمانہ ہے۔ تقریباً ہر صوبہ میں تعلیم کی قدیم عمارت کو ڈھایا جارہا ہے اور اس کی جگہ نئی عمارت کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے۔ اس وقت تک کئی کمیٹیاں اور کمیشن بیٹھ چکے ہیں۔ جنھوں نے اس تعلیمی انقلاب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تجاویز پیش کیں۔ بعض صوبوں میں ان تجاویز پر عمل بھی شروع ہوگیا ہے۔ مسلمان اس انقلاب سے بیحد پریشان و سراسیمہ دکھائی دیتے ہیں اس انسان کی طرح جو گہری نیند میں سو رہا ہو اور جسے یکایک کوئی جھنجوڑ کر جگا دے اس نیم خوابی کی حالت میں اسے سوجھائی تو کچھ نہ دے لیکن وہ دوسروں کو اپنے غم و غصہ کا نشانہ ملامت بنائے اسے اس پر نہایت غصہ آئے کہ دوسرے کیوں اس سے جلد بیدار ہو گئے ہیں اور منزل مقصود کی طرف چلنا بھی شروع کر دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بھی اپنا سامان سفر درست کرے اور منزل کی طرف بڑھے اس کی تمام طاقت غم و غصہ کی ہی نظر ہو جائے اور وہ پھر دوبارہ تھک کر محو خواب ہو جائے۔

بعینہ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ وہ برابر دوسروں کی تعلیمی اسکیموں اور تجاویز کی مخالفت کر رہے ہیں بشور و ہنگامہ بپا کر رہے ہیں مگر بحیثیت قوم اب تک جدید زمانہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر انھوں نے اپنے تعلیمی مسائل پر غور نہیں کیا ہے اور نہ کوئی عملی لائحہ عمل اس کے لئے پیش کیا ہے۔ انفرادی طور پر ضرور ان مسائل پر اظہار خیال ہو رہا ہے لیکن ہمارے مسلم مفکرین ابھی تک یکجا ہو کر نہیں بیٹھے کہ وہ بالآخر مسلمانان ہند کے لئے کوئی تعلیمی لائحہ عمل پیش کریں۔ اس مسئلہ کا حل ممکن ہوتا اگر۔ علیگڈہ۔ دیوبند۔ ندوہ۔ جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہرین

تعلیمات کیا مسلمانوں کی دینی و دنیوی تعلیمی مسائل پر غور و فکر کرتے اور ایک مکمل پروگرام قوم کے سامنے پیش کرتے۔ یہ مضمون اس ضرورت کی طرف بزرگان قوم کی توجہ مبذول کرانے کے لئے لکھا جارہا ہے ورنہ اس کا مقصد کوئی قطعی حل پیش کرنا نہیں ہے۔

مسلمانوں کے تمام تعلیمی مسائل سے تو اس وقت بحث نہیں کی جاسکتی البتہ صرف چند اہم مسائل پر روشنی ڈالنا مد نظر ہے۔ مثلاً

۱۔ مسلمانان ہند کا تعلیمی نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

۲۔ نصب العین کن ذریعوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ جدید تعلیمی رجحانات کے متعلق مسلمانوں کی کیا روش ہونی چاہیئے؟

۴۔ مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی ادارے مثلاً علیگڈھ۔ دیوبند۔ ندوہ جامعہ عثمانیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ کس طرح اس نصب العین کے حاصل کرنے میں مدد پہنچا سکتے ہیں؟

۵۔ مسلمانوں کا اپنی ہمسایہ قوم ہندوؤں سے کیا تعلیمی رشتہ ہونا چاہیئے؟

۱۔ مسلمانان ہند کا تعلیمی نصب العین | مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ جب تک منزل مقصود صحیح طور پر متعین نہ ہو اس تک پہنچنے کا راستہ بھی ٹھیک طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا خیالات میں اس وقت جو خلفشار ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہمارا نصب العین ہمارے سامنے واضح طور پر موجود نہیں ہے۔ جن مفروضات پر ہم اپنے خیالات کی بنیاد رکھتے ہیں وہ ہی جب مختلف ہیں تو اس پر جو عمارت کھڑی ہوگی وہ لازماً مختلف ہوگی۔ اس حصہ کو واضح کرلینا اس لئے وقت کی سب سے بڑی تعلیمی ضرورت ہے۔

اس وقت مسلمانوں میں اس سلسلہ میں کئی قسم کے خیالات رائج ہیں مثلاً بعض حضرات صرف معاشی محرکات کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ قوم کے بچوں کی تعلیم صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر ملک کی معاشی دولت میں اضافہ کرسکیں وہ مذہبی اور روحانی قدروں کے

مخالف ہیں اور انھیں اس کی مطلق بھی پرواہ نہیں ہے کہ ہمارے بچے آگے چل کر اسلامی تہذیب وتمدن کے حامل ہوں۔

یہ حضرات اس امر کو کلیتاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ نفس انسانی میں جہاں معاشی محرکات موجود ہیں وہاں روحانی۔ مذہبی۔ اخلاقی اور جمالی محرکات بھی ہیں۔ نفس انسانی کی مکمل نشو و نما صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان تمام صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے نہ کہ نفس انسانی کے صرف ایک پہلو پر اس کی دوسری تمام نفسی زندگی کو قربان کر دیا جائے۔ انسان دراصل حیوانی اور ملکوتی عناصر کا مجموعہ ہے۔ معاشی صلاحیتیں اس کے حیوانی عنصر سے قریب تر ہیں چونکہ ان کا مقصد ان کی حیوانی زندگی کو برقرار رکھنا ہے تاکہ اس پر اس کی ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی زندگی کی تعمیر ہو سکے۔ صرف معاشی صلاحیتوں کو تربیت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم انسان کو پھر حیوانیت کے درجہ میں گرا دینا چاہتے ہیں۔ لاکھوں برسوں میں انسان ارتقا کے ذریعہ حیوانیت سے نکل کر انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے۔ کیا ہم اس تمام نشو و نما کو بے کار کر دینا چاہتے ہیں؟ انسان کو "عروج" کی طرف لیجانے کی بجائے کیا ہم پھر اس کو زوال کے گڑھے میں دھکیل دینا چاہتے ہیں؟ "روٹی" کے مسئلے سے بھی انکار نہیں ہے۔ تمام نفسی زندگی کے لئے بھی حیوانی بنیادوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ خوشنما پھولوں کی پیدائش کے لئے بھی سیاہ مٹی کی ضرورت ہے مگر مقصود بالذات بہر صورت خوشنما پھول اور میٹھے پھل ہیں سیاہ مٹی نہیں ہے۔ عمارت کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے کیچڑ اور پتھر سب ہی کی ضرورت ہے مگر مقصد بہرحال وہ عالیشان خوشنما عمارت ہے جو اس پر کھڑی کی جاتی ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

کثافت کسی قدر ضروری ہے مگر مقصود بہرحال لطافت ہے۔ زنگار سے انکار نہیں مگر مطلوب اصلی تو باد بہاری ہی ہے۔ مختصر یہ کہ "خوردن برائے زیستن" ہے نہ کہ "زیستن برائے خوردن"۔

ہمارے اشتراکی بھائی اسی آخرالذکر مسلک کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات نہ ہونی چاہیئے کہ انسانیت کبھی بھی صرف اپنی حیوانی ضروریات کے پورے ہونے پر قانع نہیں ہو سکتی جب اس کی یہ ضروریات پوری ہو جاتی ہیں تو اس کے نفس کی دوسری صلاحیتیں اپنا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ خود روس میں دیگر تمدنی قدروں کی طرف اب کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ کلیسا کے بے جا ظلم و تشدد کے باعث وہاں جو ردعمل ہوا تھا اور عام طور پر مادیت الحاد اور دہریت کا دور دورہ ہو گیا تھا وہ دیرپا چیز نہیں ہے۔ انسانیت بہرحال اپنی اصلی روحانی بنیادوں سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتی اور شاید اسی سرزمین میں پھر دوبارہ اصلی مذہب اور روحانیت کا آغاز ہو۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی ہندوستان میں غلط راستہ اختیار کریں اور شروع ہی سے ہمارے تمدنی تعلیمی نصب العین کو صحیح بنیادوں پر کیوں نہ استوار کریں۔

دوسرا تعلیمی نصب العین جو ہندوستان میں پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں لہٰذا ہمیں ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جانا چاہیئے اگر ہندوستانی تہذیب کے یہ معنی ہیں کہ وہ دو مختلف تمدنوں یعنی ہندو تمدن اور ہندی مسلم تمدن کے مجموعہ کا نام ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا چونکہ ہم ہندی مسلم تمدن کے حامل ہیں جو ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ لیکن دراصل اس تحریک کا یہ مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا تو مقصد ہے کہ ہم ہندو تہذیب میں اپنے آپ کو جذب کر دیں۔ وہ ہندوستانی تمدن اس تمدن کو کہتے ہیں جو اس ملک کی اکثریت کا تمدن ہے۔ اور اکثریت ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی ہے۔ اس نقطۂ نظر کو ہم کئی وجوہ سے تسلیم نہیں کر سکتے۔ اوّلاً تو یہ کہ ہمارے اسلامی تمدن کے چند خصائص ہیں۔ اگر وہ خصائص برباد ہو جائیں تو ہمارا قومی نفسی وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں اپنے وجود سے اسی قدر محبت ہے جس قدر کہ کسی دوسری قوم کو اپنے وجود سے ہے۔ پھر ہماری قومی زندگی کے اصول مثلاً توحید۔ جمہوریت۔ مساوات۔ اخوت۔ آزادی۔ رواداری۔ خدمت خلق۔ اشاعت انسانیت کا نصب العین وغیرہ ایسے ہیں جو نہ صرف ہماری نشو و نما کے لئے ضروری

ہیں۔ بلکہ اس سے ہندوستان کی قومی زندگی اور انسانیت کو عظیم الشان فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ ہماری قومی نفسی زندگی اگر فنا ہو جائے تو اس سے نہ صرف ہمیں نقصان پہنچے گا بلکہ ہندوستان کی قومی زندگی اس کے بغیر غریب ہو جائے گی۔ ہماری آمد سے ہندوستان کی تمدنی زندگی ان قدروں سے مالا مال ہوئی اور ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم خود ان قدروں کے حامل رہے تو وہ ہمیشہ مالا مال ہوتی رہے گی۔

ہمارے ہندی مسلم تمدن کی بنیاد اہل عرب کی مذہبی اور اخلاقی قدروں پر استادہ ہیں اور اس میں ایران کے جمالی اور ادبی عناصر آکر شامل ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں آکر اس نے وسعت اور گہرائی حاصل کر لی ہے بحیثیت تمدن کی ایک مثال کے یہ ہندوستان کے دوسروں تمدنوں سے اعلیٰ ہے۔ انسانیت کے نصب العین سے وہ زیادہ قریب ہے۔ وہ زمانہ کی ضرورتیا کو زیادہ بہتر طریقہ پر پورا کر سکتا ہے۔ اور زمانہ کی محرکات کے ساتھ کامیابی کے ساتھ تطابق پیدا کر سکتا ہے۔ ان حالات میں اس کا برقرار رکھنا ضروری ہے ہندو قومیت میں فنا ہو جانے کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم خود کو ہندوستان کو اور انسانیت کو نقصان پہنچائیں۔ ایک زندہ اور نامی چیز کے وجود سے خود ہندوستان کے دوسرے تمدن میں زندگی اور گرمی پیدا ہو گی اور ہم مشترکہ طور پر انسانیت کے نصب العین کے لئے جدوجہد کر سکیں گے۔

اس قسم کا ایک تیسرا تعلیمی نصب العین اور ہے۔ جو مغربی خیالات و افکار کی اندھی تقلید کرنا چاہتا ہے۔ مکالے کے زمانے سے یہ تحریک شروع ہوئی اور اس کے جو مضر نتائج مرتب ہوئے وہ اب ہمارے سامنے ہیں۔ ایک عظیم الشان قوم جس کے اپنے اعلیٰ اصول زندگی تھے۔ جو عظیم الشان تاریخی روایات کی حامل تھی جو عہد جدید کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کر سکتی تھی۔ محض بندر کی طرح نقالی پر قانع ہو گئی۔ اپنے مذہب۔ تہذیب و تمدن کو تو فراموش کرنے کے باعث جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہوا ہی لیکن مغربی علوم و فنون میں بھی دستگاہ پیدا نہ کر سکے۔ مغرب میں اسی نظام تعلیم کے باعث بڑے بڑے حکما، سائنداں

صناع اور سیاست داں پیدا ہوئے لیکن یہاں "بابو" کے سوا کچھ پیدا نہ ہو سکا چاہے اس کے مدارج مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کا سبب صاف ظاہر ہے۔ مغربی نظام تعلیم مغرب کی نامی زندگی کا مظہر تھی جو اس کو قوی اور مکمل بنانا چاہتی تھی۔ یہاں اس نظام تعلیم کا تعلق قوم کی نفسی زندگی سے نہ تھا۔ وہ ایک محدود مقصد کے لئے اوپر سے قوم کی زندگی پر لاد دی گئی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی نظام قومی زندگی کے سوتوں سے سیراب نہ ہو سکا اور بالآخر خشک ہو کر رہ گیا۔ کچھ تھوڑا بہت فائدہ اس مغربی تعلیم سے بھی پہنچا اسی قدر جس قدر کہ نقل سے انسان کو پہنچتا ہے مگر یہ ہمارے مرض کی دوا نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی اور نہ اس کے بانیوں کا یہ مقصد تھا کہ اس کے ذریعہ ہماری قومی زندگی سرسبز و شاداب ہو۔ علیگڈھ نے کلکٹر تو بہت پیدا کئے لیکن قومی زندگی کے معمار بہت کم۔ اور جو اپنے فطری استعداد کے باعث پیدا ہوئے وہ غدار کہلائے جس زمانے میں ہم نے مغربی تمدن کی نقل شروع کی وہ اس وقت ایک ذہنی تمدن تھا۔ اس لئے کم یا زائد ذہنی اعتبار سے بھی ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا لیکن اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے کے اعتبار سے تو یہ محض ناکامیاب رہا۔ عموماً زرطلبی جاہ طلبی۔ آرام طلبی غیر مستقل مزاجی۔ مصائب سے خوف۔ آزادی عمل کی کمی غلامی پہ قناعت جیسی اخلاقی خرابیاں انگریزی نظام تعلیم کے باعث ہمارے طالب العلموں میں عام طور پر سرایت کر گئیں۔

اب تک تو ہم نے ان تعلیمی تصورات سے بحث کی ہے جن کا مقصد اسلامی تہذیب و تمدن کو یا تو کلیتہً برباد کرنا ہے یا ان کو بحیثیت تعلیمی قدود کچھ زیادہ وقعت دینا نہیں ہے۔ اب ہم ان تعلیمی نظاموں کا ذکر کریں گے جو شعوری طور پہ اسلامی مذہب اور تمدن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

سب سے اول لازماً ہماری توجہ اس عربی نظام تعلیم کی طرف جاتی ہے جو عام طور پر ہمارے ملک میں رائج ہے۔ جس میں درس نظامیہ رائج ہے اور جس کا سب سے بڑا نمائندہ مدرسہ دیوبند ہے عہدہ متوسطہ میں جب اس نظام تعلیم کی بنیاد پڑی تو اس زمانہ کی اسلامی قومی ضروریات کو یہ نظام تعلیم پورا کرتا تھا۔ اس وقت کی مسلمانوں کی مذہبی فکری اور علمی دنیا کا وہ مظہر تھا

تفسیر۔ حدیث و فقہ اس نظامِ تعلیم کی اساس قرار پائیں اور اس زمانہ میں جو علوم و فنون رائج تھے وہ درس کا جزو قرار دے گئے۔ یونانی علوم و فنوں اس وقت عام طور پر رائج تھے اس لئے وہ شریک درس کر لئے گئے چنانچہ یونانی منطق۔ فلسفہ، ریاضی۔ ہیئت وغیرہ سب درس کا جزو ہو گئے۔ یہ نظام تعلیم اس وقت تک مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتا رہا جب تک کہ وہ واقعتاً مسلمانوں کی قومی ضروریات پوری کرتا رہا۔ ان علوم و فنون میں اس وقت تک زندگی رہی جب تک کہ وہ حقیقت کے ترجمان رہے۔ زمانہ کی رفتار برابر بڑھتی رہی۔ قومی ضروریات میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی، علوم و فنون میں نئے نئے انکشافات ہونے شروع ہوئے لیکن زوال بغداد کے بعد مسلمانوں میں کچھ ایسی ذہنی پستی آگئی کہ انھوں نے اپنے نظام تعلیم میں ذرا بھی تبدیلی پیدا نہ کی۔ نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے۔ جس نظامِ تعلیم نے پہلے بڑے بڑے عالم، فقیہ۔ ادیب اور سیاست داں پیدا کئے تھے وہ اب سوائے مسجد کے ملاؤں کے اور کچھ پیدا نہ کر سکا بعض بعض عظیم المرتبت ہستیاں اپنی فطری استعداد کے باعث ضرور پیدا ہوئیں مگر ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ بحیثیت مجموعی قوم میں انقلاب نہ پیدا کر سکی۔ آزادی فکر کی جگہ اندھی تقلید نے جگہ لے لی۔ جدید غور و فکر کی بجائے قدما کی تصانیف پر متن پر متن اور حاشیہ پر حاشیہ چڑھائے گئے۔ غزالی۔ رازی۔ ابن سینا۔ ابن رشد۔ امام ابو حنیفہ امام شافعی کا ڈھونڈے سے بھی کہیں پتہ نہ لگتا تھا۔ غور و فکر، فطرت کا آزاد مطالعہ جس کی تلقین قرآن نے بار بار کی تھی اور جس کے باعث علوم فطرت کی مسلمانوں میں بڑی ترویج ہوئی تھی۔ ممالکِ اسلامی میں مفقود ہو گیا۔ یہی چیزیں جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و تمدن کا طرہ امتیاز تھیں اب مغرب میں سر سبز ہونا شروع ہوئیں۔ اسلامی اثرات کے تحت میں پہلے یورپ نے آزادی فکر اور فطرت کے مطالعہ کو سیکھا۔ علوم و فنون کے عربی اثر کے تحت میں راجر بیکن نے استخراجی نہیں بلکہ استقرائی طریقہ کو پسند کیا۔ ان تمام اثرات کے باعث یورپ میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ نئے علوم و فنون کے انکشافات کئے گئے۔ نئی دنیا کا پتہ چلا یا گیا۔ نئی حکومتیں قائم کی گئیں۔ منطق اور فلسفہ کی تدوین کی گئی لیکن پھر عالم اسلامی سینکڑوں برسوں تک خواب

غفلت میں گرفتار ہو گیا۔ ذہنی غلامی جمود کا نتیجہ بہت جلد سیاسی و معاشی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوا اور عالم اسلامی مغرب کی تازہ دم زندہ اقوام کی حرص و آز کا شکار بن گیا ہماری اس غلامی میں ہمارے اس فرسودہ مذہبی نظام تعلیم کا۔ کچھ کم اثر نہیں ہے۔ جس وقت یورپ کا نظام تعلیم اپنے طلباء کے قویٰ ذہنی و اخلاقی کو ابھار رہا تھا ہمارے ملا اندھی تقلید اور ترک دنیا کی تعلیم دے رہے تھے۔ ترکی اور ایران میں اسلامی تعلیمات کے خلاف اس قدر شدت سے ردعمل نہ ہوتا، اگر وہاں کے ملا اسلام کو ایسی مکروہ شکل میں پیش نہ کرتے جو ہر قسم کی آزادی فکر و عمل کو سلب کر لیتا ہے۔ جس کا مقصد قوم کے معاشی۔ سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کا حل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ محض یہ طے کرنا کہ گھٹنے کے اوپر پاجامہ ہو جانے سے جسم کا کس قدر حصہ دوزخ میں جائے گا۔ یا زکوٰۃ کی اس طرح تقسیم کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ حصہ خود مولوی صاحب کی جیب میں چلا آئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کی تمام قومی زندگی ہی خطرہ میں آگئی۔ اس مذہبی نظام کے ذریعہ دوبارہ اس گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے بے شک یہ فائدہ تو ہوا کہ مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی قدر بہت حد تک باقی رہ گئیں۔ علوم اسلامیہ جو ممکن تھا کہ کلیتاً فنا ہو جاتے موت کے منھ سے بچائے گئے۔ مگر یہ نظام تعلیم بہر صورت اس زمانہ سے سینکڑوں برس کے نظام تعلیم کی نقل تھی اس لئے نہ قوم کی ضروریات پوری کر سکتا تھا اور نہ ان میں زندگی کی نئی روح پیدا کر سکتا تھا۔ اپنی فطری صلاحیت کے ماتحت بعض عظیم المرتبت ہستیاں ضرور پیدا ہو گئیں مگر بحیثیت مجموعی اس نے سوائے مسجد کے کوتاہ نظر ملاؤں کے کچھ نہ پیدا کیا۔ ایک طرف امت اسلامیہ کا وجود ہی خطرہ میں تھا اور دوسری طرف ہمارے یہ علمائے کرام رفع یدین یا آمین بالجہر کے جزدی مسائل پر آپس میں دست و گریباں ہو رہے تھے نہ انھیں زمانہ کی ضروریات کی خبر تھی اور نہ امت اسلامیہ کے معاشی۔ سیاسی اور دیگر تمدنی مسائل سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ زمانۂ جدید کے

علوم و فنون کی ترقی سے یہ محض نا واقف تھے اور چونکہ ہر چیز سے لاعلم تھے اس لئے تمام دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ رواداری اور وسعت قلب ان میں مفقود ہو گئی اور ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لئے آمادہ ہو جانا۔ ان کا وطیرہ ہو گیا۔ غرضکہ اس گزشتہ نصف صدی میں تھوڑا بہت فائدہ مذہبی شکل میں اس نظام تعلیم سے ضرور مرتب ہوا مگر بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے تعلیمی مسئلہ کو حل نہ کر سکا۔

قوم کے ذہنی قویٰ بیدار کرنے اور نشو و نما دینے میں تو یہ نظام تعلیم بہت ناکامیاب ثابت ہوا البتہ اخلاقی قدر پیدا کرنے میں یہ انگریزی نظام تعلیم سے زیادہ کامیاب رہا۔ قناعت۔ جفاکشی سادگی جیسی خوبیاں اس نے اپنے طالب العلموں میں پیدا کر دیں۔ مگر ساتھ ہی ان کو کوتاہ نظر متعصب اور لاعلم بھی بنا دیا۔

مسلمانوں کی قومی زندگی کی ابتری دیکھ کر بطور رد عمل ایک دوسری تمدنی اور تعلیمی تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ جس کا مقصد ہے کہ قرون اولیٰ کے اسلام کا احیا کیا جائے۔ عبدالوہاب نجدی جیسے زبردست مصلح نے اس کو علامہ ابن تیمیہ کی تعلیمات کے زیر اثر شروع کیا۔ یہ چیز ہندوستان میں بھی پہنچی اور اس نے مسلمانان ہند کو ایک نئی دعوت عمل دی۔ اس کے باعث ہماری بہت سی قومی خرابیاں بھی دور ہوئیں اور ایسے مدارس کی بنیاد پڑی جن کا مقصد صرف قرآن و حدیث کی تعلیم دینا تھا اور جو قرون اولیٰ کی زندگی کو بجنسہ دوبارہ واپس کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک اسلامی اخلاق کو دوبارہ زندہ کرنے کا تعلق ہے ان حضرات کی کوششیں بڑی ہی قابل ستائش ہیں کیونکہ بغیر اس کے واقعتاً قومی زندگی کی عمارت ہی کھڑی نہیں ہو سکتی اور ان اخلاق کے لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کرامؓ سے زیادہ اور کون ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

لیکن یہ حضرات جوش اصلاح و تجدید میں قومی زندگی کے ایک بنیادی اصول کو بالکل ہی فراموش کر گئے۔ یعنی یہ کہ فرد کی طرح قومی زندگی میں بھی برابر نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی اپنے بچپن۔ لڑکپن۔ شباب۔ ادھیڑپن اور کہولت کے زمانے طے کرتی ہے۔ جس طرح آپ

ایک نوجوان انسان کو لوٹا کر بچہ نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح آپ قومی زندگی کو اس منزل سے جس میں کہ وہ پہنچ گئی ہے ہٹا کر پیچھے بھی نہیں لیجا سکتے۔ جس طرح ایک فرد اپنی زندگی کے تمام دور طے کرنیکے بعد بھی وہی فرد باقی رہتا ہے جو بچپن میں تھا۔ اسی طرح ایک قوم بھی تمام منازل ارتقا طے کرنے کے بعد بھی وہی قوم باقی رہتی ہے۔ فرد کی زندگی میں سررشتہ کا کام نفس انفرادی دیتا ہے اسی طرح قومی زندگی میں وہ سررشتہ جو قومی زندگی کو باہم استوار کئے رہتا ہے۔ مذہبی۔ اخلاقی اور تاریخی احساس ہے۔ لیکن ترقی کے منازل طے کرنے کے معنی یہ نہیں کہ قوم قوم باقی نہیں رہتی۔ قوم کے نفسی وجود کو باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو دوبارہ عہد طفولیت میں واپس کر دیا جائے یا آج تک اس نے جو سفر طے کیا ہے وہ سب بیکار قرار دیا جائے اور اس کو دوبارہ سفر کی پہلی منزل پر کھڑا کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے انسانیت کی نشو و نما کے لئے ایک روحانی۔ مذہبی اور اخلاقی سررشتہ فراہم کر دیا ہے جس پر انسانی تمدن کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ اس بنیاد کا باقی رہنا ہر وقت ضروری ہے۔ چونکہ بغیر اس کے عمارت استادہ بھی نہیں کی جاسکتی۔ مگر ان روحانی و اخلاقی عناصر پر جو عمارات کھڑی ہوں گی وہ ہر ملک میں اس کی آب و ہوا۔ جغرافیائی حیثیت تاریخی روایات۔ قومی و نسلی خصوصیات کے اعتبار سے ضرور مختلف ہوں گی۔ زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے۔ تمدنی زندگی شروع میں ہمیشہ سادہ ہوتی ہے مگر ترقی کے ساتھ اس میں بھی تنوع پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس طرح زندگی میں نشو و نما کے باعث مرکزیت کی بجائے لامرکزیت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اسی طرح تمدن میں بھی۔ البتہ ایک تمدن اسی وقت کامیاب کیا جا سکتا ہے جب وہ باوجود انتہائی نشو و نما کے بھی اپنے مرکز سے واسطہ رکھے۔ بعینہٖ یہی اسلامی تمدنی زندگی میں بھی پیش آیا۔ رسول اللہؐ نے تمام انسانیت کی تمدنی زندگی کے لئے روحانی اخلاقی سررشتہ فراہم کیا۔ مگر اس پر جو تمدنی زندگی استادہ کی گئی اس میں عربی مسالہ سے کام لیا گیا۔ چنانچہ آنحضرتؐ اور صحابہ کرام نے جو تمدنی زندگی بنائی اس میں اسلامی روح کار فرما تھی۔ مگر اس کا ڈھانچہ عربی تھا۔ پھر رسول اللہؐ کے زمانے میں تمدنی

زندگی سادہ تھی۔ مدینہ میں ایک شہری ریاست قائم کی گئی۔ آنحضرتؐ خود ایک مذہبی پیشوا، حاکم اور قاضی تھے۔ مگر تمدن کی بڑھتی رو کے باعث خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سادگی باقی نہ رہ سکی۔ خلیفہ کے مشورے کے لیے ایک مجلس شوریٰ عمل میں لائی گئی جس کے مشورے سے خلیفہ تمام کام انجام دیتا تھا۔ عہدہ قضا علیحدہ کرکے حضرت علیؓ کے سپرد کردیا گیا غرضکہ تمدنی زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کردیا گیا۔ پھر مسلمانوں کو دوسرے تمدنوں کے اچھے عناصر اپنی تہذیب میں جذب کرنے سے ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ وہ جہاں گئے انھوں نے اس ملک کے تہذیب و تمدن کے اچھے عناصر کو قبول کرلیا بلکہ ان کے باعث مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن نے فروغ پایا۔ خود عرب جاہلیت جس کے خلاف اسلام ایک بغاوت تھی اسلام کے باعث زندہ ہوگیا۔ عرب جاہلیت کے شعرا کا کلام جمع کیا گیا اور وہ اسلامی نظام تعلیم میں اس طرح شامل کرلیا گیا جس طرح کہ فقہ و حدیث۔

بنی امیہ کا زمانہ تو تسخیر ممالک میں گذرا اس لئے اصلی تمدنی کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہ ہوسکی لیکن بنی عباس کا زمانہ اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک زرین زمانہ ہے۔ اس وقت اسلامی تمدنی زندگی اپنے عہد شباب میں داخل ہوئی۔ بچپن کے زمانہ کو انسان دوسرے کے احکامات کے سہارے گذارتا ہے مگر جوانی میں وہ خود غور و فکر کرنا چاہتا ہے۔ اپنے زندگی کے اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ یہی حال بعینہٖ اسلامی تمدن میں بھی پیش آیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں جو اسلامی تہذیب و تمدن کا لڑکپن کا زمانہ تھا احادیث جمع کی گئیں چونکہ قوم خارجی احکامات کے سہارے زندگی گذارنا چاہتی تھی مگر بنی عباس کے زمانے میں زندگی کے تمام اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا گیا اور علم الکلام کی تدوین شروع ہوئی۔ یونانی منطق، فلسفہ بطور نقالی قبول نہ کئے گئے بلکہ وہ مسلمانوں کو اب اس لئے بھانے لگے کہ وہ اب ان کی ترقی یافتہ نفسی ساخت کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ ابتدا میں جوانی کے جوش میں چاہے کچھ بے عنوانیاں رہی ہوں اور بعض باتوں کو بغیر تنقید کے بھی تسلیم کرلیا گیا ہو مگر اسلامی دماغ نے بہت جلد

اپنا توازن قائم کرلیا۔ بالآخر امام غزالی نے ملت اسلامیہ کے لئے ایک ہمہ گیر تمدنی و تعلیمی نصب العین پیش کیا۔ اس نصب العین کی بنیادیں اسلام کی روحانی و اخلاقی بنیادوں پر استوار کی گئیں مگر ان میں یونانی فلسفہ، حکمت، منطق اور ہیئت کو بحیثیت تمدنی عناصر کے استعمال کیا گیا۔ امام غزالی نے اس تضاد کو جو تمدنی نشو و نما کے باعث ایمان و عقل، مذہب و فلسفہ، دین و شریعت میں پیدا ہو رہا تھا دور کیا اور ایک ہمہ گیر روحانی تمدنی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسلامی دنیا میں اس کے کچھ برگ و بار ان سے شروع ہی ہوئے تھے کہ فتنہ تاتار نے سینکڑوں برسوں کے لئے مسلمانوں کے آفتاب تمدن کو غروب کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی شمعیں ادھر ادھر جلتی رہیں مگر بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب کی روح غائب ہو چکی تھی۔ اور یہ زندگی کی رو مغرب میں جا کر اپنے کرشمے دکھانے لگی۔

ان تمام مباحث کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلامی روح جامد اور ساکن نہیں ہے بلکہ فعال اور متحرک ہے اس نے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں میں مختلف رنگ و بو اختیار کئے ہیں۔ عرب میں وہ مذہبی و اخلاقی قدروں کی حامل رہی تو ایران میں اس کے حسن و جمال کے باعث اس نے زیادہ تر جمالی ادبی رنگ اختیار کر لیا۔ ترکی میں وہ عسکری اور نظامی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ہندوستان میں زیادہ تر صوفیانہ رنگ میں اس کا اظہار ہوا۔ غرضکہ اس وقت ہندی مسلم تمدن میں اسلام کی گذشتہ تیرہ سو سالہ زندگی کے روحانی، اخلاقی جمالی اور صوفیانہ عناصر شامل ہیں۔ اس کا گوشت و پوست و خمیر ان تمام عناصر سے مل کر بنا ہے جو وہ سینکڑوں برسوں میں مختلف ممالک سے اپنی ترقی کے دور میں بطور غذا اپنے جسم میں جذب کرتا آیا ہے اس لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان عناصر کو کلیتاً ترک کر دیا جائے؟ پھر عہد جدید اور اس کی ضروریات سے کس طرح چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ مستقبل اور مستقبل کو بنانے والی قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرضکہ وہ حضرات جو "رجوع ماضی" کا سادہ نسخہ پیش فرما دیتے ہیں وہ در اصل فرد۔ قوم۔ انسانیت کائنات بلکہ خدائی کے زندگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ تمام زندگی میں ارتقا ہو رہا ہے اور ہمارے تمدنی و تعلیمی نصب العین کو اس ارتقا کا ترجمان ہونا چاہیئے نہ کہ اور اس کی راہ میں حائل ہونے کا

لاحاصل کوشش کرنا تھا البتہ اسلامی روحانی مذہبی اور اخلاقی بنیادوں پر اس ارتقا کا مکمل طور پر ساتھ دیا جا سکتا ہے ۔ بلکہ اسلامی روح ہی دراصل اس قانون ارتقا کی ترجمان ہے ۔ اسلام فرسودہ تہذیب و تمدن ۔ اخلاق و عادات کے خلاف ایک بغاوت تھی ۔ وہ ایک انسانیت کا زبردست انقلابی پیغام تھا اور بجنسہ اس کو اس انقلاب کا علمبردار ہونا چاہیئے ۔ اسلام دراصل نام ہی ان اصولوں کا ہے جن اصولوں کے تحت میں کائنات کا ارتقا ہو رہا ہے ۔ مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب بھی اس وقت یہ ہے کہ وہ ان اصولوں سے ناواقف ہو گئے ہیں ۔ حرکت و عمل کی بجائے سکون و بے عملی کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے بیٹھے ہیں ۔ مستقبل کی طرف بڑھنے کی بجائے ماضی کے سرمائے پر قانع ہو گئے ہیں ۔

جنگ عظیم کی خون آشامیوں نے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے اکثر آزاد قومی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں اور جہاں نہیں ہیں وہاں جد و جہد جاری ہے علوم و فنون کے اکتساب کی خواہش تیز تر ہو گئی ہے ۔ ہر جگہ اس نئی روح کا اظہار اسلامی تمدن میں ہو رہا ہے ۔ اس نئی زندگی کے ساتھ ایک نئے تعلیمی نصب العین کو بھی تعین کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ مگر ابھی تک یہ تصور دھندلا ہے اور ملت اسلامیہ پر اس کا اثر ہمہ گیر نہیں ہے ۔ ہم مسلمانان ہند کے اس تمدنی و تعلیمی نصب العین کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور ان عناصر کو بیان کریں گے جن کی ترکیب سے یہ نصب العین بن سکتا ہے ۔

الف ۔ اولاً اس نصب العین کو اسلامی روحانی قدور کا حامل ہونا چاہیئے ۔

ب ۔ دوم اسلامی تمدن نے اپنے ارتقا کے دور میں جو مخصوص خصائص اختیار کر لئے ہیں اسے ترک نہیں کرنا چاہیئے ۔

ج ۔ سوم اسے عہد جدید کی سیاسی و معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔

د ۔ اسے زندگی کے اصول ارتقا کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے اور مستقبل کی تشکیل کرنے والی قوتوں کا اسے حامل ہونا چاہیئے ۔

(الف)

اسلام کے روحانی تصور کو ہمارے تمدنی زندگی کی بنیاد ہونی چاہیئے اور اس طرح اسے ہمارے تعلیمی نصب العین میں اولین جگہ حاصل ہونی چاہیئے۔ اس پر اب زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اسی تصور کے باعث ہم بحیثیت ایک مسلم قوم دنیا میں موجود ہیں۔ جدید سائنس نے اب خود مادیت کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ آئنسٹائن جیسا ریاضی داں روحانیت کا قائل ہے ایڈنگٹن جیسا سائنس داں دنیا کی اصل روح کو قرار دیتا ہے۔ مادیت کی اساس اس خیال پر نہیں تھی کہ دنیا کی اصل ذرات ہیں (ATOMS) اور یہ ذرات مادی ہیں۔ مگر اب ان ذرات کو توڑا جا سکتا ہے۔ اور وہ در اصل انرجی (قوت) کا مجموعہ ہیں۔ انرجی مادی چیز نہیں ہے۔ بلکہ لامادی چیز ہے اور شعور اور انرجی باعتبار خاصیت کے ایک ہی چیز ہیں۔ روحانیت چنانچہ عہد جدید میں صرف ایک مذہبی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ سائنس کی تمام تحقیقات بھی اسی تصور کی طرف راہ نمائی کرتی ہیں پھر اسلامی تصور کے مطابق مادہ روح سے کلیتاً متضاد چیز نہیں ہے جس طرح عیسائی کلیسا کا تصور ہے۔ اسلام میں روح و مادہ کو ایک دوسرے سے متضاد نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ بلکہ حقیقت اصلی کے دو پہلو حقیقت کے باطنی پہلو کو روح کہتے ہیں اور اس کے خارجی پہلو کو جو وہ اپنی تشکیل کے لئے بنا لیتی ہے مادہ۔ اسلام میں روح و مادہ دین و دنیا۔ حال و مستقبل غرضکہ دونوں پہلوؤں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

بلکہ دین و دنیا۔ روح و مادہ کی مکمل نشو و نما ہی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ دونوں کی ترقی مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو۔

اس ہمہ گیر روحانیت کا نتیجہ اسلام کا وہ اخلاقی تصور ہے جو انسانیت کے نصب العین کا حامل ہے۔ جب انسانوں کی اصل ایک ہے۔ زندگی کی اصل ایک ہے۔ تو زندگی کے تمام مظاہر کو ارتقا کا مساوی موقع ملنا چاہیئے۔ کسی ایک جزو کی مکمل نشو و نما نہ ہو سکنے کے باعث کل کی نشو و نما

میں بھی خامی رہ جائے گی۔ اس بنا پر اسلام انفرادی وجود کے احترام کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ آزادی مساوات اور جمہوریت کا قائل ہے۔ لیکن انفرادی وجود بھی اس وقت تک اپنی نشو ونما کو انتہائی بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتا جب تک جماعت بحیثیت مجموعی نشو ونما نہ کرے اسی لئے وہ اخوت اجتماعیت اور انسانیت کا بھی نصب العین پیش کرتا ہے۔ دراصل سچی انفرادیت اور سچی اجتماعیت میں کوئی تضاد نہیں ہے چونکہ بغیر ایک دوسرے کے وہ مکمل ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاست۔ معیشت۔ قانون اور سماج کے تمام کاموں کو اسلام اخلاقی قوانین کا پابند رکھنا چاہتا ہے اور اس کا مقصد انسانیت کی نشو ونما ہے۔

(ب)

ہمارے تاریخی ارتقا کے دور میں ہم نے اپنی تہذیب و تمدن کے ذریعہ اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی ہم اپنی کوشش میں زیادہ کامیاب ہوئے کبھی کم۔ اس کا انحصار مختلف اقوام کی فطری صلاحیتوں اور خارجی اسباب پر تھا مثلاً ہماری اس اسلامی روح کا اظہار کبھی ہمارے قوانین۔ ہمارے رسوم و عادات اور ہمارے علم و ادب میں ہوا ہے۔ اگر یہ اس وقت ہماری راہ ترقی میں حائل نہیں ہیں تو ہم انھیں ضروری برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہمیں کوئی اس سے بہتر نئی چیز نہ حاصل ہو جائے ہم اپنے گذشتہ کارآمد ذخیرہ کو کیوں خیرباد کہلائیں؟ ہمارے تمدن کے یہ مخصوص خصایص انسانیت اور جمہوریت کی روح کے حامل ہیں اور ان سے دنیا کو فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے نقصان نہیں لیکن اس کے ساتھ بہت سا کوڑا کرکٹ بھی ہماری زندگی میں جمع ہوگیا ہے ہمیں اسے جلد از جلد صاف کر دینا چاہیئے۔ خصوصاً مسلمانان ہند کی تمدنی زندگی میں تو اس گندگی کی بہتات ہے۔ ہماری تعلیم کا یہ اولین مقصد ہونا چاہیئے کہ وہ اسکو صاف کر دے۔

مسلمانان ہند کی نفسی زندگی کا اظہار تو شروع میں فارسی زبان کے ذریعہ ہوا۔ لیکن اس وقت تک ہم پر ایرانی اثرات بہت غالب تھے اس لئے وہ مسلمانان ہند کی آزاد نفسی زندگی نہیں کہی

جا سکتی۔ دراصل اردو ہی مسلمانان ہند کی قومی نفسی زندگی کی ترجمان ہے۔ جب سے اردو عالم وجود میں آئی اسی وقت سے ہم نے اپنا ادبی وجود علیحدہ محسوس کرنا شروع کیا شروع میں ہم پر اس طرح ایرانی اثرات غالب رہے جس طرح سے بچے پر اس کے والدین کے اثرات غالب رہتے ہیں لیکن بالآخر ہم نے اس محکومیت سے خود کو آزاد کر لیا۔ ہماری شاعری میر و غالب کی شاعری کے دور سے گزر کر اقبال کی پر جوش و روح پرور شاعری میں اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ ہماری نثر میں ہنوز ابھی تک وہ پختگی نہیں آئی ہے لیکن زمانہ کے تھپیڑے اسے بھی شائد جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ پھر سماجی اداروں اور فنون لطیفہ یعنی فن تعمیر۔ مصوری۔ موسیقی وغیرہ میں بھی ہماری قومی خصائص کا اظہار ہے اور جس نے بحیثیت مجموعی ہندوستان کی تمدنی زندگی کو مالامال کر دیا ہے۔ بلا وجہ اس تمام سرمایہ کو ترک کر دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں البتہ جدید زمانہ کے رجحانات کا اس کو ضرور آئینہ بردار ہونا چاہیئے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ اس کی ہر اچھی چیز بھی برباد ہو جائے۔ بہر صورت یہ وہ تمدنی سرمایہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ صرف بدھنے کی لوٹنی۔ ٹخنہ سے اوپر پاجامہ اور ڈاڑھی ہی ہماری تہذیب کی نشانی نہیں ہے جس طرح پنڈت جواہر لال جی ارشاد فرماتے ہیں۔

(ج) سوم ہمارے تعلیمی نصب العین کو مسلمانان ہند کی سیاسی معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تعلیمی نصب العین سیاسی و معاشی مقاصد کو پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ اور تعلیمی نظام زیادہ سے زیادہ ان مقاصد کے حصول کے لئے طلبا کو تیار کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی تعلیمی نظام ان مسائل کو کلیتاً حل نہیں کر سکتا اور نہ تعلیمی نظام کا یہ کام ہے یہ مسائل تو کسی قوم کی مکمل زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور خصوصاً سیاسی زندگی سے انکا گہرا واسطہ ہے۔ اس لئے ان کی حل کے لئے قوم کے تمام سماجی اداروں خصوصاً سیاسی ادارے یعنی ریاست کو کوشش کرنی چاہیئے۔ تعلیم کے مقصد کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض حضرات تعلیمی اداروں کو صرف معاشی ادارے بنا دینا چاہتے۔ وہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتے ہیں یا اس سے خاص قسم کے سیاسی مبلغین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تعلیم کا مقصد تو صرف

انسان کے قومی نفس کی ترقی ہے گو سیاسی اور معاشی قدریں اس مقصد کے لئے بطور وسیلہ کے ضرور استعمال کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی نے شروع میں جو تصور تعلیم پیش کیا اس سے یہی خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مدرسوں کو صرف اس لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی قومی معاشی دولت میں اضافہ ہو۔ گویا مدرسے مدرسہ نہ رہیں بلکہ کاموں کے لئے کارخانے ہوجائیں۔ ملک میں بجا طور پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ لیکن بالآخر جو رپورٹ آل انڈیا ایجوکیشن کمیٹی نے وردھا اسکیم پر غور و خوض کے بعد پیش کی ہے وہ صحیح تعلیمی اصولوں پر مبنی ہے۔ وہاں ہاتھ کا کام صرف اس لئے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے کہ اس کا مطلوب فوری معاشی فائدہ ہے بلکہ انسانی شخصیت کی مکمل نشو و نما کے لئے جسمانی اعضا کی نشو و نما اور تربیت بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ نفسی قوی کی۔ پھر نفسی اور جسمانی قویٰ میں کچھ ایسا گہرا باطنی رشتہ موجود ہے کہ ایک کی مکمل نشو و نما دوسری کی نشو و نما کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ہم ذہن انسانی کی تربیت چاہتے ہیں تو اس کے لئے جسمانی تربیت کی اسی قدر ضرورت ہے۔ ہاتھ سے کام کی اس لئے ضرورت ہے کہ انسان کی تخلیقی قوتوں میں ترقی ہو۔ طلبہ کے اعمال جب تک تخلیقی نہ ہوں نہ وہ اسوقت تک انسانی شخصیت کے صحیح ترجمان ہو سکتے ہیں اور نہ اس کی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں ان مسائل پر ہم تفصیل سے بعد میں "جدید تعلیمی تحریکات" کے عنوان کے تحت میں بحث کریں گے۔ غرضکہ تعلیمی نقطہ نظر سے بھی ہمارے لئے سیاسی و معاشی عناصر کو اپنے تعلیمی نصب العین میں شریک کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا اہم سیاسی مسئلہ مسلمانان ہند کے لئے اس ملک کو غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ سیاسی غلامی کے باعث ہماری تمدنی زندگی کچھ ایسی سوکھ کر مرجھا گئی ہے کہ وہ اپنے شاہان شان برگ و بار نہیں لاسکتی۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آزادی تمام نفسی زندگی کی ترقی کے لئے شرط اولین ہے۔ قومی تمدنی زندگی کے لئے یہ اصل بنیاد ہے۔ گذشتہ دو سو برس میں سیاسی غلامی کے باعث ہم بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں بھی

مبتلا ہوگئے ہیں۔ اور جب تک ہم اس سیاسی غلامی سے نجات نہ حاصل کریں گے ہماری تمدنی زندگی کا پودا کبھی بھی تناور درخت نہیں بن سکے گا۔ اس کے سائے میں نہ ہم اس وقت تک سکون سے زندگی گذار سکتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو راحت دے سکتے ہیں۔ اور ہمارے لئے باہر کی جھلس دینے والی ہواؤں اور فنا کر دینے والی دھوپ میں کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

آزادی ہند کا مسئلہ اب اس قدر مسلم الثبوت ہے کہ اس پر زائد بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زبانی طور پر تو اس مقصد کو اب ہم بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے مدرسوں میں ہنوز آزادی کی بجائے غلامی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یورپ میں بچپن سے ہر بچہ کے دل میں وطن کی محبت اور جذبۂ آزادی پیدا کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کو غلامی پر قانع رہنا سکھایا جاتا ہے۔ اور نفرت۔ کوتاہ دلی اور تعصب ان کی گھٹی میں پلائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ بڑے ہو کر بجائے اس کے کہ اپنی جد و جہد ملک کی آزادی کے لئے صرف کریں ان کی تمام طاقتیں ایک دوسرے ہی کی گردنیں کاٹنے میں صرف ہوتی ہیں۔

آزادی ہند کا نصب العین جہاں مستقل بالذات اپنی حیثیت رکھتا ہے وہاں وہ ہمارے بہت سے تمدنی مسائل کے حل کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ مثلاً آزادی کے ذریعہ ہم میں وہ طاقت پیدا ہو جانی چاہیئے کہ ہم اپنے معاشی مسئلہ کو حل کر سکیں ہندوستان کی تقریباً نوے فی صدی آبادی دیہاتوں میں زندگی گذارتی ہے اور ان میں بیشتر کسان ہیں۔ ان کسانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ قابل بیان نہیں ہے۔ شہروں میں بھی غریبوں کی اس سے بہتر حالت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ انھیں روٹی کا ٹکڑا میسر آتا ہے تو دوسری مرتبہ نہیں یہ لوگ موت کے قریب آ گئے ہیں۔ ان کی صحتیں برباد ہو چکی ہیں۔ وہ صرف زندہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے ہیں۔ جہالت کا یہ عالم ہے کہ انھیں دنیا کی کسی چیز کا پتہ نہیں ہے۔ تقریباً ننانوے فی صدی ان میں معمولی لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے۔ ہر کوئی انھیں اپنی ذاتی اغراض کے لئے جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ ذہنی پستی کے ساتھ ساتھ اخلاقی پستی بھی ان میں برابر بڑھ رہی ہے۔

یہ تمام خرابیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب ان کی بے روزگاری کو دور کیا جائے۔ وہ اس قدر کما سکیں کہ خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی آرام سے گزار سکیں۔ ہندوستان کی غلامی جہالت اور غربت کی بدقسمتی میں مسلمان برابر برادران وطن کے ساتھ شریک ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں تو انہیں اپنے حق سے بھی زائد پاسنگ حاصل ہے۔ ہمارا تعلیمی نصب العین ملک کی ان شدید ترین ضروریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بچوں میں شروع سے آزادی کا جذبہ پیدا کریں۔ اپنے مفلوک الحال جاہل ہم وطنوں کے ساتھ ان میں ہمدردی کا مادہ پیدا کریں اور اسے اس قدر پختہ کر دیں کہ بعد میں ہمارے طالب العلم چاہے کسی شعبہ حیات میں کام کریں مگر ملک کو وہ غلامی جہالت اور غربت سے نکالنے کی انتھک کوشش کرتے رہیں۔

(د) غرضکہ مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین کے اجزائے ترکیبی۔ روحانی مذہبی۔ اخلاقی تاریخی۔ لسانی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور معاشی ہوں گے ان تمام اجزا میں روحانی عنصر ایک سررشتہ کا کام دے گا۔ ہمارے نظام تعلیم کا مقصد ہوگا کہ ہم نفس انسانی کی ان تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کریں اور ان کی اس نصب العین کے تحت میں نشو ونما کریں جو خود ان قویٰ میں امکانی طور پر موجود ہے (POTENTIAL)۔ عملاً ان مقاصد کے حصول کے لئے ہم روحانی و مذہبی راہ نما۔ سائنسداں فلسفی۔ شاعر۔ ادیب ماہرین فنون لطیفہ۔ قانون داں سیاسی مدبر۔ صناع اور کاشتکار وغیرہ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اچھے معلم پیدا کرنا بھی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہوگا چونکہ ان کے ذریعہ ہی ہم آئندہ نسلوں کی اپنے نصب العین کے تحت میں تربیت کر سکیں گے۔

ہمارے اس تعلیمی نصب العین کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دائمی و ابدی ہے اس نصب العین کو ہمیشہ زندگی اور زندگی کے اصولوں کا ترجمان و حامل ہونا چاہیئے ورنہ وہ فرسودہ اور بے کار ہو جائیگا اگر وہ زندگی کے دھارے کا ساتھ نہ دے گا اور اپنے میں ضروری تبدیلیاں پیدا نہ کرے گا تو وہ ہماری قوم کے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوگا۔ اسی طرح مضر جس طرح آج سے چھ سو برس کا قدیم

مذہبی نظام تعلیم جو اس وقت ہماری تمدنی ضروریات پوری نہیں کر رہا ہے ہمارے لئے مضر ثابت ہو رہا ہے۔ یا مغربی نظام تعلیم جو ہماری قومی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا اور وہ بھی ڈیڑھ سو برس قدیم ہو گیا ہے اور ہمارے لئے اس وقت باعث ہلاکت ہو رہا ہے۔

زندگی میں برابر ارتقا ہو رہا ہے۔ مادی زندگی کے ارتقا سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان نے فطرت کی سینکڑوں قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے اور ان کو وہ اپنے اغراض کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ ذہنی اعتبار سے بھی انسان برابر بلند ہو رہا ہے۔ ہم اپنے آباو اجدا سے عقلی اعتبار سے بدرجہا بلند ہیں ہمارے حیوانی آباو اجداد کو تو چھوڑئے کہ ان میں اور ہم میں اب بیّن فرق موجود ہے مگر ہم ابتدائی انسانوں سے بھی عقلی اعتبار سے بلند تر ہیں۔ ہمارے منطقی و فلسفیانہ تصورات میں اب زیادہ وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے اخلاقی و مذہبی اعتبار سے بھی ہم نشوونما کر رہے ہیں۔ اخلاقی و مذہبی تصورات شروع میں فیلی۔ پھر خاندان۔ پھر قبیلہ کے تصورات پر مبنی تھے۔ انسانوں کے دیوتا قبیلوں کے سرداروں کی طرح آپس میں لڑتے تھے۔ ان میں بغض و عداوت بھی ہوتا تھا مگر اب ہمارا مذہبی و اخلاقی تصور بہت بلند ہو گیا ہے گو انسانیت کا بین الاقوامی قانون ہنوز اقوام کے تصور پر مبنی ہے۔ ابھی تک وہ وحشت اور بربریت کے دور سے نہیں نکلا ہے۔ لیکن انسانیت کا تصور خصوصاً رسول اللہؐ کی بعثت کے زمانہ سے برابر قوت حاصل کر رہا ہے تاریخ کا موضوع چونکہ انسان ہیں جن میں جذبات کی بڑی کار فرمائی ہے اس لئے عمل اور ردعمل ہونا لازمی امر ہے لیکن باوجود اس کے بھی انسان کا اخلاقی تصور وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اب تو نظری اعتبار سے انسانیت کے تصور سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے چاہے وہ عملاً اس پر کاربند نہ ہو۔

اسی طرح مذہبی اور روحانی تصور بھی وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ رسول اللہؐ نے ایک نہایت ہی بلند و بالا روحانی تصور دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ روح جو کہ کائنات کی اصل ہے ارتقا کی پابند ہے۔ اس لئے کائنات کے ہر ذرہ کو اسی اصول کا پابند ہونا چاہیئے۔ ہمارا تمدنی

دتعلیمی نصب العین بھی حد تک زندہ نامی اور حرکی (ORGANIC AND DYNAMIC) ہو سکتا ہے جس حد تک کہ وہ ارتقا کے اس اصول کا پابند ہو۔ اگر وہ ساکن و جامد رہے گا تو زندگی کی رو آگے بڑھ جائے گی اور وہ بے کار ہو جائے گا۔ زندگی خود اپنے لئے مقاصد اور نصب العین کی تشکیل کرلے گی حقیقت کی اصل زندگی ہے۔ اور زندگی نام ہے پھیلنے۔ پھولنے۔ نشو و نما پانے آگے بڑھنے اور ارتقا کا جب تک ہمارا تعلیمی نصب العین نشو و نما کرتا رہے گا۔ زمانہ کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ مستقبل کی تشکیل دینے والی قوتوں کا حامل ہوگا وہ باقی رہے گا ورنہ موت اس کا خاتمہ کردے گی۔

اگر مذہبی اصطلاح میں گفتگو کی جائے تو کہا جائے گا کہ امکانی طور پر روحانی۔ اخلاقی۔ جمالی سیاسی۔ معاشی۔ قوتیں نفس انسان میں موجود ہیں۔ عینی طور پر یہی قوتیں خدا کی ذات میں موجود ہیں جو اس کی صفات کہلاتی ہیں۔ مثلاً ربوبیت، رحمٰنیت۔ رحیمیت۔ ملوکیت۔ رزاقیت۔ خلاقیت جمال۔ عدل۔ وغیرہ۔ انسان کی انفس امکانی ایزدی قوتوں کو اس طرح نشو و نما دینا کہ وہ خدائی صفات کے مماثل ہو جائیں اسلامی تعلیم کا نصب العین ہے۔ مختصر یہ کہ

تخلقو باخلاق اللہ

مسلمانوں کی تعلیم کا نصب العین ہے۔ اب عینی طور پر خدا انسان کے روحانی اخلاقی جمالی سیاسی و معاشی نصب العین کا حامل ہے اس لئے انسان کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے تمدنی اداروں کو اس بلند و بالا نصب العین کی روح سے لبریز کرنے کی کوشش کرے۔ جس قدر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگا اسی قدر وہ اپنے تعلیمی فریضہ کو ادا کرے گا۔

پھر اسلام کا خدا ارسطو کے خدا کی طرح جامد و ساکت نہیں ہے بلکہ فعال و خلاق ہے۔ اسی لئے فعالیت اور تخلیق ہمارے تعلیمی نصب العین کا سب سے بڑا طرہ امتیاز ہوگا۔ ہمارا تعلیمی نصب العین بھی جامد و ساکت نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمیشہ متحرک ہوگا۔ اور تخلیق اس کی خاص صفت ہوگی۔

نصب العین بغیر ذرائع کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نصب العین کے حصول کے ذرائع

نفوس انسانی ہیں۔ آئندہ مضمون میں ہم نفس انسانی کی صلاحیتوں اس کے نشو ونما کے قوانین ان صلاحیتوں کا نصب العین سے تعلق اور ان صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے تمدنی قدروں کی ضروریات سے بحث کریں گے۔ نصب العین اور ذرائع کی بحث کے بعد ہم ہندوستان کی جدید تعلیمی تحریکات اور مسلمانوں سے ان کے تعلق پر بحث کر سکیں گے۔

اقبال کا نوجوان

(از جناب نور الحسن ہاشمی صاحب ایم اے)

گذشتہ جنگ کے اختتام نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں اور اپنی اندرونی قوتوں کا دوبارہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ موجودہ طوفان خیز موجوں میں اپنی کشتی کسی سمت یا کسی طرح کامیابی سے چلا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا (اور اب بھی ہے)۔ سلطنت ترکی جس پر مسلمانوں کو خاص طور پر اور بجا طور پر ناز تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھی۔ ایران کی حالت الگ زبوں تھی اور وہ اپنی زندگی کے لئے روسی اور انگریزی قرضوں کا پابند تھا۔ عرب میں نااتفاقی تھی اور اس لے بیشتر غیر اقوام کا شکار۔ کابل غریب تھا۔ ہندوستان غلام چین بے بس ۔ ایسی حالت میں یقیناً مسلمانوں کے لئے ظاہراً صرف یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ ہر مسلمان ملک اپنے اپنے حدود میں محصور ہو کر اپنی بھلائی اور بہبودی کی ترکیبیں سوچنے لگے لیکن ایک اس سے بھی بہتر صورت تھی وہ یہ کہ پہلے مسلمان خود غور کریں کہ وہ مذہبی۔ تعلیمی۔ معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے دیگر اقوام کے مقابلہ میں کیا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ اسی سوال کا حل سوسائٹی اور دنیا کی زمینوں میں ان کی زندگی کے لئے جگہ مقرر کر سکے گا۔ اب تک جو مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی وہ مختصراً یہ کہ توہم پرست۔ گذشتہ میں یقین رکھنے والے۔ تقدیر پر پڑے رہنے والے۔ تدبیر و محنت سے جی چرانے والے۔ علم و عمل کی دنیا سے دور بھاگنے والے۔ اسلام کی روح سے بے خبر ظاہری باتوں اور فضول کی روایات پر ایمان رکھنے والے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ زمانہ نے انھیں بہت جلد دکھا دیا کہ اب وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لایق نہیں رہے۔ ان کی تلواریں اب زنگ آلود ہو گئیں اتفاق ان سے اٹھ گیا۔ ایمان ان سے جاتا رہا ان کی تہذیب پرانی ہو گئی اس لئے بہتر یہی ہے کہ اب اس دنیا میں وہ کوئی اپنا حق نہ سمجھیں بلکہ ان لوگوں کے لئے جگہ چھوڑ دیں۔ جو ان سے بہتر ہیں اور زندہ

رہنے کے لئے ان سے مستحق تر۔ یہ حالت و کیفیت تھی جس میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو پایا۔ لیکن اصلاح کی کوشش کون کرتا۔ ہمت کون کرتا۔ وہ جس کے دل میں درد ہوتا یا وہ جس کے ہاتھ میں طاقت طاقت مصطفےٰ کمال کے ہاتھ میں تھی اور درد اقبال کے دل میں۔

چنانچہ جب مسلمانوں کی اس پستی کی طرف نظر پڑی تو اقبال روئے بغیر نہ رہ سکا۔ طاقت تو تھی نہیں کہ ایک دم زبردستی مارگھسیٹ کے لوگوں کو صراط مستقیم پر لا ڈالتا۔ صرف درد تھا جس کی بدولت وہ مسلمانوں کے زوال پر پیچ و تاب کھاتا ہے اور انھیں جوش دلاتا ہے کہ وہ اپنی اس گئی گذری ہوئی حالت کو سدھاریں طرح طرح سے اکساتا ہے کہ وہ قوت عمل اور جدوجہد کے اصول کو سمجھیں۔ اس پر عمل کریں تاکہ ترقی کرکے دوسری اقوام کے صرف دوش بدوش ہی نہ چلنے لگیں بلکہ ان سے گوئے سبقت لیجائیں اور اس طرح ان کی گذری ہوئی حالت پھر سدھر جائے اور ان کا روشن گذشتہ پھر دوبارہ عود کر آئے۔

علامہ پیام مشرق کے دیباچہ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریبًا ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور ان کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے .... مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو........ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کرکے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔" غرضیکہ علامہ نے قرآن کریم کے اس سادہ اصول کو مانتے ہوئے کہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (کوئی قوم نہیں بدلتی جب تک اس کے افراد کے دلوں میں تغیر نہ ہو) مسلمانوں کی ذہنیت کو جو عرصہ سے پست ہو گئی ہے بدلنے کی کوشش کی ہے اور یہاں پر ہم ان کے اس پیغام سے بحث کریں گے جو انھوں نے

مسلمان نوجوانوں کو دیا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کی حالت کیا ہے اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو واقعی پتہ چلتا ہے تن آسانیوں کے ہم لوگوں کی، در کوئی غایت اور غرض نہیں ہوتی۔ لاپروائیاں۔ مذہب سے ناآگہی مذہب کے اصولوں سے بالکل بے خبری۔ مقصود حیات محض ذاتی عظمت۔ فرنگی تعلیم اور مغربی فیشن سے محبت۔ خود اپنی حالت درست کرنے کی نہ خواہش نہ رغبت

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں　　کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

ظاہر ہے کہ استغنا کیسے ہو تا جب دل میں نہ وسعت ہے نہ اطمینان۔ اور اصلی جڑ تمام خرابیوں کی بھی دل کی بے سروسامانی ہے جس کی تعبیر اقبال کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل ٹھیک نہیں ہوتا خارجی معاملات بھی نادرست ہی رہیں گے۔ آپس میں نفاق۔ غریبی۔ غداری۔ نہ سجدوں میں تڑپ۔ نہ نگاہ میں ذوق۔ قومیت سے بیگانہ اس لئے فرد بھی منتشر اور قوم بھی تباہ۔ دوسروں کے آگے دریوزہ گری۔ اپنی غلامانہ حالت کو باعث وقار سمجھنا یہاں تک کہ خود احساس غلامی کا مٹ جانا نتیجہ یہ کہ ظاہر محض نمائش اور دل محض تاریک۔ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس قوم کی بقا معلوم۔ فقط نیام ہے تو زرنگار وبے شمشیر۔

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ　　شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ

کم نگاہ وبے یقین و ناامید　　چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

ناکساں، منکر زخود مومن بہ غیر　　خشت بند از خاک شاں معمار دیر

موجودہ تعلیم سے اقبال نالاں ہیں اور بجا طور پر کہ نہ صرف الحاد پیدا کرتی ہے بلکہ ہم کو بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیتی ہے اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصود۔ یہ صحیح ہے کہ دماغ کو روشن کرتی ہے لیکن دل کو مار دیتی ہے روح اور اس کی تمام اعلیٰ صفات کو بے کار کر دیتی ہے۔ نہ دل میں سوز رہتا ہے نہ

روح میں تڑپ۔ ہم مادیت اور محض شکم میں یقین رکھنے لگتے ہیں۔ روح کی اعلیٰ خوبیاں ہماری نگاہ سے دور ہو جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے میں یقین نہیں رہتا اور جب اپنے میں یقین نہ رہا تو ظاہر ہے کہ دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ حضرت اقبال مسلمان نوجوانوں کی اسی زار حالت کی شکایت پیغمبر صلعم سے یوں کرتے ہیں۔

این مسلمان زادۂ روشن دماغ
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک چون حریر
آرزو در سینۂ او زود میر

این غلام ابن غلام ابن غلام
حریت اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود
از وجودش این قدر دانم کہ بود

این ز خود بیگانہ این مست فرنگ
نان جو می خواہد از دست فرنگ

نان خرید این فاقہ کش با جان پاک
داد مارا نالہ ہائے سوزناک

دانہ چین مانند مرغان سراست
از فضائے نیلگوں نا آشناست (مسافر)

ایک دوسری جگہ یوں فریاد کرتے ہیں

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

عصر حاضر کی تعلیم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اور اس ناپختہ تعلیم اور اس سے اثر پذیری کی ذمہ داری محض نوجوانوں ہی کے سر نہیں منسوب دیتے بلکہ ان اساتذہ سے بھی نالاں ہیں جو خود نہ تعلیم کا مقصد سمجھتے ہیں نہ اس علم میں غائر نظر رکھتے ہیں جس کا وہ درس دیتے ہیں

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقام او نداد او را خبر
آتش افرنگیاں بگداختش — یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست — در دلش لا غالب الا اللہ نیست
تا دل او در میان سینہ مرد — می نیندیشد مگر از خواب و خورد
از فرنگی می خرد لات و منات — مومن و اندیشۂ او سومنات
قم باذنی گوے و او را زندہ کن — در دلش اللہ ھو را زندہ کن
ما ہمہ افسونئ تہذیب غرب — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو از آں قومے کہ جام او شکست — وانمایک بندۂ اللہ مست
تا مسلماں باز بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را (مسافر)

یا ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست — تا بجذب اندرونش راہ نیست
نور فطرت را ز جانہا پاک شست — یک گل رعنا ز شاخ او نرست
خشت را معمار با کج می نہد — خوئے بط با بچۂ شاہیں دہد (جاوید نامہ)

غرضکہ اس تعلیم نے جس نے مسلمان نوجوانوں کی دماغی ذہنیت اور روحانی فطرت کو یوں بدل دیا ہو اسے اقبال کس طرح پسند کر سکتے ہیں

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ کسی طرح مسلم نوجوانوں کے ذہنوں میں انقلاب پیدا ہو جائے تاکہ انہیں اپنی رفعت کی حد اپنی حیات کا مقصد اور اپنی روحانی طاقتوں کا احساس ہو سکے

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب

انقلاب۔ اے انقلاب

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب
انقلاب

انقلاب۔ اے انقلاب (زبورِ عجم)

لیکن وہ ایسا انقلاب محض ظاہری اور وقتی نہیں چاہتے بلکہ دل کا اور روح کا۔ اور یوں بھی انقلاب کی تلقین اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ایک دوسرا لائحہ عمل پیشِ نظر ہو۔ یہ دل و نظر کا انقلاب اقبال کے خیال میں صحیح مذہبی تعلیم میں پنہاں ہے۔ کیونکہ اسی سے دل و نظر کی تعلیم یعنی اخلاق کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ موجودہ تعلیم گو نہایت اعلیٰ سہی مگر جب تک اس سے ذہنی و فکری بلندی نہ نصیب ہو اس وقت تک تعلیم کا مقصد حل نہیں ہو سکتا

مرید ہندی :۔ چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی :۔ علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی :۔ پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومی :۔ دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آکہ تیمارت کند

مریدِ ہندی:۔ علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

پیرِ رومی:۔ علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

(بالِ جبریل)

سلمان نوجوانوں اور ان کی تعلیم کا کیا صحیح اندازہ کیا ہے

عقلہا بے باک دلہا بے گداز ‏ چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل ‏ زوج زوج اندر طوافِ آب و گل
آسیا آں مرز و بوم آفتاب ‏ غیر بیں از خویشتن اندر حجاب
قلب او بے واردات نو بنو ‏ حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر ‏ ساکن و یخ بستہ و بے ذوق سیر
صید ملایاں و نخچیر ملوک ‏ آہوے اندیشۂ او لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ ‏ بستۂ فتراک لردان فرنگ (جاوید نامہ)

یا دوسری جگہ

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق ‏ آں یقین آں رنگ و بو آں ذوق و شوق
عالماں از علم قرآں بے نیاز ‏ صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست ‏ کو جواں مردے کہ صہبا در کدوست!
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب ‏ چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِ دیں اند ایں ہمہ ‏ اہل کیں اند اہل کیں اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام ‏ دیدہ ام صدق و صفا را در عوام
اہل دیں را باز داں از اہل کیں ‏ ہم نشیں حق بجو با او نشیں
کرگساں را رسم و آئین دیگر است ‏ سطوتِ پرواز شاہیں دیگر است (جاوید نامہ)

غرض اس اہل کلیسا کے نظام تعلیم کو دین و مروت کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے طالب علم کی پہلی اندرونی اصلاح کرنا چاہتے ہیں

شاخ گل پر چہک ولیکن ‏ کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ‏ ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ
غافل منشیں نہ وقت بازی ست ‏ وقت ہنر است و کارسازی ست

اور یہ کہ ‏ منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر ‏ کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو ‏ ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب ‏ سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یا یہ کہ

سینے میں اگر نہ ہو دل گرم ‏ رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست ‏ آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آب حیات اسی جہاں میں ‏ شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقت حقیقی ‏ غیرت سے ہے فقر کی تمامی

خودی کی تربیت اقبال کی نظر میں پہلا زینہ ہے جس پر کسی نوجوان کو قدم رکھنا ہے جو کوئی اس اہم اصول سے ناواقف ہے اس کی تربیت غیر مکمل اور اس لئے اس کی زندگی بےکار۔ خودی کی پرورش تربیت پہ موقوف ہے کہ مشت خاک میں آتش ہمہ سوز پیدا ہو سکے۔

یہی ہے سرّ کلیمی ہر اک زمانے میں ‏ ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

اور حالانکہ وہ ہندی مکتبوں سے ناامید ہیں کہ محکوم کے حق میں موسیقی و صورتگری و علم نباتات ہی کی اچھی سمجھی جاتی ہے۔ ساتھ ہی شیخ مکتب کے طریقوں سے بھی کسی طرح کی امید نہیں رکھتے کہ وہ کشاد دل نہیں رکھتے پھر بھی طالب علموں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کیونکہ دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور یہ ذوقِ خراش کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظر سے۔ یہ فیضانِ نظر ہی کی دولت تھی جس نے ابراہیم کو آدابِ فرزندی سکھائے۔

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر — خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر — مست می گردد باندازِ دگر!

از دمِ بادِ سحر میرد چراغ — لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش — گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش!

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر — پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ — قصد در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است، تاویلے مجو — جز بقلبِ خویش قندیلے مجو

حفظِ جانہا ذکر و فکرِ بے حساب — حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

حاکمی در عالمِ بالا و پست — جز بحفظِ جان و تن ناید بدست

لذتِ سیر است مقصودِ سفر — گر نگہ بر آشیاں داری مپر

ماہ گردد تا شود صاحب مقام — سیرِ آدم را مقام آمد حرام!

زندگی جز لذتِ پرواز نیست — آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور — رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور (جاوید نامہ)

یعنی ہم لوگ آپس میں محبت پیدا کریں۔ قہر و غضب کی حالت میں بھی عدل کو ہاتھ سے نہ دیں اطمینان و بے فکری و عیش میں بھی دیدۂ دل وا رکھیں۔ ضمیر کو پاک اور دل کو بلند اور وسیع بنائیں۔ جوانی میں نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ اور آخر یہ کہ پرواز سے کبھی غافل نہ رہیں اس لئے کہ توکل اور استغنا جمود کے ہم معنی ہیں۔ ایک زندگی یوں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کہ دریوزہ گری کی جائے یعنی دوسروں کی محنتوں پر کتوں کی طرح جیا جائے ایک زندگی یہ کہ شاہین و زاغ کی طرح اپنی زندگی کے لئے خود جد و جہد کی جائے اور ہر روز اپنے اوپر خود اپنے رزق کے لئے اعتبار کیا جائے۔

علم بغیر سوز دل کے بالکل بے کار ہے اگر دل کی تربیت نہ ہوئی اور علم اس کو نہ سنوار سکا اس کی تربیت نہ کر سکا تو کرم کتابی کی طرح ابو سینا و فارابی کی ورق گردانی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا علم اگر زندگی کو نہ بنا سکے تو ایسے علم سے کیا حاصل؟ اور علم زندگی کو اسی وقت بنا سکتا ہے جب دل میں سوز و تپش پیدا ہو جائے۔ ورنہ یوں کتابیں تو اتنا کور ذوق بنا دیتی ہیں کہ صبا سے بوئے گل کا بھی سراغ نہیں مل پاتا:

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را (پیام مشرق)

پھر آگے تلقین کرتا ہے کہ ایک نوجوان میں ادب و آدمیت ہونا چاہیئے۔ انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ کافر ہو یا مومن برابر کی شفقت کرنا چاہیئے۔ بری صحبتوں سے بچنا چاہیئے کہ مرد کا ستر یہی ہے۔

دین در اصل کیا ہے محض طلب و ذوق و شوق میں جلنا۔ اور یہ طلب ادب و احترام سے پیدا ہوتی ہے جس کا انجام عشق ہوتا ہے۔ ادب و احترام کا نوجوان میں پیدا ہونا اس کی اندرونی اصلاح کے لئے پہلا اور ضروری سبق ہے

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست — بے ادب، بے رنگ و بو، بے آبروست!
نوجوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یادِ عہدِ مصطفیٰ آید مرا!
از زمانِ خود پشیماں می شوم — در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم
سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد — سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد
حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست!
آدمیت احترامِ آدمی! — باخبر شو از مقامِ آدمی!
آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن — بر طریقِ دوستی گامے بزن!
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق!
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل، وائے دل! (جاوید نامہ)

یا

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ! (بالِ جبریل)

تیسرا سبق وہ نوجوان کو یہ دیتے ہیں کہ خواہ تو کہیں کا بادشاہ کیوں نہ ہو لیکن فقر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے دل کو الگ رکھنا باہمہ و بے ہمہ رہنا۔ دنیا کی کسی شئے سے محبت نہ رکھنا دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے درد و سوزِ دل کے۔ نعمت و فراوانیٔ اسباب تعیش انسان کو اندھا بنا دیتا ہے اس کے دل میں سوز نہیں رہتا۔ وہ علائق دنیوی میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اس کو اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر دکھ، مصیبتیں اور تکالیف روحانی شروع ہو جاتی ہیں اس لئے اقبال ہم نوجوانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنے اعلیٰ مراتب دنیوی پر کیوں نہ پہونچ جائیں لیکن دل درویش رہنا چاہئے۔

آدمی وہی ہے جو دولت حاصل کر کے اس پرست ہو جائے۔ جو ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق رکھے نہ کہ مال و دولت قارون و فکر افلاطون"

گرچہ باشی از خداوند ان دِہ | فقر را از کف مدہ، از کف مدہ
در جہاں جز درد دل سامان مخواہ | نعمت از حق خواہ و از سلطان مخواہ
اے بسا مرد حق اندیش و بصیر | می شود از کثرت نعمت ضریر
کثرت نعمت گداز دل بزد | نازمی آرد نیاز دل بزد!
من فدای آں کہ درویشانہ زیست | وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

اس کے ساتھ ہی اس بات کی صلاح بھی ہے کہ چونکہ یہ زمانہ ایسا آ لگا ہے جس میں لوگ جسم کو جان پر فوقیت دیتے ہیں اور جسم کی خبر گیری کرتے ہیں جان کی نہیں اس لئے مسلمان نوجوان کو یہ بھی چاہیے کہ کسی ایسے "مرد حق" کی پیروی کرے جو اس کے زمانہ میں ہو کیونکہ ایسا شخص

او دل اندر نار خود سوزد ترا | باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ یا سوز او صاحب دلیم | ورنہ نقش باطل آب و گلیم

اور ایسا شخص اپنے اپنے زمانہ میں کبھی کلیم کہلاتا ہے کبھی مسیح کبھی خلیل اور کبھی محمدؐ لیکن اگر ایسا شخص تجھ کو نہ مل سکے یا کسی ایسے ہی "مرد حق" کی باتوں سے تو واقف نہ ہو سکے تو پھر گذری ہوؤں میں سے کسی ایسے کو اپنا راہبر بنا جو تیری روح کو رقص میں لے آوے تاکہ تجھ میں سوز۔ تپش۔ ہمدردی اور ذوق و شوق پیدا ہو سکے

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں | در بدن غرق است و کم داند ز جاں
گر نیابی صحبت مرد خبیر | از اب و جد آنچہ من دارم بگیر!
پیر رومی را رفیق راہ ساز | تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست | پائے او محکم فتد در کوئے دوست
رقص تن از حرف او آموختند | چشم را از رقص جاں آموختند

رقصِ تن در گردش آرد خاک را — رقصِ جاں برہم زند افلاک را
رقصِ جاں آموختن کارے بود — غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر — جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر
ضعفِ ایمان است و دلگیری است غم — نوجوانا! نیمۂ پیری است غم
می شناسی؟ حرص، فقرِ حاضر است — من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب (جاوید نامہ)

ظاہر ہے جب جان رقص میں آجائے گی اور اس میں سوز و گداز پیدا ہو جائے گا تو یہی زندگی دین کی زندگی ہوگی ایسی زندگی مضبوط زندگی ہوگی اور اب اگر وہ لا الٰہ کہے گا تو زمین و آسمان گردش میں آجائیں گے ورنہ یوں خالی ہونٹوں سے کہہ دینا محض ایک ذراسی محدود ہوا کو حرکت دے دینا ہے

در رہِ دیں سخت چوں الماس زی — دل بحق بربند و بے وسواس زی
سرِّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال
لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں! — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں!
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا الٰہ — دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ!
ایں دو حرف لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است — لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است!

ظاہر ہے اقبال کا ایسا نوجوان کس قدر با محبت، کس قدر بلند ہمت، کس قدر سخت کوش اور زندگی کی جد و جہد کے لیے کس قدر پامرد یا امید اور تیار نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایسا جوان آزاد ہوگا غلام نہیں

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر | تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

جاوید کو اپنے ایک خط میں یوں نصیحت کرتے ہیں

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر | نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو | سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں | سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے | خودی نہ بیچ۔ غریبی میں نام پیدا کر

یا محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
یا اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت | دے ان کو سبق خودشکنی خودنگری کا

ضرب کلیم میں محراب گل افغاں کے افکار میں اپنا مثالی نوجوان یوں پیش کرتے ہیں

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا | شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر | اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز | کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی | کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو | یہ بے کلاہی ہے سرمایہ کلاہ داری

یہی نہیں بلکہ خدا سے دعا بھی کرتے ہیں کہ

جگر سے وہی تیر پھر پار کر | تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے | مرا عشق۔ میری نظر بخش دے

اقبال کے نزدیک وہ جوان ہنگامۂ پیکار کے لائق نہیں جو نالہ مرغان سحر سے مدہوش ہو جائے
عیش اور اطمینان جوانوں کے لئے جمود اور موت ہے۔ طلبا علیگڈھ کالج کو متوجہ کرتے ہیں

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں | کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا / اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو / گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز / غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

سر سید کو بھی سمجھاتے ہیں

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں / ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں / چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

موجودہ گروہ اساتذہ کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے کہ جوانوں کی تعلیم ان کے سپرد کی جائے کیونکہ وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں انہیں خود راہ کی خبر نہیں ہے اگر جب خود انھیں خبر نہ ہوگی تو وہ کسی دوسرے کو راستہ کیونکر بتا سکیں گے۔

"پیش خورشید بر مکش دیوار / خواہی ار صحن خانہ نورانی"

(شیخ مکتب سے۔ بال جبریل)

یا

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں / بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار / کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت / وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (ضرب کلیم)

فلسفہ کو وہ نوجوانوں کے لئے مفید نہیں سمجھتے اس لئے فلسفہ حرکت کو فنا کرتا ہے اور بے حرکتی موت ہے

انجام خرد ہے بے حضوری / ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت / ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی کی تقویم / دیں سر محمد و براہیم
دل در سخن محمدی بند / اے پور علی ز بو علی چند

(باقی آئندہ)

تعلیم اور جبلتیں

(از جناب عبد الغفور صاحب استاد ونگ مدرسہ جامعہ)

انسان کی زندگی کا نظام عمل اس قدر ہمہ گیری اور تنوع رکھتا ہے۔ کہ چند نفسی سانچوں میں اس کی خانہ بندی کرنا ممکن نہیں اور نہ اس قسم کی کوشش سے ہمیں انسان کی تعلیم و تربیت میں براہ راست کوئی مدد مل سکتی ہے۔ تاہم انسانی زندگی کو سمجھنے کے لیے بعض علمائے نفسیات نے زندگی کے بعض اہم اور نمایاں محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے (بحیثیت معلم ہمیں ان کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ زندگی اور تعلیم کا عمل ایک ہے۔ اس لئے اگر ہم کو زندگی کے محرکات اور اثرات سے واقفیت پیدا ہو گئی۔ تو تعلیم کے عمل کو بھی ہم اسی کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ کیونکہ زندگی کے دھارے سے باہر علم کوئی وجود نہیں رکھتا)۔ ان کا خیال ہے۔ کہ اگر انسان کے جذبات عمل کو سادہ سے سادہ شکل میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ تو بعض اہم محرکات ایسے نظر آئیں گے۔ جو بجا طور پر انسان کی زندگی پر حاوی سمجھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض ماہرین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق انسانی محرکات یا جبلتوں کی تقسیم کر دی ہے۔ اس تقسیم میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ لوگ اس بات کو مانتے ہیں۔ کہ انسان زندگی کے لئے چند مشترک رجحانات رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض نفسی رجحانات یا محرکات کو تھوڑی سی تشریح کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ تاکہ ہمیں ان کی صحیح تعلیمی حیثیت سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو۔ اس مشکل مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم پروفیسر جان ڈیوئی صاحب کے خیالات کو اپنی مشعل راہ بناتے ہیں۔ کیونکہ پروفیسر موصوف نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس مسئلے پر اپنی کتاب HUMAN NATUREANDCON DUC T میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے تو سرے سے اس بات کی کوشش ہی غلط ہے۔ کہ قدرتی مشاغل کو چند مخصوص اور مستقل

جبلتوں میں بند کر دیا جائے۔ اور اس خیال کے عملی نتائج تو یقیناً مضر ہیں البتہ جبلتوں کی تقسیم جس قدر ضروری ہے۔ اتنی قدرتی بھی ہے۔ زندگی کی نیرنگیوں کو ذہن اس طرح سمجھ سکتا ہے۔ کہ ان کو خاص خاص عنوانات کے ماتحت چنا جائے۔ اور چند مشترک صفتوں کی روشنی میں ان کی تقسیم کردی جائے "۔

اس طرح مختلف واقعات کی گتھیوں کو ایک ایک کر کے سلجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن جس طرح دنیا میں علمی تحقیقات کسی مقصد سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کام کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہیئے۔ اور کسی مقصد کا پورا ہونا ہی اس تقسیم کا جواز ہو سکتا ہے۔ اگر عام طور پر دیکھا جائے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے واقعات اور غیر معمولی افراد کے ساتھ تطابق کرنے میں سہولت ہو۔ مگر جب ہم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہماری جبلتوں کی تقسیم بندھے ٹکے قدرتی رجحانات کی حیثیت رکھتی ہے تو ہم بجائے انسانی زندگی کے واقعات کو سمجھنے کے اس کو اور دھندلا کر دیتے ہیں۔ ہم ایسے خیال کے مدعی ہو جاتے ہیں۔ جس پر قدرت ہم کو فوراً سزا دیتی ہے ہم اسی لئے تو قدرت اور سماج کی نیرنگیوں اور باریکیوں کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں ہمارا خیال اٹل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی کے حقائق بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیالات سخت اور منجمد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ زندگی میں لوچ اور تبدیلی پائی جاتی ہے "۔

چونکہ ہر ایک جبلت کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے اس لحاظ سے انسان کے اندر جبلی محرکات کا بھی کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی میں جتنے مواقع آتے ہیں۔ انسان کے اندر ان سے تطابق کرنے کے لئے مختلف صلاحیتیں اور محرکات موجود ہیں۔ ہر موقع کے لئے الگ محرکات یا رجحانات کارفرما ہوتے ہیں۔ کوئی خطرے کا موقع آیا آدمی چوکنا ہو گیا اور اپنی حفاظت کے لئے تدابیر سوچنے لگا۔ کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوئی۔ آدمی پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور سدباب کرنے کے لئے تیار ہو گیا لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات پر بچپن میں غصہ آسکے وہ جوانی میں بھی آدمی کو بھڑکائے۔ یا جس بات پر جوانی میں آدمی چراغ پا ہو۔ وہ بڑھاپے

میں بھی آدمی کو مشتعل کردے۔ بلکہ تبدیلی کے لئے اس قدر زمانہ گزر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک ہی وقت میں جو تحریک آدمی کو کسی جوابی عمل کے لئے اکساتی ہے۔ دوسرے روز اس کا وہ اثر نہیں ہوتا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اثر کم ہی ہو جائے بلکہ ممکن ہے کہ اس تحریک کا اثر زیادہ ہو جائے۔ اس لئے خود ایک قسم کی تحریک کی شدت میں وقت بوقت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لئے محرکات کو الگ الگ طور پر دیکھنا نظری طور پر صحیح ہوا مگر عملی طور پر مفید کیونکہ کسی جبلی تحریک کا بہت کچھ اثر ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔ اور جس ماحول میں آدمی رہتا ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ اس لئے اس کا جوابی عمل بھی آدمی کے پاس ایک سا نہیں ہوتا۔ ماحول کے اعتبار سے ایک ہی جبلت مختلف روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر ڈیوی اس بات کو 'خوف' کی مثال سے یوں سمجھاتے ہیں۔ "اندھیرے کا خوف' عام رسوائی کا خوف' دندان ساز کا خوف' جن اور بھوت کا خوف چمگادڑ کا خوف اور ریچھ کا خوف ہرگز برابر نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح بزدلی' گھبراہٹ' احتیاط اور ادب کو خوف کے اقسام میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر ایک کی کیفیت دوسرے سے جداگانہ ہے"۔ مختصر یہ ہے کہ جبلتیں نئی عادتوں کے لئے محور کا کام کرتی ہیں۔ عادتیں خود ان جبلتوں کی تربیت سے بنتی ہیں۔ اور پھر جب کسی نئی ضرورت سے عادتوں کی تشکیل نو کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو پھر یہی جبلتیں عدم تطابق کی حالت کو دور کرنے اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کام آتی ہیں۔ اور اگر وسیع معنوں میں دیکھا جائے' تو تعلیم بھی در اصل عادتوں کی مسلسل تشکیل نو سے عبارت ہے۔ اس لئے جبلت کی جو حیثیت تعلیم میں ہے۔ وہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

۱۔ خوف: معلم یا مربی دانستہ اور نادانستہ طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس جبلت یا محرک سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کے وقتی اثرات کو بھی جانتے ہیں۔ جب کوئی بچہ بڑوں کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کرتا ہے۔ تو بڑے اس کو طرح طرح سے ڈرانے' دھمکانے اور ملامت کرتے ہیں۔ وہ مجبور ہو کر دوسروں کی مرضی پر چلنا سیکھ لیتا ہے۔ اکثر والدین بچوں

کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔ بات بات پر سزا دیتے ہیں۔ اور قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ خوف ہی ایک ایسا آلہ ہو سکتا ہے۔ جس کے ذریعے بچوں کو سدھارا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بچے ڈرانے دھمکانے سے مطلوبہ کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر تعلیم و تربیت میں ایک بیرونی دباؤ کے طور پر اس کا برتنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچے محض استاد یا ماں باپ کے ڈر کے مارے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آخر میں جا کر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ بچے پڑھ تو جاتے ہیں۔ مگر زندگی میں دبو کمزور اور پست ہمت ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ ایسے بچے ہمیشہ سے دوسروں کے دھکیلنے سے کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی اُپج سے کوئی کام نہیں کر پاتے ان کو کسی کام کے کرنے سے وہ تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ جس کا کوئی کام کرنے والا قدرتاً حقدار ہوتا ہے۔ عام طور پر تعلیم کے ساتھ چند ایسی تکلیف دہ صورتیں وابستہ کی جاتی ہیں جن سے بچنے کے لئے چار و ناچار بچے کو پڑھنا پڑتا ہے۔ ایک طرف استاد کا 'بید' اور والدین کی 'ملامت' ہوتی ہے دوسری طرف سبق 'پڑھنا' اور 'مٹا' ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچہ کم سے کم تکلیف دہ صورت کو اختیار کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض ناعاقبت اندیش والدین بچوں کو باہر جانے یا کسی اور کام سے روکتے ہیں۔ تو ان پر جن اور بھوت پریت کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ اس قسم کا 'ڈرانا' بھی بچوں کے لئے بہت برا ہوتا ہے۔ اس سے بچے توہم پرست ہو جاتے ہیں۔ قدم قدم پر وہ ایک نامعلوم خطرے سے خائف و ہراساں رہتے ہیں۔ لیکن اگر اسی 'خوف' کو صحیح موقع پر استعمال کیا جائے۔ تو بچوں میں احتیاط اور دور اندیشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور بغیر بیرونی دباؤ کے مناسب طریقہ پر سمجھانے سے بہت سی باتیں سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

بچہ ویسے بھی جب نیا نیا دنیا میں آتا ہے۔ تو اس کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں اس کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ دوسروں کے ذرا سے خوف دلانے سے بدکنے لگتا ہے۔ اس لئے خصوصیت سے ان کو ہمت دلانے اور ان کے منشا کے مطابق ان سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور وہ جلد سے جلد اپنے پیروں

پر کھڑا ہونا سیکھ جائیں۔ اس لئے چھوٹی عمر میں پولس کا خوف، چور یا ڈاکو کا خوف اور جن بھوت وغیرہ کا خوف بچوں کے دل میں ہرگز نہیں جمنے دینا چاہیئے۔ بلکہ حسب ضرورت خطرے کے مواقع کو بھی بہت سمجھ بوجھ کے ساتھ ان کو سمجھانا چاہیئے۔ تاکہ وہ ڈرپوک ہونے کی بجائے محتاط ہونا سیکھیں۔

'خوف بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ حفظ نفس کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ سے آدمی اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اور یہ زندگی کے ٹھوس تجربات سے سبق حاصل کرنے کے لئے بہت بڑا محرک ہے۔ لیکن اگر یہ محرک ناجائز موقعوں پر برتا گیا۔ تو یہ ہمیں بجائے دلیری اور دوراندیشی کے بزدلی اور پست ہمتی کی طرف لے جائے گا۔

۲۔ سماجی تحریک:۔ بچہ نہ صرف ڈر کی وجہ سے کوئی کام کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی زندگی میں بڑوں کی طرح سماجی محرکات سے بھی اثر قبول کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے محبت کریں۔ اس کے کام کو اچھا کہیں۔ خود بھی وہ دوسروں سے محبت کرتا ہے۔ ان کی باتوں کو اچھا جانتا ہے۔ قدم قدم پر ان کی نقل کرتا ہے۔ بات بات میں وہ ان کی شاباش، اور تحسین چاہتا ہے۔ اس لئے اگر بچے کو خوف کی بجائے محبت اور ہمدردی سے سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس میں معلم کو بڑی کامیابی ہو سکتی ہے۔ جب شاگرد استاد کو اپنا ہمدرد تصور کرنے لگے گا۔ تو پھر وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے گا۔ کہ اس کی کسی حرکت سے استاد کو شکایت پیدا نہ ہو۔ اور اگر کبھی استاد ناراضگی کا اظہار بھی کرے گا۔ تو شاگرد کے ذہن میں اس کی اہمیت زیادہ ہوگی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سماج ہی کے ذریعے چیزوں کی قدر و منزلت کو پہچانتے ہیں۔ اسی کے ذریعے آدمی علم و ہنر سیکھتا ہے۔ اچھے برے کی پہچان پیدا کرتا ہے۔ خوب صورت اور بدصورت میں تمیز کرنے لگتا ہے سماج کے سایہ تلے انسان زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک انسان سماجی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے اندر لازمی طور پر سماجی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اور ان کو سماج ہی میں رہ کر وہ پورا کر سکتا ہے۔ سماج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آدمی طرح طرح

کے جتن کرتا ہے۔ کہیں خدمت کرتا ہے۔ کہیں خوشامد کرتا ہے۔ اور کہیں دولت خرچ کرتا ہے کیونکہ وہ سماج ہی میں رہ کر اپنی خوبیوں کو چمکا سکتا ہے۔ اور اس کی کسوٹی پر اپنی اچھائیوں کو پرکھ سکتا ہے۔

جس طرح بڑوں پر اپنی برادری کی رائے اور خیال کا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح بچوں پر بھی استاد کے اثر سے زیادہ اپنے ساتھیوں کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے مدرسہ چھوٹے پیمانے پر سماج کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ جہاں بچے مل جل کر کام کریں۔ دکھ درد میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ خوشی کے موقعوں میں باہم شریک ہوں۔ مشترک مقاصد کے لئے مل کر کام کریں۔ اپنے اندر مدنیت کی خوبیاں، احساس ذمہ داری، جذبۂ تعاون اور جذبۂ خدمت پیدا کریں۔ ایک دوسرے کے کاموں کی قدر کریں۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے مدرسہ کی زندگی کو سماجی زندگی کا نمونہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ مدرسہ اور درجہ کی تنظیم و ترتیب میں طلبہ کی عملی شرکت حاصل کی جائے۔ تاکہ خارجی دباؤ کے اثر سے آزاد ہو کر وہ اپنی اندرونی تنظیم کر سکیں۔ مدرسہ کے طلبہ کو بعض انتظامی ذمہ داریاں دی جائیں۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو حقیقی طور پر محسوس کرنا سیکھیں۔

اس لئے مدرسہ کی فضا ایسی ہونی چاہیئے۔ جہاں بچہ کتاب کی بناوٹی فضا کی بجائے اصلی سماجی فضا میں زندگی گزارے اور اپنے اندر وہ سماجی خوبیاں پیدا کر سکے جو بڑے سماج میں اس کے کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ اس قسم کی کوشش کوئی جبری کوشش نہیں ہے۔ بلکہ یہ سماجی رجحانات خود بچے کی سرشت میں پائے جاتے ہیں۔ بچے کا گھر بھی اس کا چھوٹا سماج ہوتا ہے۔ وہ پہلے دن سے سماج سے آشنا ہوتا ہے۔ مدرسہ ذرا بڑا سماج ہوتا ہے۔ یہاں آکر بچے کو نسبتاً زیادہ تطابق حاصل کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مدرسہ کا ماحول گھر کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے جس بیج کو گھر کی محدود زمین میں بویا گیا ہے۔ اس کو مدرسہ کے وسیع تر باغ میں ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس طرح سے بچے کی زندگی کو بتدریج پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے گا۔ تو وہ آئندہ جاکر سماج کی بڑی دنیا میں آسانی سے اپنی حیثیت قائم کر سکے گا۔ بچہ اپنے کاموں میں بہت فعال ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے۔ وہاں کے عام شغلوں کو وہ اپنے طور پر کرنے

کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے جو استاد بچوں کی تعلیم میں ماحول کے مشاغل کو جگہ دے گا۔ وہ بچوں کی تعلیمی دلچسپی میں بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے۔ اگر استاد میں ایسی خوبیاں یا مہارتیں پائی جاتی ہیں جن سے بچوں کو لگاؤ ہو تو وہ بہت آسانی کے ساتھ بچوں کی راہ نمائی کر سکتا ہے۔ کیونکہ بقول جیمز "بہت سے استاد اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہ ان میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کو بچے پسند کرتے اور بڑی خوشی سے نقل کرتے ہیں"

۳۔ خودی کی جبلت۔ انسان نہ صرف سماجی فضا سے متاثر ہو کر اپنے عملی مشاغل میں سماج کے برتاؤ کی نقل کرتا ہے بلکہ وہ بجائے خود ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اور طرح طرح سے اپنی حیثیت کو دوسروں سے منوانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ اپنے خیالات کو دوسروں سے تسلیم کرائے۔ اپنی قوت کو دوسروں کے خلاف آزمائے۔ معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرے۔ لوگ اس کی باتوں کو سنیں اور ان کی قدر کریں۔ بچے میں بھی یہ احساس بہت قوی ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ کمزور ہوتا ہے۔ مگر اپنی ہستی تسلیم کرانے کی اسے بھی فکر رہتی ہے۔ اس میں غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ وہ اس لئے روٹھتا ہے کہ اس کی بات نہیں مانی جاتی۔ وہ درجہ میں اس لئے عجیب وغریب سوال کرتا ہے۔ کہ استاد اس کی طرف متوجہ ہو۔ وہ دوسروں کی باری پر بن پوچھے اس لئے بول پڑتا ہے کہ استاد اور ہم جماعت اس کی لیاقت کو تسلیم کریں۔ یہ سب باتیں خودی کے جذبہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ بچے میں اظہار نفس کے لئے کس قدر تڑپ پائی جاتی ہے۔ اور معلم کہاں تک اس سے اپنے تعلیمی پروگرام میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

خودی کا جذبہ انسان میں 'کام کرنے' اور 'آگے بڑھنے' کا بہت بڑا محرک ہے۔ یہ ہمیشہ آدمی کی 'کام کرنے کی صلاحیت' کو زندہ و بیدار رکھتا ہے۔ اس کے مر جانے سے انسان کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ معلم کو چاہیئے کہ بچے کی 'خودی' کی قدر کرے اور اس کی تربیت کے لئے ایسے تعلیمی مواقع ڈھونڈے۔ جن میں بچہ اپنی ذات اور شخصیت کی تکمیل کر سکے۔ اس لئے بچوں کی تعلیم میں حرفتی کام کو خاص طور پر جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ بچہ اپنے کام کا خود اندازہ لگا سکے۔ اس

میں اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ اپنی قوت ارادی کی تربیت کر سکے۔ اور جسم و دماغ کی متوازن تربیت سے اپنی سیرت کو پختہ بنائے۔

ڈرانے دھمکانے کی بجائے اگر استاد طلبہ کے خودداری کے جذبہ کو قائم رکھے۔ ان میں اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی صفت پیدا کرے۔ تو بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد مل سکے گی۔ بچے کو خودبخود اپنی حیثیت قائم رکھنے کا خیال پیدا ہوگا۔ اور اس کو یہ چیز درجہ اور اپنے ساتھیوں میں چمکنے کے لئے زیادہ محنت کرنے کے لئے ابھارے گی۔ اس صفت کو پیدا کرانے کے لئے استاد اور والدین کو شروع شروع میں خاصی محنت کی ضرورت ہوگی۔ مگر جب بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھے گا۔ پھر اس کی بنی ہوئی شخصیت ہر موقع پر ان کے کام آئے گی۔ اور وہ زندگی کی مشکلات کو نہایت استقلال اور ہمت کے ساتھ سہار سکے گا۔ لیکن اگر اس کے برخلاف ہر موقع پر بچے کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری کی گئی۔ تو اس کا اثر اس کی مضبوط اور ترقی پذیر زندگی میں بڑی رکاوٹ پیدا کرے گا۔ بچوں کی مدد صرف ایسے موقعوں پر کی جائے جہاں واقعی ان کو ضرورت ہو۔

مروجہ تعلیم جو بچوں کی زندگی کی عام روسے الگ وجود رکھتی ہے۔ بچوں کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس کے ذریعے وہ اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے اس لئے مجبوراً استاد بچوں پر سختی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بچے کے اندر خودی کا مادہ دب جاتا ہے۔ بات بات پر اٹکتے ہیں۔ اپنے خیال اور ارادے کے اظہار سے گھبراتے ہیں۔ پٹتے پٹتے وہ آپ اپنی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ بعض بچے سخت سست سن کر ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے استاد یا والدین کے کہنے کا ان پر اثر باقی نہیں رہتا۔ بعض بچے بڑوں سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اور آئندہ جا کر تلخ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ سرکشی اور ضد کرنے لگتے ہیں۔ بات بات پر چڑتے ہیں۔ اور اگر حس باقی ہے۔ اور اس کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ تو اس پر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کی زندگی کو زنگ لگ جاتا ہے۔ پس مدرسہ زندگی کا سچا نمونہ ہونا چاہئے۔

جس میں بچے مختلف انفرادی اور سماجی مشاغل کی مدد سے اپنی شخصیت کو آزادانہ طور پر فروغ دے سکیں۔

۴۔ چیزوں کو برتنے کی جبلت:۔ بچے میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا کا قدرتی مادہ ہوتا ہے وہ بڑوں کی نقل میں طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ ہر ایک چیز کا کھوج لگانا اس کی گھٹی میں داخل ہے۔ وہ چیزوں کے دیکھنے بھالنے پر بس نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق برتنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ گھر، باغ، مدرسہ میں بڑوں کی آنکھ بچا کر وہ آس پاس کی چیزوں کو اٹھاتا اور بڑوں کی تقلید میں ان کو برتنے لگتا ہے۔ کہیں دیواروں پر تصویریں بناتا ہے۔ کہیں چاقو سے گھر کا سامان کاٹتا ہے۔ کہیں قینچی سے کتاب کے ورق کترتا ہے۔ غرض بچوں کو جو کچھ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ کام کرنے کی نوعیت بدلتی جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے بچے سے لے کر ایک ماہر انجنیر ایک قابل ڈاکٹر ایک محقق سائنسداں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہر ایک آدمی اپنی قوت نفسانی کو مختلف طریقوں سے برتتا ہے۔ اپنے اپنے نہج پر اپنے تخلیقی منشا کو پورا کرتا ہے۔

بچہ شروع شروع میں اپنی تخلیقی قوت کو کھیل کود اور دوڑ دھوپ کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقی قوت کو باقاعدہ طور پر دنیا کے آب وگل میں تشکیل کر دیتا ہے۔ بچے میں مجرد تصورات قائم کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ ان کو جو کچھ دنیا کا علم ہوتا ہے۔ وہ اشیا کے ساتھ براہ راست تعلق سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی زندگی بالکل شخصی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قریب ترین ماحول کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ وہ اشیا کی خاصیت ان کے برتنے ہی سے پہچان سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سیکھنے کا دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ عملی مشاغل پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ بعد میں جب بچے کا تجربہ بڑھ جاتا ہے۔ تو وہ مجرد تصورات کو بھی قوانین کی شکل میں سمجھ سکتا ہے۔

۵۔ جستجو۔ سیکھنے کے لئے انسان کو قدرت نے یہ ایک عجیب وغریب صلاحیت

بخشی ہے۔ وہ ہمیشہ نئی چیزوں کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ نئے نئے تجربے کرتا ہے۔ نئے نئے علاقے دریافت کرتا ہے۔ نئی چیزوں کی تلاش اور کھوج میں وہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتا۔ ہر ایک نئی حقیقت کے دریافت ہونے پر انسان کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی کے حقائق اس کے لئے متاع گم گشتہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی تلاش میں وہ ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ بچہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ جذبہ قوی ہوتا ہے۔ وہ ہر قدم پر کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا ہے۔ اگرچہ شروع شروع میں چیزوں سے اس کی دلچسپی اور وابستگی وقتی سی ہوتی ہے۔ مگر جیسے جیسے بچے کے قویٰ ترقی پانے لگتے ہیں۔ ویسے ویسے اس کی یکسوئی بڑھتی جاتی ہے وہ اپنے ماحول کو زیادہ گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ بچے کا یہ محرک استاد کو سکھانے کے لئے بچے کی طرف سے ایک قسم کی دعوت ہے۔ ایسے موقعوں کو غنیمت جان کر وہ بچے کی بہترین خدمت کر سکتا ہے۔ اور اپنے فرائض کو اچھی طرح سے پورا کر سکتا ہے اس لئے جو لوگ اس بات کی شکایت کرتے ہیں۔ کہ بچے کچھ سیکھنا نہیں چاہتے۔ بچے کی ایک ایسی صلاحیت سے انکار کرتے ہیں۔ جو روز روشن کی طرح واضح ہے۔ استاد کو اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ بچوں کی دھن کا پتہ لگائے اور اپنے تعلیمی پروگرام میں اس سے کام لے۔

جس طرح انسان کے دیگر محرکات اور تجربے بدلتے ہیں۔ اسی طرح یہ محرک بھی عمر کی مختلف منزلوں میں مختلف نوعیتوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی عمر میں بچے کی دلچسپی اس کے ماحول کی مختلف اشیا میں بٹی رہتی ہے۔ وہ تتلی کی طرح ہر جاذب نظر چیز کی طرف لپکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اگر کوئی دوسری انوکھی چیز مل جاتی ہے۔ تو اس سے چمٹ جاتا ہے۔ غرض بچہ بہت ندرت پسند ہوتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہوتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ بچے کے لئے اپنے ماحول کی کئی چیزیں نئی ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ بچے کی دلچسپی سطحی ہوتی ہے۔ وہ چیزوں کی گہرائی تک نہیں جا سکتا تیسری یہ کہ شروع میں بچے کی نظر میں چیزوں کا افادی پہلو نہیں ہوتا۔ تاکہ کسی خارجی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک مشغلہ پر دیر تک سوچ سکیں۔ چوتھی بات یہ ہے۔ کہ بالکل بچپن کا زمانہ بچے کے

تیز نشوونما کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مسلسل اچک پھاند سے اپنی طبعی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔
اس لئے بچے دیر تک کسی ایک کام میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس لئے چھوٹے بچوں کی پڑھائی میں
بہت تنوع کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان کے پڑھائی کے وقفے بھی بہت مختصر ہونے چاہئیں۔ البتہ
بڑی عمر کے بچوں کو اشیا کی تفصیل میں لے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اشیا اور مشاغل کے مختلف پہلوؤں
پر نظر ڈالنے کی قابلیت پیدا کر لیتے ہیں۔

شہوت کی جبلت | اگرچہ شہوت کا مسئلہ چھوٹے بچوں کے استاد کے لئے زیادہ قابل
توجہ نہیں ہے۔ تاہم اسے سمجھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض بچوں میں غیر معمولی جنسی بیداری
ماحول کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ عام حالات میں یہ محرک عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر
ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر اس کو صحیح راہ پر لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر شروع میں بھی اس کا خیال
رکھنا ضروری ہے۔ عام طور پر والدین چھوٹے بچوں کے بعض حساس حصوں کو مختلف مواقع پر جیسے سلانے
کے لئے یا پاخانہ پیشاب کرنے یا نہلانے کے لئے چھوتے ہیں۔ اس سے بچے کے جذبات برانگیختہ
ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ بڑے ہو کر بھی اپنے طور پر پیدا کرنے کی بری عادت ڈالتے ہیں جس کا
نتیجہ بہت برا ہوتا ہے اسی طرح بچوں کے سامنے وقت سے پہلے جنسی تحریکات کے متعلق باتیں کرنا
برا ہے۔ البتہ جب بچے میں قدرتی طور پر جنسی بیداری پیدا ہو جائے۔ تو اس کا وقت موقع بموقع ان کو
صاف طور پر سمجھانا ضروری ہے۔ یہ تو لازمی بات ہے۔ کہ بچے ایسے موقعوں پر نئی زندگی کے آغاز میں
خاص قسم کے تجربات سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے متعلق مزید معلومات بھی حاصل کرنا چاہتے
ہیں۔ مگر جن ذرائع سے بچوں کو معلومات مل جاتی ہے۔ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے۔
کہ یہ ذرائع بہت اشتعال انگیز ہوں۔ اور بجائے نوجوان کی مدد کرنے اور صحیح راستے پر ڈالنے
کے اس کو گمراہی کی جانب لے جائیں۔ اس لئے اگر اس کی خیر خواہی اور ہمدردی کے طور پر ان کو
اس کے متعلق صاف طور پر جدید اصول حفظان صحت کی روشنی میں معلومات دی جائیں۔ تو اخلاق
پر اچھا اثر ہوگا۔ اس ضرورت سے چشم پوشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی

ضرورت ہے۔ ایک مشہور سائنسداں کا قول ہے۔ کہ دنیا میں ۹۹ فی صدی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جنسی بیداری کے زمانے میں غیر فطری طور پر جنسی ہیجانات پیدا کرنے میں مبتلا ہیں اور باقی ا فی صدی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس طنزیہ مقولے میں کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہو۔ لیکن سچائی بھی اس میں کسی حد تک پائی جاتی ہے۔

موجودہ تمدنی زندگی اور خود نسلی بہتری کا خیال اس بات کے لئے مجبور کر رہا ہے کہ عمر کا ایک خاص حصہ تعلیمی کاموں اور فنی مہارتوں میں صرف کیا جائے۔ اور ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد ہی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھے پر اٹھایا جائے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ بچوں کو ایسے تخلیقی کاموں سے آشنا کیا جائے جس کے ذریعے وہ اپنے فرصت کے اوقات کا خوشی اور انہماک کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ اس کا اثر ایک طرف تو ان کی عام زندگی پر بہت اچھا ہوگا کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عموماً وہ نوجوان جنسی بے اعتدالیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ جن کو ایسے مشاغل کا چسکا نہیں ہوتا۔ جس میں وہ اپنی زندگی کی جسمانی اور جذباتی ضروریات کو تسکین دیں۔ اور دوسری طرف وہ ان تخلیقی مشاغل کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ ان نوجوانوں کو مختلف جسمانی کھیلوں اور مقابلوں کی عادت ڈالی جائے۔ تو وہ اس کے ساتھ ساتھ بہت کچھ اعتدال کے راستے پر چل سکیں گے۔ غرض یہ محرک بھی زندگی میں اپنے اثرات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کا صحیح اظہار سماجی زندگی کی خوش حالی کے لئے کافی وزن رکھتا ہے کیونکہ نسل انسانی کا تسلسل اور خاندان جو سماجی زندگی کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہے۔ اسی جبلت کا نتیجہ ہے۔ اس کی صحیح تربیت سے ہماری سماجی زندگی میں بہت استواری آسکتی ہے۔ ان محرکات کے علاوہ انسان کی زندگی میں اور بھی کئی بنیادی محرکات یا جبلتیں پائی جاتی ہیں جیسے غصہ یا پرورش کا جذبہ جن کو یہاں پر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔

محض قدرتی جبلتیں قوت عمل کا ماخذ نہیں ہیں :-

جبلتوں کے مفہوم کے سلسلہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ کہ یہ جبلتیں کسی طرح بھی انسان

کی زندگی پر حاوی نہیں سمجھی جا سکتیں۔ اولاً تو یہ کہ ایک ہی جبلت کی کیفیت کبھی دو مرتبہ یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے جوابی عمل میں فرق ہونا ضروری ہے۔ اسی لحاظ سے زندگی میں جتنے مواقع آتے ہیں۔ ان کا جوابی عمل مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ تجربے کی وجہ سے جبلتوں کی کیفیت میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ جبلتوں کی جو اس طرح تقسیم کی جاتی ہے۔ اس سے زندگی کے موٹے موٹے نفسی رجحانات کا پتہ لگانا مقصود ہوتا ہے۔ تیسری بات جو ان دونوں کے مابین پائی جاتی ہے اور جو عملی اعتبار سے زیادہ صاف اور مفید ہے۔ یہ ہے۔ کہ انسان محض چند نفسی محرکات کی وجہ سے کام نہیں کرتا۔ بلکہ جب آدمی کسی نہ کسی ضرورت سے کسی مشغلہ میں لگ جائے۔ تو پھر اس مشغلہ کی انجام دہی میں بذات خود اس قدر دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ بغیر ختم کئے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ووڈ ورتھ کہتا ہے کہ "یہ چند موٹے موٹے نفسی رجحانات کسی پیچیدار گھڑی کے بڑے بڑے پرزوں کی مانند نہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی پرزہ گھڑی کو ہر وقت چلاتا رہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ محرکات سب خوابیدہ ہوں اور پھر بھی آدمی کام کرتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت کام کرنے والے کو نہ بھوک ہو نہ پیاس۔ نہ وہ ڈرتا ہو اور نہ اس وقت جنسی میلان محرک ہو۔ لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو۔ اگر کسی آدمی کا مشغلہ اچھی طرح سے چالو ہو گیا تو پھر اس کا ختم کرنا ہی اس کو کام پر مجبور کرے گا۔"

جبلت عادات بننے میں کیا مدد دیتی ہے | دنیا میں آدمی جو کچھ کرتا ہے بیشتر عادات کی رو میں کرتا ہے۔ عادات کو یہاں ہم اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں سوچنے، کام کرنے اور جذباتی پہلو کو بھی شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح آدمی ٹائپ کرنے کے لئے خاص قسم کی میکانکی عادات اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح دقیق سے دقیق مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی کاوش بھی عادات کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھے اشعار، اچھے گانے اور عمدہ مصوری کی قدر کرنے کے لئے آدمی کو خاص قسم کی جذباتی مشق و مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر یہ ذوق بھی میکانکی سا ہو جاتا ہے۔ جب یہ حاصل کردہ عادات رسم و رواج کی صورت میں آدمی پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ تو پھر آدمی جو کچھ سوچتا، سمجھتا، محسوس کرتا اور عمل میں لاتا ہے۔ ان سب پر وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر ضرور خوبی رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے افراد اور سماج کی سیرت میں کچلی ہم آہنگی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے حالات کبھی ایک نہج پر نہیں رہتے۔ اور قومی عادات اور رسم و رواج نئی ضروریات کا ہمیشہ ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے لازمی طور پر بڑے بڑے ہنگامے اور سماجی انقلابات رونما ہو جاتے ہیں۔

یہی حال انفرادی تطابق کا بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا سے جب عادتیں نئی نئی بنتی ہیں تو وہ بھی جبلت پر اپنا سنگ بنیاد رکھتی ہیں۔ مگر عادات پھر اس قدر قوت پکڑ لیتی ہیں۔ کہ وہ کسی نئی تبدیلی کی تاب نہیں لاسکتیں۔ یہاں پھر انسان کی جبلت بیدار ہو جاتی ہے اور نئی تبدیلی کو محسوس کر کے تطابق کا راستہ ڈھونڈتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس کی پشت پر گزشتہ تجربہ برابر کام آتا ہے۔ اور گزشتہ عادات اور تجربے ہی کی روشنی میں آدمی نئی اور سنگلاخ زمینوں کو ہموار کرتا ہے۔ اس لئے آدمی کی زندگی کا رشتہ کبھی یک دم نہیں ٹوٹ سکتا۔ بلکہ جس طرح گذشتہ تجربے کی روشنی میں آدمی نئے حقایق دریافت کرتا ہے اسی طرح نئی تحقیق کی روشنی میں گزشتہ علم و تجربے میں جان آ جاتی ہے۔ غرض جبلت انسان کی زندگی میں نئے حالات کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کے لئے لوچ پیدا کرتی ہے۔ یہ اس کشمکش سے آدمی کو بچاتی ہے۔ جو پرانی عادتوں اور نئے ماحول میں عدم تطابق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قومی زبان

(از مولوی بدرالحسن صاحب بی اے (جامعی)

قوم کی تعمیر اور تخلیق میں زبان کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔ انسانوں کی جماعت کے درمیان جذبات کی ہم آہنگی، رجحانات کی یک رنگی اور اپنے برے بھلے کے یکساں احساس کے زیر اثر جو چیز رشتہ، ارتباط قائم کرتی ہے، وہ زبان ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھئے، جیسے ایک مشین تمام کل پرزوں سے درست بغیر ایک محرک کے نہیں چل سکتی جو اس کے اجزائے ترکیبی کو باہم ملاکر اس میں حرکت پیدا کر دے، ٹھیک اسی طرح ایک قوم اپنے تمام لوازم کے ساتھ زبان کے بغیر اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں ہوسکتی۔ پھر زبان اس کی مدنی زندگی کے ارتقا کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کی نفسی تحقیقات اس کے ذہنی رجحانات اور مدنی تنظیمات کا مطالعہ مقصود ہو تو اس کی زبان کا مطالعہ کیجئے۔ اس لئے کہ تاریخ محض ظاہری واقعات سے بحث کرتی ہے اس کا ان محرکات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان محرکات کو سمجھنے کے لئے ہمیں زبان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مذہب کے بعد اگر کوئی اور شئے باہمی رشتۂ اخوت و اتحاد استوار کرنے میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ زبان ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کو......

جو محض جغرافیائی حدود کے لحاظ سے مختلف نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں......... ایک مرکز پر اگر جمع کر سکتی ہے تو وہ زبان ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جو مذہب اور وقتی لڑائیوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جن دلوں کے درمیان محبت و الفت کی نامہ بری زبان کے ذریعہ ہو۔ وہ ایک مرتبہ جڑ کر الگ نہیں ہو سکتے۔ اس محبت کا نظارہ پنجاب اور گجرات سے باہر کیجئے، برما اور کلکتہ میں پنجاب کے سکھ اور مسلمان گجرات کے

مسلمان اور ہندو محض لسانی یکجہتی کی وجہ سے جس خلوص سے ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ مسجد شہید گنج اور منڈل کی قسم کے جھگڑے انسان کی قلبی گہرائیوں پر اتنا اثر نہیں ڈالتے جتنا زبان کے ذریعہ سے ملے جلے ہوئے رشتے۔ غرض متحدہ قومیت کی تعمیر میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برِاعظم ہے جہاں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے زیر اثر مختلف زبانیں بولنے والے بستے ہیں۔ یہاں تو ایک مشترک زبان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ پھر اور کس چیز کے ذریعے ایک صوبہ دوسرے صوبہ سے تعلقات قائم کرسکتا ہے۔ اور وہ اتحاد و یکجہتی جو متحدہ قومیت کی روح ہے کس طرح پیدا ہوسکتی ہے تجارت کاروبار عدالتوں کے کام، جلسوں اور کانفرنسوں میں لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کس طور پر ہوسکتی ہے اور تو اور ہمارے قومی تمدن کی تشکیل کیونکر ہوسکتی ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دیگر پیچیدہ مسائل ہیں جن کے حل کے طور پر ایک مشترک زبان کے لئے ہندوستان کا ہر مفکر بے چین و مضطرب نظر آتا ہے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیئے۔ کہ ہر قدم پر روڑے اٹکا رہا ہے اگر کوئی خلوص کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا بھی ہے تو قوم و ملک کے بدخواہ اپنے تعصب کے زہریلے اثر سے رہے سہے قومی اتحاد کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

اردو کی ابتدا | یوں تو ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے۔ جہاں چپہ چپہ کی زبانیں مختلف ہیں۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تقریباً دوسو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس خیال میں مبالغہ کو دخل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ کی زبان مختلف ضرور ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض زبانیں ایسی ہیں جو کم و بیش ملک کے بڑے حصہ میں بولی یا کم سے کم سمجھی ضرور جاتی ہیں۔ ان میں دو زبانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک اردو دوسری ہندی۔ سب سے پہلے ہمیں اردو پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے کہ یہ زبان کیسے بنی۔ اور کن لوگوں نے اس کے بنانے میں حصہ لیا۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے وقت سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا

ہے جس میں زبان، تمدن اور معاشرت سب کی قلب ماہیت ہوگئی۔ اول اول یہاں کے باشندے مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، زبان اور خود ان کے وجود سے متنفر رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تنفر دور ہوگیا۔ اور آپس میں اتحاد و اخوت یکجہتی اور رواداری کے رشتے استوار ہوتے گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کیا مسلمانوں نے انھیں حکومت کے معاملات میں اپنا شریک بنایا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات قائم کئے۔ بعضوں نے تو ایک متحدہ قومیت کے جنون میں ایک ایسے مذہبی نظام کی تبلیغ و اشاعت کرنی چاہی جو ہندوستان کے ہر طبقہ و ملت کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہو۔ لیکن اس جدت کا اثر سب سے پہلے زبان پر ہوا۔ کیونکہ اس کے بغیر دوسرے کے قلبی تاثرات کی ترجمانی ناممکن تھی۔ آپس میں دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے واقف ہوتے۔ اس ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونوں نے اپنی اپنی زبان میں ایک دوسرے کو اپنے خیالات سمجھانے کی کوشش کی۔ اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے الفاظ سمجھنے لگے۔ اس طرح الفاظ کے خلط ملط ہونے سے ایک نئی زبان عالم وجود میں آئی، جسے ہم اردو یا ہندوستانی کہتے ہیں۔ جہاں جہاں مسلمان پہنچے یہ زبان بھی پہنچی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کرلی۔ یہی وہ زبان ہے جو مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے طبقوں کی مشترکہ کوششوں اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم میں حاکم و محکوم دونوں برابر کے شریک تھے۔ ہندوستانیوں نے اس کو ہمیشہ اپنی زبان سمجھا اور اس پودے کو اپنا سمجھ کر پروان چڑھایا اس کی خدمت کی۔ اور واقعہ تو یہ ہے۔ کہ اس زبان پر دوسری قوموں کے احسانات مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ جب اردو زبان ایک متحدہ قومیت کی پیداوار اور ایک متحدہ تمدن کی آئینہ دار ہے، ہندوستان کے تمام فرقوں کے اتحاد کا مرقع ہے، ان کی انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے، تو پھر اس کے خلاف اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہے۔ آیئے اس کے اسباب پر بھی غور کریں۔

ہندی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز عہدہ داروں کو ہندوستانی زبان سکھائی جائے چنانچہ اس سلسلہ میں کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ جن سے ہندوستانی زبان میں اچھا خاصہ اضافہ بھی ہوا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ کالج ہندوستانی کے عروج کے حق میں سم قاتل بھی ثابت ہوا۔ زبان کے معاملہ میں جو کشمکش آج ہندوستان میں جاری ہے۔ اس کا بیج سب سے پہلے اسی کالج میں بویا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے ہندو منشیوں کو یہ مشورہ دینا شروع کیا۔ کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کی رسم الخط میں لکھیں۔ کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوستان کے لئے بدیسی ہے۔ اور جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول کے باوجود جداگانہ معاشرت رکھتے ہیں، ان کا رسم الخط بھی جدا ہونا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیلنے لگی اور فورٹ ولیم کالج کے نکلے ہوئے نوجوانوں نے اس خیال کو بھی اپنی سیاسی اور سماجی تحریک کے پہلو بہ پہلو رواج دیا۔ انھوں نے ہندو قوم کو بتایا کہ ہم ہندو ہیں ہمیں بدیسی چیزوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔ فارسی رسم الخط بدیسی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا فرض ہے کہ ہندی رسم الخط اختیار کریں" دوسری طرف ہندوؤں کی سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی ترقی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اس کا جو انجام ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستانی کے مخالف مسلمانوں کے آٹھ سو سال کے اثرات کو حرف غلط کی طرح مٹا کر آریائی تمدن کا پرچار کرنا چاہتے ہیں اس زبان کو جو دونوں کے اتحاد و ارتباط کی جاگتی تصویر تھی، مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال تھی، جس کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جاسکتی تھی، ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس قابل احترام بنیاد کو سرے ہی سے ڈھا دینا چاہتے ہیں، جو ہمارے اسلاف کے مبارک ہاتھوں ڈالی گئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے۔ کہ اردو ہندی کے اس آئے دن کی کشاکش کی ذمہ داری صرف انگریزوں اور ہندوؤں پر ہی نہیں بلکہ خود ہمارے اوپر بھی ہے مسلمانوں کی ایک جماعت نے سر سید مرحوم کی قیادت میں مسلمانوں کو قومی تحریکات سے الگ

رکھنے کی کوشش کی۔ اور اس قسم کی تحریکوں کا ہر طرح بائیکاٹ کیا۔ متعصب قسم کے ہندو مسلمانوں کے اس طرز عمل سے چراغ پا ہوئے۔ اور انھوں نے ہماری رہی سہی میراث کو بھی مٹا ڈالنے کی کوشش شروع کی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا۔ کہ خود مسلمانوں نے اس مشترک زبان میں عربی فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرور جماعت کے ایک خاص طبقہ نے بھی فرقہ پرست جماعت کا ساتھ دیا۔ اور ہندی کی ترقی کے لئے ہر طرح تیار ہو گئے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے قومی تحریکوں کا بائیکاٹ کیا، مشکل الفاظ استعمال کرنے لگے، تو کیا اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ متحدہ قومیت کی اس آخری یادگار کو ختم کر دیا جائے۔ اور پھر ایسی صورت میں کہ مسلمانوں نے اپنی ان غلطیوں کا اعتراف بھی کر لیا ہے اور ان کا ایک بہت بڑا طبقہ اس تدارک پر آمادہ بھی نظر آ رہا ہے وہ اس حقیقت کو سمجھ چکا ہے کہ ہماری قسمت یہیں کے باشندوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہیں اسے جینا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ وہ یہ دل سے چاہتا ہے۔ کہ ہماری ایک قومی زبان ہو۔ جس کی اساس میں دونوں تمدنوں کا برابر کا حصہ ہو۔ لیکن وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے سروں پر ایک آریائی تمدن مسلط کر دیا جائے۔

ہمیں اس طرز عمل سے قطعاً شکایت نہ ہوتی۔ اگر یہ آوازیں ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم سے آتیں۔ جو ہندوستان میں متحدہ قوم کی بجائے ایک آریائی تمدن کا غلبہ چاہتی ہے۔ لیکن رونا تو اس کا ہے۔ کہ یہ صدائیں اس جماعت کی طرف سے اٹھ رہی ہیں۔ جو متحدہ قومیت کی علمبردار ہے کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ ہندوستان کا وہ محبوب رہنما جس نے کبھی اسی قومیت کی خاطر اپنی جان تک کو قربان کر ڈالنا چاہا تھا اور جو بغیر مسلم قوم کے "جنت میں بھی جانے پر تیار نہ تھا" آج اس جماعت کی حمایت پر آمادہ ہے جو اردو کی دشمن ہے۔ اور ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتی ہے۔

اس شکایت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ہندی کی ترقی سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ ہندی کو عروج ہو رہا ہے، خدا کرے اور ہو۔ آریائی تمدن کا احیا ہو رہا ہے تو وہ اور پروان چڑھے

سیاسی، سماجی، معاشی میدان میں کوئی آگے نکلتا ہے تو شوق سے نکلے۔ ہمیں اس سے قطعاً دکھ نہ ہوگا۔ ہم کسی کی ترقی کے راستے میں روڑا اٹکانے کی بجائے کامیابی کے خواہش مند ہیں لیکن ہم اپنے تمدن کو بھی مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ آخر اس میں کیا قباحت اور مصیبت ہے۔ کہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر عمل کیا جائے۔

اس مسئلہ کا حل ہم سب ہندوستانیوں کو سوچنا ہے۔ اس لئے کہ ہم سب کو اسی ملک میں رہنا ہے۔ ملکی سیاسیات کا تقاضا ہے کہ ہم سب لوگ خواہ کسی طبقہ یا ملت کے افراد ہوں۔ آپس میں میل ملاپ سے رہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نظر انداز کر کے قوم و ملک کا بھلا نہیں کر سکتا۔ اس وقت کوئی ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں چاہتا۔ تو ہمیں خود آگے بڑھ کر اس کا حل تلاش کرنا ہے۔ اور ایک ہندی مسلم تمدن کی بنیاد رکھنی ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر جرأت بیباکی اور عالی ہمتی سے کام لیا تو وہ زمانہ دور نہیں۔ کہ جو لوگ ہم کو اپنی منزل پرے جانا چاہتے ہیں، خود ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

ہر زبان کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک عام بول چال کا دوسرا علمی۔ عام بول چال کا معیار جمہور کی طرف سے قائم ہوتا ہے اور اس میں اکثر انھیں کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے زبان کا فطری پہلو بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ جمہور زبان کو بنانے میں ارادے سے کام نہیں لیتے بلکہ ماحول کے اثر سے خود بخود ایک زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کو اکثر اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہاں البتہ اس زبان کی وسعت اور تنگی سے پتہ چلتا ہے کہ جس طبقہ کی وہ زبان ہے وہ زندگی کی کس منزل میں ہے۔ اس لئے کہ زبان ضروریات کے احساس سے بنتی ہے۔ اور ضروریات کی وسعت عبارت ہے انسان کے سماجی ارتقا سے ہندوستان تعلیمی حیثیت سے بہت پیچھے ہے اگر پھر بھی زبان تو رکھتا ہے، جو عالموں اور ادیبوں کی زبانوں سے بالکل مختلف ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسی زبان کے سہارے ہم ایک مشترکہ زبان پیدا کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس زبان سے ہم فرقہ وارانہ مسائل سے بالکل الگ ہو کر تعلق پیدا کریں۔ حسن اتفاق سے اس

زبان تک پہنچنے کے وسائل موجودہ سیاسی مسائل نے پیدا کر دئے ہیں۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ ہم ان سیاسی مسائل سے الگ نہ رہیں۔ یہ زبان عوام الناس کی وہ زبان ہے۔ جو صدیوں سے ان میں رائج ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت سی خامیاں بھی ہیں لیکن وہ محض عارضی ہیں۔ اور اب تک اس لئے باقی ہیں۔ کہ ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی۔ آج کل قومی تحریک خواص کے طبقہ سے نکل کر عوام میں مصروف کار ہے۔ زبان کے معاملہ میں ہمیں کسی پروپیگنڈے یا اہتمام کی ضرورت نہ ہوگی یہ تحریک عوام الناس کے میل ملاپ سے خود بخود ایک صاف ستھری زبان پیدا کر دے گی۔ جس پر نہ سنسکرت کا غلبہ ہوگا۔ نہ عربی فارسی کا تسلط۔ عوام کی وہی سیدھی سادھی زبان ہوگی۔ جس کو سیاسی رہنماؤں کا مہذب مذاق اس میں شیرینی پیدا کرکے دلکش بنا دے گا۔ پنڈت جواہرلال نہرو کا یہ قول کتنا صحیح ہے۔ کہ آج کل ہندوستان میں جتنے اختلافات نظر آرہے ہیں۔ سب ایک خاص طبقہ کی دماغی عیاشیوں کے نتائج ہیں۔ جو ضروریات زندگی کی طرف سے مطمئن ہیں۔ ہندوستان کی صحیح حالت کا پتہ اس خاص طبقہ کو دیکھ کر نہیں چل سکتا۔ بلکہ اس کی اصلی حالت کا آئینہ عوام ہیں۔ جو محض روٹی اور کپڑا چاہتے ہیں۔ بالکل یہی حل زبان کے مسئلہ کا ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا محض خواص تک محدود ہے عوام میں جائیے تو ایک سیدھی سادھی زبان ملے گی، جسے ہندو مسلمان سبھی بغیر کسی اختلاف کے یکساں طور پر بولتے ہیں جس طرح سیاسی آزادی کا حل عوام سے میل کرنے میں ہے، اسی طرح زبان کا مسئلہ بھی طے ہو سکتا ہے۔

ایک تجویز ہماری خوش قسمتی کہ ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت موجود ہے۔ جو متحدہ قومیت کی دعوے دار ہے۔ اور جس کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جسے پریم کا دیوتا کہیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ وہ بہادر ہے ماجری ہے، اور تعصب کی آلودگیوں سے پاک ہے ہم اس جماعت کے پہلو بہ پہلو چل کر سیاسی پیچیدگیوں ہی کا نہیں بلکہ سماجی ناخوشگواریوں کا حل بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس جماعت نے اپنا پروگرام عوام میں رکھا ہے۔ اس لئے جو لوگ

وہاں کام کریں گے۔ انھیں مجبوراً انھیں کی زبان بولنی پڑے گی اور یہ چونکہ مصلح اور معلم کی حیثیت سے جائیں گے، اس لئے قدرتاً عوام کی معاشرت پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ ان کا مذاق شستہ ہوگا۔ اس لئے زبان کا وہ بھونڈا پن دور ہو جائے گا جو عوام کے مذاق کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک دلکش اور میٹھی زبان خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے لئے یہ موقع نادر ہے۔ خوش قسمتی سے خود کانگریس نے اتحاد کی دعوت دی ہے۔ اگر اس دعوت کو ٹھکرا دیا گیا۔ تو بس ہماری باتیں ہی باتیں رہ جائیں گی۔ اور لوگ بقول حضرت اکبرؔ "کام کر جائیں گے" اس وقت ہماری شکایتیں بھی بے وقت کی راگنی سے زیادہ اہمیت نہ رکھیں گی۔ صدر کانگریس کا وہ بیان جس میں انھوں نے ماتحت کمیٹیوں کو مسلمانوں میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے اردو زبان اختیار کرنے کا حکم دیا ہے بہت نیک اور ہمت افزا ہے۔ اگر ہم نے اس مشورہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو ہم سیاسی حیثیت سے تو غلام ہیں ہی۔ ہماری معاشرت اور زبان کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ اس دعوت اتحاد کو نظر انداز کرنے کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ دو الگ الگ ماحول پیدا ہو جائیں گے۔ اور زبان اپنے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر دو جدا جدا روپ اختیار کرے گی۔ ایسی صورت میں زبان بھی وہی مشترک تسلیم کر لی جائے گی۔ جس کی پشت پر سیاسی و سماجی طاقت ہوگی۔ اور اس بحرانی کیفیت میں ایک کو دوسرے کے مقابلے میں فنا ہونا پڑے گا............ پھر ظاہر ہے فنا ہونے والی کونسی زبان ہوگی۔

عام بول چال کا مسئلہ تو اس طرح حل ہو جاتا ہے۔ اب باقی رہتا ہے زبان کے علمی پہلو کا مسئلہ۔ سو بجائے خود کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جب عام بول چال کی زبان پیدا ہو جائے گی۔ اس وقت علماء کا طبقہ اسی زبان میں سے علمی نظریوں کے لئے اصطلاحیں وضع کریگا۔ کچھ اصطلاحیں نئے علوم کے ماخذوں سے لے کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔ اور کچھ خود ایجاد کرے گا۔ اور اسے رواج دے کر مفید مطلب بنائے گا۔ لیکن اصطلاحات کے بنانے میں اس کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا۔ کہ اصطلاحات کے سبب زبان پر بار نہ پڑنے پائے یعنی

آج کل ہندی اور اردو دونوں میں ہو رہا ہے۔ ہندی کے حامی جب اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انھیں سنسکرت سے اور اردو زبان کے حامیوں کو زبان عربی سے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علوم زیادہ تر عربی اور سنسکرت ہی میں ہیں۔ لیکن جب انقلاب پیش نظر ہے تو قدامت کی طرف دست سوال بڑھانے کے کیا معنی۔ عربی اور سنسکرت کے علماء نے اصطلاحیں بناتے وقت کس چیز کا سہارا پکڑا ہوگا۔ پھر ہمیں کسی دوسرے کا سہارا لینے کی کیا ضرورت خود اپنی زبان سے اصطلاحیں کیوں نہ بنائی جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح جو اصطلاحیں بنیں گی وہ غیر مانوس ہوں گی۔ مگر کثرت استعمال سے جب ہمارے کان ان سے آشنا ہو جائیں گے تو وہی فصیح سمجھی جائیں گی۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے انشا پردازوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ مسلمان انشا پرداز اپنی تحریریں صرف مسلمانوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور ہندو اپنی قوم کو۔ اس لئے یہ لوگ ایسی تحریریں نہیں لکھتے جو دونوں قوموں کے لئے مفید ہوں۔ لیکن یہ اختلاف سیاسی اتحاد اور اس زبان کے پیدا ہو جانے سے جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے خود دور ہو جائیگا ہم سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے لگیں گے، تو یہ انشا پرداز خود بخود مجبور ہوں گے۔ کہ وہ ایسی زبان لکھیں جسے ہر شخص سمجھ لے۔ اس کے لئے ہمیں کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہمارے انشا پرداز خود عوام کے رجحانات کا لحاظ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور اس طرح عوام اور انشا پردازوں کے اشتراک عمل سے ایک ایسی زبان تیار کر سکیں گے، جو سب کی زبان ہوگی۔ اس میں نہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ہوں گے اور نہ عربی فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اس میں عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ ہوں گے۔ وہ ہندوؤں کی میراث ہوگی نہ مسلمانوں کی۔ بلکہ وہ دونوں کی مشترکہ زبان ہوگی۔ وہ اردو کہلائے گی نہ ہندی۔ بلکہ اس کا نام ہندوستانی ہوگا۔ وہ ہماری تمدنی سیاسی، اور معاشی اتحاد کا نتیجہ ہوگی۔ یہ وہ زبان ہوگی۔ جو ہمارے دلوں میں پریم کی گنگا بہائے گی۔ جس کا پوتر جل جائے دلوں کے میل کو دھو کر شیشہ کی طرح چمکا دے گا۔ ہم آج ایک دوسرے

سے ناامید ہوکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں یہ زبان ہمارے اندر آشا کی لہر پیدا کر دے گی ہم پھر ایک مرتبہ پریم کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ساتھ ساتھ زندگی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اور ہمارے دل چونکہ آپس میں جڑے ہوں گے بھارت ماتا ممتا کے جوش میں ہمیں اپنے سینہ سے لگائے گی۔ اور مسکراتے ہوئے کامیابی کا آشیرباد دے گی۔

(نوٹ، یہ مضمون مصنف نے ۱۹۳۶ء میں اس وقت لکھا تھا جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ اس مضمون میں صدر کانگریس کا لفظ پنڈت نہرو کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔)

انگلستان میں صنعتی انقلاب

۱۸۰۰ء سے دنیا کے ہر ملک میں تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ ملکوں میں تبدیلی نہایت تیزی کے ساتھ ہوئی ہے کچھ میں آہستہ آہستہ۔ لیکن کسی نہ کسی طریقہ پر ہر ملک میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی آدھی آبادی آج ایک نئے تمدن کو اختیار کر چکی ہے۔

نئے تمدن کو ترقی دینے میں چار ملکوں یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی اور امریکہ کا حصہ بہت اہم ہے اور ان چار ملکوں میں بھی برطانیہ کو رہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے اس بات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان جو کہ عہد وسطیٰ میں مینروں[۱] کا ملک تھا موجودہ عہد میں کس طرح ایک طاقتور صنعتی سلطنت بن گیا۔

آج برطانیہ انجنوں اور مشینوں، ریلوں اور موٹر کاروں، ٹیلیفونوں، ٹیلیگرافوں اور ریڈیو کا ملک ہے۔ آج برطانیہ کے قبضہ میں دنیا کے سب سے بڑے تجارتی اور جنگی جہاز ہیں۔ یہ دنیا کی تجارت کا مرکز ہے اور کرۂ زمین کی طاقتور سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

آج برطانیہ کے ہر پانچ آدمیوں میں چار آدمی شہروں میں رہتے ہیں اور یا تو فیکٹریوں، گوداموں، دفتروں، مدرسوں یا اسپتالوں میں کام کرتے ہیں یا ریلوں، موٹر لاریوں، کشتیوں یا سرنگوں وغیرہ میں۔ ہر دس آدمیوں میں سے صرف ایک شخص کھیتی کا کام کرتا ہے۔

آج برطانیہ کے آدمی اطمینان اور بے فکری کے ساتھ اپنے ملک میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے کاروبار یا تفریح کے سلسلہ میں کرۂ زمین کے دوسرے براعظموں کا سفر بھی کیا ہے اور جانتے ہیں کہ دوسرے تمدنوں کے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

---

[۱] مینر کا مفصل تذکرہ رسالہ جامعہ کی گذشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ مینر کا مفہوم مختصر الفاظ میں زمیندار کی ریاست ہے۔

موجودہ انگلستان اور عہد وسطےٰ کے انگلستان میں بڑا فرق ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً ہر شخص دیہات میں رہتا تھا اور یا تو بڑا زمیندار ہوتا تھا یا خود کاشت کرنے والا چھوٹا زمیندار یا پھر زمیندار کی رعیت ہوتا تھا۔ ان زمانے میں قریب کے چھوٹے شہر کا سفر کرنا بھی ایک بڑا اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر کسان کو اپنے لئے اور اپنے زمیندار کے لیے خود ہی غذا پیدا کرنا ہوتی تھی خود ہی اپنی بھیڑ کی اون سے کپڑے تیار کرنا ہوتے تھے اور اپنے مکان کی تعمیر اور دیکھ بھال بھی خود ہی کرنا پڑتی تھی۔ شہر میں کچھ دستکار ہوتے تھے جو اجرت پر کام کرتے تھے لیکن ان کی تعداد بہت مختصر ہوتی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹے چھوٹے تھے، قصبے بھی چھوٹے تھے اور شہر صرف گنے چنے تھے۔

انگلستان میں اس حیرت انگیز تبدیلی کے پیدا ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ پھر یہ سب تبدیلیاں یکبارگی واقع نہیں ہوئیں بلکہ آہستہ آہستہ ہوئیں البتہ سنہ [illegible]ء کے بعد سے تبدیلیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔

"کالی وبا" اس تبدیلی کا ایک سبب پلیگ یا "کالی وبا" کو قرار دیا جاسکتا ہے ۱۳۴۶ء اور ۱۳۴۹ء میں یورپ میں پلیگ کی وبا پھیلی۔ شروع تو یہ ایشیا میں ہوئی تھی لیکن بعد میں مغرب کی طرف پھیلتے پھیلتے یورپ تک پہنچ گئی۔ پھر مشرقی یورپ سے جنگل کی آگ کی طرح اس نے پھیلنا شروع کیا پہلے اٹلی کو، پھر جرمنی اور فرانس کو اور آخر میں انگلستان کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مغربی دنیا میں ایسی وبا پہلے کبھی نہیں پھیلی تھی۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد آدمی دو دن سے زیادہ نہ جی سکتے تھے۔ کسی کو اس کا علاج معلوم نہیں تھا اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں لوگ مرتے رہے۔ اس زمانہ کے صحیح اعداد و شمار چونکہ موجود نہیں ہیں اس لئے یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کتنے آدمی فی الواقعی مرے لیکن جو تحریری شہادتیں موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے ایک ضلع کی نوے فی صدی اور دوسرے ضلع کی پچانوے فی صدی آبادی اس وبا کے نذر ہوگئی۔ ایک سال کے اندر اندر انگلستان کی آدھی آبادی فنا ہوگئی۔ مینروں میں جو مزدور کام کرتے تھے ان کے پورے

خاندان نیست ونابود ہو گئے۔ زمینداروں کو اپنی زمینوں کو جتوانے کیلئے مزدوروں کو تلاش کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی اور بہت سے زمیندار ایسے تھے جن کی جائدادوں پر کوئی پٹہ دار کسان باقی نہیں رہا۔

"شاملات دہ" پر زمینداروں کا قبضہ | اس تبدیلی کا دوسرا سبب "شاملات دہ" سے متعلق ہے۔ عہد وسطے کے ابتدائی زمانہ میں چراگاہوں ویران زمینوں اور جنگلوں میں زمیندار اور ان کی رعایا دونوں اپنے مویشی چرایا کرتے تھے چونکہ ہر شخص کو ان زمینوں کے استعمال کا حق ملا ہوا تھا اس لئے انھیں شاملات دہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان مشترکہ زمینوں کے سہارے پر ہی دودھ گھی کے واسطے رعیت کے لوگ اپنی ذاتی گائیں پال سکتے تھے اپنا کھانا پکانے اور گوشت کو جھلسانے کے لیے لکڑی اور پھوس بھی ویران زمینوں اور جنگلوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

لیکن اس وبا کے بعد ملک کی زراعت اور اس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب زمین کو جوتنے کے لئے کسانوں کی تعداد کم ہو گئی تو زمینداروں نے بھیڑیں پالنا شروع کر دیں اور اپنی زمین کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو چراگاہ کے طور پر اور کم سے کم حصہ کو فصلوں کے پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ بھیڑوں کے پالنے کے کام کو جس کے لئے برطانیہ ہمیشہ سے مشہور تھا۔ ترقی دی گئی۔ گوشت اور اون کو بیچنے سے زمینداروں کو زیادہ آمدنی حاصل ہونے لگی۔ بھیڑ پالنے کے لئے زیادہ مزدوروں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ایک ہی آدمی بہت بڑے گلے کی نگرانی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے ایک مصنف نے اس تبدیلی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے "جہاں پہلے بہت سے گھر اور ان کے رہنے والے تھے وہاں اب صرف ایک گڈریا اور اس کا کتا باقی رہ گیا ہے"۔

بہرحال بھیڑوں کو زیادہ تعداد میں پالنے کے لئے زمینداروں کو زیادہ زمین کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے مینر کی "شاملات دہ" کے گرد باڑھ لگانا شروع کر دی۔ اور اس میں کسانوں کے مویشی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا اور ان کو لکڑی اور پھوس کاٹنے سے بھی منع کر دیا۔ باڑھ کو اس طرح کھڑا

کرنے اور کسانوں کو مداخلت سے روکنے کا اصطلاحی نام "زمین کی حد بندی" رکھا گیا ہے یہ کام ۱۲۰۰ء سے شروع ہوا اور چھ سو سال تک آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

اس حد بندی کی محرک صرف بھیڑوں کو پالنے کی خواہش ہی نہیں تھی بلکہ اور دوسرے اسباب بھی کام کر رہے تھے۔ شہروں اور قصبوں کی آبادی بڑھ رہی تھی۔ صرف زیادہ اون کی ہی ضرورت نہیں تھی بلکہ زیادہ غذا کی بھی ضرورت تھی۔ زمین میں جس قدر پیدا کرنے کی اہلیت تھی کسان اس کے صرف ایک حصہ کو پیدا کرتے تھے اس لئے ترقی پسند زمینداروں نے خیال کیا کہ اگر وہ شاملات دہ پر قبضہ کریں گے تو زیادہ نفع بخش طریقہ پر کھیتی کے کام کو چلا سکیں گے۔ وہ کم آدمیوں کو ملازم رکھنا چاہتے تھے لیکن آدمی ایسے چاہتے تھے جو زیادہ کام کریں اور جنھیں نئے طریقوں کو آزمانے کا شوق ہو۔ انھیں اپنے منصوبے میں بڑی کامیابی ہوئی کیونکہ آہستہ آہستہ ان کے کھیتی کے کام کو ترقی ہونے لگی اور پہلے زمانوں کے مقابلہ میں زمینداروں کی ریاستوں میں بہت زیادہ غذا پیدا کی جانے لگی۔

کسانوں پر زمین کی حد بندی کا اثر | لیکن جب شاملات دہ کو کسان اپنی جوت میں لانے سے محروم ہو گئے تو ان کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور پہلے سے بہت زیادہ غریب ہو گئے۔ آخر میں ان بیچاروں کے پاس صرف کھیت کے ایسے چھوٹے ٹکڑے رہ گئے جہاں یہ کچھ ترکاریاں بو سکتے تھے اور مرغی اور سوروں کو پال سکتے تھے۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ زمیندار کے یہاں اجرت پہ مزدوری کر کے جیسے تیسے زندگی گذارنے لگے۔

جب زندگی میں تبدیلی کا سلسلہ بڑھتا رہا تو مزدور مجبور ہوئے کہ غذا کپڑا اور اوزار حاصل کرنے کے لئے دستکاری کو شروع کریں۔ اس طرح وہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور بنتے گئے اور اپنے روزگار کے لئے دوسروں پر انحصار کرنے لگے۔ انھیں ہفتہ وار اجرت ملنے لگی جس کے ذریعہ وہ دکانداروں سے روئی، آٹا، گھی اور کپڑے وغیرہ خریدنے لگے۔

غرضکہ تبدیلی کا یہ سلسلہ جب ۱۵۰۰ء اور ۱۷۰۰ء تک چلتا رہا تو ہمیشہ کی زندگی بدلنا شروع

ہو گئی ۔ لوگوں کی زیادہ تعداد نے اجرت پر کام کرنا شروع کر دیا ۔ یہ کام زمینداروں کے فارموں پر بھی کیا جاتا تھا اور دستکاری کے کارخانوں میں بھی جن کی اہمیت بڑھنا شروع ہو گئی تھی ۔ گاؤں کی وہ بوڑھی عورتیں جو اپنے پڑوسیوں کے مقابلہ میں کبھی زیادہ خوش حال رہ چکی تھیں اپنے بچوں کو ان "اچھے دنوں" کے قصے سنایا کرتی تھیں جب زمینداروں نے زمین کی حدبندی نہیں کی تھی اگرچہ اس بات کو وہ بھلا دیتی تھیں کہ اس زمانہ میں بھی ان کے کچھ پڑوسی افلاس کی زندگی بسر کیا کرتے تھے ۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ زمانہ کیسا اچھا تھا جب صرف ایک موٹے سور یا گائے ، کچھ بھیڑوں یا بیج ، ریشم کے ذرا سے ٹکڑے یا گھر کے کتے ہوئے کپڑے کے مالک ہونے کی وجہ سے ایک آدمی اپنے آپ کو بادشاہوں کے برابر سمجھ سکتا تھا ۔ اس وقت کسی شخص کو کسی غیر دلچسپ کام پر لگے رہ کر مسلسل محنت نہیں کرنا پڑتی تھی ۔ اس زمانہ میں وقت تیزی سے گذر جاتا تھا ۔ ہر روز نئی اور مختلف مصروفیت ہوتی تھی ۔ کسی دن نرم مٹی کو بویا جاتا تھا کسی دن نئے پیدا ہوئے بچھڑوں اور گھوڑے کے چھوٹے چھوٹے بچھیروں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی کسی دن کھیت کی نرائی کی جاتی تھی ۔ کبھی لمبی لمبی گھاس کے کاٹنے کا وقت ہوتا تھا ، کبھی غلہ کو کاٹنے اور سکھانے اور انگوروں اور سیبوں کے جمع کرنے کا ۔ سردی کے موسم میں تھوڑی سی کتائی اور بنائی بھی کی جاتی تھی بلکہ دھات اور لکڑی پر بھی کام کیا جاتا تھا ۔ مکان کو آراستہ کرنے ، باڑھوں کو ٹھیک رکھنے اور چھاڑیوں کو کتر کر سلیقہ کے ساتھ ہموار کرنے کے لئے بھی اس زمانہ میں وقت زیادہ ملتا تھا ۔

غرضکہ یہ باتیں تھیں جو بوڑھے آدمی ان نوجوانوں سے کہا کرتے تھے جو گاؤں کی زندگی کے بدل جانے کے بعد اپنے جھونپڑوں کو چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں شہر کی طرف جانے لگے تھے ۔ "کالی وبا" نے پرانے رواجوں کو ختم کر دیا تھا ۔ رعیت کی تعداد جتنی کم ہو گئی تھی اتنی ہی وہ اپنے آقاؤں کی پابندی سے آزاد ہو گئی تھی ۔ بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ ہر جاندار شخص گاؤں کو چھوڑ دیتا تھا اور گاؤں بالکل ویران ہو جاتا تھا ۔

شہروں کی ترقی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں شہروں کو ترقی ہونے لگی ۔ جن گاؤں میں کسی خاص دستکاری کو ترقی ہو گئی وہ پھیل کر بڑے صنعتی شہر بن گئے ۔ لندن اس کی ایک اچھی مثال ہے ۔ سنہ ۱۵ء

میں انگلستان کی آبادی ۵۰ ہزار تھی لیکن سنہ ۱۷۰۰ء میں اس کی آبادی ۵ لاکھ ہوگئی۔ مانچسٹر لورپول، برمنگھم، لیڈس اور دوسرے شہروں کو بھی اس زمانے میں ترقی ہوئی

انگلستان کی آبادی کی ترقی	
سنہ ۱۵۰۹ء میں	۵۰ ہزار
سنہ ۱۵۲۳ء میں	۶۲ ہزار
سنہ ۱۵۹۳ء میں	ایک لاکھ ۵۲ ہزار
سنہ ۱۶۰۵ء میں	دو لاکھ ۲۴ ہزار
سنہ ۱۶۶۱ء میں	چار لاکھ ۶۰ ہزار
سنہ ۱۶۹۶ء میں	پانچ لاکھ

سنہ ۱۶۰۰ء سے پہلے پہلے انگلستان کی آبادی کے ایک بڑے حصہ نے شہروں میں رہنا شروع کر دیا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ خوش حال تاجر اور دستکار بن گئے تھے۔ باقی لوگ کم اجرتوں پر دوسروں کے یہاں مزدوری پر کام کرتے تھے یا سڑکوں پر کام کی تلاش میں بھوکے پیاسے پریشان حال مارے مارے پھرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یا دبانی جہاز ون جا کر معاہدہ کر لیتے تھے اور دنیا کے دور دراز علاقوں کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔

سنہ ۱۲۰۰ء میں جس انگلستان کو یورپ کا "کوردہ" سمجھا جاتا تھا اب وہ تجارت اور کامیاب دستکاریوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں جن لوگوں کا شمار دیہاتیوں میں کیا جاتا تھا سنہ ۱۷۰۰ء میں انھوں نے شہروں میں رہنا شروع کر دیا تھا اور زمیندار کی زمین کے ساتھ بندھے رہنے کی جگہ اجرت پر کام کرنے والے دستکار بن گئے تھے دنیا کے بارے میں ان کی واقفیت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں پارچہ بافی اور دوسری دستکاریوں کی انگلستان میں حالت

سنہ ۱۷۰۰ء میں انگلستان کے کسان اچھے دستکار بن گئے تھے۔ پارچہ بافی برطانیہ کی خاص گھریلو صنعت بن گئی تھی۔ کارخانے بہت کم تھے۔ کتائی اور بنائی کا زیادہ تر کام دیہات کے جھونپڑوں کے اندر ہی کیا جاتا تھا۔ جن سیاحوں نے اس زمانے میں انگلستان کا سفر کیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ انگلستان کے اکثر جھونپڑے شہد کی مکھیوں کی طرح مصروف نظر آتے تھے برطانیہ نے سنہ ۱۷۰۰ء سے ہی دنیا کے ساتھ کپڑے کی تجارت شروع کر دی تھی اور جو لوگ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کو اکٹھا کرتے تھے ان کے کاروبار کو خوب فروغ حاصل ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ صرف کپڑا ہی نہیں خریدتے تھے بلکہ کچا اون بھی خریدتے تھے جسے وہ

کاریگروں کو کپڑا بنانے کے لئے دے دیتے تھے۔ کاریگروں کے کسی گروہ کو اون کو کنگھی سے ہموار کرنے کا کام سپرد کیا جاتا تھا کسی کو کاتنے کا۔ پھر کتے ہوئے اون کو جمع کرکے وہ پارچہ بافوں کو بننے کے لئے دے دیتے تھے اور ان سب کاریگروں سے وہ اجرت پر کام کراتے تھے۔ اس طرح یہ تاجر آہستہ آہستہ "سرمایہ دار" بن گئے۔ ان کے پاس روپیہ جمع ہوگیا۔ یہ کچا مال خریدنے، کاتنے اور بننے کے لئے مزدوروں سے کام لینے اور بنے ہوئے مال کو بیچنے لگے۔

اون کے کاتنے اور بننے کے علاوہ اور دوسری بھی بہت سے دستکاریاں تھیں۔ ریشم اور سوت کا کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں سن کا کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔

پارچہ بافی کے علاوہ شہروں میں اور پیشے بھی ترقی کر رہے تھے۔ مثلاً مٹی کے برتن بنانے کی صنعت۔ اسی طرح فرنیچر کی صنعت بھی ترقی کر رہی تھی۔ شیفیلڈ کی چھریاں اور دوسرے لوہے اور دھات کے سامان بھی ان کارخانوں میں بنائے جاتے تھے جہاں دھار رکھنے والے پہیے پانی کی قوت سے چلتے تھے۔ بعض شہروں میں چھپائی، جلد سازی اور دستی کاغذ کا بنانا بھی کامیاب پیشوں کی حیثیت سے اختیار کیے جاتے تھے۔

لیکن ہر چیز ہاتھ کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ چیزیں کم تعداد میں بنائی جاتی تھیں اور تعداد کی کثرت کے مقابلہ میں مال کے اچھے بنانے پر زیادہ دھیان دیا جاتا تھا۔

<u>۱۷۰۰ء کے بعد سے صنعتی انقلاب</u> | پچھلی دو صدیوں میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں ان کے باوجود انگلستان کے لوگوں کا بیشتر کام ۱۷۰۰ء میں صرف کاشتکاری دستکاری، جہاز رانی اور تجارت تک محدود تھا۔ آج کل کی مشینیں اس زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھیں اور انجنوں کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تمام کام ہاتھ سے کئے جاتے تھے۔ قوت متحرکہ یا تو انسانی اعصاب کی ہوتی تھی یا پن چکیوں اور ہوا چکیوں کی۔ چیزوں کو منتقل کرنے کے لئے لادنے والے گھوڑے، گاڑیاں یا نہروں میں چلنے والی کشتیاں رکھی جاتی تھیں سفر بہت کم کیا جاتا تھا۔ ریلیں، موٹر کاریں، دخانی جہاز اور ہوائی جہاز اس زمانے میں نہیں تھے پیغامات صرف پیغامبروں کے ہاتھ پہنچائے جا سکتے تھے اور ان کی تیزی گھوڑوں کے پاؤں کی تیزی تک

محدود ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں اگرچہ مینر اور بیگاری رعیت کا نظام ختم ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس کی حالت موجودہ زمانہ سے بہت مختلف تھی۔ اس کے بعد تبدیلیوں کا سلسلہ اس قدر تیزی سے یکے بعد دیگرے شروع ہوا کہ انگلستان سے دستکاریاں غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ قوت متحرکہ سے چلنے والی مشینیں پیدا ہو گئیں اور انگلستان اپنی لوہے اور فولاد کی صنعتوں، عالمگیر تجارت، عالمگیر سلطنت کی وجہ سے دنیا کا ممتاز ترین ملک بن گیا۔ ۱۸۵۰ء کے ایک چھوٹے۔ کافی بالذات، ۶۰ لاکھ کسانوں اور دستکاروں کے ملک کی جگہ انگلستان ۴ کروڑ مشین چلانے والوں، مشین بنانے والوں، تاجروں اور محرروں کا ملک بن گیا جو چالیس کروڑ آدمیوں کی ایک عالمگیر سلطنت پر حکومت کرتے ہیں۔

ابتدائی پارچہ بافی کی مشینوں اور ابتدائی انجنوں کی ایجاد

صنعتی انقلاب پارچہ بافی کی مشینوں اور قابل استعمال انجنوں کی ایجاد کے ساتھ شروع ہوا۔ مختصر الفاظ میں ان ایجادوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرخہ اور ہاتھ کے کرگے کی جگہ کاتنے کی جینی یا فریم اور قوت متحرکہ سے چلنے والے کرگوں کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں جن خاص خاص منزلوں سے گذرنا پڑا انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے کتائی کے لئے ایجادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷۶۴ء میں ہارگریوز نے کاتنے کے لئے اپنی جینی کو ایجاد کیا۔ اس سے تیس، اسی اور آخر میں سینکڑوں دھاگے ایک ہی مشین پر کاتے جانے لگے حالانکہ پرانے چرخہ پر صرف ایک ہی دھاگے کو کاتا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد بنائی کے لئے ایجادیں ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۷۳۳ء میں جون کے نے خودکار گردش کرنے والی نال کو ایجاد کیا گیا جس کے ذریعہ بننے والا ہاتھ سے نال کو کرگے کے اس پار اور اُس پار گذارنے کے لئے مجبور نہیں رہا بلکہ وہ زیادہ تیزی اور صحت کے ساتھ خود بخود آر پار آنے جانے لگی۔ پھر مشینوں میں مسلسل اصلاحیں ہوئیں جن کی وجہ سے کپڑا بننے والا پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ کپڑا بننے لگا۔

تیسری چیز دخانی انجن کی اصلاح تھی۔ ۱۷۶۰ء تک مشینوں سے چیزوں کے بنانے کے کام میں کسی ایسی قوت متحرکہ کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے جو مشینوں کو چلا سکے رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ کاتنے اور

بننے کی مشینیں اس وقت تک ہاتھ اور پاؤں سے ہی چلائی جاتی تھیں۔ سنہ ۱۷۶۹ء میں آرک رائٹ نے کاتنے کی چینیوں کو چلانے کے لئے پانی کے بہاؤ کی قوت سے چلنے والے بھدّے پہیوں کو استعمال کرنا شروع کیا۔ سنہ ۱۷۸۵ء میں انھیں پہیوں سے اس نے کرگوں کو چلانا شروع کیا۔ پانی کے بہاؤ کی یہ قوت ہاتھ اور پاؤں کی قوت سے بہتر تھی۔ اس کے ذریعہ زیادہ سوت کاتا اور بنا جا سکتا تھا۔ اس طرح کچھ اصلاح تو ہو گئی۔

مگر اسی اثنا میں لوگ دخانی انجن کو مکمل کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن انجن کے ایجاد کرنے والوں کو ابتدا میں بڑی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دخانی انجن کی ایجاد کا قصہ تو بہت بہت پرانا ہے۔ سینکڑوں سال پہلے سے بھاپ کے پھیلنے سے جو زبردست قوت پیدا ہوتی ہے اس کا لوگوں کو علم تھا لیکن سنہ ۱۶۰۰ء سے پہلے کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کے ذریعہ قابل استعمال انجن کس طرح بنائے جا سکتے ہیں۔ سنہ ۱۶۷۹ء میں ڈینس پیپن نے بھاپ کو ایک نلکی میں بند کر کے اس کی پھیلنے والی قوت سے پسٹن کو دھکا دینے کا کام لیا۔ اس کے بعد دوسرے موجدوں نے خصوصاً سنہ ۱۷۰۵ء میں ٹامس نیوکومن نے اس پسٹن کے خیال کو اور ترقی دی اور سنہ ۱۷۵۰ء کے آس پاس بھدّے انجن انگلستان کے کوئلہ اور لوہے کی کانوں سے پانی کھینچ کر باہر پھینکنے کے لئے استعمال کئے جانے لگے۔

لیکن اس پورے زمانہ میں انجنوں کا کام بہت ناقص تھا اور ان سے پارچہ بافی کی مشینیں نہیں چلائی جاتی تھیں اس کے بعد سنہ ۱۷۸۲ء میں جیمس واٹ نے جو گلاسکو میں اوزار بنایا کرتا تھا نیوکومن کے انجن میں بہت سی اصلاحیں کامیابی کے ساتھ کیں اور اس کے بعد سے لوگوں کو ایک ایسا دخانی انجن مل گیا جو پہیوں کو گھما سکتا تھا اور مشینوں کو چلا سکتا تھا اور کاتنے والے اور بننے والے لوگوں کو مشینوں کے چلانے کے لئے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر زور ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب دخانی قوت سے سب کام ہونے لگے اور آدمیوں کا کام صرف مشینوں کی دیکھ بھال کرنا رہ گیا۔ سڑک کی گاڑیوں اور کشتیوں کے لئے بھی اس دخانی قوت کا استعمال کیا جانے لگا۔

اب جسم کی جگہ دماغ کے استعمال کرنے کی زیادہ ضرورت ہونے لگی انجن تو کھینچنے کا کام کرنے لگے اور انسان نے منصوبہ بنانے، رہنمائی اور فیصلہ کرنے کے اہم کاموں کو کرنا شروع کر دیا۔

غرضکہ انہی سالوں میں جب یورپ کے ایجاد پسند لوگ کاتنے اور بننے کی مشینیں ایجاد کر رہے تھے ان مشینوں کے چلانے کے لئے انجنوں کی ایجاد بھی ساتھ ہی ساتھ ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ صنعتی انقلاب سنہ ۱۷۰۰ء سے شروع ہوا۔ ابتدا میں نئی مشینوں اور انجنوں میں اصلاح آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ کپڑا بنوانے والے سرمایہ داروں نے ان مشینوں کے فائدہ کو جن کے کھڑے کرنے میں ابتدا میں بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا مشکل سے سمجھا۔ سنہ ۱۸۰۰ء تک بہت کم فیکٹریاں ایسی بنائی گئیں جن میں دخانی قوت سے کاتنے اور بننے کی مشینوں کو چلایا جاتا تھا
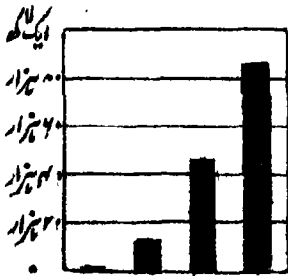
لیکن اس کے بعد سے جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے فیکٹری کے مالکوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے انجنوں اور کرگوں کو لگانا شروع کر دیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہاتھ کے کرگوں کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا اور کوئلہ کی بادشاہت مسلّم طریقہ پر قائم ہو گئی۔

ایک لاکھ
۸۰ ہزار
۶۰ ہزار
۴۰ ہزار
۲۰ ہزار
۰
۱۸۱۳ ۱۸۲۰ ۱۸۲۹ ۱۸۳۳

۱۸۱۳ تا ۱۸۳۳ء میں دخانی کرگوں کی تعداد میں اضافہ

برطانیہ کے کوئلہ کے ذخائر نئے دخانی انجنوں کے لئے کوئلہ کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ برطانیہ میں کوئلہ کی بہترین کانیں موجود تھیں۔ عہد وسطےٰ میں بھی لوگ کوئلہ سے خوب واقف تھے اور امیر آدمی کبھی کبھی اپنے چولھوں میں اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔ کوئلہ کی تجارت کو آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی اور سنہ ۱۷۲۵ء میں لندن میں ۱۰ لاکھ ٹن کوئلہ صرف کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کے ایک سیاح نے دریائے ٹیمس میں پانچ سو کشتیوں کے بیڑہ کو کوئلہ لاتے ہوئے دیکھا تھا۔

پرانے زمانے میں مکانوں کو گرم کرنے اور لوہے کو پگھلانے کے لئے لکڑی اور بجھائے ہوئے کوئلہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے انگلستان کے جنگلوں کو بہت نقصان پہنچتا تھا۔ سنہ ۱۵۵۸ء میں بھی پارلیمنٹ نے اس خطرہ کا احساس کیا تھا۔ ایک ٹن لوہے کو پگھلانے کے لئے دو ٹن بجھے ہوئے کوئلہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے پارلیمنٹ نے جہازوں کے بنانے کے لئے لکڑی کا تحفظ کرنے

کے لئے لکڑی کاٹنے پر پابندیاں لگادی تھیں اس سے لوہا بنانے والے لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی کیونکہ لکڑی کے بغیر وہ اپنا کام نہ چلا سکتے تھے ان کی اس پریشانی کو رابرٹ ڈڈلے نے جو ایک لوہا بنانے والے کا لڑکا تھا پتھر کے کوئلہ کا زیادہ استعمال کرکے رفع کر دیا۔ اس کے باپ کے لوہے کا کارخانہ کوئلہ کے کھیت کے اوپر بنا ہوا تھا۔ نوجوان ڈڈلے نے لوہے کے پگھلانے کا ایک طریقہ ایجاد کیا جس میں بجھے ہوئے کوئلہ کی جگہ پتھر کا کوئلہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

غرضکہ ۱۸۰۰ء تک نئی میکانکی صنعت کی بنیاد پورے طور پر مضبوط ہوگئی اور صنعتی انقلاب صحیح معنی میں شروع ہوگیا۔ برطانیہ میں مشینیں اور انجن عام طور پر استعمال کئے جانے لگے تھے اور پتھر کے کوئلہ کی بڑی بڑی کانیں کھودی جانے لگیں تھیں۔

صنعتی انقلاب کے اثرات۔ کام گھر پر ہاتھ سے کرنے کی جگہ فیکٹری میں مشین سے کیا جانے لگا

کاتنے اور بننے کی مشینیں بہت بڑی ہوتی تھیں۔ پھر یہ پیچیدہ اور قیمتی بھی ہوتی تھیں۔ انگلستان کے جنوب یا مغرب کے غریب جلاہے کے پاس جو اپنی معاش کو پہلے بھی مشکل سے ہی حاصل کیا کرتا تھا اتنا روپیہ نہیں تھا کہ وہ قوت متحرکہ سے چلنے والے کرگوں کو خرید سکے اور پرانے سادہ ہاتھ کے کرگوں کی جگہ انھیں اپنے گھر میں لگا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا جنھوں نے تجارت سے یا شاید زمین کی ملکیت یا بھیڑوں کے گلے پال کر روپیہ اکھٹا کیا تھا ان لوگوں نے مشینوں کو خریدنا شروع کیا اور ان کو چلانے کے لئے مزدوروں کو اجرت پر رکھنے لگے چونکہ ان کے پاس روپیہ تھا اس لئے ایک مشین اور چند آدمیوں کو اجرت پر رکھنے کی جگہ وہ بہت سی مشینوں کے مالک بن گئے اور بہت سے مزدوروں سے اجرت پر کام لینے لگے۔ مشینیں بڑی بڑی عمارتوں میں لگائی گئیں اور اس طرح فیکٹریاں پیدا ہوگئیں فیکٹریاں نئی چیز نہیں تھیں صنعتی انقلاب سے پہلے بھی دولت مند آدمی کاتنے بننے اور لوہا پگھلانے کے لئے مزدوروں کو ملازم رکھتے تھے اور دو دو سو کرگے ان کے یہاں لانبے چوڑے کمروں میں کام کرتے رہتے تھے۔ ایک فیکٹری کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ڈیڑھ سو بچے اون کو چنتے تھے سو عورتیں اس کو دھنکتی تھیں دو سو لڑکیاں کاتتی تھیں، پچاس اون کترنے والے تھے اتنی ROVERS

تھے چالیس رنگنے والے اور بیس آدمی کپڑے کو صاف اور موٹا بنانے والی کلوں پر کام کرتے تھے۔

لیکن پرانی دستی مشینوں پر مزدور کتائی اور بنائی کا اتنا کام نہیں کر سکتے تھے جتنا کہ نئی مشینوں پر کام کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے دستکار اپنا مال اتنا سستا نہ بیچ سکتے تھے جتنا نئی فیکٹریوں کے مالک بیچ سکتے تھے۔ نہ مشین کے بنے ہوئے مال کی طرح ان کے مال میں صفائی اور یکسانیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے آہستہ آہستہ ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کو خریدنا ترک کر دیا اور ان کی جگہ فیکٹری کی بنی ہوئی سستی چیزوں کو خریدنے لگے۔

اس کے بعد جو دستکار اپنے گھروں پر کام کرتے تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گئے۔ اس لیے قدرتی طور پر انھیں مشینوں فیکٹریوں اور ان کے مالکوں سے سخت نفرت ہو گئی۔ بہت سی جگہوں پر اپنی غریبی، تنگ حالی اور نفرت کی وجہ سے انھوں نے نئی مشینوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔

۲۔ جو لوگ پہلے اپنے طور پر گھر پر کام کرتے تھے اب فیکٹری میں اجرت پر کام کرنے لگے

فیکٹری کے مالک جن کے پاس مشینیں، فیکٹریاں اور سرمایہ تھا وہ ہاتھ سے کام کرنے والے لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور تھے۔ اس لیے گھر پر کام کرنے والے لوگوں کو آخر میں اپنی جنگ کو ترک کرنا پڑا۔ اپنے طور پر کام کرنے کی جگہ انھیں دوسرے کے یہاں اجرت پر کام کرنے کے لیے جانا پڑا اور روزانہ کی مزدوری حاصل کرنے کے لیے فیکٹریوں میں بہت دیر تک کام کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ آزادی کا یہ نقصان ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انھیں ایک فورمین کی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا جب وہ کہتا تھا اس وقت کام شروع کرتے تھے اور جب وہ حکم دیتا تھا اس وقت انھیں کام چھوڑنا پڑتا تھا۔ گھر پر انھیں اس بات کی آزادی تھی کہ جب چاہیں کام شروع کریں اور جب چاہیں اسے چھوڑ دیں۔ کام تو پہلے بھی وہ دیر تک کیا کرتے تھے لیکن اس وقت اپنے لیے کرتے تھے اب دوسرے کے لیے کرنا پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ فیکٹری کے مالک کوئی چھٹی نہیں دیتے تھے۔ انھیں ایسٹر کے سوموار اور یوم مئی میں بھی کام کرنا پڑتا تھا جو برطانیہ میں چھٹی کے دن سمجھے جاتے تھے۔ جب وہ اپنے گھر پر مال

بناتے تھے اس وقت بھی ان کی زندگی خاصی سخت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی ذاتی دلچسپی کے ساتھ کام کیا کرتے تھے لیکن اب ان کی دلچسپی کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ انھیں ایک خاص رفتار سے ایک مقررہ کام کو انجام دینا پڑتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تھے تو برطرف کر دیے جاتے تھے۔

ضرورت کی چیزیں مہنگی تھیں اور دیہات کے مزدوروں کے خاندان کا گذر چلانے کے لیے عورتوں اور بچوں کو بھی مجبوراً فیکٹری میں کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کے اوقات بہت طویل تھے۔ چھ بجے صبح کام شروع کر دیا جاتا تھا اور شام کو سات آٹھ بجے تک جاری رہتا تھا۔ تقریباً بارہ سے پندرہ گھنٹہ تک روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ لوگ نیند سے متوالے ہو کر اکثر مشینوں پر گر جاتے تھے۔ بچوں کو بھی پانچ یا چھ برس کی عمر سے بڑے آدمیوں کے برابر دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ کانوں میں بھی کام کرتے تھے اور ملوں اور فیکٹریوں میں بھی۔ ان کی بدنصیبی کے جن حالات کو بیان کیا جاتا ہے انھیں مشکل سے یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بعض کو چوکنا رکھنے اور کام سے لگائے رکھنے کے لیے ہنٹر کا استعمال کیا جاتا تھا وہ ہمیشہ سخت تھکے ہوئے نظر آتے تھے اور بھوکے رہتے تھے۔ بہت سے کام کی زیادتی اور غیر تندرست زندگی کی وجہ سے بیمار رہتے تھے اور بہت سے مر جاتے تھے ابتدا میں ایسے قوانین نہیں تھے جن سے بچوں کا ملازم رکھنا ممنوع قرار دیا جاتا اور ان کے والدین کو روپیہ کی اتنی زیادہ ضرورت رہتی تھی کہ وہ خود کام کرنے سے انھیں نہیں روک سکتے تھے۔

لیکن ۱۸۱۹ء سے روئی کے کارخانوں میں بچوں کے کام پر قانونی پابندیاں لگا دی گئی تھیں سولہ سال سے کم عمر کے بچوں سے ایک دن میں بارہ گھنٹہ سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور ڈیڑھ گھنٹہ دوپہر کو کھانا کھانے کے لیے انھیں ملتا تھا صنعتی انقلاب کے ابتدائی سالوں میں بہت سے مزدوروں کا یہ خیال تھا کہ مشینوں کے استعمال سے صرف پریشانی اور مصیبت پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیہات کی غریبی سے نکل کر وہ شہر کی غریبی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ دیہات میں تو انھیں تازہ ہوا دھوپ میسر تھی لیکن شہر میں انھیں نہایت غیر صحت بخش گنجان آباد علاقوں میں کام کرنا پڑتا تھا جہاں ہوا اور روشنی کا بہت کم گذر ہوتا تھا۔

۳۔ برطانیہ کی آبادی پر صنعتی انقلاب کا اثر | صنعتی انقلاب سے ایک اور خلاف توقع اثر بھی پیدا ہوا۔ مزدوروں کی غریبی کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ انھیں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا۔ وہ تنگ اور گندے مکانوں میں جمع ہو کر رہتے تھے۔ ایسے حالات میں آبادی کے بڑھنے کی توقع قائم نہیں کی جا سکتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں انگلستان کی آبادی میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ۱۸۰۱ء میں برطانیہ کی آبادی ایک کروڑ ۵ لاکھ تھی لیکن ۱۹۲۱ء میں آبادی بڑھ کر چار کروڑ تیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ۱۷۰۰ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان برطانیہ کی آبادی میں ترقی ہوئی۔
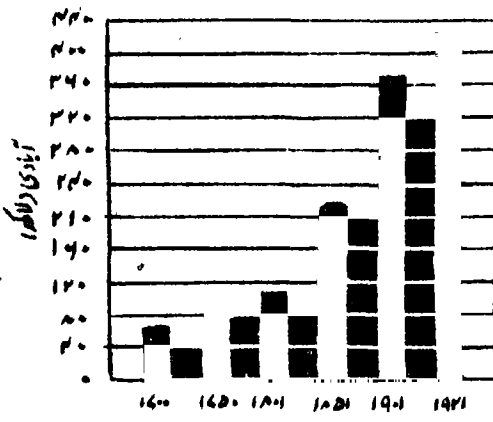
۱۷۰۰ء تا ۱۹۲۱ء میں برطانیہ کی آبادی کی ترقی

اس کے کئی اسباب تھے۔ لیکن دو اسباب کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے (۱) سائنس کے معلومات میں ترقی اور (۲) لوگوں کے معیار زندگی میں ترقی۔

صنعتی انقلاب کے ابتدائی سالوں میں مزدوروں کی حالت ضرور خراب تھی لیکن بعد میں حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ یورپ اور امریکہ کے سائنس داں امراض اور ان کے اسباب اور علاج کے بارے میں اپنی واقفیت برابر بڑھاتے رہے، انھوں نے معلوم کیا کہ بعض امراض مثلاً ٹائیفائیڈ کا تدارک سڑکوں اور مکانوں کی صفائی کو بہتر کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ چیچک کے تدارک کے لئے انھوں نے ٹیکہ لگانے کو مفید پایا۔ اس خطرناک بیماری کی وجہ سے سینکڑوں آدمی بہت سالوں سے مرتے چلے آرہے تھے لیکن اس کے بعد سے چیچک کی اموات کا سدباب ہو گیا۔ شہروں میں امراض سے مرنے والوں کا تناسب عام طور پر کم ہوتا گیا۔

فیکٹری کی حالت بھی بہتر ہوتی چلی گئی۔ قانون کے ذریعہ کام کے گھنٹے کم کر دیے گئے اور بچوں

کو کام کرنے کی اجازت بھی کم دی جانے لگی۔ جوں جوں تجارت میں ترقی ہوتی رہی اور زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہوئی۔ اجرتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا ۔ دیہات کے علاقوں سے بہت سے آدمی شہر آگئے اور یہاں کی آبادی کو بڑھانے لگے۔

دیہاتی علاقہ کے لوگوں کی حالت بھی بہتر ہونے لگی۔ جب بیٹے اور بیٹیاں شہروں کو چلی گئیں تو کھانے والوں کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ جب دیہات کی آبادی کم ہوئی تو جو باقی رہ گئے تھے ان کے لئے کام بھی زیادہ نکل آیا۔

۴۔ کچے مال، اور بنے ہوئے مال کی بڑے پیمانہ پر تیاری

جب مشینوں نے ہاتھ کی محنت کی جگہ لے لی اور آدمیوں کی ایک بڑی تعداد ہر روز دیر دیر تک کام کرنے لگی تو کانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں جو مال تیار کیا جاتا تھا اس کی مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی ۱۸۱۳ء میں برطانیہ میں دو ہزار چار سو کرگے تھے لیکن ۱۸۳۳ء میں کرگوں کی تعداد ۸۵ ہزار ہو گئی۔ کاتنے کی مشینوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا۔ انگلستان کی پارچہ بافی کی بڑی صنعتوں یعنی سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے کی صنعتوں میں بھی تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔

۱۸۰۱ء کے بعد روئی کی درآمد میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہوا کہ ۱۸۴۵ء میں ۱۸۰۱ء کے مقابلہ میں ۵۴ گنا زیادہ روئی منگائی جانے لگی۔ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان کچے ریشم کی درآمد میں ، گنا اضافہ ہوا اور اسی زمانے میں اون کی درآمد میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔

برطانیہ میں روئی اور خام ریشم کی درآمد کی مقدار (پونڈ میں)		
ریشم	روئی	سال
۹,۶۱,۰۰۰	۵,۴۰,۰۰,۰۰۰	۱۸۰۱
۴۳,۰۰,۰۰۰	۷۲,۲۰,۳۰,۰۰۰	۱۸۴۵

کانوں سے کوئلہ نکالنے کا بھی یہی حال تھا ۱۷۰۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان جو کوئلہ نکالا جاتا تھا اس کی مقدار بہت کم تھی لیکن ۱۸۵۰ء میں مشینوں کا استعمال بہت پھیل گیا اور ان میں سے اکثر دخانی انجنوں سے چلائی جانے لگیں انجنوں کی تعداد کے اس اضافہ کی وجہ سے کوئلہ کی پیداوار میں بھی اضافہ شروع ہوا چنانچہ ۱۸۵۰ء میں ۴ کروڑ ٹنے

لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔

۱۷۰۰ء تا ۱۹۲۵ء میں برطانیہ میں کوئلہ کی پیدائش

۱۸۰۰ تا ۱۸۶۰ء میں برطانیہ میں خام لوہے کی پیدائش

تقریباً یہی حال لوہے کی پیداوار کا بھی تھا۔

۵۔ ۱۸۰۰ء کے بعد برطانیہ کی آبادی کا صنعتی علاقوں کے شہروں میں اجتماع

صنعتی انقلاب کے بعد لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی لیکن آبادی میں ایک اور تبدیلی بھی واقع ہوئی۔ یعنی یہ ایسے علاقوں میں مجتمع ہونے لگی جہاں کام کثرت سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قصبے چھوٹے شہر بننے لگے اور چھوٹے شہر بڑھ کر بڑے شہر بن گئے۔ مانچسٹر اس تبدیلی کی ایک اچھی مثال ہے ۱۷۰۰ء میں مانچسٹر ایک چھوٹا سا شہر تھا آج یہ دنیا کے نہایت ممتاز صنعتی علاقہ کا مرکز ہے۔ اس شہر کے ۵۰ میل کے گھیرے میں تقریباً ۹۰ لاکھ آدمی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نیو یارک کو چھوڑ کر آبادی کا اس قدر کثیر اجتماع دنیا کے کسی اور دوسرے حصہ میں نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں کسی جگہ فیکٹریوں کی اتنی کثرت، ریلوں کی اتنی بہتات، صنعت میں اس قدر ہما ہمی اور انجن کی قوت کی اس قدر زبردست مقدار نہیں پائی جاتی۔

مانچسٹر کی طرح اور دوسرے شہروں نے بھی مثلاً لورپول، برمنگھم، لیڈس وغیرہ نے اسی طرح

ترقی کی ہے

انگریزی شہروں کی آبادی ۱۸۰۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان			
	۱۸۰۱	۱۸۴۱	۱۹۲۱
مانچسٹر	۹۵ ہزار	۳ لاکھ ۱۱ ہزار	۹ لاکھ ۶۴ ہزار
لورپول	۸۲ ہزار	۲ لاکھ ۸۶ ہزار	۸ لاکھ ۳ ہزار
برمنگھم	۷۱ ہزار	۱ لاکھ ۸۳ ہزار	۹ لاکھ ۱۱ ہزار
لیڈس	۵۳ ہزار	۱ لاکھ ۵۳ ہزار	۴ لاکھ ۵۸ ہزار

اسی زمانہ میں ان لوگوں کی تعداد جو کھیتوں پر کام کرتے تھے برابر گھٹتی رہی۔ پچاس سال ہوئے برطانیہ میں جو لوگ زمین پر کام کرتے تھے ان کی تعداد ۲۰ لاکھ سے زائد تھی۔ اب ان کی تعداد صرف ۱۵ لاکھ رہ گئی ہے حالانکہ گذشتہ پچاس سال میں مجموعی آبادی دوگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریز قوم اپنی غذا کے لئے دوسری قوموں کی کس قدر محتاج ہوگئی ہے

۶۔ برطانیہ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جدید وسائل نقل و حمل کی تعمیر

۱۷۰۰ء میں سڑکیں بہت خراب تھیں، نہریں بہت کم تھیں اور چیزوں کو منتقل کرنے کے لئے کافی دریا موجود نہیں تھے۔ جہاں تک ریلوں کا تعلق ہے ان کا کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ انجن موجود نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان میں سڑکیں عہد وسطیٰ سے پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں رومیوں نے انگلستان کو فتح کر لیا تھا اور اپنے زمانہ قیام میں انھوں نے بڑی اچھی سڑکیں تعمیر کردی تھیں۔ لیکن یہ بات صنعتی انقلاب سے پانچ سو سال پہلے کی تھی۔ ۱۷۰۰ء میں ان سڑکوں کی حالت نہایت افسوس ناک تھی۔ لیکن پھر بھی کسانوں کو اپنی پیداوار کو انھی سڑکوں کے ذریعہ لے جانا پڑتا تھا اور شہر کا سفر بڑا لمبا اور تھکا دینے والا ہوا کرتا تھا۔ اسٹیفورڈشائر کے کمہار اپنا مال گھوڑوں پر لاد کر شہروں کو لاتے اور

وہاں سے ایندھن لے جایا کرتے تھے۔ مانچسٹر کے چھوٹے تاجر بھی ٹٹوؤں کی قطار بنا کر اپنا مال منتقل کیا کرتے تھے۔ خراب سڑکوں اور نقل و حمل کی دیرطلبی کی وجہ سے تجارت اور سفر بہت مشکل سمجھے جاتے تھے سیاحوں کے بیان سے سڑکوں کی خرابی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے

ایک سیّاح لکھتا ہے :۔

راستہ صرف چالیس میل تھا لیکن اس کے طے کرنے میں چودہ گھنٹے لگتے تھے اور ہر میل کے ختم ہونے پر گاڑی یا تو ضرور الٹ جاتی تھی یا دلدل میں پھنس جاتی تھی شاہی رتھ کو بھی راستہ کی ان ہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا اگر کسانوں کی ٹولیاں باری باری سے اپنی قوت بازو سے اس کو سہارا دے کر سیدھا نہ رکھتیں اور آخری دو میلوں میں کندھوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھاتیں۔ اس صبر آزما کام میں بھی پورے چھ گھنٹے لگے۔

ایک دوسرا سیاح بھی اسی قسم کا ایک عجیب واقعہ بیان کرتا ہے :۔

دیہات کے ایک ایسے گرجا گھر کو جاتے ہوئے جو لیوس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا میں نے ایک بوڑھی خاتون کو جو بے چاری نہایت شریف اور نیک نفس معلوم ہوتی تھیں دیکھا کہ چھ بیلوں کی گاڑی میں بیٹھ کر گرجا گھر جا رہی ہیں۔ یہ بات مذاق یا تفننِ طبع کے سلسلہ میں نہیں کی گئی تھی بلکہ مجبوراً ایسا کرنا پڑا تھا کیونکہ راستہ اتنا گہرا اور سخت تھا کہ گھوڑے کا جانا ناممکن تھا۔

سڑکوں اور نہروں کی ترقی | ۱۷۵۰ء کے بعد سڑکوں کی حالت کچھ بہتر ہوگئی اور گاڑیوں کا استعمال بھی بڑھ گیا۔ مال کی گاڑیاں مقررہ وقت پر اون اور کپڑا لندن کو لے جانے لگیں۔ لندن کے آس پاس کے خاصے بڑے علاقہ میں کسان اپنی گاڑیوں اور جوڑیوں کو شہر کے لئے غذا لے جانے کے لئے کرایہ پر دینے لگے۔ واپسی پر ان گاڑیوں میں بنا ہوا مال مثلاً کرانہ کا سامان کوئلہ شراب وغیرہ دیہات کی دوکانوں کے لئے لائی جاتی تھی۔

سترھویں صدی کے اخیر میں ناکہ بندی کرنے والی کمپنیوں نے انگلستان میں اچھی سڑکوں کا بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان نئی سڑکوں کی وجہ سے سفر سہولت اور تیزی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ خاص شہروں کے درمیان منزل بہ منزل سفر کرنے والی گاڑیاں باقاعدگی کے ساتھ چلنے لگی تھیں اور ان میں مسافر، ڈاک اور سامان خورد و نوش روانہ کیا جاتا تھا۔ بعض بعض گاڑیاں بڑی آرام دہ اور خوب صورت ہوا کرتی تھیں۔ اندر ان پر خوب اچھی طرح کپڑا منڈھا ہوتا تھا اور گدّے دار نشستوں کی وجہ سے بیٹھنے والوں کو سخت جھٹکے نہیں لگتے تھے۔

جب گاڑی گاؤں میں بھوپوں کی آواز کے ساتھ تیزی سے داخل ہوتی تھی تو لوگوں کی تصرفیت بدحواسی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ مسافر اپنا سامان جلدی جلدی اٹھا کر اپنی جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ قصبوں کے رہنے والے ان پیغاموں اور پارسلوں کو جو کوچبان انھیں دیتا تھا نہایت شوق اور ذوق کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوچ گاڑی خبر رسانی کا بھی کام انجام دیتی تھی۔ لوہار کی دکان پر اس کی آمد کا دیر تک چرچا رہتا تھا۔ جو خبر یہ لاتی تھی اس سے گاؤں والوں کو باہر کی دنیا کا پتہ چلتا تھا۔

امریکہ میں تو نہریں ۱۸۰۰ء تک نہیں بنائی جا سکی تھیں لیکن انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں یہ بات نہیں تھی۔ کوئلہ اور لوہے جیسی بھاری چیزوں کے منتقل کرنے میں نہروں کا حصہ بہت زبردست تھا۔ ۱۷۵۹ء میں ڈیوک آف برج واٹر نے جن کا شمار اولین نہر سازوں میں کیا جاتا ہے ایک نہر کو بنایا جس کے بارے میں ایک مصنف کا بیان ہے کہ "مانچسٹر کے قریب ایک نہایت شاندار تعمیر ہے اور دنیا کی مصنوعی چیزوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ چیز ہے ملک کے تمام حصوں سے لوگوں کے انبوہ اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور بڑے مرتبہ کے لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔"

اس نہر بنانے کا مقصد یہ تھا کہ کوئلہ کو کانوں سے شہر تک لے جایا جائے۔ مانچسٹر سے ۷ میل کے فاصلہ پر یہ نہر شروع ہوتی تھی اس جگہ ڈیوک آف برج واٹر نے ایک بند بنایا تھا۔ ڈیوک

نہایت ہوشیار شخص تھے انھوں نے یہ اسکیم بنائی تھی کہ پہاڑ کی کانوں سے کوئلہ بغیر دوبارہ لادے ہوئے مانچسٹر تک روانہ کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے پہاڑی کے بازوؤں میں نہر کاٹنا شروع کردیا۔ لانبی چپٹے پیندے کی کشتیاں سرنگوں میں سے گذر کر کوئلہ لاتی تھیں۔

جیسے جیسے وقت گذرتا رہا انگلستان کے صنعتی اضلاع میں اور نہریں بھی بنائی گئیں۔ ان میں سے ایک یعنی مانچسٹر کی جہازوں کی نہر بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

جب صنعت کو ترقی ہوئی خصوصاً سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۱۸۹۰ء کے درمیان تو مانچسٹر کے کاروباری لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کا شہر اس وقت تک ایک بڑا تجارتی مرکز نہیں بن سکتا جب تک سمندر سے براہ راست آمد و رفت کا سلسلہ شروع نہ ہو چنانچہ انھوں نے عزم مصمم کر لیا کہ ایک ایسی نہر بنائی جائے جس کے ذریعہ مانچسٹر کے مال سے لدے ہوئے جہاز سمندر تک جا سکیں سنہ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے نہر کو بنانا شروع کیا۔ اس کے بننے میں بارہ سال لگے اور آخر میں سنہ ۱۸۹۴ء کے سرد جنوری کے مہینہ میں ایک بہت بڑا اسٹیمر مانچسٹر کے بالکل وسط میں پہنچ گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تجارت بڑھنے لگی۔ مانچسٹر کا مال برطانیہ کے دوسرے حصوں اور دنیا کے دور دراز علاقوں میں پہلے کے مقابلہ میں بہت سستے داموں پر بھیجا جانے لگا۔ اس طرح سو سال سے کم مدت میں سڑکوں اور نہروں کا ایک زبردست نظام بن گیا۔ لیکن ان ترقی یافتہ سڑکوں اور بہت سی نہروں سے بھی برطانیہ کے لیے جس قدر تیز ذرائع نقل و حمل کی ضرورت تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔

تیز تر ذریعہ نقل و حمل یعنی ریلیں

یوں تو انگلستان میں سنہ ۱۸۰۰ء میں بھی ریل کی پٹریاں استعمال کی جاتی تھیں لیکن یہ زیادہ تر کوئلہ کے علاقوں میں تھیں یہ دخانی ریلیں نہیں تھیں بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹھیلے ہوتے تھے جنھیں لکڑی یا پتھر کی پٹریوں پر گھوڑے یا مرد اور عورتیں کھینچا کرتی تھیں کان سے شہر تک یا دریا اور نہر کی کشتیوں تک کوئلہ لانے کا یہی طریقہ تھا۔ اسی طرح کی ریلوں کا استعمال سو سال تک ہوتا رہا لیکن ان کو صرف آدمی یا گھوڑے کھینچتے تھے۔

اس کے بعد جارج اسٹیفنسن نے اپنا دخانی لوکو موٹو ایجاد کیا۔ ۱۸۲۵ء میں اسٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک گھوڑوں سے کھینچی جانے والی گاڑیوں کے لئے ایک ریل کی پٹری موجود تھی۔ یہ سڑک ۲۵ میل لمبی تھی۔ اسٹیفنسن ایک ایسا انجن بنانا چاہتا تھا جو گاڑیوں کی ایک قطار کو کھینچ سکے۔ آخر کار اسے اس کو کامیابی ہوئی اور اس نے گھوڑوں کی لائن کے ڈائرکٹر کو راضی کر لیا کہ اس طرح کی چھ ریل گاڑیاں بنائے یہ گاڑیاں ۱۲ سے ۱۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی تھیں۔ یہ صرف بوجھ کھینچ سکتی تھیں اور اس کی مقدار بھی بہت کم ہوتی تھی۔ مسافروں کی گاڑیوں اور مال کے ایک بڑے حصہ کے کھینچنے کے لئے اب بھی گھوڑوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

مگر ترقی تیزی سے ہوتی رہی۔ ۱۸۲۹ء کے اکتوبر میں اسٹیفنسن نے ایک نئے قسم کا انجن بنایا جس کا نام اس نے راکٹ رکھا جو ۲۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۱۲½ ٹن وزن کھینچ سکتا تھا۔ پھر صرف اسٹیفنسن ہی اکیلا ایسا شخص نہیں تھا جو وزن کھینچنے والے انجنوں کو بنا رہا تھا۔ اور لوگ بھی اسی قسم کے دخانی انجن بنا کر پہیے دار گاڑیوں کے ساتھ لگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ۱۸۲۹ء میں بہت سے مختلف قسم کے انجنوں کا امتحان لیا گیا اور بہترین انجن کے لئے انعام مقرر کیا گیا۔ امتحان کی شرط یہ تھی کہ دو میل کی ہموار ریل پر دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بیس پھیرے کئے جائیں۔ ہزاروں آدمیوں نے مانچسٹر اور لورپول میں شوق اور جوش کے ساتھ اس مقابلہ کو دیکھا۔ اسٹیفنسن نے اس موقع کے لئے اپنا راکٹ تیار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ تین اور حوصلہ مند انجنیر اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ ان کے انجنوں کا نام ناولٹی، سانسپیریل اور پرسیویرنس تھا۔ جب سگنل دیا گیا تو سب نے مقابلہ میں شرکت کی۔ راکٹ کا کام سب سے اچھا رہا ناولٹی کی رفتار بعض وقت ۲۴ فی گھنٹہ تک پہنچ گئی لیکن جن دھونکنیوں سے انجن کو ہوا پہنچائی جاتی تھی ان کی ہوا نکلنے لگی اور ناولٹی کو مرمت کے لئے مقابلہ سے الگ ہو جانا پڑا۔ سانسپیریل کو بھی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے بائلر کو مرمت کی ضرورت پیش آگئی۔ پرسیویرنس کی رفتار ۶ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔ غرضکہ اس طرح دوسرے انجن ناکام رہے اور راکٹ جیت گیا۔ لیکن یہ مقابلہ ختم نہیں ہوا یہ برابر ملتوی

ہو تار ہا تاکہ دوسرے انجنوں کو مرمت کر کے مقابلہ میں شریک کیا جا سکے۔ راکٹ ہر روز دو میل کے فاصلہ کو طے کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس نے لوگوں کی دلچسپی کے لئے یہ بھی کیا کہ تیس آدمیوں کو بٹھا کر ۳۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے سفر کیا۔ دوسری مرتبہ اس نے تیرہ ٹن وزن لاد کر ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کیا۔ آخر کار ججوں نے فیصلہ کیا کہ مقابلہ کو اور زیادہ عرصہ تک جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے اور مسٹر اسٹیفنسن کو ۵۰۰ پونڈ کا انعام دے دیا گیا۔

۱۸۲۹ء میں یعنی اس سال جب کہ راکٹ کا امتحان ہو رہا تھا لورپول اینڈ مانچسٹر ریلوے کا افتتاح ہوا۔ اس لائن پر مقررہ نقشہ کے مطابق ۶ پھیرے روزانہ ہوتے تھے۔ اس کے بعد لندن سے برمنگھم اور پھر ساؤتھ امپٹن تک ریلیں بنائی گئیں۔ ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹ نے ۲۹ نئی ریل کی سڑکوں اور ایک ہزار میل کی لانبی پٹریوں کے بنانے کی اجازت دی اور ۱۸۴۲ء میں خود ملکہ نے ریل میں جسے خطرناک سمجھا جاتا تھا سفر کیا۔

آج برطانیہ میں ۲۱ ہزار میل لانبی لائنیں پائی جاتی ہیں اور برطانیہ کی ریلوں کا شمار دنیا کی بہترین ریلوں میں کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ۲ لاکھ ۵۲ ہزار میل لانبی لائنیں پائی جاتی ہیں۔ امریکہ کا رقبہ برطانیہ کے مقابلہ میں اگرچہ ۲۵ گنا ہے لیکن ریل کی لائنیں صرف ۱۲ گنا ہیں۔

خلاصہ | انگلستان کس طرح زراعتی ملک سے صنعتی ملک بن گیا۔ یہ قصہ بہت لانبا ہے۔ یہ کام کئی سو سال میں ہوا۔ ایک ہزار سال تک تو انگلستان کی رعیت اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتی رہی اور وہاں اپنی زمین کے چھوٹے ٹکڑوں کو یورپ اور ایشیا سے بالکل الگ تھلگ رہ کر جوتتی بوتی رہی۔

لیکن ۱۱۰۰ء کے بعد سے آہستہ آہستہ ان کے طریقہ زندگی میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی ان کے کام کے اور تجارت کے طریقے بھی بدل گئے۔ آہستہ آہستہ رعیت زمینداروں سے آزاد ہو گئی اور اس نے زراعت کے پیشہ کی جگہ دستکاری کے پیشہ کو اختیار کر لیا۔ جب زراعت کو زوال ہوا تو دستکاری کو ترقی ہوئی۔ فیکٹریاں بہت کم تھیں زیادہ تر گاؤں کے لوگ اپنے گھر پر کام کیا کرتے

تھے۔ اون کو کاتا اور بنا جاتا تھا۔ گھر کے برتن، کھیتی کے اوزار اور ہتھیار گاؤں کے لوہار کی چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں تیار کئے جاتے تھے۔ انگریزی دستکار بہت عمدہ مٹی کے برتن بھی بناتے تھے۔ اور انگلستان کی شہرت کا باعث تھے۔

لیکن ۱۷۵۰ء تک تقریباً سب کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ انجن بہت کم تھے اور قوت محرکہ سے چلنے والی مشین تقریباً بالکل نہیں تھی۔

اس کے بعد پہلے قابل استعمال انجن اور پہلی کاتنے اور بننے والی مشینوں کی ایجاد ہوئی۔ ۲۵ سال کے اندر اندر ایجاد کرنے والوں نے معلوم کر لیا کہ پٹری کی گاڑیوں دخانی کشتیوں اور مشینوں کو کس طرح چلایا جائے اور ایک صدی کے اندر اندر انگریزوں کا طرز زندگی بالکل بدل گیا۔ دستکاروں نے ہاتھ کے اوزاروں اور گھریلو دھندوں کو چھوڑ دیا اور مشین کی دیکھ بھال اور فیکٹری میں اجرت پر کام کرنے لگے۔ یہ فیکٹریاں بڑے قصبوں اور شہروں میں واقع تھیں اس لئے گاؤں ویران اور شہر آباد ہونے لگے۔

ملک کی کل حالت ہی بدل گئی۔ جہاں کوئلہ کا ذخیرہ موجود تھا وہاں کانوں سے کوئلہ نکالنے والے شہر بن گئے۔ لوہے اور فولاد کی ملوں کو ترقی ہوئی اور بیسیوں پارچہ بافی کی فیکٹریاں بنا کر کھڑی کر دی گئیں۔

نئے زمانہ کے لئے زیادہ بہتر ذرائع نقل وحمل کی ضرورت تھی۔ سڑکوں کو بہتر بنایا گیا۔ نہروں کو کھودا گیا اور برطانیہ کی آبادی کو دخانی ریلوں سے جکڑ دیا گیا۔

صنعتی انقلاب جب چل نکلا تو آبادی تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی۔ ۱۷۵۰ء کے سو سال بعد برطانیہ کے باشندوں کی تعداد تو بڑھ گئی لیکن زراعت میں مصروف آبادی کا تناسب برابر گھٹتا رہا۔ آج برطانیہ کے پانچ آدمیوں میں سے چار شہروں میں رہتے ہیں۔

غرضکہ اس طرح میندروں کا انگلستان موجودہ صنعتی برطانیہ عظمیٰ بن گیا۔

مولانا سید محمد شرف الدین صاحب مرحوم

۶ مارچ ۱۹۳۶ء کو مولانا سید محمد شرف الدین صاحب استاد جامعہ نے ۷۱ سال کی عمر میں دو دن کی مختصر علالت کے بعد قرول باغ دہلی میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نہایت خوبیوں کے بزرگ تھے۔ شعر و شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ابھی حال میں مکتبہ جامعہ نے "تسخیر یاس" کے نام سے مولانا کے کلام کا انتخاب شایع کیا تھا۔ تحقیق زبان اور محاورہ میں مرحوم سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی تحقیق و واقفیت بھی بہت بلند پایہ کی تھی۔ معلم کی حیثیت سے نہایت کامیاب تھے۔ مرحوم کا حافظہ نہایت اچھا تھا اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات نہایت جزئی تفصیل کے ساتھ ان کو یاد تھے۔ لیکن یہ تمام خوبیاں ان کا امتیازی وصف نہیں تھیں۔

مولانائے مرحوم کی وہ خصوصیت جو صرف ان کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی وہ ان کے یقین کی پختگی اور اظہار خیال کی بے باکی تھی۔ مولانا اپنی ذات اور معلومات پر قابل رشک حد تک اعتماد رکھتے تھے۔ جس بات کو حق اور صحیح سمجھتے تھے اس کا مردانہ وار بہ بانگ دہل اعلان کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتے تھے چاہے وہ سننے والوں کے لئے کتنی ہی ناگواری اور ناپسندیدگی کا باعث کیوں نہ ہو۔

اس کے علاوہ ان کی وضع داری، خلوص اور خاطر و مدارات میں بھی ایک شانِ امتیاز اور بزرگی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی موجودگی کو ہر مجمع میں ضرور محسوس کرادیا کرتے

تھے۔ جامعہ کی برادری میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو مولانا کی ڈانٹ اور پھٹکار سے بچ سکا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاید ہی کوئی ایسا بھی ہو جو ان کے خلوص محبت اور مدارات سے بہرہ ور نہ ہوا ہو۔ ان کی وفات گویا ایک ادارہ کی موت ہے اور اسی حد تک جانکاہ اور ناقابل تلافی ہے۔ ان کے رخصت ہو جانے سے پرانی وضع داری رخصت ہوگئی اور جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر کرنا ممکن نہیں ہے۔

مولانائے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے جب وہ اٹاوہ کے اسکول میں تعلیم پاتے تھے استاد شفیق تھے اور جامعہ کی برادری کے اکثر افراد کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے اور جنھیں یہ شرف حاصل نہیں تھا وہ بھی ان کی موجودگی میں اپنے آپ کو ان کا شاگرد ہی سمجھنے پر مجبور رہتے تھے۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور جیسے سچے کھرے۔ پابند نماز باجماعت مسلمان وہ تھے ویسی ہی اعلیٰ علیین میں انھیں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

ذیل میں ہم مولوی عقیل الرحمٰن صاحب ندوی کے وہ قطعات تاریخ وفات درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے اس المناک واقعہ سے متاثر ہو کر تصنیف فرمائے ہیں۔ مدیر)

سید ذی وقار شرف الدین   اشرف خاندان بلند مقام

۱۲۷۶

(علم تاریخی نام)

مبدأ فیض سے ملے تھے انھیں — علم و دانش کے بے بہا انعام
عالم باعمل تھی ان کی ذات — تابع اسوۂ رسول تھے کام
ایک مدت اٹاوہ کا اسکول — رہا ان کے فیوض سے خوش کام
جامعہ کے نصیب پھر جاگے — ہوئے سیراب فیض خاص و عام
فیض صحبت سے بن گئے اکسیر — محفلِ علم کے ثقات و کرام
ان کی رحلت سے کیوں نہ ہوں دلگیر — ہند کے صاحبان علم تمام
صبح کے وقت دار فانی سے — توڑ کر جسم عنصری کا دام
پہنچی جنت میں روح سیّد کی — ملی شایان شان جائے قیام

کہا رضواں نے دیکھ کر ان کو
لب کوثر ہے جناں میں مقام
۱۳ ھ ۵۸

دیگر

بزرگ و عالم دیندار سیّد ذبیجاہ — کہ جن کے فضل کے ہیں معترف ثقات و کرام
فیوض علم سے جن کے اٹاوہ ہے شاداب — قدم سے جن کے ہوا جامعہ بلند مقام
جسد کی قید سے آزاد ہو گئے آخر — ہے یہاں کی ہستیٔ دوروزہ کا یہی انجام
نگاہ مرد خدا میں ہے انتظار کی شب — نہ جب تلک ملے بندے کو وصل کا پیغام

پیام ادھر سے چلا اور ادھر سے روح چلی
در بہشت سے پہنچی ندا سلام سلام
۱۳ ھ ۵۸

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

دنیا میں ہر قوم کی الگ زبان ہوتی ہے اور قوموں میں بھی دیکھئے تو ہر پیشے کے لوگ اپنی الگ زبان بنا لیتے ہیں۔ جسے دوسرے پیشے والے یا عام لوگ مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس کی شکایت نہ ہونی چاہیئے کہ سیاست کا کام کرنے والے اپنی الگ زبان بولتے ہیں۔ لیکن شکایت کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ سیاست بڑی دلچسپ چیز ہے اور پھر اسے سمجھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ ابھی دیکھئے فلسطین کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ کتنا جی چاہتا تھا کہ اس کی تجویزوں اور بحثوں کا پتہ لگائیں کہ کس ڈھنگ پر ہوئیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کانفرنس کی کوئی نہ کوئی خبر اخباروں میں روز چھپتی تھی۔ مگر خاص برطانوی زبان میں اور اس لئے سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی آدمی سر کھجا کر رہ جاتا تھا۔ اس کا تو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے اس میں شریک نہ کئے جائیں گے یہ تو ہماری تقدیر کا لکھا تھا جو پورا ہوا۔ کانفرنس کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ ایک اور شبہ جسے سیاست کی زبان چھپا نہ سکی یہ تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ورنہ کانفرنس کی کارروائی اور برطانیہ کے ارادوں اور تجویزوں کو راز میں رکھنے کے کیا معنی تھے۔ آخر ہندوستان کے دستور پر بحث کرنے کے لئے بھی تو ایک کانفرنس ہوئی تھی اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مختلف خیالات کے لوگ جمع کئے جائیں۔ تقریریں ہوں، مشورے ہوں اور اس طرح سارا معاملہ طے کر لیا جائے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہندوستانی برطانیہ کے وفادار شہری تھے جھگڑنے کو نہیں گئے تھے برطانوی سیاست کی مشکل کو آسان کرنے گئے تھے۔ انھوں نے آپس میں کوئی بات طے نہیں کی برطانیہ کو خوشی سے پنچ بنا لیا۔ اور ہر طرح سے

یہ ظاہر کر دیا کہ برطانیہ پنچ نہ بنا تو وہ آپس میں قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ پھر بھی کوئی ایسی بات فلسطین کانفرنس میں تھی کہ برطانوی سیاست نے اپنے فیصلے کو آخر تک چھپائے رکھا۔

شاید اس کا سبب یہ تھا کہ عرب ابھی تک ہندوستانیوں کی طرح مہذب نہیں ہوئے ہیں۔ لندن جیسے شہر میں انھیں بے مروت اور ہٹ دھرم کہلانے کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے گول میز کانفرنس کو گول نہیں رہنے دیا۔ ایک طرف فلسطین کی موڈریٹ پارٹی کے نمایندوں کو اپنے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا اور یہ کہا کہ یہ پارٹی ناجائز طریقے پر پیدا ہوئی ہے۔ دوسری طرف یہودیوں کو ڈھکیل کر الگ کر دیا۔ اس طرح برطانیہ جو پنچ بننا چاہتا تھا۔ مدعا علیہ بن گیا اور عرب اور یہودی مدعی ٹھیرے۔ اور ایک زحمت یہ بھی تھی کہ عرب اپنی بات اپنی زبان میں کہتے تھے پھر اس کا ترجمہ ہوتا۔ پھر انگریزی میں اس کا جواب دیا جاتا۔ پھر اس جواب کا ترجمہ عربی میں کیا جاتا اور اس کا جواب عربی میں دیا جاتا۔ ایسی گفتگو میں نہ عرب اپنی عربی سے فائدہ اٹھا سکے نہ انگریز اپنی انگریزی سے۔ ہر معاملہ اس پر آکر اٹک جاتا کہ جھگڑا ختم کرنا چاہتے ہو تو ہماری بات مان لو۔ اسی وجہ سے عربوں کا پلہ بھاری رہا۔ وہ ایک موٹی سی بات صاف صاف کہتے اور بار بار کہتے۔ کہ فلسطین ہمارا ملک ہے اسے ہمارے حوالے کر دو یہودی جتنے وہاں اس وقت ہیں رہ سکتے ہیں انھیں ہم ہر وہ حق دینے کو تیار ہیں جس کی اقلیتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہم انھیں اب اس کی اجازت نہ دیں گے کہ باہر سے ہر سال ہزاروں یہودی بلا کر آباد کریں اور عربوں سے ان کی زمین ان کی روزی ان کا وطن خرید لیں۔ برطانیہ سے بھی ہم دوستانہ تعلق رکھنا چاہتے ہیں اور جیسے مصر نے معاہدہ کیا ہے ویسے ہی ہم بھی کریں گے۔ فلسطین کے پڑوسی عربوں کے جتنے نمائندے تھے وہ سب فلسطینوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ یا بہر حال ان کی عربی کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہو سکا کہ جس سے پتہ چلتا کہ ان کے اور فلسطینوں کے مطالبہ میں کیا فرق ہے۔

مدعی نمبر ۲ فلسطین کے یہودی اور ان کے یورپی اور امریکی سرپرست تھے۔ یہ سب انگریزی بہت اچھی بولتے ہیں۔ مگر افسوس جہاں گولی چل رہی ہو وہاں اچھی انگریزی کام نہیں آتی دل میں تو یہودی

یہ چاہتے ہیں کہ فلسطین میں انگریزوں کی حکومت اس وقت تک رہے جب تک یورپ اور امریکہ کے یہودی وہاں آکر آباد ہوکر یہ نہ ثابت کر دیں کہ یہ یہودیوں کا پرانا اور اصل وطن ہے برطانیہ اگر اس مدت تک حکومت کرنے کا خرچ کے خیال سے ذمہ نہ لے تو وہ اس پر بھی تیار ہو جائیں گے کہ برطانیہ جو فوج وہاں رکھے اس کا خرچ بھی ادا کریں۔ لیکن یہ تجویز منظور کرنا برطانیہ کی شان کے خلاف ہوگا۔ اس لئے یہودی کانفرنس میں اس بات پر زور دیتے رہے کہ برطانیہ نے لارڈ بیلفر کی زبانی جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرے انگریز یہ مطالبہ سن کر چاہے چپ ہو جاتے ہوں مگر عرب یہ کہتے ہیں کہ جب ہم سے پہلے سے ایک وعدہ کیا جا چکا ہے تو لارڈ بیلفر کو کوئی حق نہ تھا کہ یہودیوں سے اس کے خلاف کوئی وعدہ کریں اور ہم ان کی بات رکھنے کی خاطر اپنا دیس بیچنے کو تیار نہیں ہیں۔

عرب اور یہودی اپنے مطالبے کانفرنس سے بہت پہلے پیش کر چکے تھے اور اگر اس کانفرنس کا اجلاس حسب منشا ہوتا یعنی یہودی اور انتہا پسند اور موڈریٹ ساتھ بیٹھتے تو یہودی اپنی بات انگریزی میں کہتے فلسطینی عربوں کے سوا وہ سب کی سمجھ میں آجاتی اور سب کے دل میں بیٹھ جاتی۔ پریس میں یہودیوں کی تقریریں چھپ جاتیں اور عرب اپنی عربی کا ترجمہ کراتے رہ جاتے دنیا سمجھتی کہ عرب کسی ایک بات کا جواب نہیں دے پاتے جاہل ہیں۔ وحشی ہیں اور ان کی تنقادت کو مٹانا تہذیب کی ایک خدمت ہوگی لیکن عرب ایسی چال چلے کہ انگریزی نہ جاننے کے سبب سے ان کو نقصان کی جگہ فائدہ ہوا۔ ان کی تقریریں چاہے اچھی ہوں وہ باغیوں کی گولیوں سے کچھ کارآمد بنیں برطانوی سیاست حیران رہ گئی کہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ کس طرح نباہے۔

لیکن کانفرنس کرنے، تقریریں سننے، اور پھر ترجمہ کرا کر انھیں سمجھنے کی بھی حد ہوتی ہے اس میں بھی وقت صرف ہوتا ہے روپیہ اٹھتا ہے اگرچہ اتنا نہیں جتنا کہ باغیوں کا پیچھا کرنے اور پکڑنے میں ہم کو تو صرف اتنا بتایا گیا۔ کانفرنس میں برطانیہ کے نمائندوں کی طرف سے ایک تجویز تیار کی گئی۔ عربوں اور یہودیوں سے اس پر الگ الگ گفتگو ہوئی۔ اس ہفتے وہ برطانوی وزارت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد کانفرنس میں باضابطہ طور پر پیش ہوئی تجویز یہ ہے کہ فلسطین ایک حد تک خود مختار

ضلعوں میں تقسیم کیا جائے اور سارے ملک کی حکومت کے لئے ایک مرکزی مجلس ہو جس میں عربوں یہودیوں اور عیسائیوں کے نمائندے آبادی کی نسبت سے ہوں۔ اس مجلس کے اختیارات کیا ہوں گے برطانوی سیاست اپنا حق کس طرح محفوظ کرے گی۔ بلکہ اس تجویز پر عمل کس طرح اور کب کیا جائے گا یہ ابھی ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا۔ تجویز پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ ملک میں فساد بند ہو جائے ظاہر ہے کہ فساد کی ذمہ داری عربوں پر ڈالی جائے گی اس کا اصل سبب کچھ بھی ہو پھر جرمن سیاست بھی ایک دنیا کو بے چین کرنے پر تلی ہوئی ہے اور برطانیہ کو اس کا کھٹکا بھی لگا رہے گا۔ فلسطین کی گول میز کانفرنس نے سچ پوچھئے تو بس ایک بات طے کر دی ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا قومی وطن فلسطین کا ایک چھوٹا سا ضلع ہوگا۔ عربوں کے خوش اور مطمئن یا مایوس ہونے اور آخر میں مفتی صاحب کے رضامند ہونے کی خبریں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کی تجویز ذلیل نہ سمجھی جائے۔ عرب اور دنیا کے دوسرے مسلمان اس غلط فہمی میں نہ پڑیں کہ برطانوی سیاست کسی سے دب سکتی ہے۔

اس غلط فہمی کے پھیلنے کا آج کل خاصا اندیشہ ہے شام اور عراق میں جرمنی حکومت طرح طرح سے پروپیگنڈے کر رہی ہے ابھی چند روز ہوئے شام میں ایک کلب بند کیا گیا۔ جس کے ممبر کھلم کھلا کہتے تھے کہ انھیں جرمنی سے روپیہ ملتا ہے اور وہ اس روپے کو شام کی آزادی کے لئے استعمال کرنا برا نہیں سمجھتے۔ کلب کی تلاشی لی گئی تو ہتھیاروں کا ایک خاصا ذخیرہ نکلا اور کلب کے سکریٹری اور کلب کے کئی ممبر ہتھیاروں سمیت گرفتار کر لئے گئے شام میں آزادی کی ایک تحریک شروع ہوئی ہے جس میں نوجوان زور شور کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں اور فرانسیسی حکومت اور اس کے شامی عہدے داروں کو بہت پریشان کر رہے ہیں۔ فرانسیسی کہتے ہیں کہ ہمیں شام پر حکومت کرنے کا حق ہے شامی کہتے ہیں کہ ہمیں آزاد ہونے کا حق ہے۔ وہ حکومت کی مخالفت اپنے بل پر نہیں کر سکتے اس لئے کیا تعجب ہے اگر وہ جرمنی سیاست کا سہارا چاہیں۔ جرمن سیاست اپنی غرض سے انھیں سہارا دے گی۔ اگرچہ شام کی آزادی کی تحریک ابھی بڑھی نہیں لیکن جرمن سیاست بہت کچھ کام کر چکی ہے۔ جرمن مسافر اور سیاح جرمن اور شامی دوکان دار جرمنی بال بنانے والی عورتیں

شامی اور جرمن طوائفیں بہت جاسوسی کر رہی ہیں۔ شامی حکومت کے سارے بھید جرمنی کی وزارت خارجہ کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور جاسوسوں کو پکڑنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ انھیں تنخواہیں نہیں دی جاتیں۔ جرمن کا بنا ہوا مال دیا جاتا ہے۔ عراق میں عراقیوں کی حکومت ہے اس لئے وہاں جاسوسی اور رعایا کو بھڑکانے کی ضرورت نہیں وہاں نازی سیاست کے کارنامے بیان کر کے ٹھیکے اور اجارے حاصل کئے جا رہے ہیں۔

ایسی حالت میں یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ فلسطین کے عرب آزاد ہو گئے یا انھیں استقلال اور اختیار کا پھل ملنے والا ہے۔ یہودیوں کا سیلاب تو اب بند ہو گیا یہودی اب یہ بھی نہ جتا سکیں گے کہ وہ عربوں سے بہتر قسم کے آدمی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخالفوں کی تعداد میں کمی ہو گئی معاملہ سلجھ گیا۔ عرب اور انگریز آمنے سامنے آ گئے برطانوی سیاست ابھی تک نہ جانے کب تک عربوں پر جرمنی ہونے کا۔ عربوں کی آزادی کی تحریک پر جرمن سیاست کی چال ہونے کا شبہ کرتی رہے گی یعنی فلسطین کے معاملہ کا دارومدار ہر ہٹلر پر ہے جب تک وہ برطانیہ کو اس خیال میں رکھ سکے کہ انھیں منانا اور راضی رکھنا ممکن ہے برطانوی سیاست کو فلسطینی عربوں کی دوستی اور ہمدردی کی ضرورت نہ ہوگی اور فلسطین آزاد نہ ہوگا جس دن ہٹلر کی طرف سے مایوسی ہوئی۔ سیاست پلٹا کھائے گی اور فلسطینی عرب آزاد ہو جائیں گے!

قسمت کو دیکھئے کہ اس نے فلسطین اور چکوسلواکیا دونوں کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک ہی ہفتہ رکھا ہر ہٹلر کی نسبت گمان یہ تھا کہ اکتوبر میں کوئی کارروائی کریں گے یا اٹلی کے ساتھ مل کر نوآبادیوں کا مطالبہ کریں گے لیکن انھوں نے بدھ کی صبح کو اچانک چکوسلواکیا پر حملہ کر کے اس کے دو سب سے بڑے ضلعوں کو جو بوہیما اور مرادیا کہلاتے ہیں۔ قبضہ کر لیا۔ یہ دونوں ضلع اب چیکائی کہلائیں گے اور جرمنی کے ماتحت انھیں سوراج کے کچھ اختیارات حاصل ہوں گے۔ سلواکیا ابھی تک آزاد ہے مگر غالباً تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی جرمنی میں شامل ہو جائے گا۔ چیکوسلواکیا کے مشرقی حصہ پر جو کارپاتھو اور ٹن کہلاتا تھا ہنگری نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور ہر ہٹلر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

ہر ہٹلر کا شاید پہلے سے ارادہ نہ تھا کہ چیکوسلواکیا کا خاتمہ کر دیں انھوں نے یہ ارادہ پچھلے دوشنبہ

کو کیا ہوگا جب اس کی خبر آئی تھی کہ چکوسلواکیا کے خودمختار صوبے اور چیکوسلواکیا کی مرکزی حکومت
کے درمیان جو جھگڑا چلا آرہا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں منگل کی رات کو جب چکوسلواکیا
کے ہمدرد ڈاکٹر ہان ان سے ملے تو ہر ہٹلر کو جو ذرا سا تامل تھا وہ بھی نہ رہا۔ چکوسلواکیا سے آزاد
خودمختار حکومت کا بوجھ اٹھایا نہیں جا سکتا تھا اور ہر ہٹلر نے یہ بوجھ اپنے اوپر لے کر گویا چکوسلواکیا
کے ساتھ احسان کیا۔ لیکن جیسا کہ لارڈ ہیلی فیکس نے فرمایا یہ بات ہے قابل افسوس اس پر اعتراض
کرنا چاہیے کہ ہر ہٹلر نے اپنے معاہدوں کی پابندی نہیں کی۔ لارڈ ہیلی فیکس کی یہ رائے بھی صحیح
ہے کہ انگلستان یا کوئی اور ریاست اس وقت کچھ نہیں کرسکتی ہر ہٹلر نے بہت برا کیا لیکن اب جو
کرلیا تو کیا کیا جائے۔

مطبوعات موصولہ

مشکلات القرآن | مصنفہ مولانا انورشاہ مرحوم کشمیری بزبان عربی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت فی نسخہ عہ/ ملنے کا پتہ ناظم صاحب ادارہ شرقیہ متصل جامع مسجد دہلی

مولانا انورشاہ دیوبند کے مدرسہ کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے۔ اور جملہ علوم اسلامیہ میں کمال رکھتے تھے۔ قرآن کی تفسیر میں درس کے وقت طلبا، اور بالخصوص حنفی طلبار کو جو علمی دشواریاں پیش آتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس کو چھاپ کر شائع کیا ہے۔ مولوی محمد یوسف صاحب بنوری استاد جامعہ ڈابھیل نے اس پر عربی میں ایک مقدمہ ۴۸ صفحوں کا لکھا ہے جس میں مولانا انورشاہ کی مختصر سوانح حیات اور مشکلات قرآن کے متعلق بھی بعض امور کی تفصیلات ہیں۔ ا۔ج۔

ترجمان الغیب | مصنفہ مولوی محمد احتشام الدین صاحب حقی دہلوی۔ ایم۔ اے (علیگ) تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۲۳۲ صفحات قیمت فی نسخہ عہ/ ملنے کا پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ نئی دہلی

مولوی احتشام الدین صاحب حقی دہلی کے ان ممتاز اہل ادب میں سے ہیں جو اردو کے مالک اور نظم ونثر دونوں کے ماہر ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کے ساتھ ان کو کم سے کم ایک قرن سے دلچسپی ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے خواجہ صاحب موصوف کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ اصل فارسی کے بحر وقافیہ اور ہم آہنگ ردیف میں کر ڈالا۔

چونکہ اردو فارسی سے قریب تر ہے اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں بہت مشابہ اور مماثل ہیں۔ اور جس طرح خواجہ حافظ کی فارسی مستند اور مسلم ہے اسی طرح مولانا احتشام الدین صاحب کی اردو خالص دہلوی اور ٹکسالی ہے۔ جو لوگ خواجہ حافظ کے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ نہایت دلکش ثابت ہوگا۔

الرق فی الاسلام حصہ اول | مصنفہ مولوی سعید احمد صاحب فاضل دیوبند ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد کتابت طباعت دیدہ زیب اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۲عہ

درج نہیں ہے۔ غالباً عا ر ۔ ملنے کا پتہ ناظم صاحب ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

جامعہ میں ہم ندوۃ المصنفین کے قیام کا ذکر کر چکے ہیں کہ چند اہل ہمت صاحبان علم نے جو دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں یہاں قرول باغ میں ایک مجمع علمی اس نام سے قائم کیا ہے جس کی طرف سو ایک ماہانہ رسالہ برہان بھی شائع ہوتا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ اس ندوۃ المصنفین کی پہلی تصنیف ہے جو ملک وملت کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس میں غلامی کی حقیقت اور اس کے نفسیاتی۔ اخلاقی۔ اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا، اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا۔ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت مجبوریوں کی وجہ سے باقی رکھا اور کیا کیا اصلاحات اس میں کیں۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات درج کئے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ آئندہ شائع ہوگا۔

(ا۔ ج۔)

رسالہ نگار مصحفی نمبر "نگار" کی یہ ایک دیرینہ خصوصیت ہوگئی ہے کہ اس کا جنوری نمبر ایک خاص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں غالب، مومن ظفر وغیرہ کی شاعری پر رسالہ "نگار" میں سیر حاصل تبصرے شائع کئے جاچکے ہیں جنوری ۱۹۳۹ء کے نمبر کو مصحفی کی شاعری کے لئے وقف کیا گیا ہے اور جو توقعات نگار کے ساتھ پچھلے نمبروں کو دیکھ کر وابستہ کی جاسکتی تھیں وہ اس نمبر کی اشاعت سے اچھی طرح پوری ہوتی ہیں۔ نیاز صاحب کے مقدمہ کے علاوہ امیر احمد صاحب علوی، فراق صاحب گورکھپوری، عبدالباری صاحب آسی۔ مجنوں صاحب گورکھپوری حسرت صاحب موہانی۔ مشیر احمد صاحب علوی اور جوش صاحب ملیح آبادی کے محققانہ مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے پاکیزہ ذوق شعر سے کام لیتے ہوئے مصحفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے انتخابات کو بھی پیش فرمایا ہے۔ رسالہ شروع سے آخر تک اس لائق ہے کہ اردو ادب وشاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

ترانہ شاہ یہ پیر شاہ محی الدین قادری صاحب کا کلام ہے جسے جناب محمد اسمٰعیل شریف صاحب بی اے لیبو رسول سرمدی نے مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے جناب اے حبیب اللہ خاں صاحب

منصف، اونگرے نے تعارف لکھا ہے اور اے۔ کے سید تاج پیراں صاحب بی۔ اے قادری ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر ریاست مملکت میسور نے حالات مصنف درج کئے ہیں۔ خود محمد اسمٰعیل صاحب نے "شاہ صاحب کی یادآوری" اور ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو خوبی اور تفصیل کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مرتب و دیگر حضرات کی اس گہری عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے جو انھیں شاہ صاحب مرحوم کی ذات سے تھی اور جو ان کے وفات کے بعد ان کے کلام کو شائع کرانے کی محرک ہوئی۔ شاہ صاحب کی زبان کچھ پرانے طرز کی معلوم ہوتی ہے جو شاید جنوبی ہندوستان میں تو اب بھی بولی جاتی ہو لیکن شمالی ہندوستان میں اب اس طرح نہیں بولی جاتی۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

ترا جلوہ مجھ میں عیاں ہوا، تو خودی کو اپنی بھلادیا ۔۔۔ ترا عشق مجھ میں جنم لیا تو سر انبیا نہ جھکادیا

اے صنم مجھ کو ترا رخ ذرا بتلا جانا ۔۔۔ مضطرب ہوں مجھے جلوہ ذرا بتلا جانا

تلاش یار میں میں نے مرا وطن چھوڑا ۔۔۔ جہاں سے اہل جہاں سے ہوں بیتی منہ موڑا

تیرا مطلب آکے یاں توکھودیا ۔۔۔ اس کے بدلے ایک بکھیڑا لے چلا

محاورہ کے اس فرق کو اگر نظرانداز کر دیا جائے تو شاہ صاحب کا کلام تصوف اور معرفت کا ایک اچھا مرقع نظر آئے گا۔

احکام القرآن مولوی حبیب مبین صاحب صدیقی ساکن رودلی شریف ضلع بارہ بنکی نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمان قرآن پاک کا بلاترجمہ متن پڑھنے کی وجہ سے اس کی تعلیمات کی طرف سے غافل ہیں اور محض طوطے کی طرح الفاظ ادا کر کے قرآن پاک کے معانی و مطالب سے غرض نہیں رکھتے اس مختصر کتاب میں احکام قرآن کو اردو زبان میں مختلف عنوانات کے ماتحت جمع کیا ہے تاکہ مسلمان اپنے ایمان و اسلام کا جائزہ لے سکیں اور ان کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ کلام مجید کی تلاوت کا شوق پیدا ہو۔

مرقاۃ القرآن اس میں عربی سکھانے کے لئے چالیس سبق جمع کئے گئے ہیں جو تمام تر قرآن شریف سے لئے گئے ہیں۔ اس کے مؤلف محمد عبد اللہ صاحب کامل ایم۔ اے لیکچرار عربی

فارسی اردو گورنمنٹ کالج لائل پور ہیں۔ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے کلید مرقاۃ القرآن علیحدہ لکھی گئی ہے۔ دونوں کا یکجائی مطالعہ کرنے سے قرآن کی عربی سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

احسن المقال فی رویت الہلال از جناب محمد عبید اللہ قادری امجھری صاحب۔
صوبہ بہار میں ایک عرصہ سے امارت شرعیہ اور محکمہ قضا قائم ہے۔ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ میں رویت ہلال پھلواری شریف میں ۲۹ر کو نہیں ہوئی اس لئے وہاں ۳۰ر کا ہی حساب ملحوظ رکھا گیا لیکن بعد میں مختلف دیار اور امصار سے آئے ہوئے خطوط، اخبارات اور اطلاعیں پیش ہوئیں جن کے مطالعہ سے قاضی صاحب کو ۲۹ر کی رویت کا ظن غالب پیدا ہوا۔ انھوں نے ۲۹ر کی رویت قبول کر لی اور جمعہ کو عید الضحےٰ کا حکم دے دیا۔ لیکن مخالف لوگوں نے اس فیصلہ کو نہیں مانا۔ یہ رسالہ قضاء قاضی کو حجۃ تسلیم کرانے اور قضا قاضی کو ظاہراً و باطناً نافذ منوانے کے لئے لکھا گیا ہے۔

طبقات الشعرا یہ قدرت اللہ صاحب صدیقی شوق سنبھلی کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا ایک نادر تذکرہ ہے جس کا حسبۃ حسبۃ خلاصہ جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی بی۔ اے آنرز ایم۔ اے (علیگ) نے مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ طباعت و کتابت بہت اچھی ہے۔

شرارے یہ ڈاکٹر آہ سیتاپوری صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے ان افسانوں میں زندگی کے الم انگیز پہلوؤں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ افسانوں کے موضوع کو مصنف اور کتاب کے نام سے پوری مناسبت ہے۔ اس میں واقعی بہت سے دل جلانے اور آہ کا دھواں پیدا کرنے والے شرارے جمع کر دئے گئے ہیں۔

سفر حیدرآباد دکن اور سر اقبال کے تاثرات ۱۹۱۰ء میں یہ اقبال کی دو نظموں کا مجموعہ ہے جنھیں جناب تصدق حسین صاحب تاج نے بہ یادگار یوم اقبال حیدرآباد دکن منعقدہ ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء مرتب کر کے شایع کیا تھا۔ پہلی نظم میں اقبال نے مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے اور دوسری نظم کا عنوان "گورستان شاہی" ہے۔ دونوں نظمیں اقبال کی اعلیٰ شاعری کی ترجمان ہیں۔

سالنامہ ۱۹۳۹ء ادبی دنیا ادبی دنیا لاہور کے اس سالنامہ کا شمار اپنے مضامین کے بلند معیار

اور تنوع اپنی کتابت و طباعت کی خوشنمائی اور دیدہ زیبی اور اپنی تصاویر کی خوبی اور کثرت کے لحاظ سے ہندوستان کے کامیاب ترین رسالوں میں کیا جا سکتا ہے۔ رسالہ میں مشہور اہل قلم کے اچھے افسانے اور ڈرامے، علمی و ادبی مضامین، نظمیں اور غزلیں جمع کی گئی ہیں جن کے لئے رسالہ کے مدیران مبارکباد کے مستحق رہیں۔

بصائر القرآن (حصہ اول) از جناب نکہت شاہجہانپوری صاحب بی۔ اے۔ یہ کتاب نکہت صاحب کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو انجمن تحریک قرآنی بمبئی کے زیر اہتمام دئے گئے تھے اس میں مسلمانوں اور دیگر اقوام کی مجموعی زندگی کا (اصلاحی حیثیت سے) جائزہ لینے کے بعد چند قرآنی اصول پیش کئے گئے ہیں تاکہ ان اہم اسلامی مسائل کا بے تعصبی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکے جو خصوصیت کے ساتھ مغرب زدہ دماغوں اور موجودہ نوجوانوں کے ذہن میں الجھن اور خلجان کا باعث ہیں۔ لکچروں کے عنوانات اللہ، غفران، رحمت قبلہ اور ایمان وغیرہ کی تفسیر حاضرہ ہیں۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ "دنیا کے لئے ہدایت یعنی قرآن مبارک صرف طوطے کی طرح رٹنے اور محض زکوٰۃ و صدقہ اور یٰسین خوانی اور زینت طاق بننے کے لئے وقف نہ رہے بلکہ ہماری روح اور ہمارے تمام افعال و اعمال کی رہنمائی کرے"

نبض مصنفہ حکیم عبداللطیف صاحب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یہ حکیم صاحب کی نہایت محققانہ تصنیف ہے اور اس کے بارے میں مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ نبض شناسی کے فن پر اتنی مفصل بحث نہ صرف اردو زبان میں بلکہ کسی اور زبان میں بھی موجود نہیں ہے کتاب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان سے یونانی طب کی کتب درسیہ موجز، نفیسی، اقصرائی قانون شیخ، شرح قانون وغیرہ خالی ہیں بلکہ غیر درسی عربی کتابوں میں بھی مصنف کا یہ بیان ہے کہ یہ مسائل نہیں ملتے۔ مصنف کے جد امجد حکیم محمد یعقوب صاحب نے "ارجوزہ شیخ الرئیس" کے قلمی نسخہ کے سر ورق پر چند اشارات لکھے تھے جو مصنف کے خاندان میں سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں لیکن ان سے بھی تمام حالات کی جانب قطعی رہبری نہیں ہوتی تھی۔ آیورویدک کی کتاب "ناری وگیان" کو بھی مصنف نے اس کتاب میں بعینہ نقل کر دیا ہے اور

چینی اطبا کی اختراعات کو بھی جن پر دوسروں نے اپنے قوانین کی بنیاد رکھی ہے ڈاکٹر گومتر کے قانون سے بعینہ نقل کیا ہے۔

ان اصول و قوانین کی صحت کے بارے میں مصنف اپنے ذاتی تجربے سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر قوت لامسہ کی تمیز صحیح تربیت یافتہ ہو تو یہ اصول بہت کچھ معین ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن محض نبض پر اعتماد کرنا اصول طب کے خلاف اور سخت خطرناک ہے۔ معائنہ مریض کے وقت کسی چھوٹی سی چھوٹی علامت اور معمولی سے معمولی حالت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ مریض کے مخصوص حالات، خصوصی خلقت، معاشی ماحول اور طبیب کے مخصوص حالات نبض کی صحیح رہنمائی میں حائل ہوتے ہیں۔ ان تمام موانع کا قطعی انسداد اور تمام مناسب حالات اور شرائط کا موجود ہونا عملی دنیا میں خارج از امکان ہے۔ اس لیئے نبض کی رہنمائی اپنے حدود کے اندر بھی کامل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں جب تک مریض کی نبض بحالت صحت طبعی نہ دیکھی گئی ہو اس وقت تک اس کی اضافی کیفیت کا صحیح اور قطعی اندازہ دشوار ہے۔"

عملی تحقیق، کاوش و جستجو اور نتیجہ کی معقولیت نیز بیان کی صفائی اور خوبی کے لحاظ سے اس کتاب کا شمار اردو کی بلند پایہ کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

کانگریس یا مسلم لیگ مصنفہ جناب حکیم انصاری صاحب ناشر ناظم دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ آفندی لاج قرول باغ نئی دہلی۔ قیمت ۲ر۔ یہ رسالہ مسلم لیگ کی تائید میں لکھا گیا ہے۔ موافق اور مخالف دلیلوں کو مکالمہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مکالمہ کا انداز نہایت سلجھا ہوا اور معقولیت پر مبنی ہے۔ جو حضرات کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ کے مخالف ہیں ان کو بھی اس رسالہ کے مطالعہ سے مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کو بہترین شکل میں سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

اسلامی حقوق اور مسلم لیگ ناشر عبد الصمد رحمانی ملنے کا پتہ مکتبہ امارت شرعیہ۔ پھلواری شریف پٹنہ۔ قیمت مع محصول ڈاک ۱ہر

اس رسالہ میں اس خط کو شائع کیا گیا ہے جو مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت

صوبہ بہار نے مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کو لکھا تھا۔ نائب امیر شریعت صاحب اس سے پہلے بھی ایک خط مسٹر جناح کو لکھ چکے تھے جس میں برطانیہ کے قائم کردہ نظام حکومت کے خلاف کلیتہً انقلاب برپا کرنے کے لئے مسٹر جناح کو حرب سلمی (پرامن سول نافرمانی) کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا لیکن مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے پٹنہ کے اجلاس میں اس کو لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی تمام کارروائیاں دیکھ کر جن حقائق کا انکشاف ہوا "ان سے متاثر ہو کر جناب نائب امیر شریعت صاحب نے یہ دوسرا خط تحریر فرمایا تھا۔ اس میں "مسلم لیگ اور برطانوی شہنشاہیت" "مسلم لیگ اور مذہبی حقوق کی حفاظت" "اسلامی کلچر اور مسلم لیگ" "پرسنل لا اور مسلم لیگ" وغیرہ کے عنوانات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ دو ضمیمے بھی اس رسالہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں تو نائب امیر شریعت صاحب کے متذکرہ بالا اول خط کو شائع کیا گیا ہے اور دوسرے ضمیمہ میں "مسودہ نظارت امور شرعیہ" درج کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے طبقہ علماء کے مطالبات اور نقطہ نگاہ کے سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

درس قرآن قاضی عبدالمجید قرشی صاحب سکریٹری سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور نے قرآن کا درس دینے کے لئے ایک نہایت مفید اور عالیشان اسکیم بنائی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ "آٹھ آنے سالانہ میں چوسٹھ چوسٹھ صفحے کے بارہ ماہوار رسائل شایع کئے جائیں ہر رسالہ میں ۳۰ درس قرآن ہوں گے ہر درس دو صفحے کا آسان تقریری شکل میں ہوگا ہر درس میں اوپر ایک آیت ہوگی اور نیچے صرف دو صفحوں میں اس کا ترجمہ اور تشریح۔ آپ گھر میں ایک وقت مقرر کریں کہ اس وقت گھر کا کوئی ممبر غیر حاضر نہ ہو۔ ایک جگہ فرش بچھا کر ہر روز ماں بچے، بہن، بھائی سب حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں اور آپ صرف چار منٹ میں انھیں روزانہ ایک درس پڑھ کر سنا دیا کریں جس دن باپ نہ ہو بیٹا مسند ہدایت پر بیٹھے اور ایک درس پڑھ کر سنا دے ہر مسجد، ہر زنانہ اور مردانہ اسکول اور اسلامی گھر میں روزانہ ایک ایک آیت کا ترجمہ سکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔" اس سلسلہ کا پہلا ماہوار درس شائع کر دیا گیا ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس درس کے بارے میں مصنف نے معذرت کی ہے کہ "یہ سبق صرف قلم اٹھا کر لکھ دیے ہیں انشاءاللہ اگلے سبق بہتر ہوں گے" لیکن ہم ان سبقوں کو بھی بہت مفید پاتے ہیں۔ زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ ہر درس

اسلام کی بنیادی تعلیمات سے لبریز ہے۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے ہم سیرت کمیٹی کے اس احسان کا شکریہ ادا کر سکیں۔ سیرت کمیٹی کا یہ کارنامہ زرین حروف سے لکھے جانے کے لئے لائق ہے سیرت کمیٹی اسلام کی نہایت عظیم الشان خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہم نہایت پرزور الفاظ میں اسلام سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو مشورہ دیں گے کہ وہ آٹھ آنے بھیج کر رسالہ درس قرآن اپنے نام جاری کرائیں۔ اس اسکیم کے چلانے والوں کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا ہے اس اسکیم میں ۱۲ رسائل پر تین آنے سالانہ محصول ڈاک کا اور ایک آنہ سالانہ ریپر پوسٹ اور انتظام کا خرچ ہو جائے گا اور اس طرح سیرت کمیٹی ۱۲ رسائل کے عوض صرف ۱۶ پیسے خود وصول کرے گی۔ حالانکہ اس کی اپنی کم سے کم لاگت ۴۸ پیسے ہیں۔ اگر ۱۶ ہزار گھروں میں درس قرآن جاری ہوگیا تو اس اسکیم میں سیرت کمیٹی کو دوسو روپیہ ماہوار کا مستقل خسارہ ہوگا۔ لیکن اگر ۱۶ ہزار گھروں یا مسجدوں میں ۸۰ ہزار مسلمان ترجمہ قرآن شروع کر دیں تو اس فائدے کے مقابلہ میں سب نقصانات ہیچ ہیں۔

انقلابی پارے یا اشتراکی اقوال | مصنفہ کامریڈ اے۔ ایس۔ حامد صاحب ملتانی ناشر فیض بخش پاس نیم بلڈنگ مٹکا شیدی پورہ نئی دہلی۔ قیمت ۴ر

اس رسالہ میں کچھ منتشر خیالات اور عبارتوں کو جمع کیا گیا ہے جن میں سے چند کو چھوڑ کر باقی سب کامریڈ اے۔ ایس۔ حامد نے خود ہی تصنیف فرمائے ہیں۔ کامریڈ حامد اور ان کے خیالات سے جن حضرات کو دلچسپی ہے ان کے لئے یہ کتاب شاید مفید ثابت ہوگی۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عار	عہ ۱۲ آ	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے	عار
المقول الاظہر	صہ	مہ	" " " دوم	عہ	عار
[illegible]یان ہند	عار	عہ	تاریخ یونان قدیم	عار	
امرائے ہنود	سے	سے	نکات الشعرا	عہ	عہ ۱۲ آ
القمر	عہ	•	وضع اصطلاحات	سے ۱۲ آ	سے
تاریخ تمدن حصہ اول	عار	عہ	بجلی کے کرشمے	عہ ۱۲ آ	عہ
" " دوم	عار	عہ	تاریخ	عہ ۱۲ آ	•
فلسفۂ جذبات	عار	عار	محاسن کلام غالب	عہ	۱؍
البیرونی	عار	عہ	قواعد اردو	عہ	عار
دریائے لطافت	سے	عہ	تذکرہ شعرائے اردو	عہ ۱۲ آ	عہ
مبقات الارض	عہ	عار	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق	سے	عہ
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	للعہ	سے	تاریخ ہند[illegible]	•	عہ ۱۲ آ
" " دوم	سے	عہ	مثنوی خواب و خیال	عہ	عہ
اسباق النحو حصہ اول	•	۶؍	کلیات ولی	صہ	للعہ
" " دوم	•	۶؍	چمنستان شعرا	صہ	للعہ
علم المعیشت	صہ	صہ	ذکر میر		عار

الملتمس: مظفر حسین شمیم انجمن ترقی اردو (ہند) القریش نئی دہلی

تفسیر بیان للناس

قرآن مجید کی بے شمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی لیکن ذرا تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر تفسیر قرآن ہونے کی بجائے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور معتقدات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے ائمہ واجلہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے حالانکہ قرآن کو، کہ قول الٰہی ہے۔ آیات قرآنی اور صحیفۂ فطرت (کہ فعل الٰہی ہے) کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی تصنیف کو اس کے مصنف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا بس یہی ضرورت تھی جو محرک ہوئی تفسیر پیش نظر کے وجود میں آنے کی قدما میں بھی حال خال ایسے لوگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے ماحول کے لحاظ سے نہایت قابل قدر تفسیریں لکھیں لیکن چونکہ قرآن ایک مخصوص ماحول کا پابند نہیں کسی خاص فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں کسی مخصوص زمانہ اور محدود ملک کی ضرورتوں کا متکفل نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ عصر حاضر تک کی ترقی علوم و تجارت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا ایک عمیق مطالعہ تمام کائنات انسانی کے سامنے پیش کیا جائے پس اس تفسیر میں یہ چھ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) اس کے مخاطب بلالحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

(۲) اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔

(۳) ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۴) اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے جو محکمات سے واضح ہے۔

(۵) اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔

(۶) قانون وراثت کا احیا۔

کاغذ ولائتی دبیز کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ باوجود ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے قیمتیں نہایت خفیف ہیں منزل اول صفحات ... مجلد سنہری (…) منزل دوم (…) منزل سوم (…) منزل چہارم (…) منزل پنجم (…) منزل ششم (…) منزل ہفتم (…)

ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ امرتسر (پنجاب)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ، ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرماکر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

نئی کتابیں

گئودان ۔ منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول، اردو میں پہلی بار منتقل ہوا ہے۔ صفحات ۱۵۰۔ قیمت عہ

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب ۔ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ اور وردھا تعلیمی اسکیم کا مکمل نصاب اردو میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت عہ؍

ہندستانی ۔ ان چھ لکچروں کا مجموعہ جو آل انڈیا ریڈیو پر ۲۰ سے ۲۵ فروری سنہ تک براڈکاسٹ ہوئے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں۔ ہر ایک کی قیمت ۱۲؍

اجتماعی زندگی کی ابتدا ۔ سیاست، معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

قیمت ۸؍

محکومیتِ نسواں ۔ مشہور فلسفی مل کی کتاب THE SUBJECTION OF WOMEN کا اردو ترجمہ۔ قیمت عہ

جوہر اقبال ۔ علامہ اقبال کی زندۂ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے اہل فکر حضرات کے مضامین اور پیغامات کا مجموعہ۔ قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	مئی ۱۹۳۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں گے۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر ایدی اسیر وادم ریڈر سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

ہندوستان آج جن مسئلوں سے دوچار ہے ان میں بلاشبہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ مسئلہ آل انڈیا فیڈریشن اور آزادی کامل کے مسئلوں سے بھی جن پر آج کل بہت بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اس کے ماننے میں غالبًا کسی کو تامل نہیں ہوگا کہ اگر ملک کے اندر خانہ جنگی اور نااتفاقیاں موجود ہوں تو بہترین سیاسی ادارے بھی کامیاب نہیں ہو سکتے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک قومی اتفاق پیدا نہ ہو جائے ہمیں آزادی کی جدوجہد کو ملتوی کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا امکان بہت قوی ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول اور قیام کے لئے جو جدوجہد کی جائے گی وہ بذات خود خوشگوار تعلقات اور باہمی سمجھوتوں کی ان مخفی قوتوں کو پیدا کرنے کا موجب ہوگی جس سے ایک متحد اور مضبوط قوم تعمیر کی جا سکے گی۔

مہاتما گاندھی کو آج ہندوستان کے زندہ لوگوں میں سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ہمارے اندر قومی وقار نفس کا ایک زبردست احساس پیدا کرا دیا ہے لیکن وہ شخص مہاتما گاندھی سے بھی بڑا ہوگا جو قومی اتحاد کے لئے ایک پائدار حل نکال سکے گا۔ آئندہ نسلیں ایسے شخص کو موجودہ ہندوستان کا سب سے بڑا مصلح سمجھیں گی۔ جب تک قومی اتحاد مفقود ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے ہم غلام بنے رہیں گے اور باہر کی دنیا ہمارا مذاق اڑاتی رہے گی۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کی مذمت کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان اختلافات کو ایک دن کے اندر مٹایا جا سکتا ہے یا یہ کہ ہندوستانی جماعت کے مختلف عناصر کو ہر حیثیت سے ایک ہی طرز اور سانچے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہیئے۔ اختلافات تو ایک عرصہ دراز تک جاری رہیں گے اور بذات خود ان کے جاری رہنے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ اختلافات میں

برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال برتری اور کمتری کا پیدا ہونے لگتا ہے اور اس سے شک و شبہ اور بے چینی کی نہایت تلخ فضا پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ایک خاندان کے افراد قدرتی طور پر آپس کے تعلقات میں زیادہ یگانگت محسوس کرتے ہیں اور کچھ باتوں میں دوسرے خاندانوں سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھتے ہیں اسی طرح ان لوگوں میں بھی جو ایک ہی قسم کے خیالات اور نصب العین رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح کے مذہبی اعتقادات رکھتے ہیں ہم جنسی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسری جماعتوں کی طرف سے ان کے دل میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ اختلاف کا یہ خط اتنا نمایاں ہو جائے کہ معاشری، معاشی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جائے۔ فرقہ وارانہ تنظیم کو جہاں تک معاشری میل جول اور تمدنی ترقی کا تعلق ہے وہاں تک تو جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ سے ایک قوم مخالف سیاسی اور معاشی گروہوں میں منقسم ہونے لگے تو اسے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ عہد جدید کی ریاست ایک دنیوی ادارہ ہے اور اس میدان میں وہ اپنے شہریوں سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ معاشی اور سیاسی پروگراموں، پالیسیوں اور طریقوں کے مطابق تو پارٹیاں بنانے کی اجازت دے سکتی ہے اور اسے دینا چاہیے لیکن اگر ہر مذہبی فرقہ اور جماعت، ہر نسلی گروہ، اور ہر لسانی اقلیت کو ریاست اپنے سے جدا ہونے کی اجازت دیتی رہی تو اس کا نتیجہ اس کے حق میں خودکشی ثابت ہوگا۔ اگر انتشار پسند قوتوں کو حاوی ہونے کا موقع دے دیا جائے تو نہایت زبردست سلطنت بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

یہ دیکھ کر سخت تکلیف اور افسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ تمام نیک نیت ہندوستانی قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس سمت میں ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ اس کا سبب عقل کی کمی نہیں ہے بلکہ اتحاد باہمی کے ارادہ کی کمزوری ہے اور اس کمزوری کا سبب وہ خوف، بدگمانی اور سخت بداعتمادی ہے جو ہر فرقہ کے دل میں دوسرے کی طرف سے پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں سے اکثر اور دوسری اقلیتوں میں سے کچھ لوگوں کو خوف ہے کہ سوراج کے معنی ہندو راج ہوں گے۔ اپنے اس خوف کے ثبوت میں وہ شہادت کے طور پر اس بات کو

پیش کرتے ہیں کہ سرکاری دفتروں، تعلیم گاہوں وغیرہ میں جو شخص برسر اقتدار ہو جاتا ہے وہ خالی جگہیں پر صرف اپنی ذات اور برادری کے لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس جانب داری کو جائز قرار دینے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دوسرے فرقوں میں ضروری قابلیت رکھنے والے لوگوں کا فقدان ہے۔ یہ بات پہلے تو ممکن ہے صحیح رہی ہو لیکن اب ہر فرقہ میں تعلیم کے ترقی پا جانے کے بعد یہ عذر صحیح نہیں رہا ہے۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ ہندوستان سے اس وقت تک نااتفاقی ختم نہ ہوگی جب تک ہم بڑے پیمانہ پر فیاضی، برادرانہ سلوک، رواداری اور ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سیاسی دستور اور تحفظات اور ضمانتیں ایسی حالت میں جب دل کے اندر دشمنی باقی رہے محض کاغذی کارروائی بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھگڑے ہمیشہ باقی رہیں گے اور اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ اپنے معاشری، معاشی اور سیاسی انتظامات کو فرقہ وارانہ اصول کے ماتحت سلجھانے کی کوشش کی جائے تاریخ کے اسباق سے روگردانی کرنا ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اسی قسم کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انھوں نے حالات کے زیر اثر جزوی یا مکمل طور پر ان مسائل کو حل کر لیا ہے۔ جو کام دوسرے لوگ کر سکے ہیں ہندوستانی بھی کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں اپنے مذہب کی تعلیمات کی روح کی طرف رجوع کریں اور اپنے فرائض پر بھی اتنا ہی زور دیں جتنا کہ وہ اپنے حقوق پر دیتے ہیں یہ بات بہت زیادہ قابل افسوس ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں مذہبی جذبہ بہت قوی ہے اور جہاں مذہبی جوش و خروش مکمل ترک دنیا کی صورت بھی اختیار کرتا رہتا ہے پھر بھی مذہب سے لوگوں کو ملانے کی جگہ ان کو جدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ مذہب کو ہی سرے سے ختم کر دیا جائے بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ مذہب کے تصور کو بدل دیا جائے۔ مذہب ہندوستان کی لعنت نہیں ہے بلکہ ہماری مصیبتوں کا اصل سبب مذہب کا غلط تنگ اور ناجائز تصور ہے۔ کوئی مذہب رقابت، نفرت، شک، بے اعتمادی یا خود غرضی (چاہے وہ فرقہ کی

صورت میں ہو جاتا ہے جماعتی صورت میں) نہیں سکھاتا۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کے ختم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے لئے اتنی ہی تربیت دی جائے جتنی کہ انھیں اپنے حقوق کے حاصل کرنے کے لئے دی جاتی ہے جس دنیا میں آج کل ہم رہ رہے ہیں اس میں ممکن ہے یہ بات ناقابل عمل معلوم ہو لیکن بہرحال ہمیں کوشش کرکے ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جس شخص کے پاس جتنی زیادہ چیزیں ہوتی ہیں اتنی ہی اور زیادہ چیزیں حاصل کرنے کے لئے اس کی حرص بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جب ہم چیزوں کو دینا شروع کر دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو شریک کرنے لگتے ہیں تو خود ہماری زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں ایک سیرچشمی اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ فرقہ پرستی کا سبب روحانیت کی بنیادی کمی اور سیرت کی خرابی ہے جس کی وجہ سے ادنےٰ مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لی جاتی ہے۔ فرقہ پرستی شہریت کے اعلیٰ جذبہ کے منافی ہے اور اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے اچھا شہری ہونا نہایت ضروری ہے لیکن جن لوگوں کو اچھا شہری بنانا ہو پہلے ان کی سیرت کو اچھا بنانے کی ضرورت ہے۔

اس عام بحث کے بعد اب ہم فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو مختلف تجربے دوسرے ملکوں میں کئے گئے ہیں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض ہمارے لئے ہندوستان میں مفید اور سبق آموز ثابت ہوں۔

سوئٹزرلینڈ | سوئٹزرلینڈ ایسا ملک ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات کو اس خوبی کے ساتھ حل کیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا ہے اس ملک کے لوگوں کا تعلق کسی ایک نسل سے نہیں ہے۔ جرمن نسل کے لوگ ۱۰ فی صدی ہیں فرانسیسی نسل کے ۲۰ فی صدی اور اٹلی کی نسل کے ۷ فی صدی ان کی کوئی ایک قومی زبان بھی نہیں ہے۔ اکثر لوگ جرمن زبان بولتے ہیں اور بقیہ فرانسیسی اور اٹالین۔ مذہبی اعتقاد کے لحاظ سے بھی اسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے ۵۸ فی صدی لوگوں کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب کے مختلف فرقوں سے ہے ۴۱ فی صدی کا رومن کیتھولک

ہے۔

لیکن نسل، زبان اور مذہب کے اس اختلاف کے باوجود کم از کم گزشتہ چھ سو سال سے سوئٹزرلینڈ ایک متحد ملک رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ اس کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ یورپ کے تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس خصوصیت کے پیدا کرنے میں جن اسباب نے خاص طور پر حصہ لیا ہے وہ حسب ذیل ہیں (الف) ملک بہت مختصر اور اس کا علاقہ یکجا اور پیوست ہے۔ (ب) اس ملک میں مدافعت کے قدرتی ذرائع موجود ہیں (ج) لوگ ذہین وطن پرست اور معقولیت پسند ہیں (د) جائداد کی تقسیم نسبتاً مساوی ہے اور غریبوں اور امیروں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ (ہ) عمدہ شہری اور سیاسی روایات موجود ہیں جن پر لوگ فخر کرتے ہیں اور جن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور (و) ایک سادہ، قابل فہم اور معقول طرز حکومت موجود ہے۔

تین طاقتور پڑوسیوں کی موجودگی نے بھی سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو متحد رکھنے میں بہت مدد دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب ہندوستان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو دل میں بعض وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے ایک طویل عرصہ تک جس طرح امن و اماں کو قائم رکھا ہے اور لوگوں میں اعتماد کو پیدا کر دیا ہے کہ باہر کے حملہ آوروں سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے انگلستان انتہائی کوشش کرے گا کہیں یہ چیز تو ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و جنگ کے جاری رکھنے کا سبب نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے لوگ اپنا تحفظ اپنی ذاتی کوشش سے کرنے کے لئے مجبور ہوتے اور اگر وہ یہ سمجھتے کہ نااتفاقی کی صورت میں تباہی لازمی ہے تو انھوں نے ضرور ان ذرائع اور وسائل کو ڈھونڈھ نکالا ہوتا جن سے فرقہ وارانہ اختلافات کو ہم آہنگی کے ساتھ مٹایا جا سکتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں جس فیڈرل نظام حکومت کا رواج ایک عرصہ سے ہے اس کی وجہ سے بھی اتحاد اور پائداری کے پیدا ہونے میں بہت مدد ملی ہے۔ اس کی وجہ سے فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو بہت بڑی حد تک مقامی خودمختاری مل گئی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی سرزمین کو بے شمار چھوٹے چھوٹے خودمختار ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ضلعوں میں اکثر و بیشتر مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور ہر ایک

کے اندر اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم پائی جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے لیے اس قسم کا حل ہندوستان کے واسطے
بھی بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اگر صوبوں کو بڑی حد تک خود مختار کر دیا جائے اور مقامی حکومتوں کی قوت
میں اضافہ کر دیا جائے تو ہندوستان کے مختلف فرقوں کو اپنی قوتوں اور اہلیتوں کے استعمال کرنے
کے لیے ایک بڑا میدان مل جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر صوبوں اور مقامی قسمتوں کا انتظام اس
طرح پر کیا جائے کہ مختلف اقلیتوں کو ان کے حدود کے اندر پورا اقتدار حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی
برائی نہیں ہے۔

سوئٹزرلینڈ کی مثال سے جو ایک دوسرا قیمتی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں سیاسی
جماعتیں عام طور پر نسلی، لسانی یا مذہبی اختلافات کی بنا پر نہیں بنائی جاتیں۔ یہ صحیح ہے کہ کلریکل جماعت
کو بڑی قوت کیتھلک صوبوں سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس جماعت کے علاوہ دوسری جماعتیں
مثلاً زراعت پیشہ لوگوں کی جماعت، انڈپینڈنٹ ڈیماکریٹس کی جماعت اور سوشل ڈیماکریٹس کی جماعت
بھی ہیں جو نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کی جماعت پر انحصار نہیں کرتیں سوئٹزرلینڈ میں پارٹی کا جذبہ
بہت قوی نہیں ہے اور لوگوں کے اندر جاہ اور منصب طلبی کی خواہش بھی اتنی بڑھی ہوئی نہیں ہے
جتنی کہ ہندوستان میں ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں سوئٹزرلینڈ میں مساوات اور آزادی کے تصور کو خوب ترقی حاصل
ہو گئی ہے۔ ضمیر اور مذہب کی کمل آزادی حاصل ہے۔ کسی شخص کو کسی ایسی عبادت گاہ کا خرچ پورا کرنے
کے لیے جس کا وہ خود ممبر نہ ہو کوئی محصول ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اس بات کا ہندوستان سے مقابلہ کیجیے
جہاں انگلیکن چرچ کے بعض پادریوں کا خرچ اس قومی آمدنی سے پورا کیا جاتا ہے جو غیر عیسائیوں سے
وصول کی جاتی ہے۔ نظام حیدرآباد نے بھی جن کے ملک میں ۹۰ فی صدی ہندو اور گیارہ فی صدی مسلمان
ہیں محکمہ کلیسا قائم کرکے برطانوی ہندوستان کی پیروی کی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے علاقہ کے اندر کوئی بشپ
کا علاقہ بغیر عہدہ (کانفیڈریشن) کی منظوری کے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

تمام صوبوں میں ابتدائی تعلیم مفت ہے۔

کناڈا | یہ دوسرا ملک ہے جس نے اپنے نسلی اور لسانی مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کر لیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برطانوی اور فرانسیسی نسل کے لوگ کناڈا میں امن و امان کے ساتھ رہ رہے ہیں اور ان میں نااتفاقی کا کوئی سخت مظاہرہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ فرانسیسی زیادہ تر کیوبک کے صوبہ میں آباد ہیں ان کے مقابلہ میں برطانوی لوگ تمام مملکت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیوبک سنہ ۱۷۵۹ء سے برطانیہ کے قبضہ میں ہے اور کناڈا کا کل علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں سنہ ۱۷۶۳ء میں آگیا تھا

سنہ ۱۹۳۱ء میں کناڈا کی کل آبادی ایک کروڑ ۳ لاکھ ۷۶، ہزار ۸۶، تھی جس میں ۵۳ لاکھ ۸۱ ہزار ۷۱، تو برطانوی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ۲۹ لاکھ، ۲ ہزار ۹۹۰ فرانسیسی نسل سے۔ برطانوی نسل کی بیشتر آبادی کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب سے تھا اور فرانسیسی نسل کے لوگوں کا کیتھولک مذہب سے لیکن اس اختلاف کے باوجود دونوں نسلوں کے لوگ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

کیوبک میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں طرح کے ابتدائی مدرسہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں ایک ہی محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں اور مشترکہ محصول سے چلائے جاتے ہیں اگرچہ ان کا انتظام پوری آزادی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ پورے ملک کی تعلیم صوبہ کی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا خرچ مقامی محاصل سے پورا کیا جاتا ہے اور امداد صوبہ کی حکومت کی طرف سے ملتی ہے۔ کیوبک کے صوبہ کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہے اپنی تعلیم کے انتظام میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ صوبہ کی کیتھلک آبادی کے لئے مونٹریل اعلیٰ تعلیم کا مرکز ہے۔ کناڈا کے فرانسیسیوں کو اپنی زبان بہت زیادہ عزیز ہے اور وہ برابر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اس میں سے متروک اور اینگلیکن اصل کے الفاظ کو خارج کرتے رہیں۔

برطانیہ عظمیٰ | عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جزائر برطانیہ ایک ہم آہنگ ملک ہے اور اس میں کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کبھی موجود نہیں رہا ہے لیکن جو لوگ یہ فرض کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انگریزوں، ویلس کے رہنے والوں اور اسکاٹ لینڈ کے رہنے والوں کا تعلق ایک ہی نسل سے نہیں ہے۔ ان کا خون مختلف ہے، ان کے قومی رواج مختلف ہیں اور ایک حد تک ان کی زبان

بھی مختلف ہے لیکن پھر بھی ان تینوں گروہوں نے مل کر رہنا سیکھ لیا ہے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کا کوئی باشندہ یہ کہے کہ انگریز اس پر ظلم کر رہے ہیں تو سب لوگ اس بات پر ہنسیں گے کیونکہ نسبتاً ان کا واقعی حصہ ہونا چاہیئے تھا اسکاٹ لینڈ کے اس سے زیادہ لوگ برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدہ پر رہ چکے ہیں۔ برطانوی تجارت اور صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت اچھا رہا ہے اور اگرچہ یہ بات مذاق میں کہی جاتی ہے کہ "برطانوی سلطنت کو آئرلینڈ والوں نے حاصل کیا اور انگریز لوگ اسکاٹ لینڈ والوں کے فائدہ کے لئے اس پر حکومت کر رہے ہیں" لیکن اس میں بہت کچھ صداقت موجود ہے۔

ایک زمانہ میں مذہبی اختلافات کی وجہ سے انگلستان میں ایک مصیبت نازل رہتی تھی لیکن اب یہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ اب ایک دوسرے کو جلاتے اور قتل نہیں کرتے کیونکہ اب ایک دوسرے کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہے۔ جب خوف ہوتا ہے اسی وقت مذہب کے نام پر سزا دینے کا کام اور اس کے جواب کے طور پر انتقامی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ آج کل بھی کبھی کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ اسکاٹ لینڈ والوں اور ویلس کے لوگوں کو ہوم رول ملنا چاہیئے لیکن اس مطالبہ کی نوعیت کبھی سنجیدگی کی حد تک نہیں بڑھتی اور اس کی وجہ انگریزوں کا وہ رواداری کا سلوک ہے جو وہ اپنے ملک کے دوسرے عناصر کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

آئرلینڈ آئرلینڈ ابھی تک اپنے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا ہے۔ جیمس اول کے دور حکومت کی ابتدا میں شمالی آئرلینڈ (السٹر) میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے آدمی ترک سکونت کر کے آباد ہو گئے تھے یہ سب کے سب پروٹسٹنٹ تھے اور ان کی وجہ سے آئرلینڈ دو غیر مساوی مذہبی فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جس سے بعد میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور آج تک یہ لوگ آئرش فری اسٹیٹ کے ساتھ جس کو ۱۹۲۲ء میں دستوری آزادی مل گئی ہے متحد نہیں ہو سکے ہیں۔

اس دستور کے اندر جن حقوق کا اعلان کیا گیا ہے انھیں السٹر کے لوگوں نے اپنے لئے کافی نہیں سمجھا اس لئے وہ آئرش فری اسٹیٹ میں شامل نہیں ہوئے۔ اعلان حقوق میں اس بات کی تعریف کی گئی ہے کہ کن کن لوگوں کو آئرلینڈ میں شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ اس میں آئرلینڈ

کی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے لوگوں کے جسم اور ان کی جائداد کو ناقابل دست اندازی قرار دیا گیا ہے ضمیر عبادت زبان اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کسی مذہب کی امداد نہیں کی گئی ہے اور" مختلف مذہبی فرقوں کے انتظام میں جو مدرسے ہوں گے ان کو سرکاری امداد دیتے وقت کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا حق نہیں دیا گیا ہے۔"

تمام شہریوں کو ابتدائی تعلیم مفت دیے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے لئے بنیادی حقوق کیا ہوں۔ اس مسئلہ پر ایک عرصہ تک بحث کی جاچکی ہے اور بحث و مباحثہ کے بعد انھیں ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اب اس سوال کو از سر نو زندہ کر رہی ہے۔

جنوبی افریقہ | جنوبی افریقہ نسلی اختلافات کا دنگل رہ چکا ہے۔ اس ملک میں ڈچ، برطانیہ کے لوگ، نیگرو، رنگ دار (یعنی مخلوط نسل کے) لوگ اور ہندوستانی آباد ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جنوبی افریقہ کی آبادی کا تخمینہ جنوب مغربی افریقہ کو ملا کر ۹۵ لاکھ، ۴ ہزار ۵۰۹ کیا گیا تھا جس میں ۲۰ لاکھ ۴۴ ہزار ۲۴۳ یوروپ کے لوگ ہیں اور ۹، لاکھ ۱۳ ہزار ۷۱ غیر یورپی ہیں۔ مردم شماری میں برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کے اعداد اس وجہ سے الگ الگ نہیں دیے جاتے کہ اس سے ان دونوں فرقوں کے اختلاف کے مستقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر ہندوستان میں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیاد پر حکومت اور انتظام کے ہر شعبہ میں اعداد رکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار بھی بجائے یہ لکھنے کے کہ زید نے بکر کو مار ڈالا تقریباً ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ "ایک ہندو نے ایک مسلمان کو مار ڈالا یا ایک مسلمان گرد بیٹھا وغیرہ"

یورپ کے لوگ افریقہ میں آباد ہونے کے لئے آئے تھے اور رنگین نسل کے لوگ ان کی رعایا رہ چکے تھے۔ پہلا مسئلہ جس کے حل کرنے کی ضرورت پڑی وہ برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کا تھا جس کا انجام آخر میں جنگ بوئر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۰۸ء کے قانون نے جمہوری قوتوں کو آزادی کے ساتھ نشو و نما کا موقع دے کر ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع فراہم

کر دیا۔ لیکن اب بھی دونوں مکمل طور پر ایک دوسرے سے نہیں ملے ہیں۔ ڈچ لوگوں کے اندر ایک حد تک شکست خوردہ لوگوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تمدن برطانیہ کے برابر اچھا نہیں ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ کے لوگ اپنے آپ کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں اور اس بات کو ڈچ لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ برطانیہ کے لوگوں میں تخیل کی کمی ہے اور وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ بوئر لوگ کیوں سلطنت برطانیہ کی برکات کی تعریف اتنی ہی شد و مد سے نہیں کرتے جتنی کہ برطانوی نسل کے لوگ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آئندہ کے فسادات کے لئے ذہنی فضا تیار ہو رہی ہے۔

لیکن اس کے اثر کو زایل کرنے والے اور دوسرے اثرات بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ انگریزی اور افریقی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملازمتیں جن میں کچھ عرصہ کے لئے برطانوی نسل کے لوگوں کا اجارہ سا قائم ہو گیا تھا اب دونوں نسل کے لوگوں کے لئے کھل گئی ہیں۔ برطانوی افسر جو پہلے افریقی زبان سیکھنے سے انکار کرتے تھے اب انھیں لازمی طور پر اس زبان کو سیکھنا پڑتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی یونین کے وزیر اعظم ہمیشہ بوئر نسل کے لوگ ہوتے ہیں آپس کی شادیوں اور دو زبان بولنے والے خاندانوں کی وجہ سے اختلافات مٹتے جا رہے ہیں۔

جنرل بوتھا "ایک دھارے کی پالیسی" کا علمبردار تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے دونوں نسلیں ایک متحدہ جنوب افریقی قوم میں جذب ہو جائیں۔ لیکن یہ چیز بڑی حد تک ناقابل عمل ثابت ہوئی ہے۔ جنرل ہرٹزاک کی پالیسی "دو دھاروں کو قائم رکھنے والی پالیسی" ہے جس کی وجہ سے دونوں نسل کے لوگوں کے فرق کو قائم رکھا جاتا ہے لیکن مشترکہ مفاد کے کاموں میں شرکت کرنے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جدا کرنے والے جو رجحانات ہیں ان میں کمی اس اندیشہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر سفید نسل کے لوگوں کے اختلافات قائم رہے تو رنگین نسل کے لوگ ان پر حاوی ہو جائیں گے۔

جنوبی افریقہ میں سیاسی پارٹیوں کی تنظیم زیادہ تر نسلی بنیاد پر رہی ہے سیاسی خیالات پر نہیں۔ مگر ۱۹۳۴ء سے دو جماعتوں یعنی جنوبی افریقہ پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی کو ملا کر جنوبی افریقہ کی ایک متحدہ پارٹی بنا دی گئی ہے۔ سیاسی اصولوں اور پالیسیوں کی بنیاد پر بھی پارٹیاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گو مردم شماری میں دونوں نسل کے لوگوں کے اعداد الگ الگ نہیں دیے جاتے لیکن پھر بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ دونوں نسل کے لوگوں کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ نٹیال کے صوبہ کو چھوڑ کر باقی سب صوبوں میں ڈچ لوگوں کی تعداد برطانوی نسل کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ڈچ زیادہ تر کسان ہیں اور دیہات میں رہتے ہیں لیکن برطانوی نسل کے لوگ زیادہ تر صنعت کا کام کرتے ہیں اور شہروں میں رہتے ہیں۔ اگر اتحاد کے عناصر کافی قوی نہ ہوئے تو اندیشہ ہے کہ معاشی مفاد کے اس اختلاف کی وجہ سے آیندہ تصادم کے امکانات پیدا ہوں گے۔

ملک کے اصل باشندوں اور رنگین نسل کے لوگوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں جو سلوک کیا جاتا ہے اس کے لئے جنوبی افریقہ کافی بدنام ہو چکا ہے۔ تمام جنوبی افریقہ میں بالعموم قسم کے سلوک کو عام طور پر روا رکھتے ہیں اسکے مقابلہ میں کیپ کے صوبہ میں اصل باشندوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نسبتاً بہتر ہے۔ کیپ کی نوآبادی میں دیسی لوگوں کو لیجسلیٹو کاؤنسل میں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق ملا ہوا ہے۔ یونین کے ادنیٰ اور اعلیٰ ایوان میں بھی "سنہ ۱۹۳۶ء کے دیسی لوگوں کی نمایندگی کے قانون" کے مطابق نمایندگی ملی ہوئی ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے دیسی لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ سینیٹ کے لئے چار ممبر اور ہاؤس آف اسمبلی کے لئے تین ممبر منتخب کر سکیں۔ اور یہ ارکین اس صورت میں بھی جب کہ ایوانوں کو برطرف کر دیا جاتا ہے پانچ سال تک اپنی نشستوں پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک سخت پابندی یہ ہے کہ دونوں ایوانوں کے ارکین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ یورپی نسل کے برطانوی رعایا ہوں۔ دیسی لوگ جن چار سینیٹروں کا انتخاب کرتے ہیں ان کے علاوہ گورنر جنرل چار سینیٹروں کو دیسی مفاد کی نمایندگی کے لئے نامزد کرتے ہیں۔

پرانے بوئر لوگوں کی روایت یہ رہی ہے کہ دیسی لوگوں کو گرجا اور ریاست میں برابر کا درجہ نہ دیا جائے۔ لیکن موجودہ پالیسی انتہاپسندی کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ سیسل روڈس نے جس پالیسی کی حمایت کی تھی وہ یہ تھی کہ "زیمبیسی کے جنوب میں جتنے مہذب آدمی ہیں ان سب کو مساوی حقوق دیے جائیں" لیکن اس پر عملدرآمد ابھی تک نہیں کیا جا سکا ہے۔ سفید نسل کے لوگ دیسی لوگوں کو

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب دینے کے بھی مخالف ہیں۔

چونکہ کھلے طور پر دبانا اور جذب کرنا دونوں مشکل ہیں اس لئے آج کل جس پالیسی کی تبلیغ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں الگ رکھا جائے اور ان کے لئے متوازی ادارے علیحدہ قائم کیے جائیں اس پالیسی کے مطابق کچھ علاقے تو ایسے ہوں گے جن میں سفید نسل کے لوگوں کو اقتدار حاصل ہوگا اور رنگین نسل کے لوگ محض اجرت پر کام کرنے والے لوگوں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ لیکن دوسرے ایسے علاقے ہوں گے جن میں رنگین نسل کے لوگوں کو قانون سازی اور انتظام سلطنت کے اختیارات ملے ہوئے ہوں گے۔

متوازی اداروں کی پالیسی کے سلسلہ میں "دیسیوں کو نمائندگی دینے والی ایک کاؤنسل" قائم کی گئی ہے۔ اس کاؤنسل میں چھ سرکاری ممبر ہوتے ہیں چار گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کئے جاتے ہیں اور بارہ منتخب شدہ دیسی ممبر یعنی ہر انتخابی حلقہ سے تین تین ممبر۔ اس کونسل کا کام یہ ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں پر غور کر کے رپورٹ پیش کرے (الف) مجوزہ قانون پیش کرنا جہاں تک ان کا اثر دیسی آبادی پر پڑتا ہو (ب) کوئی اور معاملہ جس میں وزیران کی رائے طلب کرے (ج) کوئی اور دوسرا معاملہ جو عام طور پر دیسیوں کے مفاد پر اثر ڈالتا ہو۔

عدالت کے سلسلہ میں دیسی کمشنروں کی عدالتیں مخصوص علاقوں میں قائم کی گئی ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ تمام سول مقدمات اور دیسیوں کے مابین جو معاملات ہوتے ہیں ان کی سماعت کرتی ہیں ان عدالتوں کی اپیل دیسی اپیل کی عدالتوں میں کی جاتی ہے اور ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے سوائے اس صورت کے کہ یہ عدالت اس پر راضی ہو جائے کہ اس مسئلہ کے بارے میں جس کی یہ عدالت صراحت کرے گی سپریم کورٹ کی اپیل کی عدالت میں معاملہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ فوجداری کا اختیار بھی جو مجسٹریٹ کی عدالت کے مساوی ہوگا دیسی کمشنروں کی عدالت کو دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فوجداری کا ایک محدود حد تک اختیار دیسی سرداروں کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کے معاملات کے لئے دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے اداروں کو نہ تو ہندوستان کی اکثریت

پسند کرے گی نہ اقلیت جن فرقوں کے لیے یہ قائم کئے جائیں گے۔ ان کی کمتری کے بارے میں ہمیشہ کے لئے مہر توثیق، ثبت ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک متحدہ قومی جماعت نہیں بنائی جاسکے گی۔

علیحدہ کرنے کا خیال چاہے وہ جزوی علیحدگی ہو یا مکمل علیحدگی ایک باطل خیال ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وسائل آمد و رفت کی ترقی کی وجہ سے دنیا روز بروز ایک دوسرے کے قریب آتی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ جیساکہ ابراہیم لنکن نے کہا تھا "اگر ہم کالے آدمی کو باہر رکھنے کے لئے ایک دیوار بنائیں گے تو ہمیں سفید آدمی کو باہر رکھنے کے لیے سات دیواریں بنانا پڑیں گی" جہاں تک عملی سیاست کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے دیسیوں کی نصف سے زیادہ تعداد سفید نسل کے لوگوں کے علاقہ میں رہتی ہے اس لئے ان سب کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے ان کی علیحدگی سے یہ ضروری ہو جائے گا کہ ان کے لیے جتنی زمین اس وقت مخصوص کی گئی ہے اس سے زیادہ زمین مخصوص کی جائے اور دیسی مزدوروں کی جگہ سفید رنگ کے مزدوروں سے کام لیا جائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں نے اکثر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کیا ہے کہ آپنے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ حبشیوں کو دوبارہ افریقہ بھیج دیں لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا ہے۔

ہندوستان میں بھی بعض وقت یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ ملک کو دو ہندوستانوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک ہندوؤں کا ہندوستان ہو اور دوسرا مسلمانوں کا ہندوستان اور پھر ان کی ایک مشترکہ دفاقی حکومت ہو۔ مسلم ہندوستان میں افغانستان، بلوچستان، کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور سندھ شامل ہوں گے۔ کچھ حوصلہ مند حضرات یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک مسلمانوں کی سو میل چوڑی پٹی پنجاب اور بنگال کو ملانے کے لیے بنادی جائے تاکہ یہ احاطہ بھی مسلم علاقہ میں شامل کیا جاسکے۔ دوسرے حضرات کی یہ خواہش ہے کہ اس فہرست میں حیدرآباد کو بھی اس بنا پر شامل کر لیا جائے کہ یہاں کے حکمراں مسلمان ہیں اگرچہ یہاں کی ۹۰ فی صدی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ تمام ہندوؤں کو ان مسلمانوں کے لئے جو مندرجہ بالا علاقوں سے تعلق نہیں رکھتے حیدرآباد کو چھوڑ دینا ہوگا۔ ان تجویزوں کا ناقابل عمل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ پھر ڈیڑھ سو سال کے اندر اتحاد کا جو کام ہوا ہے اس کے ختم کرنے کے لیے اس

سے زیادہ یقینی طریقہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس سے اتحاد ہند کے تخیل پر ایسی ضرب کاری لگے گی کہ جس کے بعد وہ ہرگز جاں بر نہ ہو سکے گی۔

جنوبی افریقہ کے لیے اور بھی تجویزیں نسلی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ کابینہ کے طرز کی جماعت عاملہ کو منسوخ کر دیا جائے اور اس کی بجائے امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کے طرز کی جماعت عاملہ قائم کی جائے دوسری تجویز یہ ہے کہ سینیٹ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہاؤس آف اسمبلی میں جب ایسے مسودات قانون منظور ہوں جو دیسیوں کے حق میں مضر ہوں انھیں مسترد کر دے تیسری تجویز یہ ہے کہ مستقل بورڈ اور کمیشن مقرر کیے جائیں تاکہ ان کے ذریعہ غالب اکثریت رکھنے والی پارلیمنٹ کی زیادتیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ اس آخری تجویز کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ دیسی معاملات کا کمیشن" اس کام کو پہلے سے ہی کر رہا ہے لیکن اس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ اس کو دیسی مفادوں کی صحیح نمائندگی کا موقع دینے کے لیے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کمیشن کے ارکان کو ایک آل افریقہ دیسی کونسل منتخب کرے اور جب کبھی حکومت واضح طور پر دیسی لوگوں کی مخالفت کی پالیسی پر عمل درآمد کرے تو اسے مداخلت کے زیادہ اختیارات دے جائیں۔

لیکن ہمیں نہ تو دوسری تجویز معقول معلوم ہوتی ہے نہ تیسری۔ دوسری تجویز سے تو عوام کا ایوان کمزور اور بے اثر ہو جائے گا اور تیسری تجویز سے پارلیمنٹ کا اقتدار ایک قانون سے بالا ادارہ کے قائم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا۔ جس کام کا کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ ایک اقلیتوں کی کونسل یا اسٹینڈنگ کمیٹی بنائی جائے جو ان تمدنی اور معاشری مسائل پر جن سے اقلیتیں متاثر ہوتی رہتی ہیں غور کرے۔

باقی ماندہ برطانوی افریقہ | جب افریقہ کی برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہاں بھی حالت اس سے زیادہ بہتر نظر نہیں آتی۔ جنوبی روڈیشیا کو ذمہ دار حکومت ۱۹۲۳ء میں مل گئی تھی لیکن ابھی تک دیسی لوگوں کو روڈیشین پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی ہے۔ جنوبی روڈیشیا

کی پالیسی دیسیوں کے ساتھ بالکل جنوبی افریقہ کی یونین جیسی ہے۔ شمالی روڈیشیا اور نیاسالینڈ کی لیجسلیٹو کاؤنسل خالصتہً سفید نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

کینیا میں مختلف نسلی گروہوں کی نمایندگی کو ان کی تعداد سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیجسلیٹو کانسل میں گیارہ ایکس آفیشو ممبر ہوتے ہیں نو نامزد کیے ہوئے سرکاری ممبر، گیارہ منتخب کئے ہوئے یورپین، پانچ منتخب کئے ہوئے ہندوستانی، ایک منتخب کیا ہوا عرب* اور دو نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبر دیسی لوگوں کے مفاد کی نمایندگی کرنے کے لئے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے یورپین لوگوں کی تعداد صرف ۱۸ ہزار ۲۶۹ ہے۔ ایشیا کے لوگوں کی ۴۱ ہزار ۸۳۵، عربوں کی ۱۲ ہزار ۱۵۵ اور دیسیوں کی ۳۱ لاکھ ۸۶ ہزار ۷۰۰۔ غیر یورپینوں کی تعداد یورپینوں سے زیادہ ہے لیکن ان کی نمایندگی نصف سے بھی کم ہے۔ یہ لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے شور مچا رہے ہیں لیکن سفید نسل کے لوگ ان کے مخالف ہیں۔

ٹانگانیکا کی لیجسلیٹو کاؤنسل ۱۳ سرکاری ممبروں، دس نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبروں (اگرچہ عملاً صرف ۹ کو نامزد کیا جاتا ہے) ۵ یورپینوں اور دو ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ یوگانڈا کی لیجسلیٹو کاؤنسل میں ۷ سرکاری اور ۶ غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں عموماً دو ہندوستانی بھی ہوتے ہیں۔

(باقی)

سرمایہ داری اور فسطائیت

(از جناب محب الحسن صاحب بی۔اے (آنرز) لندن پروفیسر ایم۔اے۔او کالج امرتسر)

یہ سمجھنے کے لئے کہ فسطائیت[1] کیا ہے؟ اور کیوں وجود میں آئی۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہم سرمایہ داری نظام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں اس لئے کہ وہ اس کا ایک دور اور اسی کی ایک منزل ہے۔ سرمایہ داری اور فسطائیت کوئی مختلف اور متضاد چیزیں نہیں۔ ان کی بنا یکساں اصولوں پر ہے۔ دونوں میں دولت آفرینی عوام کے نکتہ نظر سے نہیں کی جاتی بلکہ نجی فائدہ کے لئے اور دونوں میں ذرائع پیداوار پر قبضہ سماج کا نہیں ہوتا بلکہ افراد کا قبضہ ضرور ہے کہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ جو کہ سرمایہ داری کے گہوارے ہیں اور جہاں اس نے نشوونما پائی ابھی ایک حد تک جمہوریت کے ڈھانچے کو قائم کئے ہوئے ہیں اور شاید اس بات سے لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ سرمایہ داری اور فسطائیت دو مختلف چیزیں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سرمایہ داری اپنی بقا کے لئے دوسرا روپ اختیار کر لیتی ہے تو اس کو ہم فسطائیت کہتے ہیں ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں صرف ظاہری شکل و صورت کا فرق ہے۔ انگلستان اور فرانس میں جمہوریت کا نام و نشان ابھی اس وجہ سے باقی ہے کہ وہاں سرمایہ داری کو اتنا دھکا جنگ عظیم کے بعد نہیں لگا جتنا کہ جرمنی میں وہ فاتح ملک تھے ان کے پاس وسیع نوآبادیاں اور مقبوضات تھیں اور اس کی لوٹ سے وہ مزدوروں کو ایک حد تک راضی رکھ سکتے تھے۔ اس وجہ سے مزدوروں نے جنگ کے بعد کبھی موجودہ معاشی نظام کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس لئے سرمایہ داروں کو اس کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ

---

[1] یہاں پر فسطائی اور نازی الفاظ ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور جو نظام جرمنی اور اٹلی میں قائم ہے اس کو فسطائیت کہا گیا ہے۔ نازی (NAZI) نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (NATIONAL SOCIALIST GERMAN WORKERS PARTY) کا مخفف ہے اور اس کا سرکاری نام NSDAP ہے۔ اس کی بنیاد ۲۰-۱۹۱۹ میں پڑی۔ اٹلی میں فسطائی (FASCIST) پارٹی صاحب اقتدار ہے۔ یہ لفظ فاشیو (FASCIO) سے نکلا ہے جس کے معنی جماعت یا اتحاد کے ہیں۔ یہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔

حکومت مطلق قائم کریں۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ جتنا سرمایہ دارانہ نظام پر زوال آرہا ہے اتنا ہی فرانس اور انگلستان میں فسطائی قوتیں ترقی پذیر ہو رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کی داخلی اور خارجی پالیسی اس کا مظہر ہیں۔ دونوں ملکوں میں مزدوروں کی جماعت پر جبر و تشدد کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اور آزادی خیال و بیان پر سخت پابندیاں عائد کی جارہی ہیں اس کے علاوہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کا رویہ چین۔ حبش۔ چیکوسلواکیہ اور اسپین سے ایسا رہا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فسطائیت کو جمہوریت پر ترجیح دیتی ہیں اور اس کی کوشاں ہیں کہ فسطائی قوتوں کا ہر جگہ یورپ میں بول بالا ہو جائے۔

سرمایہ داری کی سب سے پہلے بنیاد انگلستان میں پڑی تھی یہیں اس کو عروج ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ہم کو چاہیئے کہ اس وقت کے دوسرے یورپین ممالک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

پندرھویں صدی میں اہل پرتگال و ہسپانیہ یورپ میں ایک بہت منظم منضبط اور مہم پسند لوگ تھے یہ اس کشمکش اور جد و جہد کا نتیجہ تھا جو ان کو آزادی حاصل کرنے کے لئے موروں (MOORS) کے خلاف کرنا پڑی۔ اور جب آزادی نصیب ہوگئی تو کامیابی کے نشہ سے مخمور ہوکر انھوں نے بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ کولمبس نے نئی دنیا تلاش کی اور واسکوڈیگاما نے ہندوستان کے جانے کا نیا راستہ معلوم کیا۔ اہل پرتگال نے فن جہاز رانی و جہاز سازی میں اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کی تمام بحری تجارت پر جو کہ عربوں اور اہل وینس و جینوا کے ہاتھوں میں تھی قابض ہوگئے۔ ہسپانیہ والوں کے حصہ میں نئی دنیا اور اس کی سونے کی کانیں پڑیں اور سولہویں صدی میں یہ دونوں قومیں دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی تھیں۔

لیکن سترھویں صدی سے ان پر زوال آنا شروع ہوا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں ہالینڈ اور انگلستان نے اشتراک کرکے ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا۔ پرتگال اور ہسپانیہ خود بھی اپنی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے۔ جاگیرداری نظام اور مذہبی تعصب نے دونوں ملکوں پر ایسی جمود کی کیفیت طاری کر دی کہ وہاں کوئی ایسا طبقہ نہ پیدا ہو سکا۔ جو کہ نئی ترقیوں اور نئے اصولوں کا علمبردار ہوتا۔ ہسپانیہ قرون وسطیٰ کے نظام کی زنجیروں سے ابھی تک جکڑا ہوا تھا۔

سترھویں صدی سے ہالینڈ کا عروج شروع ہوا۔ لیکن برطانیہ سے تجارتانہ رقابت اور جدو جہد کا نتیجہ اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ ایک چھوٹا ملک تھا۔ اس لئے وہ انگریزوں سے مقابلہ نہ کرسکا۔ اس صدی کے آخر سے اس کا زوال شروع ہوا اور انگلستان اس کا قائم مقام بنا۔ فرانس نے بھی سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں بہت ہاتھ پیر پھیلائے۔ تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں۔ نئی دنیا میں نوآبادیاں قائم کیں۔ اور ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے انگلستان سے بڑی بڑی معرکہ آرائیاں کیں۔ لیکن فرانس کو اس تجارتی دوڑ میں شکست ہوئی۔ وہ بھی اسپین کی طرح جاگیرداری اور مذہبی تعصب کا شکار بن گیا۔

انگلستان کی تاریخ نے ان ممالک کے برخلاف بالکل دوسرا ہی پہلو اختیار کیا۔ یہاں بارھویں اور تیرھویں صدی سے ایک ایسا درمیانی طبقہ پیدا ہونے لگا جس نے اون کی تجارت کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی شروع کردی۔ ٹیوڈر حکمرانوں نے باغی امرا کی سرکوبی کے لئے ان سے تعاون کیا۔ جس سے ان کی قوت میں اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ جب خاندان اسٹوارٹ کا دور دورہ ہوا اور اس نے تجارت پر پابندیاں عائد کرنا شروع کردیں تو اس نئے طبقے نے مقابلہ پر کمر باندھ لی جس کا نتیجہ ۱۶۴۲ء کی خانہ جنگی تھی اور آخر کار اس نے شاہی استبدادیت اور جاگیرداری کو شکست دی اور ۱۶۸۸ء سے خود برسر اقتدار ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی تجارت میں خوب ترقی ہوتی گئی۔ اور ایسے قوانین وضوابط بن گئے جس سے اس کو اور مدد ملی۔ اس کے علاوہ انگریز فرانسیسیوں اور جرمنوں کے مقابلہ میں پہلے ایک متحدہ قوم بن گئے۔ وہ بڑی حد تک اور ملکوں کی مذہبی جنگوں سے محفوظ رہے اور دوسروں کے مقابلہ میں مذہبی رواداری بھی قائم کردی۔ پھر ملک کی آب وہوا اور اس کا (ATLANTIC OCEAN) بحر اوقیانوس میں واقع ہونا ایسی باتیں تھیں جس سے یہاں کے تجارتی طبقے نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی دولت خوب بڑھالی۔ اس کی مدد سے کارخانے قائم ہونے لگے تاکہ دوسرے ملکوں کو (اور خاصکر امریکہ کی انگریزی نوآبادیوں کو) مصنوعات بھیجی جائیں لیکن چونکہ ان کارخانوں میں صرف ہاتھ سے کام ہوتا تھا۔ اس لئے نہ صرف انگریزی نوآبادیوں کو ان کی ضروریات کا سامان پہنچانا مشکل تھا۔ بلکہ ان کے

آمدنی بھی بہت محدود تھے۔ اس وقت یہ لازم تھا کہ دولت آفرینی کا کوئی دوسرا طریقہ وجود میں آئے چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر سے ایجادات و اختراعات ہونا شروع ہوئے۔ اور ہاتھ کے بجائے مشین سے اشیاء بننے لگیں یہی وہ حیرت انگیز چیز ہے جس کو ہم صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ گویا کہ انگلستان کی جغرافیائی معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے سب سے پہلے صنعتی انقلاب یہیں آیا۔ اور موجودہ معاشی نظام جس میں ہم سب رہتے ہیں اور جس کو سرمایہ داری کہا جاتا ہے اسی صنعتی انقلاب کا سبب ہے۔ اس صنعتی انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام دنیا انگلستان کی منڈی بن گئی۔ لیکن اس کے راز زیادہ عرصہ تک دوسرے ملکوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے فرانس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے ذریعہ سے جاگیرداری نظام سے چھٹکارا حاصل کرکے صنعتی ترقی شروع کردی۔ جرمنی نے بھی انیسویں صدی کے وسط سے جبکہ وہاں قومی اتحاد قائم ہوگیا صنعت و تجارت کے میدان میں قدم رکھا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر اس صنعتی انقلاب کے دنیا پر کیا اثرات ہوئے۔ سب سے پہلا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دست کاروں کو اپنا کام بند کردینا پڑا اس لئے کہ مشین کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا بھوک اور تنگ دستی سے بچنے کے لئے ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ ملوں میں جاکر اپنی "محنت" بہت قلیل اجرت پر بیچ ڈالیں اور بجائے مالک رہنے کے سرمایہ داروں کے غلام بن جائیں اس انقلاب کا اثر کاشتکاروں پر بہت تباہ کن ہوا۔ اول تو کسان کھیتی کے علاوہ دست کاری سے بھی کچھ کما لیتے تھے لیکن مشینوں نے یہ ذریعہ آمدنی بالکل بند کردیا۔ دوسرے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کو کاشتکاری بھی ترک کرنی پڑی۔ تیرھویں صدی ہی سے انگلستان میں زمینداروں نے اپنی زمینوں کو کاشتکاروں کے قبضہ سے نکال کر احاطہ بندی شروع کردی تھی۔ اس میں وہ بھیڑیں پالتے تھے۔ کیونکہ ان کے لئے اون کی تجارت کھیتی کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش تھی۔ لیکن اس احاطہ بندی کی وجہ سے ہزاروں کسان بے روزگار ہوگئے اور شہروں میں تلاش معاش کے لئے پھرنے لگے صنعتی انقلاب نے ان کی حالت کو اور ابتر بنا دیا کیونکہ احاطہ بندی کی تحریک زیادہ شدید ہوگئی اور بڑے بڑے زمینداروں نے زراعت مشینوں کی مدد سے شروع کردی۔ بیچارے کاشتکاروں کو بے دخل

چھوڑ کر اور دیہات کی آزاد اور تندرست زندگی کو خیرباد کر کے ملوں میں غلامی کرنے کے لئے شہروں میں آنا پڑا۔

اس زمانے میں نہ کوئی فیکٹری کے متعلق قانون تھے اور نہ مزدور اتنے بیدار اور منظم تھے کہ وہ اپنے حقوق کی پاسبانی کر سکتے۔ سرمایہ دار ان سے مثل جانوروں کے برتاؤ کرتے تھے۔ کام بہت لیتے تھے لیکن اجرت اتنی بھی نہ دیتے کہ وہ اپنا پیٹ پال سکتے۔ پانچ چھ برس کے بچوں سے لے کر حاملہ عورتوں تک سے سینکڑوں گز نیچے کانوں کے اندر اتنی محنت اور مشقت کے کام لئے جاتے تھے کہ ان کا حال سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں سے چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور ان کو رہنے کی جگہ مرغیوں کے دربے سے مکانوں میں دی جاتی۔ ایک چھوٹے سے گندے اور کثیف کمرے میں پورے پورے خاندانوں کو زندگی بسر کرنا پڑتی۔ مارکس ایک county مجسٹریٹ کا مزدوروں کی حالت کے متعلق حوالہ دیتا ہے جس کو میں یہاں درج کرتا ہوں۔ "اکثر چھوٹے بچے اپنے گندے بستروں سے دو تین یا چار بجے صبح کو اٹھائے جاتے تھے اور رات کے دس گیارہ یا بارہ بجے تک ان سے بہت ہی معمولی اجرت پر کام لیا جاتا تھا۔"
یہاں پر میں ایک بیس سالہ لڑکی کا دردناک واقعہ جس کا نام میری عین واکلے تھا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ ایک بڑے اور معزز عورتوں کے کپڑے سینے کے فرم میں ملازم تھی اس کو روزانہ ساڑھے سولہ گھنٹے اور بعض اوقات تیس گھنٹے متواتر کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی لاغر تندرستی اور گھٹتی ہوئی طاقت میں قہوہ اور شراب سے جان ڈالی جاتی تھی۔ آخر کار ایک مرتبہ ایک شاہی رقص کے سلسلہ میں اس کو اعلیٰ طبقہ کی خواتین کا لباس بنانے میں ساڑھے چھبیس گھنٹے کی مسلسل محنت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس کو ایسے کمرے میں سونے کو جگہ ملی جس میں تقریباً تیس اور لڑکیاں تھیں اس میں نہ ہوا کا گذر تھا اور نہ کوئی آرام کا سامان۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری دو دن بیمار رہ کر مر گئی۔ اس واقعہ کو استثنائی نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ نمونہ ہے ان لاکھوں مزدوروں کی زندگی کا جن کو افلاس اور غم والم کے سوا کبھی آرام و آسائش سے سابقہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں تو درکنار جو سب سے زیادہ ہیبت ناک مصیبت ان کے سر پر منڈلایا کرتی

تھی۔ وہ خوف بے روزگاری تھا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ مغربی یورپ کی صنعتی ترقیوں سے کساد بازاری کا آنا لازم تھا۔ سرمایہ داری نظام میں پیدائش کی خاکہ اور تخمینہ سے ترقی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اندھا دھند طریقہ سے سرمایہ دار لوگوں کی ضروریات مدنظر نہیں رکھتے بلکہ اپنی ذاتی منفعت کو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ نئی ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ جاری رہا جس سے کہ پیدائشی قوتیں بھی ترقی کرتی گئیں سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا اور نئے نئے ذرائع پیدائش قائم ہوتے گئے اس وجہ سے اشیاء ان کی کھپت سے کہیں زیادہ پیدا ہونے لگیں۔ جس کی وجہ سے قیمتیں کم ہو جاتیں اور چونکہ فائدہ کی گنجائش کم ہو جاتی اس لیئے سرمایہ دار اپنی فیکٹریاں بند کر دیتے اور اس طرح ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جاتے۔

ان دشواریوں کا حل یوں ہو سکتا تھا کہ اول تو پیدائش ایک خاکہ اور نظام کے ساتھ کی جاتی اور یہ مدنظر رہتا کہ اس میں اور عوام کی ضروریات میں ایک توازن قائم رہے دوسرے یہ کہ مزدوروں کو اتنی کافی اجرت دی جاتی کہ وہ اپنی تمام ضروریات زندگی کا سامان خرید سکتے۔ اس طرح مال کی کثرت اور خریداروں کی کمی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ کساد بازاری کا آنا بھی بند ہو جاتا۔ لیکن اس اسکیم پر سرمایہ دار کب عامل ہو سکتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے اصولوں کے منافی ہے۔ اس کے اختیار کرنے کے یہ معنی تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے خود اپنے پیروں پر کلھاڑی ماریں۔

چنانچہ سرمایہ داروں نے اپنی مشکلات کا حل یوں کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ تاکہ ان پر سیاسی اثر یا اقتدار قائم کر کے ان کو اپنے مال کی منڈیاں بنائیں۔ انگلستان نے ہندوستان کو اس کی صنعت و حرفت کو ختم کر کے اپنی مصنوعہ اشیاء کی منڈی بنا لی اور اسی لئے اپنے اثر کا جال دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں برطانیہ عظمیٰ، فرانس، بلجیم اور جرمنی نے افریقہ میں بڑی بڑی نو آبادیاں حاصل کیں، اور تقریباً اس کے ۹/۱۰ حصے پر قابض ہو گئے لیکن باوجود اس کے سرمایہ دار ممالک کو سیری حاصل نہ ہوئی۔ ان کی حالت عمرعیار کی زنبیل کی سی تھی

جس میں جو کچھ آیا وہ ہضم ہو جاتا چونکہ سرمایہ بڑھتا رہا۔ نئی ایجادات ہوتی رہیں اور پیداواری کی قوتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس لیے جو نو آبادیاں اور مقبوضات ان کے پاس تھے وہ ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ پرانی تقسیم تسلی بخش ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز سے مغربی یورپ کے ممالک میں ایک دوسرے کے دائرۂ اثر کو اس سے چھیننے کی جد وجہد شروع ہوئی۔ جرمنی نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے صنعتی میدان میں انگلستان اور فرانس کے بعد قدم رکھا اور اس لئے اس کے ہاتھ بہت کم نو آبادیاں لگیں۔ لیکن اس نے اتنی تیزی سے ترقی شروع کر دی کہ اس کو نو آبادیاں کی کمی بہت جلد محسوس ہونے لگی۔ جرمنی کو ایسے خطہ کی ضرورت تھی جہاں سے اس کو اپنی فیکٹریوں کے لئے مال دستیاب ہو سکتا اور بدلہ میں وہ اپنی مصنوعہ اشیا بیچ سکتا۔ چنانچہ جرمنی انگلستان اور فرانس کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ فرانس اور انگلستان بھی جرمنی کی صنعتی ترقیوں اور بری اور بحری قوت کو دیکھ کر حسد کرنے لگے اور اس کی تباہی کے درپے ہوئے چنانچہ ان ممالک کے آپس کے مفاد کے تصادم کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ تھی۔

لیکن اس جنگ سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس لئے کہ اب سرمایہ داری کا آخری دور آ پہنچا تھا۔ کساد بازاری جو ایک میعادی بیماری تھی اب مستقل مرض بن گئی اور وہ تمام تضاد جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اب نمایاں طریقہ سے اپنا اثر دکھلانے لگے۔ تجارتی رقابتوں۔ انتقامی محاصل۔ اور نو آبادیوں کی از سر نو تقسیم کی جد و جہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سرمایہ دار ملک پھر دوبارہ جنگ کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ یہ اس کے فطری نقائص اس کو تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور عنصر تھا جو اس کی فنا کا کوشاں تھا۔ یہ مزدور تھے جو محسوس کرنے لگے کہ سرمایہ داروں کی تباہی اور بربادی میں ان کی نجات اور بہبودی کا راز پنہاں ہے۔ ان میں اتنا سیاسی شعور اور اتنی بیداری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سمجھنے لگے کہ سماج کا معاشی نظام بہت ناقص ہے اور اس کا مقصد صرف تباہی۔ جنگ۔ بے روزگاری اور افلاس کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے تنگ آکر انھوں نے اس کا ارادہ کر لیا کہ سرمایہ داری کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے ایسا نظام قائم کریں

جس میں ذرائع پیداوار افراد کی نہیں بلکہ تمام قوم کی ملکیت ہوں۔ پیدائش کی بنیاد ذاتی منفعت پر نہیں بلکہ ضرورت عامہ پر ہو۔

سرمایہ داروں کے سامنے ان حالات میں تین صورتیں تھیں۔ اول تو کچھ دے دلا کر مزدوروں کی تالیف قلوب کر لیتے اور اس طرح سے ان کو باغیانہ رویہ سے باز رکھتے۔ انیسویں صدی میں وہ اس اصول پر ایک حد تک عامل رہے اس لئے کہ اپنی نوآبادیوں کی لوٹ کے مکلف دسترخوان سے وہ چند سوکھے ٹکڑے مزدوروں کو بھیک دے سکتے تھے لیکن بیسویں صدی سے ان مقبوضات اور نوآبادیوں کی قومی تحریکوں اور صنعتی ترقیوں نے اس امر کو مشکل بنا دیا۔ اس کے علاوہ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں کامیابی کی یہی صورت ہے کہ مزدوروں کو جتنی ہی کم اجرت دی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن مزدور اس پر کب راضی تھے وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اس وقت سرمایہ داروں کے سامنے دو طریق کار تھے یا تو وہ مزدوروں سے بغیر مقابلہ کئے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیتے اور اپنی تباہی کو قبول کرتے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کہ کوئی جماعت بغیر قوت آزمائی کئے ہوئے اپنے مفاد کو نہیں چھوڑتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مزدوروں کی قوت بالکل ختم کر دی جائے کیونکہ یہی ان کے پہلو میں سب سے بڑا خار تھا۔

جرمنی۔ اٹلی اور آسٹریا کے سرمایہ داروں نے اسی اصول پر عمل کیا اور اپنی بقا کے لئے ایک ایسی مطلق العنان حکومت قائم کر دی جس کا مقصد مزدوروں کی طاقت کو فنا کر دینا تھا۔ اس استبدادی نظام کو ہم فسطائیت کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ممکن ہو گیا کہ سرمایہ داری کی بوسیدہ عمارت کچھ عرصہ کے لئے جبر وظلم کے کمزور ستونوں کے سہارے پر رک سکے۔ گویا کہ فسطائیت اس وقت وجود میں آئی جبکہ سرمایہ داری نظام اپنے خلقی نقائص۔ تضاد اور مزدوروں کے حملوں کی وجہ سے اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے آکر اس میں ذرا جان ڈال دی۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اشتراکی لیڈروں نے اپنی کمزوری۔ مصالحت پسندی اور غداری سے فسطائی تحریک کو کس قدر تقویت دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور مزدوروں کی صحیح رہنمائی کرتے تو آج جرمنی اور اٹلی میں اشتراکیت

کا بول بالا ہوتا۔ لیکن ان کی حماقتوں سے سماجی انقلاب ناکامیاب ہوا اور اس کا جواب سرمایہ داروں نے فسطائیت سے دیا۔

اگر یورپ کے جنگ عظیم کے بعد کے واقعات پر ایک نظر دوڑائی جائے تو نہ صرف سرمایہ داری اور فسطائیت کے رشتہ پر روشنی پڑسکتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوسکتا ہے کہ فسطائیت کو جرمنی، آسٹریا اور اٹلی میں کیوں فتح ہوئی اور انگلستان اور فرانس میں کیوں نہ ہوئی۔ میں اس مضمون کی ابتدا میں فرانس اور انگلستان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وجہ سے اب میں اپنے کو جرمنی اور اٹلی ہی کے حالات تک محدود رکھوں گا جرمنی کو جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے جنگ عظیم میں شکست ہوئی۔ فاتح ملکوں نے اس کی تمام افریقہ کی نوآبادیوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ یورپ میں الساس اور لورین Alsace and Lorraine جو کہ ۱۸۷۱ء سے اس کے قبضہ میں تھے۔ فرانس کو واپس دلا دئے گئے۔ اس پر کئی ارب پونڈ کا تاوان لگایا گیا، اور جب وہ دے نہ سکا تو ۱۹۲۳ء میں فرانس نے روہر Ruhr کی کوئلہ کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے جرمنی کے معاشی نظام کی چولیں ہل گئیں۔ بین الاقوامی کساد بازاری کے اثرات یہاں اور ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ شدید پڑے۔ اس لئے یہاں کے سرمایہ داروں کے سامنے اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ وہ کسی ایسے نظام کو قائم کریں جو ان کی نوآبادیاں دلائے۔ جو جرمنی کو دنیا میں پھر ایک طاقتور ملک بنا دے اور جو سب سے زیادہ اہم بات تھی وہ یہ کہ وہ مزدوروں کی طاقت کو ختم کر دے۔

جرمنی میں مزدور بہت باشعور اور منظم تھے اور لڑائی کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ ان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہیئے جو کہ واقعتاً ان کی حکومت ہو اور جو ان کے حقوق کی پاسبانی کر سکے۔ یہی وجہ ہے انھوں نے ۱۹۱۸ء کا انقلاب کیا اس کے بعد ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۹ء میں پھر انھوں نے اشتراکی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے لیڈروں کی غداری کی وجہ سے یہ تحریکیں ناکامیاب رہیں۔ مگر اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کا

۱؎ یہ جرمنی کی اشتراکی پارٹی تھی جس کی بنیاد کارل مارکس (Karl Marx) اور اینگلس Engels نے ڈالی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدا میں قوم پرستی کا اثر ہو گیا اور ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اپنے اصولوں کے خلاف قیصر Kaiser جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی مرتبہ اشتراکی حکومت قائم کرنے کا موقع ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک جرمنی میں اسی کا اقتدار

اثر کم ہونے لگا اور مزدور کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہونے لگے۔ سرمایہ دار یہ حالت دیکھ کر کب [illegible]
نہ بیٹھ سکتے تھے۔ جب تک کہ اشتراکی پارٹی ان کے لئے مفید تھی انھوں نے اس کی اور [illegible]
رواداری کی۔ لیکن جب مزدور اس کی قیادت سے منکر ہونے لگے اور بغاوت کے علم بردار ہوئے
تو وہ نازیوں کے ذریعہ سے ان کو پسپا کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اگر ہم جرمنی کی نازی NAZI
پارٹی کی تاریخ دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی نشو ونما میں سرمایہ داروں نے کس قدر مدد دی ہے
جب ۱۹۲۳ء میں ہٹلر نے بویریا Bavaria کی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو لیوڈنڈارف
Ludindorff نے جو جنگ عظیم میں سپہ سالار رہ چکا تھا اس کی سازش میں بڑا حصہ لیا۔ ڈیوک
ولیم آف بویریا۔ Bavaria۔ ڈیوک آف برنزوک BRUNSWICK کروپس KRUPPS اور
مانڈس Monds وغیرہ جو کہ بہت زبردست سرمایہ دار تھے نازیوں کی برابر مالی اور فوجی امداد
کرتے رہے۔

اٹلی میں بھی فسطائیت انھیں وجوہات سے قائم ہوئی جیسے کہ جرمنی میں۔ اس وجہ سے یہاں
پر اس کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ فرق ہے وہ مقامی حالات کی بنا پر ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کی فتح
ہوئی اس لئے کہ وہ ایک حد تک شکست خوردہ قوم کے جذبات کی نمایندگی کرتا تھا۔ لیکن مسولینی نے
یہ نعرہ بلند کیا کہ اگرچہ اٹلی نے جنگ میں فتح پائی ہے لیکن صلح میں اس کو شکست ہوئی۔ اٹلی کو لندن
کے پوشیدہ صلح نامے میں شہر فیوم اور علاقہ ڈالیشار DOLMESIA
کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ورسائی .... کے صلح نامے میں انگلستان فرانس اور امریکہ نے
اس کا ایفا نہ کیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسولینی نے قومیت اور قومی عزت و اہمیت کے جذبات
ابھار کر اپنی پارٹی کی قوت کو بہت بڑھا لیا۔ لیکن فسطائیت جرمنی اور اٹلی دونوں جگہوں میں سرمایہ
داری اور اشتراکیت کی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ مزدوروں کی [illegible]
[illegible] اس کی [illegible] سے نازی پارٹی ترقی کرتی رہی۔ ان حالات کو دیکھ کر [illegible]
[illegible] کمیونسٹ پارٹی Communist Party کی بنیاد ڈالی۔

کو برباد کر دیں گے تو اشتراکیت کی فتح ہوگی۔ اسی لئے انھوں نے ایسی پارٹی کی جو ان کی مطلب براری کرے بنیاد ڈالی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ دار بغیر مسولینی اور اٹلی کی رائے کے تصرف نہیں کر سکتے اور چونکہ ان ڈکٹیٹروں اور سرمایہ داروں میں کبھی کبھی داخلی اور خارجی پالیسی پر اختلاف ہوجاتا ہے اس لئے ان ملکوں میں سرمایہ داری نظام نہیں ہے۔ یہ رائے بالکل غلط ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ سماج کے اور پیدائش بھی فائدہ کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ عوام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ یہ ضرور ہے کہ فسطائیت سرمایہ داروں پر پابندیاں عائد کرتی ہے لیکن یہ بھی ان کے فائدہ کے لئے۔ سرمایہ دار نوآبادیاں چاہتے ہیں جہاں سے ان کو کچا مال مل سکے اور اس کے بجائے اپنی مصنوعات بیچ سکیں۔ لیکن نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایک زبردست مسلح فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ پر بغیر ہٹلر اور مسولینی کی رائے کے تصرف نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ جرمنی اور اٹلی کی دولت کا بیشتر حصہ اسلحات جنگ بنانے میں صرف کیا جائے اور یہی جرمنی اور اٹلی میں ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ عوام کے آرام و آسائش کے لئے روپیہ صرف کیا جائے فسطائی ایک تباہ کن جنگ کے لئے سامان بنانے میں مشغول ہیں۔ باوجود ان باتوں کے جرمنی اور اٹلی کے موجودہ حالات یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں سرمایہ داروں کی آمدنی برابر بڑھ رہی ہے لیکن مزدوروں کی اجرت برابر کم ہوتی جاتی ہے اور اسی وجہ سے ان کا معاشی معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔

بعض لوگ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ چونکہ انگلستان اور فرانس جیسے سرمایہ دار ملکوں میں جمہوریت ہے اس لئے فسطائیت اور سرمایہ داری میں یقیناً کوئی بنیادی فرق ہوگا۔ لیکن یہ تجزیہ غلط ہے۔ سرمایہ دار جمہوریت کا ڈھونگ اس وقت تک رچاتے ہیں جب تک کہ ان کے ذاتی مفاد معرض خطر میں نہ ہوں۔ وہ اعتراضات اور تنقیدات سے نہیں گھبراتے لیکن جب اپنی حالت کو خطرے میں پاتے ہیں تو استبدادیت قائم کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ موجودہ

سبھائیں توڑ دی جاتی ہیں۔ چناؤ بالکل ایک رسمی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ قانون ساز جماعتیں برائے نام قائم رہتی ہیں اور آزادی خیال و بیان پر طرح طرح کی سختیاں اور پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جرمنی اور اٹلی کے عوام ان مظالم کو کیوں برداشت کرتے ہیں۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ فسطائی مزدوروں کے باشعور طبقہ کو جبر و تشدد سے دبائے رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی چالوں کو پہچانتے ہیں۔ دوسروں کے لئے جن میں سیاسی بیداری کم ہے اور جو حالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے سرمایہ داروں کے فسطائی ایجنٹ ان کو راضی رکھنے کے لئے نئے نئے جذباتی اور دل خوش کن نظریئے ایجاد کرتے ہیں۔ کبھی ان کو سوشلسٹ، کمیونسٹ اور یہودی کی نفرت کا نشہ پلایا جاتا ہے تاکہ اس میں وہ اتنے مخمور ہو جائیں کہ اپنی پریشان حالی کا احساس نہ کر سکیں اور کبھی اسی لئے ان کی توجہ بیرونی فتوحات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔

اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ داری نے اپنی بقا کے لئے یہی طریقے اختیار کئے ہم انگلستان میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے استبدادی نظام کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جتنا ہی اس کا معاشی نظام کمزور ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی وہاں فسطائی رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

ہندوستان اور بین الاقوامی تجارت

(از جناب ریاض الحسن صاحب)

یورپ کے دور جدید کی تاریخ میں دو چیزیں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو قومی ریاستوں کا تصور اور ان کا قیام اور دوسرے صنعتی انقلاب۔ موجودہ زمانے کی قومیت کا نظریہ ہم کو انھیں قومی ریاستوں کی ترقی اور بقا کی کوششوں میں ملتا ہے۔ قومیت کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے لیکن عام تعریف یہ کی جاتی ہے کہ قومیت ایک خاص جغرافیائی حدبندی کے اندر اس خطے کے لوگوں کا آپس میں خیال و عمل کی یکسانی اور یک رنگی پیدا کرنا ہے۔ اس یکسانی سے جو ریاست بنیگی وہ قومی ریاست ہوگی اور وہ اپنی حدود کے اندر کامل طور پر خود مختار ہوگی۔

انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب بدنظمی پھیلی تو نپولین نے بڑی ہوشیاری سے تمام قوتوں کو سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد فرانس کے تخت پر قبضہ کر بیٹھا۔ اس زمانے میں اس کی برابر یہ کوشش رہی کہ فرانس کی کھوئی ہوئی طاقت کو از سر نو حاصل کیا جائے اور یورپ پر فرانس کا سکہ دوبارہ بٹھایا جائے۔ نپولین کے اس فعل سے یورپ کی دوسری قوموں میں غم و غصہ کا جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ لوگ جوابی کارروائی پر تیار ہو گئے۔ منجملہ اور کئی چیزوں کے اس جوابی کارروائی نے بعد کو قومیت کا رنگ پکڑا جس سے آپس میں دشمنی اور رقابت کی آگ اور تیز ہوگئی۔ یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ اٹلی نے اپنے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنا شروع کیا اور مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر آخرکار ایک قومی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں ایک نیا فلسفہ تعلیم رائج ہوا جس سے جرمنی کی مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملا کر جرمنی قوم کی یک رنگی اور وحدت پر زور دیا جانے لگا۔ ساتھ ہی وہ تمام تدبیریں سوچی جانے لگیں جو ان کاوٹوں کو ہٹا کر ایک واحد جرمن قوم کے بننے میں مددگار ہوں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان سے ایک دوسرے قسم کے انقلاب کی ابتدا ہوئی جو قومیت

کی طرح رفتہ رفتہ یورپ کے تمام ملکوں پر کم وبیش پھیل گئی۔ یہ صنعتی انقلاب کی لہر تھی جس نے سماج کے بہت سے پرانے بندھنوں کو توڑ دیا اور بہت سے نئے رشتے پیدا کر دئے۔ بھاپ سے چلنے والا انجن ایجاد ہوا۔ پھر اس کی مدد سے بہت سے تیلی گھر بن گئے۔ لوہے کے بڑے بڑے کارخانے کھلے اور ریل اور جہاز خشکی اور پانی پر سفر کرنے لگے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان جو اپنا بیکار وقت چوپالوں میں بیٹھ کر کھیل تماشا یا گپوں میں گزارتے تھے رفتہ رفتہ مزدور بن گئے اور کارخانہ کی سیٹی اور انجن کی بھک بھک کے منتظر رہنے لگے۔ ان نئے نئے طریقوں سے دولت کی پیدائش میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

انیسویں صدی میں ساٹھ ستر سال کے اندر یہ صنعتی انقلاب انگلستان سے نکل کر براعظم یورپ پر اپنا اثر دکھانے لگا۔ ۱۸۳۰ء کے بعد فرانس میں ریلوں کا جال بچھنا شروع ہوا اور لوہے اور دوسری مصنوعات کے کارخانے کھلنے لگے۔ ۱۸۵۰ء کے بعد جرمنی اسی راستہ پر چلنے لگا اور اس صدی کے آخر میں تو روس اور جاپان بھی اسی صف میں شامل ہو گئے۔ جس طرح انقلاب فرانس اور نپولین کی بڑھتی ہوئی طاقت نے یورپ میں قومیت کی روح کو ابھارا تھا اسی طرح انگلستان سے جو صنعتی انقلاب کی لہر اٹھی اس نے قومیت کو معاشی رنگ میں رنگ دیا۔ قومیت نے جب صنعتی ترقی کا لبادہ اوڑھا تو وہ لوگ جو جنگ کے وقت پرانے قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے اب عمدہ قسم کی توپوں، بندوقوں، بموں اور دیگر آلات جنگ کا استعمال کرنے لگے۔ اس ہنگامے سے قوموں میں جو نفسی نفسی کی کیفیت پہلے سے پیدا ہو گئی تھی اس کو تقویت پہنچی اور ہر ملک کے پیش نظر بس یہی خیال تھا کہ لڑائی کے وقت بچاؤ کی بہترین ترکیب کیا ہوگی اور وہ کون سا حربہ ہوگا جس سے دشمن کو زیر کر کے قومی وقار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے لوہے کے بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے، مصنوعات کو فروغ دینے اور آلات جنگ کے سستے اور بڑی تعداد میں بنانے کا راستہ دکھایا۔ فرانس اور جرمنی نے اس انقلاب سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو زک دینے کی پوری کوشش کی۔

سائنس کی ترقی نے صنعت کی دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا تھا اس کا اثر سیاست پر بھی پڑا۔ اول

تو وسائل آمدورفت کی ترقی سے جو غلہ پہلے دوسرے ملکوں سے نہ آسکتا تھا' وہ اب یورپ کی منڈیوں میں آکر بکنے لگا۔ دوم سائنس کی مدد سے کھیتوں کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ زمین نے اپنی دولت اگلنی شروع کر دی۔ اس سے بعض ملکوں میں غلہ اور بعض میں مصنوعات کی کثرت نظر آنے لگی۔ شروع کے پچاس برسوں میں تو یورپ کے ملکوں میں تجارت کی خوب گرم بازاری رہی۔ جہاں جہاں مقامی محصول یا چنگی تھی وہ اٹھا دی گئی۔ اور بڑے بڑے ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھانے اور درآمد پر محصول کو گھٹانے کے لئے معاہدے بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ملک بالکل صنعتی بننے لگے اور بعض بالکل زراعت پیشہ۔ چنانچہ انگلستان میں کھیتی باڑی کا کام تقریباً ختم ہو گیا اور لوگ کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ برطانوی مصنوعات کی دنیا میں مانگ بڑھی کیونکہ اس وقت برطانیہ ہی صنعتی زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ گو امریکہ میں کسی قدر پابندیاں تھیں مگر دنیا کے بازار برطانیہ کے کارخانہ داروں کے واسطے کھلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سستی سے سستی کچی پیداوار خریدتے اور پھر ان کو کارخانوں میں بنا کر نفع کے ساتھ بیچ دیتے۔ یہ گویا آزاد تجارت کا اصول تھا جس کی رو سے جو چیز جہاں سستی سے سستی ملے وہاں سے لی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد تجارت کا یہ طریقہ اس صورت میں کہ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوں اور قومی و نسلی منافرت اور کمزور ملکوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہش نہ ہو بہت اچھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ بیماری انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

آزاد تجارت سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو ملک پکی چیزیں نہیں پیدا کر سکتے ان کو پکی چیزیں سستی مل جاتی ہیں۔ پکی چیزیں پیدا کرنے والے ملکوں کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بڑے بڑے کارخانے کھل جاتے ہیں اور ان میں وہ حسب ضرورت سامان جنگ بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس سے دوسری قوموں پر ان کا اثر و رعب قائم ہوتا ہے اور لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ کچی پیداوار والے ملک بے بس ہو جاتے ہیں اور کسی آفت کے وقت بجائے اپنی طاقت کے دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جنگ کے وقت جب آمدورفت کا سلسلہ کٹ جاتا ہے تو صنعتی ملک والوں کو بھی فاقہ کشی کا خطرہ ہوتا ہے۔

آزاد تجارت کا اصول تمام دنیا کو ایک بڑی منڈی تصور کرتا ہے اور کسی قسم کی انسانی پابندی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس طرز کا سب سے بڑا مفکر انگلستان کا مشہور معاشی آدم اسمتھ گزرا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ذاتی طور پر ہر شخص اپنا نفع نقصان پہچانتا ہے اس لئے ہر شخص کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے نفع کی خاطر تجارت کرے۔ اس صورت میں مقابلہ سخت تو ہوگا لیکن نفع وہی کمائے گا جو اچھے سامان پیدا کرے گا۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے ریاست کو آزاد تجارت میں کبھی دخل نہ دینا چاہئے کیونکہ دخل اندازی سے دولت کی پیدائش میں جو تجارت کا عین مقصد ہے، کمی ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے معاشیات کے ماہروں نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سب سے مشہور جرمنی کا معاشی فریڈرک لسٹ (FREDERICK LIST) ہے۔ لسٹ کا خیال ہے کہ ہر قسم کی معاشی تحریک کو اول ملک اور قوم سے وابستہ ہونا چاہیئے اور اس کا مقصد بجائے دولت کی افزائش کے ملک اور قوم کی ترقی ہونا چاہیئے۔ آدم اسمتھ کی طرح وہ بھی آزاد تجارت کا قائل ہے مگر کہتا ہے کہ آزاد تجارت اس وقت ہو جب تمام ملکوں میں مقابلہ کی طاقت یکساں طور پر پیدا ہو جائے۔ اگر ایک ملک قدرتاً کمزور ہے اور اس میں معاشی ذرائع کم ہیں تو وہ مضبوط اور معاشی ذرائع رکھنے والے ملک کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اور تباہ ہو جائے گا۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے وہ بیرونی تجارت پر پابندی عائد کرنے کے حق میں ہے تاکہ اس پابندی کے سایہ میں ملک معاشی ترقی کر سکے اور جب کمزوری دور ہو جائے تو آزاد تجارت قائم ہو جائے۔ آدم اسمتھ اور لسٹ میں فرق یہ ہے کہ آدم اسمتھ تمام دنیا کو ایک ہی تجارتی حلقہ شمار کرتا ہے اور مضبوط اور کمزور ملکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ برخلاف اس کے لسٹ قوموں کی معاشی ترقی کی بنیاد ان کی ذاتی حیثیت اور ان کی مخصوص ملکی کیفیت پر رکھتا ہے تاکہ جب سب قومیں اپنی اپنی جگہ ترقی کر لیں تو ان میں اتحاد ہو سکے۔

لسٹ نے اپنی کتاب "علم المعیشت کا قومی نظام" ۱۸۴۱ء میں شائع کی اور تھوڑے ہی دنوں بعد جرمنی کو اس کی صداقت کا احساس ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے بیچ میں جب

یورپ میں غلہ سستا ہونے لگا تو جو ملک غلہ سستا نہیں پیدا کر سکتے تھے ان کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کسان بھوکوں مرنے لگے۔ کھیت ویران ہو گئے کیونکہ بازار میں دام کم ہو جانے سے کسان کھیتی چھوڑ کر دوسرے پیشوں میں لگ گئے۔ ان کسانوں کی روزی کا معاملہ بہت سخت تھا خاص کر ان ملکوں کے لیے تو اور بھی سخت تھا جہاں فوجی بھرتی کا دارومدار کسانوں پر تھا۔ جرمنی اور فرانس مدتوں سے ایک دوسرے کے حریف چلے آتے تھے اور ان کی فوجوں میں سپاہی بھی کسانوں کے لڑکے ہوتے تھے اس لیے یہ دونوں ملک کسی طرح بھی آزاد تجارت پر چل کر کسانوں کی تباہی برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ آزاد تجارت کو ختم کرنے کے لیے پہلا قدم جرمنی نے اٹھایا اور یہ قدم جیسا کہ ظاہر ہے محض معاشی غرض سے نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ اس میں فوجی اور سیاسی غرض بھی چھپی ہوئی تھی۔ یہ گویا معاشی قومیت کی ابتدا تھی۔ سنئے ذوق کے ایک شعر میں عشق اور تجارت کو کس طرح نبھایا گیا ہے۔ کہتے ہیں[۹]

اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا — ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

تجارت میں نقصان کا افسوس اور پھر دل کو بازار سے اٹھا لینا کیا چیز ہے؟ ذوق کا یہ فعل بالکل معاشی قومیت ہی کے انداز میں تو ہے جس کا اشارہ انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

بیرونی تجارت پر محصول لگا کر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ یہ محصول دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک محصول تو وہ ہوتا ہے جو صرف ملک کے بجٹ میں آمدنی بڑھانے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ اس کی شرح بہت معمولی ہوتی ہے۔ دوسرا محصول وہ ہوتا ہے جو ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور نئی نئی صنعتوں کو قائم کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ اس کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں تو سو فی صدی سے بھی اوپر جاتی ہے تاکہ کسی خاص چیز کا داخلہ ملک میں رفتہ رفتہ کم ہو جائے۔ فرانس اور جرمنی کی سنہ ۱۸۷۰ء والی لڑائی نے دونوں ملکوں میں فولاد کے کارخانوں کی اہمیت بہت بڑھا دی اور ان کارخانوں کی ترقی کے ذریعے سوچے جانے لگے ۱۸۷۹ء میں جرمنی میں پہلے پہل بسمارک کی تحریک سے ایک نیا قانون منظور ہوا جس کی رو سے باہر سے آنے والے غلہ اور تمام سامان تجارت پر محصول لگا دیا گیا۔ دو برس بعد فرانس میں بھی ایسا ہی محصول جاری

ہوا یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ ۱۹۱۰ء تک سوائے انگلستان کے یورپ کے تمام بڑے بڑے ملکوں نے درآمد پر حفاظتی محصول لگا کر آزاد تجارت کو ختم کر دیا۔ انگلستان جو آزاد تجارت کا قلعہ سمجھا جاتا تھا وہاں بھی تحریک ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں سیاسی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں تقریباً ہر ملک کی یہی کوشش رہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی وقار اور جنگی قوت کو بڑھائے اور دنیا کے بازاروں پر قبضہ حاصل کرکے اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ اس کوشش نے پرانی رقابتوں کو خوب بھڑکایا جس کا نتیجہ جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جنگ عظیم نے رہی سہی آزاد تجارت کو ختم کر دیا جنگ کے زمانہ میں تمام ملکوں نے اپنی پرانی صنعتوں کو ترقی دی اور بعض نئی صنعتیں قائم کیں۔ جنگ کے بعد اپنی ترقی یافتہ صنعتوں کی حفاظت کے لئے ہر ملک میں محصول درآمد پر اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۱۹ء کے بعد سے تو دنیا میں ہر طرف حفاظتی محصولوں کی اونچی اونچی دیواریں نظر آتی ہیں جنھوں نے تجارت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ خود برطانیہ میں ۱۹۲۲ء میں قانون تحفظ صنعت منظور ہوا لیکن اس تجارت کی بندش سے دنیا کے لوگ تنگ آ گئے مگر کوئی ملک پہلے محصول کم کرنے کو تیار نہ تھا بہرحال اس حالت کو دور کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ ابھی یہی گو مگو کا عالم تھا کہ ۱۹۲۹ء میں معاشی بدحالی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سے حفاظتی محصولوں میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ ہر ملک ایک تجارتی حصار کے اندر بند ہے البتہ کہیں کہیں چند ملک آپس میں تجارتی معاہدہ کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے مال پر رعایتیں کرتے ہیں۔ اس سے محصولوں میں کمی تو ضرور ہوئی مگر برائے نام۔ ان حالات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں آزاد تجارت کا دور شاید اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

یہ تو آپ نے دنیا کی تجارت کا حال سنا۔ اب ذرا ہندوستان کی بیرونی تجارت کا حال سنئے۔ ۱۸۵۸ء میں ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی سے نکل کر برطانوی حکومت کے قبضہ میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگلستان میں ہر طرف آزاد تجارت کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ اس کا اثر ہندوستان کی

تجارت پر بھی پڑا۔ ۱۸۵۸ء سے پہلے ہندوستان کی بیرونی تجارت آزاد تھی البتہ بعض چیزوں پر برائے
نام محصول آمدنی کے لیے لگا دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حکومت کو کافی رقم خرچ کرنا پڑی
بجٹ کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۸۵۹ء میں سوتی کپڑوں پر محصول درآمد ۵ فی صدی سے بڑھاکر
۱۰ فی صدی کردیا گیا لیکن تین برس بعد یہ گھٹا کر پھر ۵ فی صدی کر دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں یہ ۵ فی صدی محصول
بھی اٹھا دیا گیا اور برائے نام محصول نمک، شراب، اسلحہ اور افیون پر رہ گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں
بعد برما میں لڑائی چھڑ گئی اور سرحد پر بھی فوج کشی ہوئی جس سے حکومت کو کافی خرچ برداشت کرنا پڑا
اور روپیہ سال بہ سال بڑھتا گیا تا آنکہ ۱۸۹۴ء کے بجٹ میں ۳½ کروڑ کا گھاٹا ہوا۔ اس کمی کو پورا
کرنے کے لیے حکومت نے سوائے سوتی کپڑوں کے تمام اشیاء درآمد پر ۵ فی صدی کا عام محصول لگا
دیا لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتی کپڑے پر بھی ۵ فی صدی محصول لگانا پڑا مگر حکومت نے
ساتھ ہی دیسی ملوں کے مال پر بھی ۵ فی صدی کا ٹیکس لگایا جو دو برس بعد گھٹا کر ۳½ فی صدی کر دیا
گیا یہ صورت جنگ عظیم تک جاری رہی۔ جنگ کے زمانہ میں بیرونی وسائل آمد و رفت کے کم ہو جانے
سے ہندوستانی صنعت و حرفت کو کافی ترقی ہوئی۔ بہت سی نئی نئی صنعتیں کھل گئیں اور پرانی
صنعتیں چمک اٹھیں۔ کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں عام محصول درآمد کی شرح بڑھا
کر ۷½ فی صدی کردی گئی اور چھ برس بعد جب مزید آمدنی کی ضرورت ہوئی تو یہ شرح ۱۵ تک پہنچ گئی۔

اب تک ہندوستان آزاد تجارت کے اصول پر چلتا رہا۔ مگر جنگ نے جو سبق دیا اس سے
معلوم ہوا کہ صنعت کی ترقی ازبس ضروری ہے۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت نے انڈین فسکل کمیشن مقرر کیا
اور اس سے ہندوستانی صنعت، تجارت اور اس کی حفاظت کے لیے رائے طلب کی۔ کمیشن نے
بیرونی تجارت کو محفوظ اور محصول درآمد میں موثر اضافہ کا مشورہ دیا اور بتایا کہ ایک ٹیرف بورڈ قائم
کیا جائے جس کا فرض یہ ہو کہ وہ ہر اس صنعت کی تحقیقات کرے جس کو محفوظ کرنے کا مطالبہ کیا جائے
اگر تحقیقات کے بعد ثابت ہو جائے کہ فلاں صنعت کو حفاظت کی ضرورت ہے تو ٹیرف بورڈ کی
سفارش پر حکومت محصول بڑھا دے۔ حکومت نے کمیشن کی رپورٹ منظور کر لی۔ اب ہندوستان گویا آزاد

تجارت سے نکل کر محفوظ تجارت کے اصول پر چل رہا ہے۔

اس کمیشن کی سفارش کے مطابق جو ٹیرف بورڈ بنا اس کے سامنے لوہے، فولاد، روئی، شیشہ اور شکر وغیرہ کے کارخانوں کی تحقیقات اور ان کو محفوظ کرنے کے مطالبے ہوئے۔ تحقیقات کے بعد اس قسم کی باہر سے آنے والی چیزوں پر محصول بڑھا دیے گئے۔ اس کی وجہ سے تمام صنعتوں کو ترقی ہوئی خصوصاً شکر سازی نے تو بہت ترقی کی کروڑوں روپے کے بجائے اب صرف ساٹھ ستر ہزار کی باہر سے آتی ہے اور ملک اپنی ضرورت آپ پوری کر لیتا ہے اسی طرح لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کافی ترقی ہوئی۔ روئی کے کارخانوں کو تو کچھ لڑائی سے فائدہ ہوا اور کچھ حفاظتی محصول سے۔ آج کوئی ۳۵۰ سے اوپر ملیں چل رہی ہیں جو ساٹھ فی صدی سے زیادہ ہندوستان کی ضروریات کو پورا کر لیتی ہیں۔ لیکن صنعت کی ترقی میں ایک چیز کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اور وہ ہماری سودیشی تحریک ہے اس تحریک نے لوگوں کے رجحان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ دیسی کپڑے اور دیسی چیزوں کا استعمال بڑھ گیا جس سے ملکی صنعت کو بہت فروغ ہوا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ۱۹۲۹ء کی معاشی بدحالی نے بین الاقوامی تجارت کو بہت نقصان پہونچایا۔ اس نقصان کو کم کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے اوٹاوا میں ایک تجارتی معاہدہ مرتب کیا جس میں ہندوستان، برطانیہ اور برطانوی نوآبادیاں شریک تھے۔ اس معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ اور برطانوی شاہنشاہی کے تابع جو ملک ہیں ان کی آپس کی تجارت کو بڑھایا جائے مثلاً اجنبی ملکوں سے مال کے مقابلہ میں ان ملکوں میں ایک دوسرے کا مال کم محصول پہ داخل ہو سکے گا۔ اس رعایت سے بعض ملکوں کی تجارت کو کسی قدر فائدہ ضرور ہوا۔ ہندوستان میں اس معاہدہ کی رو سے برطانوی مال کم محصول پہ آتا ہے اور اسی طرح ہندوستان کے مال کو انگلستان میں بہ نسبت غیر ملکوں کے ترجیح دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے محصول درآمد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر شرح ۱۵ فی صدی سے شروع ہو کر ۵۰ فی صدی تک پہنچتی ہے۔ اوٹاوا کا عہد نامہ اسمبلی نے رد کر دیا اور اب علیحدہ علیحدہ دوسرے ملکوں سے تجارتی معاہدہ کرنے کی رسم پڑ چکی ہے

جاپان سے ایک معاہدہ ہو چکا ہے اب انگلستان سے گفت وشنید ہو رہی ہے۔

آپ نے ہندوستان اور یورپ کی تجارتی واقعات کی ایک مختصر روداد سن لی۔ آج دنیا میں چیزوں کی کمی نہیں۔ اگر تجارت پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں اور لوگ انسانوں کی طرح برتاؤ کرنے لگیں تو دنیا کی کتنی آفتیں کم ہو جائیں مگر دنیا کا مرض بڑی حد تک سیاسی ہے اور جب تک سیاسی گتھی نہ سلجھ جائے معاشی سکون وآرام محال ہے۔

حکومت اور تعلیم

(از جناب سید وقار عظیم صاحب الہ آباد)

کسی ملک یا قوم کی تعلیم پر عموماً تین چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی حالت، اس کی سوسائٹی (جس کے وسیع مفہوم میں مذہبی جماعتیں، سیاسی تحریکیں اور خود حکومت سب چیزیں شامل ہیں) اور تیسرے وہاں کا کلچر۔ اقتصادی حالت اور ضرورت کے مطابق مختلف قسم کے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، ان کے درس، ان کا انتظام، ان کے مدرس اور ان کا سامان، سب چیزیں ایسی ہیں جن پر مالی حالت کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ سوسائٹی، اس سے بھی زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مذہب جو کچھ چاہتا ہے، سیاسی تحریکیں جس چیز کی طالب ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ خود حکومت جو کچھ پسند کرتی ہے، تعلیم کے ذریعہ سے وہی بچوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور انھیں ان خارجی اثرات کے رنگ میں ڈبو کر زمانہ کے مطابق نئی نئی شکلوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ کلچر، تو حقیقت میں تعلیم پر سب سے نمایاں اثر اسی کا ہونا چاہیئے۔ ملک کی قدیم روایات، گذری ہوئی نسلوں کے جمع کئے ہوئے بیش بہا تجربے، ان کے خیالات کے انمول خزانے، ادب، تاریخ، فلسفہ، طرز معاشرت، رفتار و گفتار کے طریقے، اچھائیوں اور برائیوں کا معیار، ان سب چیزوں کی گہری رنگ آمیزی، ملک اور قوم کے تعلیمی نصاب اور نظام پر ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ پہلی دو چیزیں خارجی ہیں اور تیسری داخلی۔ داخلی اثرات زیادہ دیرپا، مستحکم اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے زیر اثر آنے والا آدمی، ان سے مستقل طور پر متاثر ہوتا ہے۔

یہ بات محسوس سب نے کی لیکن اس پر جس طرح عمل ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہوا۔ اور قریب قریب ہر زمانہ میں تعلیم پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر رہا، وہ حکومت تھی۔ چونکہ حکومت، بظاہر ان تینوں چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہے۔ اس لئے اس نے اپنی ضرورتوں کو پیش نظر

رکھ کر تعلیم کے نصاب و نظام مرتب و مقرر کئے اور باقی اثرات غیر محسوس طریقے پر پس پشت پڑ گئے۔ نپولین کو تعلیم کی قوت کا احساس تھا جب اس نے کہا کہ ایک تعلیمی جماعت قائم کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ملک کے سیاسی اور اخلاقی تخیل کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آجائے۔" اور یہی احساس تھا جس نے دنیا کے ہر ملک میں حکمرانوں کی رہبری کی انھوں نے اپنے مقصد کے مطابق تعلیم کے نظریے بنائے انہیں رائج کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور اس طرح اپنی سلطنتوں کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنالیں۔ چین اور یونان میں مذہبی پیشواؤں اور خاندان کے بزرگوں کا دور دورہ تھا اس لئے تعلیم نے اس بات پر زور دیا کہ دیوتاؤں اور گھر کے بڑے بوڑھوں کی پرستش کی جائے۔

یورپ میں مذہب کا دور دورہ ہوا تو تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ لوگوں کو مذہب اور اس کی تبلیغ کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کا بنایا جائے۔ انگلستان کے موجودہ دور سے پہلے تعلیم کی مدد سے قوم کے بچوں کو زیادہ مہذب اور سوشل بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ باہر سب کچھ اور اندر کچھ نہیں۔ اسی طرح امریکہ اور جاپان کو لیجئے۔ جاپان نے تعلیم کی مدد سے اپنی قومی عظمت بڑھانے کی کوشش کی۔ امریکہ نے اس سے قومی اتحاد و اتفاق کا سبق پڑھانا چاہا۔ غرض یہ کہ ہر ملک اور ہر قوم کے سامنے ہمیشہ سے مختلف مقاصد رہے اور ان سب کے حاصل کرنے میں ہر ایک نے تعلیم ہی سے سب سے زیادہ مدد لی۔

لیکن جوں جوں تہذیب اور تمدن میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں، حکومت اور تعلیم کا رشتہ بھی زیادہ پیچیدہ اور اہم ہوتا جارہا ہے۔ آزادی اور احساس کی ایک لہر ساری انسانی دنیا پر دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اور اس لئے ہر ملک اور ہر قوم میں ہزاروں نئی نئی تحریکات پیدا ہوتی جارہی ہیں۔ ایک تحریک دوسری پر غالب ہونا چاہتی ہے ایک قوت دوسری کو دبانا چاہتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا مقصد ہے کہ اس کا پروگرام اور لائحہ عمل دنیا میں سب سے آگے رہے۔ وہ امام ہو اور دوسرے مقتدی۔ وہ رہبر ہو اور دوسرے رہرو۔ اس لئے اس کشمکش کے زمانہ میں کسی ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو ان سب پر غالب ہو۔ جس کے سامنے سب بظاہر اپنی اپنی سادہ جوں

پر چلتے ہوئے معلوم ہوں لیکن کوئی کسی دوسرے کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے اور ایک
وقت ایسا آئے کہ سب کے سب جا کر ایک مرکز پر مل جائیں۔ راستے مختلف، لیکن منزل سب
کی ایک۔ ان مختلف قوتوں کو یکجا کرنے والی سب سے بڑی قوت حکومت ہے۔ لیکن حکومت بھی
مجبور ہے۔ صرف اس کی موجودگی، مخالف قوتوں کو ایک جگہ نہیں جمع کر سکتی۔ صرف اس کا ہونا ہی اسے
سب سے بڑا نہیں بنا سکتا۔ اسے ضرورت ہے کسی ایسی سحر آفریں کشش کی جس کی مدد سے وہ سب
کو اپنی طرف کھینچ لے۔ زور اور طاقت کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب اگر اس سے کام لیا جا سکتا ہے تو
صرف ایسی حالت میں جب دنیا غافل ہو۔ سوتے ہوؤں کو مار دینا آسان ہے، لیکن جاگتے ہوؤں
کی طرف قدم بڑھانا بھی دشوار۔ دنیا اب بیدار ہے، اس لئے جب کوئی حکومت صرف زور اور
طاقت سے کام لینا چاہتی ہے تو پہلے فضا کو خمار آلود بنا دیتی ہے۔ لوگ اس نشے میں ڈوب
کر غافل ہو جاتے ہیں اور ظالم کا داؤں چل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی حکومت خواہ وہ نرمی سے رعایا کو
اپنا ہم خیال بنانا چاہے، خواہ سختی سے بغیر کسی بیرونی مدد کے ایسا نہیں کر سکتی۔ اور یہ مدد جتنی زیادہ
تعلیم سے مل سکتی ہے کسی اور چیز سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے پیچیدہ نظام کو ضرورت
ہے ایک زبردست طاقت کی جو مخالف قوتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دے، اور یہ زبردست طاقت
ہے، حکومت اور دوسری طرف حکومت کو ضرورت ہے کسی ایسے آلے کی جس کی مدد سے وہ اپنے
مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ یہ آلہ ہے تعلیم دنیا حکومت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی اور حکومت تعلیم کے بغیر

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت تعلیم کے ذریعہ سے کسی محدود ذاتی مقصد کو حاصل کرنے
کی کوشش کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کا سوال ہی نہیں باقی رہا۔ کسی مقصد کو محدود اور ذاتی ہونے
کے باوجود بھی کافی وسیع ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی رفتار بہت تیز ہے اور جو ملک یا قوم
اس تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا، اسے دوسری قومیں کچلتی اور پامال کرتی ہوئی
آگے نکل جاتی ہیں۔ کسی کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ہر شخص کو خود اپنی حالت سنبھالنی مشکل ہے، پھر
بھلا کسی دوسرے کی مدد کے کیا معنی۔ اس لئے اس مقابلہ کی دنیا میں ہر قوم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے

اس حد تک وسیع بنانا پڑتا ہے کہ وہ قومی وقار اور عظمت کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکیں۔ مثال کے لئے جاپان، جرمنی، ترکی، اٹلی اور روس موجود ہیں۔ ہر ملک کے سیاسی اصول جداگانہ ہیں، دوسرے سیاسی نظام کی بنیاد، کہیں نازیت اور فاشیت پر ہے، کہیں اشتراکیت اور قومیت پر، اور کہیں صرف قومی وقار عظمت اور بیداری کے احساس پر۔ لیکن ان میں سے ہر ایک ایک لحاظ ہم خیال ہے اور وہ یہ کہ ہر ملک کو ایک بیدار، متحدہ اور باعمل قوم کی ضرورت ہے۔ ہر ملک اچھے شہری بنانا چاہتا ہے۔

اچھے شہری کا کیا مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کی بحث کرنے سے پہلے صرف ایک بات کا اندازہ کر لینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آج کل دنیا میں عموماً دو طرح کی حکومتیں ہیں۔۔۔ جمہوری یا شخصی۔ جمہوری حکومتوں میں، سلطنت کی باگ ڈور رعایا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ رعایا اپنے کچھ نمائندے چنتی ہے اور یہی نمائندے رعایا کی آواز بن کر ملکی اور قومی مفاد کے ہر معاملے کو، حکومت کی فضا میں پھیلاتے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے اور ملک میں خوش حالی رہتی ہے شخصی سلطنتوں میں، رعایا کی آواز نسبتاً دھیمی اور ہلکی ہوتی ہے۔ لیکن آمر یا شخصی حکمراں چونکہ اپنی سلطنت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے اس ہلکی آواز کا بھی اثر ہوتا ہے۔ کچھ اپنی سیاست کے جادو سے، اور کچھ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کر کے، وہ انہیں اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اسے کچھ ایسے منتر یاد ہوتے ہیں کہ ان کے پھونکتے ہی سب اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور حکومت کا پہیہ بغیر کسی روک ٹوک کے چلتا رہتا ہے۔ چونکہ تعلیم کے بغیر نہ جمہوری حکومتوں کا کام نکل سکتا ہے، نہ شخصی حکومتوں کا، اس لئے اس کا دور دورہ دونوں جگہ رہتا ہے دونوں کو اچھے شہری پیدا کرنے کی دھن ہوتی ہے لیکن یہ کہ دونوں کے نزدیک اچھے شہری کون ہیں؟ یہ بالکل اضافی چیز ہے۔

رسل (RUSSEL.) نے اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر شہریوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک شہری وہ جو جمہوری حکومتوں میں ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو شخصی حکومتوں میں۔ پہلے قسم کے شہری کو رسل نے تخلیقی (CREATIVE.) شہری کہا ہے اور دوسرے قسم کے شہری کو میکانک (A mechanic)

کا خیال ہے کہ ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کم سے کم پانچ خوبیاں ہوں۔ فکر کی قوت، لیڈر بننے کی صلاحیت، ڈسپلن، شرکتِ عمل کا احساس اور رواداری۔ اس لیے کہ جمہوری حکومتوں میں ملک اور قوم کی بھلائی، ترقی اور عظمت میں ہر شخص کو الگ الگ اور اجتماعی حیثیت سے حصہ لینے کی ضرورت ہے ہر شخص اپنی مخصوص فکر اور عمل سے قوم کی مجموعی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے میں حصہ لیتا ہے یہ بات پہلی دو صفتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ انفرادی حیثیت سے فکر اور عمل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود بھی کوئی شخص ملک اور قوم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اس لئے اسے ایک منظم جماعت کا فرد ہونا چاہئے وہ جو کچھ کرے صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پورے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے۔ اس کے لئے تیسری اور چوتھی صفت ضروری ہے۔ اور اس سے زیادہ ضرورت ہے رواداری کی۔ چونکہ ہر شخص کو خیال اور عمل کی آزادی حاصل ہے اس لئے ہر شخص میں دوسرے کے خیال کو صبر سے سننے اور اس پر غور کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ دوسرے کے خیال، نقطۂ نظر اور جذبہ کا احترام بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر شرکتِ عمل ممکن نہیں۔

دوسرے قسم کے شہری جنہیں شخصی حکومتوں کا شہری بننے کی تعلیم دی جاتی ہے، اس شہری سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ چونکہ آمر (DICTATOR) کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی رعایا کا ہر شخص اس کے بنائے اصول اور قانون کو اپنے لئے ایمان سمجھے، اور اس پر بغیر چون و چرا کے عامل ہو، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام شہری خیال اور جذبہ میں یکساں ہوں۔ جو کچھ ان سے کہا جائے اسے وہ اپنی قومی اور ملکی بہبودی سمجھ کر اس پر عامل ہوں۔ ان کا ہر عمل اسی مخصوص ذہنیت کے رنگ میں ڈوب کر نکلے۔ ان کے لئے آمر نے ایک سانچہ بنا دیا ہے اور آدمی جب اس سانچے میں ڈھل کر باہر نکلتا ہے، تو وہ شہری کہے جانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس شہری کی حیثیت بالکل مشین کی سی ہے جو چلتی ہے تو ایک خاص انداز اور رفتار سے اور اگر نہیں چلتی۔ تو بالکل نہیں۔ اس میں اپنی گردش کو بدلنے کی صلاحیت نہیں۔ اسی طرح یہ شہری جس سانچے میں ڈھال دیا گیا، اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس میں آزادیٔ فکر و عمل کا جذبہ نہیں ہوتا، وہ لیڈر بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ اسے [illegible]

جو کسی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلنا نہیں آتا۔ اس کی فطرت میں لچک نہیں۔ ڈسپلن اور شرکت عمل اس کے لئے بھی ضروری ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ کہ جمہوری اور شخصی دونوں حکومتیں اچھے شہری بنانا چاہتی ہیں اور دونوں کے نزدیک "شہریت" کا معیار جداگانہ ہے۔ تعلیم دونوں جگہ دو مختلف فرائض انجام دیتی ہے۔ تخلیقی شہریت بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور مشین نما شہری بھی۔ تعلیم سے دو مختلف موقعوں پر دو الگ الگ کام لیے گئے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا تقاضا بھی یہی ہے، جو جمہوری حکومتوں کا اس لئے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فطرت کے قریب ہونا چاہیئے۔ فطرت انسان کی بہترین معلم ہے تہذیب کے جال کے پھیلنے سے پہلے بچہ فطرت ہی کی گود میں تعلیم پاتا تھا۔ وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر، انھیں چھو کر، ان میں شریک ہو کر، فکر اور عمل کی آزادی کے ساتھ، ان سے نئے نئے سبق سیکھتا اور اپنے تجربات کی دنیا کو وسیع کرتا رہتا تھا۔ اس لئے ضرورت ہے اب بھی اسے فطرت کے اسی ماحول کی گود میں پالا جائے، تاکہ اس کی مخصوص فطرت زیادہ سے زیادہ ترقی کرے اور کائنات کے وسیع تنوع میں کوئی فرق نہ آئے۔ شخصی حکومتیں فطرت کے اس ماحول کو نظر انداز کرتی ہیں اور جمہوری حکومتوں میں غیر ارادی طور پر اسی پر عمل ہوتا ہے۔

لیکن فطرت صرف یہیں تک محدود نہیں۔ فطرت کا ایک مقصد ہے انسان کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی دینا۔ لیکن یہ انتہائی ترقی اصل میں اس جماعت یا سماج کی ضرورت کے لئے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ترقی کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان اپنی مخصوص صلاحیت کے مطابق اپنی جماعت، سماج یا قوم کی ترقی اور بہبودی میں حصہ لے۔ اس لئے تعلیم کو اس خاص جماعت کی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیئے، جس میں انسان رہتا ہے۔ ہر جماعت یا سماج کا کلچر، دوسری سماج سے مختلف ہے۔ یہ ایک دو سال میں نہیں بن جاتا۔ بلکہ کلچر مجموعہ ہے، ان تمام تجربات کا جو نسلاً بعد نسلٍ کسی قوم تک پہنچتے ہیں۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، رسم و رواج، تہذیب و تمدن، کھانا پہننا، رہنا سہنا، بول چال، زبان اور فن اور ان سب چیزوں کے مختلف نظریے مل کر کسی خاص جماعت کا کلچر کہے جاتے ہیں۔

اور یہ غیر محسوس طریقے پر انسان کے ضمیر کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس لئے جو تعلیم فطرت سے قریب ہونا چاہتی ہے اس کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ وہ قوم کے کلچر اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہو۔ صحیح تعلیم وہی ہے جو ہماری داخلی فطرت کے مطابق ہو، جس میں ایسے رجحانات ہوں جو ہمارے ضمیر میں بسی اور رچی ہوئی چیزوں سے مل کر بنے ہوں۔

اس لئے فطری تعلیم کے حقیقت میں تین جزو ہوئے۔ انفرادی۔ سماجی اور مثالی۔ انفرادی نقطۂ نظر سے انسان کی فطرت کے مطابق اس کی انتہائی ترقی۔ سماجی نقطۂ نظر سے کسی مخصوص جماعت کی ضرورتوں کا لحاظ، اور مثالی نقطۂ نظر سے اس جماعت کے کلچر کا عکس۔ یہ تینوں چیزیں ہر اچھی تعلیم کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے ہر حکومت کا فرض ہے کہ تعلیم کو ان تینوں حیثیتوں سے مکمل بنائے جب تک ایسا نہیں ہوگا، تعلیم نہ افراد کے لئے کام کی ہو سکتی ہے اور نہ سماج، ملک اور قوم کے لئے۔ ملکی تعلیم کے نصاب کی تدوین اور نظام کی ترتیب کرتے وقت ہر حکومت کو یہ تین سوال پیش نظر رکھنے چاہئیں کہ۔

۱۔ تعلیم پڑھنے والوں کو شخصی اور انفرادی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ترقی دے۔

۲۔ وہ جماعت یا سماج کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔

۳۔ وہ سماج کے کلچر اور روایات کی آئینہ دار ہو۔

ان اصول کے مطابق نصاب کی ترتیب کے بعد حکومت کو اس کی تفصیلات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملکی اور قومی ترقی ہو اور یہ بغیر اچھی تعلیم کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ تعلیم کو ہر حیثیت سے بہتر بنائے۔ اور اس کے ایسے اصول بنا دے جن پر عمل کرنے کے بعد بہترین نتائج کی امید ہو سکے۔ مدرسے اپنی ضرورتوں کے مطابق تفصیلوں میں جو تبدیلیاں چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف اصول بنا دینے ہی سے حکومت کا کام ختم نہیں ہوتا۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ ان اصولوں اور ضروریات کے مطابق ملک میں کافی مدرسے ہیں یا نہیں، انہیں کافی کامیابی سے چلانے کے لئے سرمایہ موجود ہے یا نہیں اور ان صورتوں میں مقررہ اصول پر عمل ہو سکتے ہیں یا

نہیں، اس لیے حکومت کو مدرسوں کی مالی امداد بھی بڑی حد تک اپنے ذمہ لینی پڑے گی۔

بظاہر مشورے دینا آسان ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان اصولوں کے مطابق ہم کس حد تک تعلیم دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یوں تو ہر کام میں اور ہر قدم پر مختلف قسم کی دقتوں کا پیدا ہونا ضروری ہے لیکن سوال ان دقتوں کے حل کرنے کا ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک جو تعلیم جاری ہے وہ شاید فطرت کے تینوں اصول کے مطابق نہیں۔ نہ اس میں افراد کو شخصی ترقی حاصل کرنے کا موقع ہے نہ اس میں سماج کی ضرورتوں کا حل ہے، اور نہ وہ ہمارے کلچر کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے یقینی طور پر ہمیں اس نظام میں شدید انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی احساس کے بعد ہمارا دشوار کام شروع ہوتا ہے۔

عوام میں تعلیمی دلچسپی اور اس کے بلند مقاصد کا صحیح احساس پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں تھوڑی بہت تعلیم دی جائے۔ اس لئے حکومتوں کے سامنے اس وقت سب سے پہلا یہ سوال ہونا چاہیے کہ کس طرح ملک کا بچہ بچہ پڑھا لکھا ہو جائے۔ شکر یہ ہے کہ اس خیال نے اب عملی شکل اختیار کرنی شروع کر دی ہے اور ملک کی متعدد تحریکیں اب جہالت کو مٹانے کا بیڑا اٹھا چکی ہیں۔ حکومت اس سلسلے میں بہت مدد کر سکتی ہے۔ اسے چاہیے کہ ملک بھر میں لازمی تعلیم کا قانون نافذ کر دے اور ہر شخص کو بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ ملک کے بچے بچے کو تعلیم اور اس کی ضرورت سے آگاہ کر دینے کے بعد دوسرے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

پہلے تو یہ کہ تعلیم ایسی ہو جس میں افراد کو اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی کا موقع ملے اس قسم کی تعلیم صرف وہ تعلیم ہو سکتی ہے جہاں بچے صرف کتابوں سے پڑھ کر نہیں، بلکہ "کچھ کر کے" سیکھیں مدرسے کی فضا آزادانہ ہو۔ بچہ کی فکر کو عمل کا موقع دیا جائے۔ وہ سب کے ساتھ مل کر کام کرے۔ ایثار، محبت، شرکت عمل، رواداری، اپنی جماعت کی محبت، اور اس کی عزت کا احساس اس میں پیدا ہو۔ یہ مقصد صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ہم مدرسوں کو بچوں کی ایک چھوٹی سی دنیا بنا دیں جہاں بچے اپنی دلچسپی کے مطابق ہر چیز سیکھنے ہر کام میں حصہ لینے، اور ہر جذبہ کے احساس و اظہار

کا موقع ملے۔ اس طرح کے مدرسے یورپ اور امریکہ میں کافی ہیں اور ان سے نکلنے والے بچے انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے قوم اور ملک کے سرمایۂ ناز رکن بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس طرح مدرسوں سے دوسرا مقصد خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہر بچہ وہ کام سیکھے گا جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے اور اس لئے ذاتی شخصیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ملک اور قوم کا ایک مفید رکن بننے کی قوت بھی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اپنے مخصوص کام سے سوسائٹی کے نظام زندگی میں ایک خاص حصہ لے گا۔ اس کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی اور سوسائٹی بھی اس کے کاموں سے فائدہ اٹھائے گی۔ چونکہ ہر شخص اپنی دلچسپی کا کام کرے گا۔ اس لئے کام میں اس کا جی لگے گا۔ اس کی زندگی بھی اچھی ہوگی اور کام بھی اچھے سے اچھا ہو سکے گا۔ سوسائٹی کے حق میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا ہر فرد اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن اور خوش حال ہے اور دوسرے یہ کہ ہر کام جو ہو رہا ہے، اسے اس کا ماہر کر رہا ہے اس لئے کام کی اچھائی پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

اب رہا تیسرا سوال کلچر کا۔ کلچر کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا کلچر مختلف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک ہی جماعت میں کچھ پڑھے لکھے اور زیادہ بے پڑھے لکھے لوگوں کے معاشرت، تمدن اور نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے تعلیم کی بنیاد کلچر پر کس طرح رکھی جا سکتی ہے؟ بظاہر یہ سوال بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ کلچر کے اختلافات ہمیں اپنے زمانہ میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ زمانہ گذر جانے کے بعد ان اختلافات میں سے ایسے حصے نکل جاتے ہیں، جن کا تعلق لوگوں کی چند وقتی ضروریات سے ہوتا ہے۔ اور ہر زمانے کی معاشرت کا ایک مستقل حصہ، آئندہ آنے والی نسلوں تک، اس عہد کے کلچر کی صورت میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اب سے ایک صدی پہلے بھی کلچر کے یہاں اختلافات تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اختلافات کے غیر مستقل جزو مٹتے گئے اور ان کے مستقل حصے باقی رہ کر ہم تک پہنچے۔ یہی حال موجودہ کلچر کا ہوگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علم و جہل کا جو فرق اس وقت اتنا نمایاں ہے، اسے کوشش کر کے رفتہ رفتہ

مٹایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد خود بخود ملک میں کلچر کے اختلافات میں کمی ہوتی جائے گی۔ علم لوگوں کو
ہم مذاق بنا دینے کے بعد، معاشرت اور زندگی میں بھی انھیں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ
قریب کر دے گا۔ اس لئے نا امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے عمل اور امید کی ——
حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں آنے کے بعد دشواریاں، خود بخود آسانیاں ہو جائیں گی۔

ہندوستانی صنعتوں کو تحفظ کی ضرورت

(از جناب عبداللہ زمانی ایرانی صاحب متعلم جامعہ)

صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے | کسی شے کو نقصان پہنچانے والی شے سے بچانا تحفظ کہلاتا ہے

جماعتی زندگی میں عدل و انصاف کو رواج دینے کے لئے انسان مجبور ہوا کہ اپنے اوپر اور اپنی جماعت کے دوسرے افراد پر باہمی تحفظ کی غرض سے کچھ پابندیاں عاید کرے۔ یعنی اس نے ریاست ایجاد کی اور ریاست کو حق دیا کہ اگر کوئی اس کے حق کو چھیننا چاہے یا وہ خود دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا چاہے تو سزا پائے۔ یہ تو سیاسی تحفظ کا عام مفہوم ہوا۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے روسو جیسا فطری آزادی کا حامی فلسفی بھی اس بات کے ماننے پر مجبور ہوا تھا کہ چونکہ بعض انسان دوسروں کی بہ نسبت ضعیف ہوتے ہیں اس لئے ان کا تحفظ ضروری ہے اور اسی تحفظ کے لئے ریاست وجود میں آتی ہے۔ بالکل یہی حالت صنعتوں کی بھی ہے۔ بعض ممالک کی صنعتیں ترقی پر ہیں ان کے لئے خام پیداواریں معدنیات اور دیگر لوازم صنعت بکثرت ہیں اور ایسے زمانے میں ترقی کی ایک خاص منزل تک پہنچ بھی چکی ہیں جب کہ ان کا کوئی رقیب نہ تھا۔ اب اگر کوئی ملک صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تو جب تک طاقتور اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے مقابلے سے اس کا تحفظ نہ کیا جائے تو وہ ترقی نہ کر سکے گا۔ اس لئے حکومت مجبور ہوتی ہے کہ اس ملک کی صنعتوں کے تحفظ کا سامان کرے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ تحفظ کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ تحفظ کمزور ابتدائی صنعتوں کو قوی اور ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت سے بچانے کا نام ہے۔

تحفظ پر اعتراض | اوپر کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صنعتوں کے تحفظ کی کیوں ضرورت ہے مگر اس کے لئے کچھ تفصیل کی حاجت ہے۔ لیکن اس سے قبل تحفظ کے مخالفوں کا نقطۂ نظر پیش کر دینا زیادہ بہتر معلوم

ہوتا ہے۔ وہ دلائل جن پر وہ زیادہ زور دیا کرتے ہیں یہ ہیں۔

(۱) تحفظ سے داد و ستد کی کامل آزادی باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے محنت اور عمل ان جگہوں پر نہیں پہنچ سکتے جہاں کہ ان کی اشد ضرورت ہے۔ بلکہ جہاں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے وہاں ممکن ہے کہ یہ بہت کم ہوں اور جہاں کم ضرورت ہے وہاں بہت زیادہ تعداد میں ہوں۔ اس لئے یہ ایک غیر فطری اور ناپسندیدہ رویہ ہے کہ ایسی پابندی عائد کی جائے جس سے فطری توازن تجارت بگڑ جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے دنیا کی پیداوار گھٹ جائے گی اور دولت بھی کم ہو جائے گی۔

(۲) یہ کہ عدم تحفظ کی صورت میں ہر شخص آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنی قوتوں کو کام میں لاکر اپنا سامان تو مہنگے سے مہنگا بیچ ڈالے اور دوسروں کا سستے سے سستا خریدے اور اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی ہمت بلند ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرے گا اور اپنے دل و دماغ سے کام لے کر ہر ہر لحہ نئی نئی صورتیں اور راستے تلاش و ایجاد کرے گا تاکہ اپنی چیز زیادہ سے زیادہ دلکش بنائے اور دوسروں کی چیزیں سستے سے سستے داموں پر حاصل کرے۔ اس سے نہ صرف دنیا کی مجموعی پیداوار اور دولت بڑھے گی بلکہ اشیا کی نفاست اور گوناگونی میں بھی ترقی ہوگی اور خریدار اور فروشندہ کا حوصلہ بھی بڑھ جائے گا اور ہر ملک اس طرح پر انتہائی ترقی حاصل کر سکے گا۔

(۳) انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ خود غرضی ایک بہیمانہ اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس لئے تحفظ اس اخلاقی زاویۂ فکر سے بھی کوئی پسندیدہ اور بہترین چیز نہیں ہے۔

(۴) تحفظ درحقیقت تحفظ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے صنعت کی بعض قسموں کو تو فائدہ پہنچتا ہے اور بعض کو نقصان۔ یعنی تحفظ کا مقصد صرف ایک ناپسندیدہ حیثیت سے پورا ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے بالکل مضر اور نقصان رساں ہے۔

(۵) اس سے صنعتی کارخانوں میں جو جماعتیں کام کر رہی ہیں ان کی اخلاقی حالت پر برا اثر پڑتا ہے۔

(۶) اس سے سرمایہ دار تو مستفید ہوتے ہیں لیکن غریب طبقہ کو جو کہ ان صناعوں کی اشیاء صرف کرتا ہے نقصان پہنچتا ہے۔

(۷) چونکہ تحفظ کے لئے حکومت کو صنعت اور تجارت میں دخل دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اس سے بسا اوقات برے سیاسی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۸) اس سے قوموں میں ایک قسم کی دشمنی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(۹) تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا مشکل اور ملک کی سیاسی و معاشی حالت پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔

تحفظ پر اعتراضات کا جواب یہاں تک تو تحفظ کے مخالفین کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا اب اس سے پہلے کے ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا مختصر جواب دے دیا جائے۔

(۱) یہ کہ تحفظ سے محنت اور اصل اپنی فطری روانی سے رک جائے گی۔ اس لئے غلط ہے کہ عدم تحفظ کی صورت میں بھی اس کا نہ صرف امکان ہے بلکہ عملاً اس کا وجود پایا گیا ہے اور پایا جاتا ہے کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ملکوں کی پالیسی تحفظ اختیار کرنے سے پہلے سب ملکوں کی محنت و اصل حسب ضرورت کام میں آئی ہے اور یا اپنی اپنی لیاقت کے برابر ہر ملک اپنی تجارت، صنعت کو ترقی دے سکا ہے؟ اس کا جواب نفی میں اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لئے ذرا بھی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(۲) یہ کہ ہر ملک یا ہر شخص کو آزادی ہو کہ اپنی اپنی چیزوں کو بہتر سے بہتر بنا کر بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت کرے اور سستے سے سستے سامان اپنے لئے فراہم کرے۔ یہ اعتراض بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ہم نے مثال دے کر بتایا ہے کہ بعض صنعتیں ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور جب تک موجودہ حالات ان کے لئے ناموافق ہیں اور بعض

سہارا دیا جائے۔ کمزور انسان کی طرح قوی کے مقابلہ میں، ترقی یافتہ صنعتوں کے مقابلہ کی استعداد نہیں رکھتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اگر ان کو تحفظ نہ دیا جائے تو وہ بالکل ختم ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ حکومت اور تحفظ پر اعتماد کر کے ہمیشہ تحفظ ہی کے بل پر کھڑی رہنے کے قابل ہوں گی یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ یہ تحفظ تو ابتدائی کمزوری یا بیماری کی حالت میں ہر شے کے لئے ضروری ہے مثلاً انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کیا اس کو اس اندیشہ کی بنا پر سہارا نہیں دینا چاہیے، یا گود میں نہیں لینا چاہیے، یا اس کا تحفظ نہیں کرنا چاہیے، کہ آئندہ اپنا تحفظ خود نہ کر سکے گا اور ہمیشہ ماں کی گود اور خبرگیری کا محتاج رہے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ جس طرح انسان نہ صرف حالت طفولیت میں ماں باپ کے سہارے کا محتاج ہے بلکہ کمزوری اور بیماری کی حالتوں میں بھی۔ اس طرح وہ صنعتیں بھی تحفظ کی محتاج ہوں گی جو اگرچہ وہ وجود میں عرصہ سے آچکی ہیں لیکن پست حالت میں ہیں۔

(۳) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی تحفظ اس لئے کوئی بری چیز نہیں ہے کہ کوئی ملک اپنی صنعتوں کو ترقی دے کر، دوسروں کو ایسا کرنے سے نہیں روکتا۔ ہر ملک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تحفظ کو اختیار کرے یا نہ کرے۔

(۴) یہ کہ تحفظ، تحفظ یافتہ صنعتوں کے حق میں اگر مفید ہے تو اس کے علاوہ دیگر صنعتوں کے حق میں مضر ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکومت کی نظر میں جن صنعتوں کو تحفظ نہ دینے سے تحفظ دادہ صنعتوں کے مقابلہ میں نقصان کا خطرہ ہو حکومت ان کو بھی تحفظ دیگی۔ اور اگر ایک ملک کی پالیسیٔ تحفظ سے دوسرے ملک کی صنعتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کا جواب اوپر دے دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بھی اپنی صنعتوں کو تحفظ دے کر ہر قسم کے نقصان سے بچا سکنے میں آزاد ہے۔

(۵) یہ کہ صناع طبقہ کے اخلاق پر تحفظ سے برا اثر پڑتا ہے اسکو کوئی باور نہیں کر سکتا۔ مثلاً کیا امریکہ والوں کے اخلاق جو کہ تحفظ میں انتہا پسند ہیں انگریزوں کے اخلاق سے جو کہ آزادیٔ تجارت میں انتہا پسند ہیں، پست ہیں؟

(۶) یہ کہ تحفظ سے سرمایہ دار کو فائدہ اور غریب طبقہ کو نقصان پہنچے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کیا حکومت خارجی رقابت اور نقصانات سے اپنی صنعت کو بچا سکتی ہے۔ غریب طبقہ کو سرمایہ دار کی دستبرد سے نہیں بچا سکتی؟ پھر یہ کہ تحفظ سے رعایا پر بہت بار پڑتا ہے؟ یہ قربانی وقتی ہے اور آئندہ چل کر جلد ہی اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

(۷) یہ کہ تحفظ سے سیاسی ناخوشگوار واقعات و نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ یہ بھی ایک بے دلیل اعتراض ہے اب ساری دنیا میں تحفظ کا نظام جاری ہے یہاں تک کہ انگلستان سا علمبردار آزادی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے؛ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان تمام ممالک میں محض تحفظ کی وجہ سے سیاسی خلفشار یا خوشگوار نتائج پیدا ہوئے ہیں؟ اگر منطق سے کام لے کر اثبات میں کوئی جواب بھی دیا جائے تو کیا آزاد پالیسی سے کوئی ایسا سیاسی نتیجہ نہیں پیدا ہوتا ہے؟

(۸) قوموں میں اگر تحفظ کی وجہ سے دشمنی پیدا ہوتی ہے؛ تو اس کے جواب میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ متمولوں کے اپنی دولت کی حفاظت کرنے سے بھی چوروں کے دل میں ان سے نفرت پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان کو دوسروں کا مال چرانے اور غصب کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوموں سے اس لئے دشمنی پیدا کرے کہ انھوں نے اپنی دولت کے تحفظ کا سامان کیا ہے اور اس کی زیادتی سے اپنے مفاد کو بچانے کی کوشش کی ہے تو اس کا کیا علاج!

(۹) یہ کہ تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا قوم اور ملک کے لئے مضر ہوتا ہے اور ملک کے مالیات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، وغیرہ۔ یہ بھی ایک لایعنی اعتراض ہے اس لئے کہ تحفظ جب ہٹایا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو اور جب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تو ظاہر ہے کہ اس کے دور کرنے ہی میں ہر طرح کا فائدہ ہے۔ اور اس کا باقی رکھنا یا تو بے سود ہوگا یا نقصان رساں۔

<u>تحفظ کے فوائد</u> اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی ضرورت پر بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان فوائد تحفظ کا ذکر کر دیا جائے جن کی وجہ سے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ہر ملک اس کا حامی نظر آتا ہے اور اسے نہ صرف مفید بلکہ ضروری سمجھتا ہے اور یہ فوائد حسب ذیل ہیں

علاوہ اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر دنیا کو آج ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔ اٹلی کا حبشہ پر قابض ہو جانا اسپین کی یہ طول وطویل جنگ۔ جاپان وچین کا یہ میدان کارزار، اور ابھی ابھی آسٹریا پر جرمنی کا یکایک قبضہ وغیرہ وغیرہ ایسے حالات ہیں جن کو کوئی محتاط حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی بلکہ اپنے مستقبل کے لئے معاشی، سیاسی اور دیگر قسم کے بچاؤ کا سامان اسے کرنا پڑے گا اور چونکہ آج کل جنگ کی سب سے بڑی وجہ۔ معاشی معاملات ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جنگ اس لئے ہوتی ہے کہ یا تو کسی ایسے ملک پر قبضہ کیا جائے جہاں معدنیات اور مواد خام کے ذخائر کافی موجود ہوں یا اس ملک کو اپنے کارخانہ جات کی مصنوعہ اشیا کے لئے وسیع منڈی بنایا جا سکتا ہو۔ اس لئے تحفظ مصنوعات کا مسئلہ اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ یہاں اس بات کا جتانا بھی بے جا نہ ہو گا کہ ہمارا مقصد تحفظ سے صرف تحفظی محاصل برآمد عاید کرنا یا صنعتی کارخانوں کو مدد دینا نہیں بلکہ ان تمام ذرائع کو اختیار کرنا مراد ہے جن کو ملک کی صنعت کی ترقی کے لئے حکومت ضروری سمجھتی ہو مثلاً علاوہ تحفظی محاصل کے حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اشیائے درآمد کی مقدار محدود کر دے یا بعض چیزوں کو بالکل ممنوع قرار دے دے۔ وغیرہ تحفظ کے حامی اپنی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) جو صنعت ابھی وجود میں نہیں آئی ہے یا بالکل ابتدائی حالت میں ہے یا وجود میں تو عرصہ ہوا کہ آ چکی ہے مگر ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت کی وجہ سے خراب حالت میں ہے۔ ان سب کو تحفظ دینا لازمی ہے۔ تاکہ وہ تحفظ کے سہارے پر ترقی پا کر اپنے انتہائی نشو ونما کو پہنچ سکیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بلا تحفظ مقابلہ کی تاب نہ لا کر ختم ہو جائیں گی۔ مثلاً شکر کو لیجئے اگر جاوا کی شکر پر تحفظی محصول عاید کر کے اس کی درآمد کو کم نہ کیا جائے تو ہندوستان میں باوجودیکہ گنے کی کاشت بخوبی ہو سکتی ہے نیز ضروری سامان فراہم کیا جا سکتا ہے شکر کی صنعت ترقی نہیں کرنے پائے گی۔

(۲) آج کل دنیا کے ہر گوشے میں ہر ہر لمحہ جنگ کا خطرہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نازک وقت میں سامان جنگ یا اور اشیا کے لئے دوسرے ممالک کا دست نگر ہونا اور خاص کر اگر وہ قیمتی سے دشمن کا ملک ہو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے دور اندیشی کے نقطۂ نظر سے ہر ملک کو

چاہیے کہ وہ ہر حیثیت سے جہاں تک ممکن ہو دوسروں سے آزاد رہے اور اپنی احتیاجات خود فراہم کرے۔

(۳) بسا اوقات تحفظی محاصل کے نہ ہونے سے درآمد کا پلہ برآمد سے اتنا بھاری رہتا ہے کہ تجارت کا توازن بگڑ کر ملک ہمیشہ یا کم از کم عرصۂ دراز کے لئے قرضہ کا زیر بار ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ملک کے تمام طبقوں پر اس کا نہایت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ طاقتور حکومتوں نے اس طرح پر کمزور حکومتوں کو اپنا مقروض بنا کر ان کے ملکوں پر قبضہ تک کر لیا ہے اس سے درآمد اور برآمد میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی تحفظ ناگزیر ہے۔

(۴) بعض ملکوں میں بعض چیزوں کے پیدا کرنے کی خاص صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کا جوٹ۔ تحفظ کے مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ ہر ملک کو چاہیئے کہ صرف وہ چیزیں پیدا کرے جن کی صلاحیت اس میں زیادہ ہو۔ اور جن چیزوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت دوسرے ملکوں میں زیادہ ہو تو یہ کام ان کے سپرد کر دے۔ پھر آپس کے مبادلہ سے ہر ملک اپنی ضروریات حاصل کرے۔ لیکن حامیانِ تحفظ اسے ٹھیک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان مکمل طور پر اس وقت صحیح اور سالم مانا جا سکتا ہے جبکہ اس کی تمام قوتیں مناسب طور پر نشو و نما پائی ہوئی ہوں۔ نہ یہ کہ بعض قوتیں تو انتہائی ترقی پر پہنچائی جائیں اور بعض بالکل ناگفتہ بہ حالت میں چھوڑ دی جائیں۔ جیسے کہ کوئی طالب علم کہ اس کو پڑھنے میں تو کافی مشق ہو مگر اس کو لکھنا نہ آتا ہو۔ یا کوئی دماغی حیثیت سے تو قوی ہو لیکن جسمانی حیثیت سے کمزور۔ یا بالعکس۔ اس طرح ہر ملک کو چاہیے کہ اپنے تمام ذرائع ثروت سے فائدہ اٹھائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی ضروریات خود مہیا کرے جس کے لئے تحفظ شرطِ اولین ہے۔

(۵) اگر کوئی ملک صنعتی ملک بننا چاہتا ہے یا صنعتی تو پہلے ہی سے ہے مگر اپنی صنعت کی ترقی کا خواہاں ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحفظ کو اس لئے اختیار کرے تاکہ سرمایہ دار کا اصل جن کی کثرت اس مقصد کے پورے ہونے کے لئے شرطِ اولین ہے معرض خطر میں نہ

پڑسے اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنی اصل کو کام میں لا سکے۔

(۶) چاہیئے کہ تحفظ کے ذریعے سے ملک کا بازار ملک ہی کی پیداوار اور مصنوعات کے لئے محفوظ کیا جائے۔

(۷) تحفظ سے مزدوروں کی اجرت بڑھتی ہے ان کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔ امریکہ کے مزدور اس کی بہترین مثال ہیں۔

(۸) تحفظ سے ملکی صنعتوں کو استقلال حاصل ہوتا ہے۔

(۹) تحفظ سے ایک قسم کا جذبۂ خودی پیدا ہوتا ہے جو کہ قومیت کی تعمیر میں نہ صرف بہت زیادہ مفید ہے بلکہ بہت ضروری بھی ہے۔ پھر یہ کہ تحفظ دیے جانے کے بعد صنعت میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کی ہمت افزائی ہونے کی وجہ سے ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار بہت سرگرمی سے انجام دینے لگتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسی بیداری قوم میں پیدا ہوتی جو کہ ملک کی سیاست میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تحفظ کی حمایت میں لکھا جا سکتا ہے لیکن عدم گنجائش اور تنگی وقت کے خیال سے ان چند باتوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے تحفظ کے متعلق ایک عام بحث کی ہے۔ اب ہم صرف ہندوستان کے مسئلے کو لیتے ہوئے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو کن وجوہ کے لحاظ سے تحفظ کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہندوستان کی خاص صلاحیتیں | ہندوستان کو وسعت رقبہ، اس کی وسیع آبادی اور مختلف و کثیر پیداوار کے لحاظ سے نہ صرف ایک ملک بلکہ اسے ایک برّاعظم سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان کا ایک ایک صوبہ یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے، ہندوستان کو تحفظ دینا اس لئے اور زیادہ ضروری ہے کہ اس کے مختلف صوبوں میں وہ تمام وسائل دولت موجود ہیں جو کہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کے لئے لازمی ہیں۔ چنانچہ محکمۂ اراضیات کے ناظم مسٹر ٹامس ہالینڈ نے صنعت و حرفت کی کانفرنس

کے روبرو ۱۹۰۸ء میں جو مضمون پڑھا تھا "اس واقعہ کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ اگر کافی اصل میسر ہو، کاروبار میں اولالعزمی بڑھے اور صنعت و حرفت کی تعلیم بھی حاصل ہو جائے تو معدنیات کی قسم سے شاید ہی کوئی چیز ہو جو یہاں دستیاب نہ ہو سکے" ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "اب موقع آگیا ہے کہ لوہا اور فولاد خود ہندوستان میں تیار کیا جائے" اور یہی دو چیزیں ہیں جن کی قیمت معدنیات کی برآمد میں سب سے زیادہ بڑھی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کا عہد ماضی بھی شاہد ہے کہ یہاں کی صنعت شہرۂ آفاق رہ چکی ہے اس سلسلے میں ایک فاضل کا قول نقل کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے انگریزی حکومت کے آنے کے بعد سے اپنی صنعت میں کیسی معکوس ترقی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "صنعتوں میں اہل ہند نے بہت پیشتر کے زمانے میں غضب کا کمال حاصل کیا تھا حتیٰ کہ روم کے شاہی دربار ہندوستان کے طلائی اور نقرئی بافتوں سے زرق برق بنے رہتے تھے آج سے صدیوں پہلے ڈھاکے کی ململ تمام مہذب ممالک میں مشہور تھی۔ یہاں کے پارچے کہ جن کی نفاست دنیا بھر میں بے مثل تھی۔ یہاں کے عشجر کہ جن میں جگمگاتے ہوئے جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ بیش قیمت زردوزیاں کشیدے، کمخواب، زربفت اور تاش بادلے، عجیب و غریب بوقلموں قالین، نہایت درخشاں میناکاریاں، وہ نازک بچہ کاریاں کہ بڑی بڑی خوردبینوں سے کہیں باریک اجزا کا پتہ چلے تو چلے۔ ساز و سامان پر نہایت ہی عمدہ بڑے اہتمام کا نقش و نگار، طرح طرح کی شکل و صورت کی نہایت عمدہ ضمیر کی تلواریں۔ یہ سب چیزیں اب بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں بھی صنعتوں نے کیا کمال حاصل کیا تھا"

مسٹر مارٹین اپنی کتاب سلطنت ہند میں لکھتا ہے کہ "جس زمانے میں برطانیہ کے وحشی باشندے اپنے جسم رنگتے تھے۔ تار عنکبوت کی سی باریک ڈھاکہ کی ململ، کشمیر کی نفیس شال، دہلی کے کارچوب اور ریشم قیصر روم کے دربار میں بڑے بڑے نازنین و حسین زیب تن کرتے تھے۔ وہاں کا بنا ہوا سامان، ہاتھی دانت، آبنوس اور صندل پر کیسے خوشنما نقش و نگار اور گل کاریاں کیسی

خوش رنگ چھینٹیں، ہیرے جواہرات اور مدنی نفاست سے جڑے ہوئے، زردوز مخملیں اور قالین، کیا پختہ فولاد، نہایت عمدہ چینی اور اعلیٰ درجہ کا بحری سامان کشتی اور جہاز وغیرہ صدیوں دنیا کی مہذب قومیں ہندوستان کی ان مصنوعات پر عش عش کرتی رہیں اور جب کہ لندن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ ہندوستان دنیا کا سب سے ہرا بھرا بازار تھا" سر ولیم ہنٹر کے یہ جملے بھی نقل کے قابل ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ہندوستان کی قدرتی دولت اور اس کے وسیع بحری ساحل سے کہیں زیادہ اس کے باشندوں کی صنعت گری میں خداداد ذہانت اور قابلیت اس کو ایشیا بھر کا تاج بنائے ہوئے تھے"

ہندوستانی صنعتوں کے اسباب زوال | ذیل کے مختلف وجوہ سے ہندوستانی صنعتوں کو زوال ہوا۔

(۱) صنعتی انقلاب نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ جوں جوں انسان کو فطرت پر غلبہ حاصل ہوتا گیا اور بجائے ہاتھ پیر یا جانوروں کے اس نے بھاپ اور بجلی کے ذریعہ مشین سے کام لینا شروع کیا ووں ووں پرانی دستی صنعتوں کا زوال شروع ہوا۔

(۲) ہندوستان کی صنعتوں کو جس چیز کی وجہ سے سب سے زیادہ صدمہ پہنچا اور اس کے لئے کچھ تفصیل کی بھی ضرورت ہے وہ انگریزی حکومت ہے۔

سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسی چالیں چلیں اور ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے یہاں کی دستی صنعتیں بے دست وپا ہو کر رہ گئیں اور اس کے بعد سے اب تک حکومت برطانیہ کھلم کھلا دیسی صنعتوں کو ہر طریقے سے فنا کرنے یا کم از کم ترقی نہ ہونے دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کے اسباب گو کہ مختلف ہیں لیکن مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ عمل محض انگلستان والوں کو فائدہ پہنچانے پر مبنی ہیں۔ سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں اور ان کا یہ بیان ایک واقعی دردناک [illegible] ہے۔

"ہندوستان پر انگلستان کی عنایت ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں پر بڑھا بڑھا کر محصول درآمد لگانے سے بھی کام نہ چلا تو ان کی درآمد ہی روک دی، اور اس طرح ہندوستان

کے کپڑوں کا انگلستان میں آنا ممنوع قرار پایا" اس کے بعد بھی برطانیہ تھا کہ جب تحفظ کی بدولت اپنی صنعت و تجارت کو کمال ترقی پر پہنچا چکا، سارے اسباب بحری حمل و نقل پر قبضہ کر چکا اور اپنے کارخانوں کے لئے مواد خام کا محتاج ہوا اور اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی ضرورت پڑی تو آزاد تجارت کا علمبردار بنا اور تحفظ کی پالیسی پر انگلستان والوں نے طرح طرح کی نکتہ چینیاں شروع کیں۔ اور بدقسمتی سے ہندوستان بھی اس کے قبضہ میں آگیا انگریز اس کے سوا کیا چاہتا تھا۔ ع
یک گلے می خواستم یک گلستاں یافتم۔ ایک بہترین اور زرخیز ملک ہاتھ آگیا جس کی خام پیداوار بہت کافی، بازار بہت وسیع اور اس پر طرہ یہ کہ رعایا جاہل، یعنی جس طرح چاہے وہ اسے اپنا آلہ کار بنائے۔

لیکن ہندوستان کا موجودہ وسیع بازار بھی ناکافی سمجھا گیا اور جو کچھ صنعت و حرفت ہندوستان میں باقی رہ گئی تھی اس کے خاتمہ کی کوشش شروع کی گئی۔ جو صنعتی اور تجارتی قوانین بنائے گئے وہ ہندوستانیوں کے مفاد کے خیال سے نہیں بلکہ انگلستان والوں اور خاص کر لنکاشائر کے کارخانے داروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لحاظ سے بنائے گئے۔ حکومت آمدنی کی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے کہ ۳½ فی صدی درآمد کا محصول عاید کرے تو اس خیال سے کہ ممکن ہے اس سے لنکا شائر والوں کی صنعت برآمد کو نقصان پہنچے اور اس قلیل محصول سے ہندوستانی صنعت کو تحفظ مل جائے۔ ہندوستانی مصنوعات پر بھی اتنا ہی محصول عاید کیا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے تحفظ مضر ہے اور اس کی برآمد پر تحفظ سے برا اثر پڑے گا یعنی یہ کہ جب ہندوستان اپنی صنعت کو تحفظ دے گا تو ہندوستان سے دیگر صنعتی ممالک جو مواد خام وغیرہ منگاتے ہیں وہ نہیں یا ہندوستان سے اپنی درآمد کم کر دیں گے۔ یہ بات بھی صرف ایک خود غرضانہ دلیل ہے ورنہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہندوستان کی داخلی مصنوعات پر محصول عاید کیا جائے۔

تحفظ کے مخالفین کی تمام دلیلیں ہم نے پیش کر دیں اور ان کے جواب بھی۔ نیز تحفظ کے فوائد کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہ دلائل تو نظری اور علمی بحث سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عملاً اگر دیکھا جائے تو تحفظ کی اور تائید ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں موجودہ زمانے میں ہر ملک میں اسی کا راگ گایا جاتا ہے۔ چنانچہ جرمنی ۱۸۷۹ء سے اب تک تحفظ پر عامل ہے فرانس نے ۱۸۸۱ء اور جاپان نے ۱۸۹۹ء میں تحفظ کی پالیسی کو اختیار کیا نیز جاپان نے تو ۱۹۱۱ء میں تحفظی پابندیوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ امریکہ تو تحفظ کا علمبردار رہے ہی۔ دنیا جانتی ہے کہ امریکہ کا تمول تحفظ ہی کی بدولت ہے۔ ورنہ وہ بھی ہندوستان کی طرح مفلس ہوجاتا اور دور کیوں جائیں خود انگلستان کی صنعتوں کی ابتدا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تحفظ ہی کے سایہ میں ہوئی۔ مصنوعات کی درآمد پر ۷۵ فی صدی تحفظی محصول عاید کیا گیا۔ اسی طرح انگلستان نے کپڑوں کے کارخانوں کو مختلف ترکیبوں سے تحفظ دیا گیا اور جنگ عظیم کے بعد سے موٹر کی درآمد پر ۳۳ فی صدی محصول درآمد عاید کیا گیا۔ قانون تحفظ کارخانہ جات پاس ہوا۔ شکر پر سے محصول آب کاری اٹھایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیا دنیا بھر کے لئے تحفظ مفید اور صرف ہندوستان کے لئے مضر اور نقصان رساں ہے؟ آج کل تمام بڑے صنعتی ممالک تمام کے تمام بلا استثنا تحفظ کی بدولت اپنی اپنی انتہائی ترقی پر پہنچ چکے ہیں پھر ہندوستان کی صنعتوں میں کونسی نرالی بات ہے؟ جس کے لئے تحفظ بہت نقصان دہ بتایا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر ہندوستان برطانیہ کا محکوم نہ ہوتا اور بالکل آزاد ہوتا تو ان جھگڑوں کی ضرورت پیش ہی نہ آتی بلکہ تحفظ اختیار کئے ہوئے اسے کافی عرصہ بھی گذر چکا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ایسا نہیں ہے انگلستان اپنی رعایا کو چھوڑ کر ہندوستان کے مفاد کا خیال کیوں کرے اور کس طرح کر سکتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ دنیا کی نظر میں بھی بدنامی نہیں چاہتا نتیجہ یہ کہ براہ راست محض قوت سے کام لے کر اپنی مقصد براری کرنے کے بجائے سیاسی مکاریوں دھوکہ بازیوں

خودغرضانہ دلیلوں کے ذریعہ سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس قوت نہ ہوتی تو ہندوستان ان مکاریوں میں کبھی نہ آتا۔ کیونکہ اب ہندوستانی بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ان کی بھلائی کس میں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ "دست شکستہ بارگراں" جس طرح کسی نے لکھا ہے"۔ ہندوستان کی صنعتوں کے لئے تحفظ اتنا ضروری ہے اور اس کے فوائد اتنے لازمی اور بدیہی ہیں کہ ان کے لئے کسی بحث واستدلال کی ضرورت ہی نہیں کیا کوئی منصف اور بے غرض شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ساری دنیا تحفظ کا دامن تھام کر اپنی داخلی وخارجی، سیاسی ومعاشی، کمیوں کو پورا کرنے میں منہمک رہے اور ہندوستان اس سے محروم رہے اور دنیا کے لئے لنگرخانہ بن کر ان کی من مانی چیزیں مہیا کرے اور خود مفلس رہ کر سخاوت کا دروازہ دوسروں ہی پر کھلا چھوڑ دے کیا ہندوستان نے اپنی عظمت پارینہ کو بھلا دیا اگر اس میں اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور یقیناً ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنی بے بسی کا احساس دل میں لے کر میدان میں نکلے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہاں تک کہ اپنا مقصد حاصل کرکے سانس لے۔

اس مختصر بیان سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ ورنہ ہندوستان کے لئے تحفظ کے ناگزیر ہونے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔

تحفظ کی نوعیت:- یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی بہرحال تحفظ ہندوستان کی صنعت کی ترقی کے لئے لابدی شے ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تحفظ کی نوعیت کیا ہو فسکل کمیشن نے اختصاصی طریق تحفظ کی سفارش کی تھی یعنی صرف ان صنعتوں کو تحفظ دینا چاہیئے جو کہ اس کے بغیر ترقی نہ کرسکیں ان کے لئے اور ہر قسم کی ضروریات مہیا ہوں۔ تحفظ کے بعد ایک خاص مدت کے اندر اندر اس قابل ہوسکیں کہ باہر کی صنعت کا مقابلہ کرسکیں اس کے علاوہ ہندوستانی معاشیین نے بھی کچھ تنقیدیں اس پہ کی ہیں مثلاً یہ کہ تحفظ کی چند خرابیاں جو ہیں وہ

یہاں کے تحفظ میں نہیں ہونی چاہییں۔ اس میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہندوستان میں اس وقت بڑی بڑی صنعتوں پر اکثر و بیشتر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے اور چونکہ تحفظ کا بار اشیاء کے صرف کرنے والوں کے طبقہ پر پڑتا ہے اور اس کا فائدہ براہ راست مصنوعات کے پیدا کرنے والے سرمایہ دار کو اس لئے اس کا بھی کسی نہ کسی طرح علاج کرنا چاہیئے۔

(۲) ہندوستان میں اصل کی کمی ہے اس لئے یہ لازمی و لابدی ہے کہ غیر ملکی اصل سے کام لیا جائے لیکن اس کے معنی یہ نہ ہونے چاہئیں کہ اس اصل کے ذریعہ سے تحفظ کی بدولت جو کچھ فائدہ یا نتیجہ ہو وہ بھی یہ غیر ملکی سرمایہ دار اینٹھ لیں۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ سارے کارخانے دار آپس میں سازباز کر کے تحفظ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو لوٹ لیں۔ اس کی پیش بینی بھی کرنی چاہیئے۔

اس طرح اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا خیال تحفظ دیتے وقت از حد ضروری ہے لیکن تحفظ کی نوعیت کا فیصلہ خود ہندوستانیوں کو کرنا چاہیئے نہ کہ برطانوی حکومت کرے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحفظ کی بدولت ہندوستان اپنی دفاعی قوت کو ترقی دے سکتا ہے اور اپنی معاشی زندگی کا معیار بلند رکھ سکتا ہے ۱۹۲۳ء سے ہندوستان میں تحفظ کی پالیسی پر عمل شروع ہوا ہے مگر اس قسم کے تحفظ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ یہ بھی محض ہندوستانی سرمایہ دار اور کارخانہ دار کو بہلانے کے لئے دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ کوئی منظم پالیسی نہیں ہے۔ بلکہ انگلستان اور دیگر غیر ممالک کے سرمایہ داروں (جن کا ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتوں اور متاع ثروت پر قبضہ ہے) کے مفاد کا خیال کر کے یہ تحفظ دیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ تحفظ لازمی ہے اور اس کی نوعیت وغیرہ کا فیصلہ خود ہندوستانی کریں گے اور اس کے علاوہ تمام تلبیس آمیزانہ بحث و مباحثہ بیکار ہے۔

اقبال کا نوجوان

(از جناب نورالحسن ہاشمی صاحب ایم اے)

(بہ سلسلہ سابق)

نہ صرف زبان ہی سے علامہ اقبال نوجوانوں کی تعمیر سیرت پر زور دیتے ہیں بلکہ وہ عملاً بھی اسی قسم کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے چند نوجوان طلبا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک جلسہ شاعرہ کی صدارت کے لئے درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا خیر میں صدارت تو کرتا نہیں لیکن شاعری تم لوگوں کے لئے بہت مضر ہے اور پھر اس کے بعد موجودہ شاعری اور اس کے بے فائدہ ہونے پر اس قدر شدت سے لیکچر دیا کہ ان جوانوں کا تمام جذبہ شعری یک لخت ٹھنڈا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ ہم نوجوانوں کی جو حالت ہے یعنی یورپ کی کورانہ تقلید۔ احساس غلامی غائب خود پر بھروسہ نہیں اعتماد نہیں۔ تعلیم کو محض ذریعہ معاش یا ذریعہ وجاہت سمجھنا۔ "کالج میں بیٹھ کر محض ڈینگیں مارنا" ظاہر کو اصل حقیقت جاننا۔ خود غرض اور اپنی ہی فکر ہونا اس لئے آپس میں نفاق۔ مادہ اور حواسی چیزوں پر یقین رکھنا اس لئے بیدینی لامذہبی۔ تن کی پرورش اور روح کی تربیت سے ناآشنا محض۔ عیاں ہے کہ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہوگا اس قوم کی بقا کیونکر ہو سکتی ہے اب جبکہ قومیں زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور عرصہ کائنات میں فنا و بقا کا سخت معرکہ گرم ہے جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے یا جو نرم بستر کا عادی ہوا یقینی اس کو دوسری قومیں کچلتی ہوئی اور روندتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ کیا مسلمان قوم اس قابل ہے کیا اس میں زندگی کی اس قدر قوت ہے کہ وہ موجودہ تنازعہ للبقا کی گرما گرمیوں کی تاب لا سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اب وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں رہا اب مسلمان اور مسلمان بچے جیسے رہ گئے ہیں ان کی صورت ان کی حالت یہ ہے

مومن و پیش کساں بستن نطاق؟ مومن و غداری و فقر و نفاق!

با پشیزے دین و ملت را فروخت | ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست | ناز ہا اندر نیازش بود و نیست

نور در صوم و صلوٰۃ او نماند | جلوہ در کائنات او نماند

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ | فتنۂ او حب مال و ترس مرگ

رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور | دین او اندر کتاب و او بہ گور

صحبتش از عصر حاضر درگرفت | حرف دیں را از دو پیغمبر گرفت

آں ز ایراں بود و آں ہندی نژاد | آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد

تا جہاد و حج نماند از واجبات | رفت جاں از پیکر صوم و صلوٰۃ

سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی | از چنیں مرداں چہ امید بہی

از خودی مرد مسلماں درگذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است | بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است

سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود | در ہوا آشفتہ گردد ہمچو دود

ایں زماں از سر بزیری ہیچ نیست | اندرو جز ضعف پیری ہیچ نیست

آں شکوہ ربی الاعلیٰ کجاست | ایں گناہ اوست؟ یا تقصیر ماست

ہر کسے بر جادہ او تند رو | ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

صاحب قرآں و بے ذوق طلب
العجب ثم العجب ثم العجب

(جاوید نامہ)

اپنے گذشتہ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ حال کی کیفیتوں اور نزار حالتوں کو دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آئندہ کے ہولناک نتائج رہ رہ کر اپنا بھیانک چہرہ ہم کو دکھلاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ بے فکر اور لاپرواہ بیٹھے ہیں۔ ہم کو اپنے میں اعتبار نہیں رہا۔ خود میں نہ وہ استعداد

نہیں رہا۔ فنا (ویدانت اور بودھ مذہب والی) کو ہم بقا سمجھنے لگے ہیں اور اپنی کشتی موجوں کے تلاطم بغیر کسی پتوار یا ناخدا کے ڈال رکھی ہے۔ ہم خود قرآن کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اپنا راستہ تاریکیوں میں بھلا بیٹھے ہیں ایسے حالات میں اقبال کی آواز پر لبیک نہ کہنا گویا موت کو قطعی دعوت دینا ہے۔ اقبال کی بانگ کہ اپنی خودی میں یقین رکھو۔ ناامیدی بھول جاؤ۔ دل میں درد اور تپش پیدا کرو دل کو بلند اور روح کو سربلند کرو۔ فقر کو جادۂ راہ بقا سمجھو۔ راہ حق اور راہ دین میں گامزن ہو۔ یہ ایسی بانگ درا ہے کہ سونے والوں کو بغیر چونکائے نہیں رہ سکتی اور مست اور نیند کے متوالوں کو ایسا ہلا دے گی ایسا جھنجوڑے گی کہ وہ لامحالہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے

لیکن ایک سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نوجوان عملی ہے یا محض خیالی یعنی یہ کہ وہ نوجوان جو اقبال کے دل و دماغ میں ہے کیا دنیا میں واقعی طور پر ایسا ہونا اور ایسا تربیت اور تعلیم سے بن جانا ممکن ہے؟ بجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جوانی جس میں کہ شباب فطرتاً جوش اور نمائش خودی پر بہت مائل ہوتا ہے کیا اقبال کے فقر کی تلقین دل پر رکھ سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دنیا اور علائق دنیا سے اپنے دل کو الگ کر سکتا ہے جبکہ ہر ہر قدم پر اس کے لئے لغزش کے لئے سامان موجود رہتے ہیں۔ کیا وہ اس دنیا سے جس کو وہ بہت رنگین دیکھتا اور سمجھتا ہے یوں دل برداشتہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی رہے اور اس سے الگ بھی رہے۔ باہمہ اور بے ہمہ کا اصول اہل شباب کے لئے ناممکن ہی سا معلوم ہوتا ہے دل میں فقر پیدا کرنا۔ جوانی میں اپنے دل کو بڈھا بنا لینا ایک دماغی بیماری کہی جا سکتی ہے نہ کہ اس کا صحیح استعمال۔

اقبال کے پیغام فقر کی غلط تشریح ہوگی اگر اس سے اس قسم کے شکوک پیدا ہوں۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نوجوان اپنے احساسات یا جذبات یا خیالات میں کسی طور پر بڈھا بن جائے بلکہ وہ تو ایک ابدی شباب جوش اور ذوق عمل کی تلقین کرتا ہے۔ یہ صحیح کہ زمانۂ شباب تمام و کمال رنگینیاں اور دلچسپیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے باہر کی دنیا بھی رنگین

دولچسپ دیکھتا ہے لیکن وہ یہ تو کہیں نہیں کہتا کہ اس رنگینیٔ تخیل کو مار دو۔ یا برہمچریوں کی طرح نفس کے فنا کرنے کی ترغیب نہیں دیتا (بلکہ وہ اس کے سخت خلاف ہے ملاحظہ ہو واقعہ بریلوی چند گھنٹے علامہ اقبال کے ساتھ۔ معارف ستمبر ۳۸ء) بلکہ وہ البتہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ثانوی چیز ہے اول شئے حق کی راہ میں جد وجہد۔ اور اپنی خودی کی تعمیر ہے اور اپنے کردار و سیرت کی تربیت

معارف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

لیکن شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہونے سے پیشتر معاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرنا اول شرط ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کا نوجوان خیالی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اول تو اقبال کی تلقین جد و جہد جوش و سرگرمی کے ساتھ میں فطرت شباب کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ طبیعت میں استغنا و ہمت و پامردی اور خود اعتمادی کا پیدا کر دینا بھی جوانی کی نفسیات کے بالکل مناسب ٹھیرے گا۔ اس لئے کہ جوانی ہی میں آدمی اپنے میں زور و سوز محسوس کرتا ہے جوانی ہی میں وہ تمام دکماں پر فتح کرنے اور ہر شئے پر قدرت حاصل کرنے کا طامع ہوتا ہے اور جوانی ہی میں اپنی محنت و کوشش کے اعتماد پر اپنے میں آسانی سے شان استغنا پیدا کر سکتا ہے۔ بڑھاپا ضعف قویٰ کا زمانہ ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرص دنیا اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اپنے میں وہ شان بے نیازی نہیں پیدا کر سکتا جتنا کہ ایک نوجوان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے اور اسی شان بے نیازی کا دوسرا نام فقر ہے۔ اپنے نظریہ فقر کی اقبال مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی

کنجشک و حمام کے لئے موت ہے اس کا مقام شاہبازی!

روشن اس سے خرد کی آنکھیں بے سرمۂ بوعلی و رازی!

حاصل اس کا شکوہ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی

تیری دنیا کا یہ سرافیل رکھتا نہیں ذوق بے نوازی

ہے اس کی نگاہ عالم آشوب | درپردہ تمام کارسازی!
یہ فقر غیور جس نے پایا | بے تیغ و سناں ہے مرد غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

(جاوید سے۔ ضرب کلیم)

اقبال کا پیام عمل اور اقبال کی مسلسل جدوجہد نوجوانوں کے خون کو گرم کرتی ہے اور چونکہ گرمی شباب کا تقاضا ہے اس لئے کسی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کا پیغام جوانوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے رہی وہ باتیں جن کی تربیت اقبال نے تبلائی ہے وہ ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اس لئے ذرا سی تربیت سے ان خصائص کو غیر معمولی طور پر ترقی دی جا سکتی ہے مثلاً کون جوان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں حوصلہ مندی عزم و ہمت کے جذبات نہیں ہوتے۔ اسی جذبۂ حوصلہ مندی کو اقبال اور بھی اکسانا چاہتے ہیں اس قدر کہ زمین و آسمان پر اس کو مالک بنانا چاہتے ہیں بلکہ ذوق طلب اس قدر بڑھا دینا چاہتے ہیں کہ کسی مقام پر رک جانا یا کسی خاص جگہ کو منزل قرار دے دینا وہ نوجوان کے ذوق کی تشنگی و حوصلہ کی پستی قرار دیتے ہیں

تو رہ نورد شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول! | لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز | ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

جوانوں کو اس قسم کی تلقین ظاہر ہے ان کی فطرت کے کس قدر مطابق ہے اور کیونکر تحسین کی جا سکتی ہے

اقبال کے اس نوجوان کے متعلق ایک دوسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وہ شعائر و روایات اسلامی کے مطابق ہے؟ صوفیا و کرام تو اس سے قبل ذات کو فنا کر دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے اور قرآن سے اس کی تاویلیں بھی پیش کرتے تھے۔ جبر کو اصول زندگی مانتے تھے اور خود کو مشاکر عدم پر تکیہ کرنا شرائط ایمان میں سے سمجھتے تھے۔ یہ آخر اقبال نے کیوں اور کیسے خودی کی بقا اور خودی

کا قدرت کے اصول قرآن سے استنباط کرے۔

درحقیقت ایران کا تصوف یعنی خودی کا بطلان کا اصول ویدانت اور بدھ مت کے اصولوں کے موافق تھا اور جیسا علامہ اقبال نے اپنے مقالہ ایران کے فلسفہ میں ثابت کیا ہے اور اکثر خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ طریقہ تفکر ایران میں انہیں مذاہب کے پیروں کی تعلیم سے وہاں پہنچ چکا تھا اس لیے وہاں کے تفکر و تخیل پر جاری و ساری ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ چیز سامی نسلوں میں قطعی موجود نہ تھی اور یوں بھی یہ آریائی قوموں کی چیز ہے۔ اور اپنے اس خیال میں اقبال کو رومی سے بہت کچھ مدد ملی جس نے جبر و قدر کے مسئلہ کو دو لفظوں میں بالکل واضح کر دیا کہ

بال بازاں را سوئے سلطان برد
بال زاغاں را بہ گورستان برد

اس کے علاوہ یہ بات قرآن سے بھی ظاہر ہے کہ فرماتا ہے لیس الانسان الا ما سعٰی۔ نہیں ملتا کسی کو مگر اتنا جتنے کے لیے وہ محنت کرے۔ اور بالکل یہی چیز ہے جو رومی نے بتلائی ہے کہ جس میں جتنی ہمت و جرات ہوتی ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے ورنہ یوں زاغ اور باز دونوں کے پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودی کی فنا و بقا کے متعلق قرآن شریف کا صاف حکم موجود ہے کہ لا تحزن ولا تقنطو۔ ظاہر ہے جب یہ حکم دیا جائے گا کہ نہ غم کرو اور نہ نا امید ہو تو اس سے کبھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اپنی خودی کو مٹا دو اور اپنی خودی کا مٹانا تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب زندگی اور دنیا کو ہر طرح ہیچ سمجھا جائے اور یہی بدھ مذہب کا خاص پرچار ہے کہ چونکہ زندگی جینے کے لائق نہیں اور دنیا فانی ہے اور دکھ اور فساد سے بھری اس لیے اس میں جی لگانا بے کار ہے زندگی بدھ ازم کے مطابق فقیری میں اور بھکشو بن کر گذارنا چاہیے خود کو فنا اور بے کار محض سمجھ کے۔ اسلام نے اس قسم کی رہبانیت کی کبھی تعلیم نہیں دی لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ اسلام نے مادہ کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا اللہ

تناہی سے الگ رہنے یا بھاگنے کی کبھی تعلیم دی۔ہاں مادہ سے اپنی ذات اور روح کو بلند رکھنے کی البتہ تلقین کی ہے۔مادیات کو مقصد بالذات نہیں بنایا روح کو مادہ میں زندگی کرنے کو کہا لیکن یہ بھی کہا کہ اپنے دیدہ و دل وار کھے اور محض مادہ ہی میں نہ متوجہ رہے اور اسی کو اقبال فقر کہتے ہیں۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب
حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن
نگاہش بر شعاع آفتاب است

ان دلائل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اپنے نوجوان کو جو خودی کی تعمیر کی اور بے خوفی کی تعلیم دیتا ہے وہ سر اسر قرآں کے احکام کے مطابق ہے۔لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون اس کی تلقین میں جاری و ساری ہے رہا یہ امر کہ انھوں نے صرف مسلمان نوجوانوں کو کیوں مخاطب کیا کیا دوسرے جوانوں میں اس قسم کی کمزوریاں نہ تھیں جو مسلمان نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں یا کیا یہی تعلیم دوسری جوانوں کے لئے مفید ثابت نہ ہوگی۔اس امر کا شافی جواب ان کے ایک خط میں مل سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک معترض مسٹر ڈکنس کے متعلق لکھا ہے جو کہتا تھا کہ ان کا تخاطب مسلمانوں ہی سے صرف ان کے محبت اسلام کی وجہ سے ہے

"یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنس کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھیرایا ہے بلکہ دراصل میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے

تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم"

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی موجودہ مسلم نوجوان کی بیماری کی تشخیص صحیح ہے اور کیا ان کا طریقہ علاج جو انھوں نے بتایا ہے وہ مفید ثابت ہوگا۔دوسرے الفاظ میں کیا اقبال

کا نوجوان موجودہ تنازعۃ البقا اور کشمکش کو سر کرنے کے لائق اور اسمیں کامیاب ثابت ہوگا۔ اور اس قدر کامیاب کہ وہ دوسروں سے بازی لے جا سکے گا:۔

یہ تو بالکل عیاں ہے کہ مسلمان من حیثیۃ القوم آج کل بہت پستی کی حالت میں ہیں دوسری قومیں ان سے بہت آگے بڑھ چکی اور بڑھ گئی ہیں۔ مسلمان بالکل جمود کی حالت میں ہیں۔ اس لئے کہ کوئی راہ عمل ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ ہر قوم کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں اور تکتے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ آپس میں نفاق الگ۔ افراد کے سردار الگ بے ذوق و پست۔ نہ ارادوں میں زور نہ دلولوں میں شور اس تمام پستی کی اصل وجہ کیا ہے؟ محض یہ کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے' دوسری وجہ یہ کہ غلط تعلیم و تربیت

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کس قسم کے نکلیں گے

یہ بتاں عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں ۔۔۔ نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

یا

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ۔۔۔ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

غرضکہ مسلمان اور مسلمان نوجوانوں کی جو حالت آج کل ہے اس کی تشخیص اور نبض شناسی اقبال نے بالکل صحیح کی ہے۔ اب رہا طریقۂ علاج! اقبال نے پہلے جڑ ہی کی حالت درست کرنا مناسب سمجھا اور اس کی درستی کے لئے ان کا پہلا اور اصلی گر خودی کی تلقین ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو صحیح راستہ پر اور منصوبہ خیال کرنا شروع کرے گا تو ظاہر ہے اس کی وہ تمام قوتیں برسرکار آجائیں گی جو اس میں پنہاں ہیں اور یہی تخلیق کا مقصد ہے کہ ہم اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اس طرح فطرت کے عطایا کا صحیح اور جائز استعمال ہو سکے۔ جب دل سے کمزوری کا احساس جاتا رہا اور نگاہ میں گرمی آنا شروع ہوئی تو ایسا نوجوان جو نہ کچھ کر ڈالے عجب نہیں

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار ۔۔۔ شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار ۔۔۔ ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اور ایسا نوجوان جس کی خودی بیدار ہو گئی ہو اس کی زندگی کا کیا کہنا

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی　　نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال کا دوسرا گر فقر کی تلقین ہے اور در حقیقت یہ بہت بڑا اور اہم اصول ہے۔ دنیا میں رہنا لیکن دنیا کو مقصد بالذات نہ سمجھنا خاک سے اور خاک میں پیدا ہونا لیکن کرۂ خاکی سے آپ کو سر بلند رکھنا دراصل عزم و ہمت و حوصلہ کی بہترین تربیت ہے اور خصوصاً مسلمان کے لئے آج کل جب کہ ان کی اپنے نصب العین سے ناواقفیت ان کو مختلف غلط راستوں پر ڈال دینے کے لئے آمادہ ہے، انہیں زر و مال و خوں ریزی و جہانگیری حرص و طمع کے جال پھیلائے ہوئے ہے اور مسلمان کے قدم اس کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے اور اس غلط راستہ پر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اقبال کے یہ بانگ فقر نہایت خوش آیند کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے کہنے کا طرز بھی کچھ کم موثر نہیں۔ جوش و روانی۔ زور و شور کے ساتھ جوان کا اپنا ذاتی ڈھنگ ہے اور خون نوجوان کے لئے بہت موزوں ہے وہ مسلمان نوجوان کو گذشتہ کی بھی یاد دلاتے ہیں اور گذشتہ کی حالات بتا کر اسے اکسانا اور آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ (تاریخ کی تعمیری قوت سے وہ بخوبی واقف ہیں ان کے نزدیک سر زند از ماضی تو حال تو خیزد از حال تو استقبال تو)

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟　　وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں　　کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

طنز سے بھی موقعہ موقعہ سے کام لیتے ہیں

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا　　موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے　　پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

یا

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں　　کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

غرضکہ ہر طرح سے وہ مسلم خوابیدہ کو بیدار کر دینا چاہتے ہیں۔ درد دل میں ہے اس لئے انہیں

اپنی غایت اور اس غرض سے کام ہے کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو جائیں ورنہ طریقہ بیداری ان کی شاعری کا جزو اصلی نہیں

اب رہی یہ بات کہ ایسا نوجوان موجودہ دنیا میں اپنا کیا درجہ رکھے گا سو ظاہر ہے کہ جب خود میں امتیاز ور پیدا ہو جائے گا اور اپنے میں اس قدر اعتماد ساتھ ہی دل میں وسعت نگاہ میں بلندی اور جان میں سوز تو ایسے نوجوان کے راستوں میں کونسی رکاوٹیں حایل ہو سکیں گی۔ صرف یہ نہیں کہ وہ موجودہ حالات زندگی کے موافق اپنے آپ کو بنا سکے گا بلکہ اپنی قوت روحانی کی بدولت وہ مصائب زندگی میں اس قدر طاقتور ثابت ہوگا کہ اپنے حالات اپنے خارجی واقعات پر پورا پورا قبضہ وقدرت حاصل کر سکے گا۔ وہ محض اپنے زمانے اور وقت کی پابندی نہ کرے گا بلکہ اپنے زمانہ اور وقت کو اپنا پابند بنائے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ اقبال نے روح کی تربیت فرائی ہے اس لئے ایسا نوجوان محض کسی خاص زمانہ اور خاص عہد ہی کے لئے موزوں اور مناسب نہ سمجھا جائے بلکہ تمام آنے والے عہدوں اور زمانوں کے لئے کسی خاص مقام یا جغرافی چار دیواری کے لئے نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ کے لئے۔ مختصرا یہ کہ ایسا نوجوان ہمیشہ کے لئے مثالی رہے گا۔ اس لئے کہ روح کے لئے صحیح تعلیم اور صحیح راستہ کا مل جانا شرط ہے۔ گامزن تو وہ ہو ہی جائے گی۔ مسلمان قوم اب تک محض اس وجہ سے دوسروں کا منہ دیکھتی رہی اور دوسروں کی تقلید کرتی رہی کہ اسے خود اپنا جادہ نہیں معلوم تھا اس کے علاوہ صوفیا نے بعض غلط راستہ پر ڈال دیا تھا۔ اب جب کہ انہیں ایک درویش اور دانائے راز نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم پھر گذشتہ کی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں سربلند اور ممتاز نظر آنے لگے

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کیا مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر نوجوان یا مسلمان نوجوان (یا کسی نوجوان) کے لئے اس سے بہتر تعلیم ممکن ہے؟ بہتر و بدتر ایک اضافی کلمہ ہے جو ہر زمان و مکان میں مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ کی موجودہ حالت اور دنیا کی فی زمانہ رنگ کشمکش دیکھتے ہوئے صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نوجوان کا تصور مکمل۔ باعمل اور

بہترین ہے اور اس کے ساتھ اتنا بھی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے بہتر بھی کوئی مثالی نوجوان ممکن ہوا اور ساتھ ہی وہ عملی بھی ہوا تو اس کا بھی تخیل اقبال ہی کے نوجوان کی داغ بیل پر ڈالا جائے گا اور اسی کی محض ایک ترقی یافتہ صورت ہوگی نہ کہ اس مختلف النوع۔

آخر میں بس اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر کرائیں کیونکہ ان اصول کا منبع و مخرج قرآن ہے اور انھیں پر عمل کرنے سے وہ پھر دنیا میں سربلند اور نیک نام ہو سکتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے

برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا؟

قدیم زمانے میں اس جزیرہ کا نام برٹین تھا اور اس میں نیم وحشی لوگ آباد تھے۔ اس کی جنوبی بندرگاہوں میں جو اس زمانے میں دنیا کا انتہائی شمالی کنارہ سمجھی جاتی تھیں رومی تاجر آکر رکتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں ٹین ملتا تھا جس کی برونز (یعنی تانبے اور ٹین کا مرکب) بنانے میں ضرورت پیش آتی تھی۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو لوہے کا زیادہ علم حاصل نہیں تھا اوزار اور ہتھیار بنانے کے لئے برونز کو ہی سخت ترین دھات کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا انگلستان میں آج جس علاقہ کا نام کارنوال ہے وہاں جولیس سیزر کے زمانے (۵۵ ق۔م۔) سے پہلے ٹین کی کانوں کو کھودنا شروع کر دیا گیا تھا اور رومی جہاز اسے اٹلی لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان ابتدائی تجارتی تعلقات کے باوجود انگلستان ایک تجارتی قوم نہیں بن سکی تھی۔

امریکہ کی نئی دنیا کے دریافت ہونے سے پہلے جزائر برطانیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ واقع تھے۔ اس زمانے میں جس دنیا کا لوگوں کا علم تھا اس کا مرکز بحر روم تھا اور جیسے وینس، اسکندریہ بغداد اور موصل دنیا کے تجارتی شہر سمجھے جاتے تھے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں جہاز بحر روم میں تیرا کرتے تھے اور قیمتی سامانوں سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے مشرقی یورپ سے مغربی ایشیا کا مسلسل سفر کرتے رہتے تھے۔

لیکن برطانیہ کے پاس تاجروں کو دینے کے لئے کچھ زیادہ مال نہیں تھا اور اس کا محل وقوع بھی تجارت کے لئے موزوں نہیں تھا۔ رومی اور دوسرے قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ برطانیہ پر سطح زمین کی حد ختم ہو جاتی ہے اور چونکہ زمین کی گولائی کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اس سے آگے بڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ فنا کے اتھاہ گڑھے میں کود جائے۔ قدیم اسکندریہ اور یورپ کا دنیا کے جو نقشے عہد وسطے میں بنائے جاتے تھے ان میں برطانیہ کو دنیا کے شمالی مغربی سرے پر جگہ دی جاتی تھی۔ دوسرے مہذب

ملکوں سے چونکہ اس کے تعلقات بہت کم تھے اس لئے اسے یورپ کے وحشیوں اور غیر مہذب لوگوں کا تاریک مسکن سمجھا جاتا تھا۔

بعد کے زمانے میں بھی تاجروں کو برطانوی بندرگاہوں تک پہنچنے کے لئے جن کی آبادی چھوٹے قصبوں سے زیادہ نہیں تھی ساحل اٹلانٹک تک سفر کرنے کا کوئی خاص شوق پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسے زیادہ پسند کرتے تھے کہ بحر روم کے ان شہروں کا سفر کریں جو نزدیک تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت مہذب بھی تھے۔ یہاں تاجروں کو تفریح و دلبستگی کا خوب موقع ملتا تھا۔ اگر جینوآ کا کوئی تاجر خرید و فروخت کرنا چاہتا تھا تو چند روز کا سفر کر کے وہ مارسائی یا اور زیادہ نزدیک کے شہروں مثلاً فلورنس اور وینس تک چلا جاتا تھا۔ اسکندریہ تک بھی وہ جا سکتا تھا جہاں اسے ہندوستان، چین، ایران اور عراق و عرب کے تاجروں سے مال کے مبادلہ کا موقع مل سکتا تھا اور اگر وہ اپنا گھر چھوڑنے کے لئے مائل نہ ہوتا تھا تب بھی گھر بیٹھے بہت سے ملکوں کا مال اسے مل جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اٹلی دنیا کے کاروبار کا مرکز تھا۔

لیکن بیچارہ انگریز تاجر اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔ کیونکہ جنوآ، وینس اور بروگس کے جہاز محض کبھی کبھی انگلستان کی بندرگاہوں کی طرف آ نکلتے تھے۔ جس علاقہ کو آج بلجیم کہا جاتا ہے خصوصاً اس کا شہر بروگس تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کی تجارت کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ بروگس کے کپڑے کے تاجر انگریزی اون خریدتے تھے اور اس کے معاوضہ میں اٹلی کا بنا ہوا سامان دیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر غریب انگریز تاجروں کو اپنا مال بیچنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو جانا پڑتا تھا اور انھیں بڑی مشکلوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے لئے بحری سفر بہت طویل اور خطرناک ہوتا تھا۔ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ان پر اکثر حملے کر دیا کرتے تھے اور ان کے مال پر قبضہ کر کے ان کے جہازوں کو ڈبو دیتے تھے۔ جب کبھی یہ بیچارے منزل مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جاتے تھے تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے مال کی طرف کوئی متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

نئی دنیا کا انکشاف | لیکن [illegible] کے بعد حالات نے ایک نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا کہ کرسٹوفر کولمبس نے [illegible]

تھا ایک جہاز راں تھا غیر معلوم سمندروں کا سفر کیا اور انگلستان کے مغرب میں نئی سرزمین کو دریافت کیا جس کا نام بعد میں امریکہ رکھا گیا۔ اس کے بعد اور لوگوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور بہت جلد سمندر پار دو نئے براعظموں یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ کو دنیا کی حدود میں شامل کر لیا گیا۔

انگریزی جہاز رانوں نے بھی اس نئی سرزمین کو دیکھنے کے لئے مغرب کا سفر کیا۔ انگریزوں کے بادشاہ کی ملازمت میں وینس کا ایک جہاز راں جان کیبٹ تھا اس نے ۱۴۹۷ء میں نیوفاؤنڈلینڈ کو دریافت کیا۔ انگلستان کے غریب بادشاہ نے اسے اس کارگزاری کے صلہ میں دس پونڈ یعنی ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا! لیکن انگلستان کے لوگوں نے دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ بہت سے آدمی آیندہ کے بحری سفر میں اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔

ان انکشافات کی وجہ سے ہر ملک کی تجارت کی رفتار تیز ہو گئی۔ اسپین اور پرتگال نے جن کا شمار اس وقت کی بڑی تجارتی قوموں میں کیا جاتا تھا سونا اور دوسری دولت کو لانے کے لئے دریافت کرنے والوں اور فتح کرنے والوں کو روانہ کرنا شروع کر دیا اور ان ملکوں کی دولت بہت تیزی کے ساتھ بڑھ گئی۔ اس کے بعد واسکوڈ ےگاما نے جو پرتگال کا ایک حوصلہ مند جہاز راں تھا افریقہ کے گرد چکر لگایا اور یہ معلوم کیا کہ تاجروں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ پورا راستہ پانی پر طے کر کے اپنا مال ہند شرقی، چین اور ہندوستان تک لے جائیں۔ بحر روم کے تاجر شرقی ملکوں کی تجارت میں اپنا حریف کسی کو بنتا نہ دیکھ سکتے تھے اس لئے انھوں نے مشکلات پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تاکہ مغربی یورپ کے تاجروں کو مکمل بحری راستہ نہ مل سکے۔ مگر اب ایسا راستہ ہند اور مادہ رلئے ہند کا دریافت ہو گیا تھا جس پر ان کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

یہ اہم خبر ایک جہاز راں سے دوسرے جہاز راں تک، ایک شہر سے دوسرے شہر تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیلتی رہی۔ انگلستان کو ایشیا سے اپنی تجارت بڑھانے کا بہت شوق تھا اس نے بحری راستہ کے دریافت ہو جانے کے بعد اس نے بھی تجارت کی اس تگ و دو میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ انگریزی ملاحوں نے پرتگیزی جہازوں پر ملازمت کرنا شروع کی تاکہ اس بحری راستہ کے

رموز کا پتہ چلائیں جو افریقہ کے گرد جاتا ہے۔ انگریزی تاجروں نے دور دراز علاقوں مثلاً ترکی، روس، اٹلانٹا اور افریقہ کے شمالی ساحل سے بھی تجارتی تعلقات شروع کر دیے اور انگلستان نے اس کا بھی پورا ارادہ کیا کہ مغرب میں جو نئی زمینیں دریافت ہوئی ہیں ان کی تجارت میں بھی اپنا واجبی حصہ حاصل کرے۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں برطانوی بندرگاہیں تجارت کے خوش حال مراکز بن گئیں

یورپ کے ملکوں میں جہاں جہاں تجارت کی جاتی تھی وہاں کشتی سازی اور ملاحی نے اہم پیشوں کی حیثیت اختیار کر لی۔ برطانیہ کے نوعمر لڑکے ملاح بن کر سمندر کے سفر کرنے لگے۔ برطانوی تاجر خوشی کے ساتھ اپنے جان اور مال کو دنیا کے بعید ترین گوشوں سے تجارت کرنے کے لئے خطرہ میں ڈالنے لگے۔ انگلستان کے جری سپاہیوں نے جنھیں "ایلزبتھ کے سمندری کتوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یعنی ڈریک، ریلے، ہاکنس اور گلبرٹ نے حریف ملکوں کے جہازوں کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا۔ اسپینی جہازوں کی دولت کو یہ لوگ اکثر لوٹ لیا کرتے تھے جس کا یہ اثر ہو گیا تھا کہ برطانوی جھنڈے کو دیکھ کر غیر ملکی ملاح کانپنے لگتے تھے ان لوگوں نے بہت سے سالوں تک اسپین کی تجارت کو لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان جہازوں کے مال کو اپنے وطن لے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ غلاموں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ افریقہ سے غلاموں کو خریدتے تھے اور ہند مغربی کے اسپینی نوآبادی بسانے والوں یا اسپین کے دولتمند لوگوں کے ہاتھ انھیں فروخت کر دیتے تھے۔

یہ لوگ اس قدر دلیر تھے اور اسپین کے جہازوں کو اتنا نقصان پہنچاتے تھے کہ آخر میں مجبور ہو کر اسپین نے انگلستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس جنگ میں اسپین ناکامیاب رہا۔ سنہ ۱۵۸۸ء میں اسپین کا شاندار بیڑہ یعنی آرماڈا جو انگلستان کی بڑھتی ہوئی بحری قوت کو تباہ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ختم کر دیا گیا۔ اور اس طرح انگلستان کا ایک نہایت طاقتور حریف مقابلہ کے میدان سے خارج ہو گیا۔ انگلستان کے لوگوں کی ہمتیں اور حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے کل دنیا کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی توجہ کو مرکوز کرنا شروع کر دیا۔

غرضکہ اس چھوٹے سے جزیرے کی تجارت دنیا کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اب دنیا میں اس کا محل وقوع بدل چکا تھا۔ اسپین اور پرتگال کے علاوہ یورپ کے باقی تمام ملکوں کے مقابلہ میں امریکہ سے اس کا فاصلہ کم

تھا۔ اس کے پاس بہت سی اچھی بندرگاہیں اور عمدہ جہاز تھے۔ اس کی قوم کے لوگ ماہر جہاز راں بن گئے تھے اور انھیں تجارت کے فائدہ کا بھی پوری طرح علم تھا۔

چنانچہ اب انگلستان کا مقابلہ غیر ملکی تاجروں کے ساتھ بہت سخت قسم کا ہوگیا تھا۔ زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے انگلستان کے لوگ بڑے خطرے برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے۔ اپنے لدے ہوئے مال کو حفاظت کے ساتھ پہنچانے کے لئے "انگلستان کے سمندری کتے" طوفانوں کے موقع پر، دشمن کے جہازوں کی لڑائی کے وقت اور دوسرے خطرات کے موقعوں پر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ خوفناک بحری ڈاکو اب بھی ساحلوں پر گھات میں لگے رہتے تھے۔ جہاز بہت مختصر اور نازک ہوتے تھے اور اگر موجودہ معیار سے انھیں جانچا جائے تو بڑے سمندروں کے خطرات کے مقابلہ کرنے کی اہلیت ان میں بہت کم تھی۔

ملک کے اندر جو لوگ انگلستان کی تجارت کے کام میں مصروف تھے ان کی جانیں تو خطرے میں نہ ہوتی تھیں لیکن وہ اپنا مال خطرے میں ڈال رہے تھے۔ دولتمند خواتین اپنے زیور گروی رکھ کر تجارتی مال سے جہازوں کو لادا کرتی تھیں۔ بیرونی تجارت سے نفع کمانے اور اپنی دولت کو کئی گنا بڑھانے کے لئے لوگ اپنا سارا روپیہ خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ اس زمانے میں صرف قیمتی مال جہازوں پر لادا جاتا تھا اور جب یہ مال ایک دفعہ ملکی بندرگاہوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ جاتا تھا تو اسے بہت بڑے نفع کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا تھا۔ لوگ نفع کو ہی اپنے سامنے رکھتے تھے اور نقصان کا خیال اور اس اندیشہ کو کہ ممکن ہے جہاز ڈوب جائے اور کبھی واپس نہ آئے دل میں جگہ نہ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ برابر ہوتا رہتا تھا کہ بہت سے آدمی دولت مند ہو جاتے تھے اور بہت سے بالکل تباہ و برباد۔ کاروباری لوگ بڑی بڑی بازیاں لگاتے تھے اور جہازوں کے واپس آنے کا دیر دیر تک انتظار کرتے رہتے تھے۔

برطانوی تاجروں کی تجارتی کمپنیاں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی

کسی ایک آدمی کے لئے دولتمند بن جانا بہت مشکل تھا۔ دو سال کی طویل مدت کے سفر کے لئے جو جہاز نکلتے تھے ان کے لئے سامان کوئی ایک آدمی تنہا فراہم نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تن تنہا جہاز کو حملہ آور ڈاکوؤں یا دوسرے ملکوں کے حریف جہازوں کے بالکل رحم و کرم پر رہنا پڑتا تھا۔ تاجروں نے اس مسئلہ کا حل کمپنیاں بنا کر کیا۔ یہ کمپنیاں جہازوں کا ایک بیڑہ

بناتی تھیں ان کو چلانے کے لئے ملاحوں کو ملازم رکھتی تھیں اور طویل سفر کے لئے جس قدر غذا اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان سب کو فراہم کیا کرتی تھیں۔ ان کا نام تجارتی کمپنیاں ہوتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ان تجارتی کمپنیوں کی بہت مشہور مثال ہے۔ اس کے جو اراکین سمندر کا سفر کرتے تھے اگر وہ ڈوب نہ جاتے تھے یا ایشیا کے ویران ساحلوں پر بخاریں مبتلا ہو کر نہ مرتے تھے تو واپسی پر خاصے دولت مند ہو جاتے تھے۔ اس کمپنی کی ابتدائی تاریخ مسلسل اور پیہم خطروں، جرأت، ہمت، عزم، استقامت، کامیابی اور ناکامی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں یہ زیادہ عرصہ تک باقی رہی اور اس کو منافع بھی زیادہ حاصل ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سنہ ۱۶۰۰ء میں ان انگریزی تاجروں نے بنایا تھا جنھوں نے ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان اور انگلستان کی تجارت کے اجارہ کا پروانہ حاصل کرنا چاہا تھا۔ ملکہ نے انھیں پروانہ دے دیا تھا۔ ۱۶۰۱ء میں چار جہاز جو اس کمپنی کی پہلی تجارتی مہم تھی انگلستان سے روانہ ہوئے تھے اور ڈھائی سال بعد یہ جہاز سیاہ مرچ سے لدے ہوئے واپس آئے تھے۔ کمپنی نے انھیں بیچ کر بہت نفع کمایا تھا۔ اس کے بعد اور زیادہ سرمایہ جمع کیا گیا۔ سنہ ۱۶۰۴ء میں ہی چاروں جہاز دوبارہ روانہ کئے گئے۔ ایک تو تباہ ہو گیا لیکن تین واپس آئے اور اپنے ساتھ سیاہ مرچ، لونگ، جائفل   اور جوتری لاد کر لائے۔ کمپنی کے اراکین میں اس کی آمد پر بڑی ہماہمی اور ہنگامہ ہوا تھا۔

سنہ ۱۶۰۷ء میں تین اور جہاز بھیجے گئے لیکن ان کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں دو جہاز اور بھیجے گئے لیکن دونوں ضایع ہو گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۶۰۹ء میں ایک جہاز بھیجا گیا اور اتنا قیمتی مال واپس لایا کہ کمپنی کے شرکاء کو دو سو فی صدی منافع تقسیم کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس کامیابی کی جب خبر پھیلی تو سرمایہ اکٹھا کرنا بہت آسان ہو گیا۔

سال گذرتے رہے اور کمپنی کی قسمت بھی پلٹے کھاتی رہی۔ بعض سالوں میں اسے نفع ہوتا تھا اور بعض میں نقصان۔ جب جہاز انگلستان واپس آنے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو مال کی ہر طرف سے مانگ ہوتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں جو مال آتا تھا وہ موجودہ زمانے کے مال سے بہت مختلف ہوتا

تھا۔ آج کل کی طرح لوہے، کوئلے، گوشت، گیہوں، تیل وغیرہ سے جہاز لدے ہوئے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں تیس لاکھ پونڈ سیاہ مرچ، ۳ لاکھ پونڈ جوتری پندرہ لاکھ پونڈ شورہ ہوا کرتا تھا۔ تانبے اور ٹین کی بھی مانگ رہتی تھی۔ اسی طرح کافی، چائے، ادرک، بانس، بنگالی ریشم، سوت اور رنگین رومالوں کی بھی مانگ تھی۔ جب کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز واپس آتے تھے تو لوگ بڑے ذوق اور شوق سے ان چیزوں کو خریدا کرتے تھے۔

لیکن رفتہ رفتہ جہاز رانی محفوظ ہوتی گئی۔ زیادہ جہاز مال سے لدے ہوئے انگلستان واپس آنے لگے اور کمپنی نے آہستہ آہستہ روپیہ پیدا کرنا شروع کیا۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں اور کمپنیاں بنائی گئیں۔ کچھ لوگوں نے وہیل مچھلی کا شکار کرنے کے لئے جہاز بنائے اور انھیں گرین لینڈ کے سمندروں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ وہیل کے شکار کی صنعت بھی اتنی ہی غیر یقینی تھی جتنی مشرق بعید کی تجارت۔ بعض سالوں میں کمپنی کامیاب ہو جاتی تھی اور بعض سالوں میں بالکل ناکام رہتی تھی۔ لیکن ان کمپنیوں کی ناکامی کے باوجود انگریز تاجر اپنا روپیہ ان کمپنیوں میں لگاتے رہے۔ ان کے جہاز کرہ زمین کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے رہے اور انگلستان کی تجارت جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے برابر بڑھتی رہی۔

سنہ ۱۶۱۳ء تا سنہ ۱۷۵۰ء میں انگلستان کی تجارت کی ترقی	
سنہ ۱۶۱۳ء	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر
سنہ ۱۷۰۰ء	۶ کروڑ ۲۰ لاکھ "
سنہ ۱۷۵۰ء	۱۰ کروڑ ڈالر

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کی حالت میں کس طرح تبدیلی واقع ہوئی۔ ابتدا میں انگلستان مہذب دنیا کے بالکل سرے پر آباد تھا لیکن بعد میں وہ دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ اس کے مناسب محل وقوع اس کی عمدہ بندرگاہوں اور اس کی حوصلہ مند آبادی نے اسے تجارتی رہنمائی کا اہل بنا دیا۔ انگریز قوم کو سمندر سے اور تجارت کے کاروبار سے ہمیشہ انسیت رہی ہے۔

اس غیر ملکی تجارت سے برطانیہ کی صنعتوں کو بھی ترقی ہوئی۔ دوسرے ملکوں کی تجارتی [illegible]

اور کپاس کو جب انگلستان نے حاصل کرنا چاہا تو اسے اس کے بدلے میں اپنی بنی ہوئی چیزوں کو روانہ کرنا پڑا انگلستان کے کاریگروں نے لوہے کا مال اونی اور سوتی مال، مٹی کے برتن، گھر کے استعمال کی چیزیں روز بروز زیادہ مقداروں میں بنانا شروع کیں اور انھیں انگلستان کے تاجروں نے ان ملکوں میں بھیجنا شروع کیا جہاں سے وہ کچا مال حاصل کرنا چاہتے تھے۔

برطانیہ کے لیے ایک بڑے تجارتی بیڑہ کی تعمیر | چونکہ برطانیہ بہت سی چیزیں درآمد اور برآمد کرتی تھی اس لئے انگریز تاجروں نے مال کو لانے اور لیجانے کے لیے خود اپنے جہاز تعمیر کرنا نفع بخش سمجھا۔ تجارتی کمپنیاں تو اس کام کو پہلے ہی سے کر رہی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو جہاز ابتدا میں بنائے اس میں جس اصول کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا وہ یہ تھا کہ جہاز چاہے سست رفتار ہوں لیکن ہونے چاہئیں مضبوط اور مستحکم۔ یہ بہت پختہ ہوتے تھے اور خراب موسم کا مقابلہ کر سکتے تھے اور بحری ڈاکوؤں کو پسپا کرنے کے لئے خوب مسلح ہوتے تھے۔ لیکن یہ سپاٹ اور چوکور ہوتے تھے اس لئے ان کی رفتار تیز نہیں ہوتی تھی۔ انگلستان سے ہندوستان تک سفر کرنے میں دو سال بلکہ اس سے بھی زائد لگ جاتے تھے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی کے پورے زمانہ میں انہی سست رفتار لیکن محفوظ جہازوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔

۱۸۵۰ء میں "ٹی کلیپرس" کی تعمیر | ابتدا میں چائے کا شمار تعیشات میں ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۶۶۴ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قیمتی تحفہ انگلستان کے بادشاہ کو دینا چاہا تو اس نے دو پونڈ چائے کے ایک بنڈل کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔

سترھویں صدی میں انگلستان کے لوگوں نے چائے کو پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۰۰ء تک مشرق بعید کی تجارت کا یہ ایک اہم جز بن گئی تھی لیکن مال کے جہازوں کی سست رفتاری کی وجہ سے اس کی تجارت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ چین سے انگلستان تک آنے میں جو ایک سال صرف ہوتا تھا اس میں چائے کا سارا ذائقہ ختم ہو جاتا تھا۔

۱۸۵۰ء میں نئے نمونہ کے بادبانی جہازوں نے جو امریکہ میں بنائے جاتے تھے انگریزی جہازوں کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ یہ جہاز پتلے اور ترشے ترشائے ہوتے تھے تقریباً ایک ایکڑ کے رقبہ میں

ان میں سفید بادبان پھیلے ہوئے ہوتے تھے اور جب ان میں ہوا بھر جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرند اڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ان کا نام "کلپرس" تھا۔ انگلستان کو مشرق کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ان کی نقل اتارنا پڑی۔

ان جہازوں کے تیز رفتار اور قابل اعتماد ہونے کا پتہ ان کی انتہائی کارگزاریوں سے چلایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ پانچ "کلپرس" چین کے فوچو مقام سے ایک ہی روز روانہ ہوئے اور انگلستان کے دریائے ٹیمس میں چند گھنٹوں کے فصل سے ۱۲۰ دن بعد پہنچ گئے۔ اس طرح پر انگلستان کے "کلپر" جہازوں کے بیڑے نے رفتار کی تیزی کے مسئلہ کو حل کر دیا۔

ان "کلپر" جہازوں کو اس زمانہ میں ایک بڑی حیرت انگیز چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چلانے کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی تھی اور جو کپتان انھیں چلاتے تھے وہ حریف جہازوں کے ساتھ اپنے مقابلہ کا تذکرہ فخر کے طور پر کیا کرتے تھے۔

__فولاد کے بنے ہوئے دخانی جہاز__ لیکن تمام بادبانی جہاز جس میں "کلپرس" بھی شامل تھے ہوا اور موسم کے پابند ہوا کرتے تھے چار مہینے کے اندر چین سے انگلستان تک کا سفر نہایت موافق حالات میں کیا جاسکتا تھا لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہوا اور طوفان کی وجہ سے انھیں دیر ہو جاتی تھی بلکہ راستہ بھٹک جاتا تھا اس لیے جہازوں کی کمپنیاں زیادہ قابل اعتماد ذرائع سفر کی ضرورت بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھیں۔

[illegible] کے ابتدائی سالوں میں دخانی انجنوں سے چلنے والے جہازوں کی افواہ مشہور ہوئی رابرٹ فلٹن کے جہاز کلیر مونٹ نے دریائے ہڈسن پر چلنا شروع کر دیا اور دریائے اوہیو اور مسیسپی پر بھی دخانی کشتیاں چلنے لگیں۔ جہاز بنانے والوں نے سوچنا شروع کیا کہ دخانی جہاز سمندروں پر بھی کیوں نہ چلائے جائیں تاکہ سفر میں تیزی اور باقاعدگی پیدا ہو جائے اور ترقی پسند جہاز سازوں نے مسافروں اور مال کے لیے ایسے جہاز بنانا بھی شروع کر دیے۔

[illegible] میں ایک انگریزی جہاز "گریٹ ویسٹرن" بحر اٹلانٹک کو پار کر کے محض دخانی قوت سے نیویارک پہنچ گیا۔ انگلستان کو واپس ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ ۲۰۰ مسافر اور ۲۰ ہزار خطوط لایا۔ اور

پندرہ دن کے اندر اس نے اپنا سفر پورا کر لیا۔ اس سے جہاز بنانے والی کمپنیوں کو دخانی جہازوں کے فائدے کا یقین ہو گیا۔ بادبانی جہاز بالکل تو ختم نہیں ہوئے۔ بادبانوں کی قوت کے استعمال کرنے میں خرچ کم تھا اور سفر خاصی تیزی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا اسی لئے آج بھی بہت سے بادبانی جہاز سمندر کا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔

لیکن دخانی انجنوں نے بادبانوں کی جگہ لینا شروع کر دی اور پرانے اور لکڑی کے جہازوں اور ترشے ہوئے "کلیپرس" کی جگہ فولاد کے بنے ہوئے جہاز استعمال کئے جانے لگے۔ اس سے برطانیہ کو سمندروں پر اپنی برتری قائم رکھنے کا موقع مل گیا ورنہ کلیپرس کے ذریعہ سے امریکہ نے برطانیہ کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوہے اور فولاد کو برطانیہ نے امریکہ سے پہلے بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ فولاد کے جہاز امریکہ کے مقابلہ میں سستے بنا سکتا تھا۔
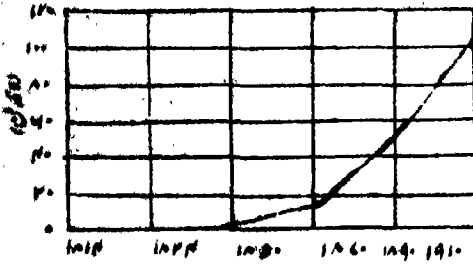
۱۲۰
۱۰۰
۸۰
۶۰
۴۰
۲۰
۰
۱۸۱۴ ۱۸۲۴ ۱۸۵۰ ۱۸۶۰ ۱۸۹۰ ۱۹۱۰

سنہ ۱۸۱۴ء تا ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے جہازوں میں اضافہ

چنانچہ جتنی فیکٹریاں بڑھتی رہیں کوئلہ کو جتنی کانوں سے نکالنے کا کام ترقی پاتا رہا اور زیادہ فولاد اور ریل کی پٹریاں بنائی گئیں اتنی ہی جہازوں کی طلب، کارخانوں اور کانوں کی پیداوار کو انگلستان سے باہر اور غذا اور کچے مال کو انگلستان کے اندر لے جانے کے لئے بڑھتی رہی، انگلستان کے تجارتی بیڑہ کو ترقی ہوتی رہی اور سمندروں پر اس کا اقتدار مسلّم ہو گیا۔

سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے انگلستان کے دخانی جہازوں کا بیڑا قوت اور حجم میں بڑھتا رہا۔ جنگ عظیم سے بہت پہلے انگلستان کے جہازوں کا وزن کل دنیا کے جہازوں کے وزن کا ایک تہائی ہو گیا تھا اور یہی صورت کم و بیش آج تک قائم ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں دنیا کے دخانی

دنیا کی میزان = ۶۰،۵۱،۵۹،۰۰۰
برطانیہ عظمیٰ اور یہاں کی مقبوضات = ۲،۲۵،۰۴،۰۰۰
ریاست ہائے متحدہ امریکہ = ۱،۳۵،۰۳،۰۰۰
جاپان = ۴۰،۴۵،۰۰۰
جرمنی = ۳۹،۴۸،۰۰۰
فرانس = ۳۴،۵۶،۰۰۰
تمام دوسرے ملک = [illegible]

اس نقشہ میں دنیا کے دخانی جہازوں اور موٹر جہازوں کے وزن کو ٹنوں میں مجموعی طور پر اور مختلف ملکوں کے الگ الگ دکھایا گیا ہے۔ یہ اعداد [illegible] کے ہیں۔

جہازوں اور موٹر جہازوں کی کل مقدار ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تھی۔ اسی قسم کے برطانیہ کے جہازوں کا میزان ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن ہوتا تھا۔ دوسرا نمبر امریکہ کا تھا تیسرا جاپان کا چوتھا جرمنی کا اور پانچواں فرانس کا۔

برطانیہ کو اپنے بحری بیڑہ کو ترقی دینے کی ضرورت اس لئے تھی کہ اس کی تجارت دنیا کی بہت سی بندرگاہوں سے ہونے لگی تھی۔ ان بندرگاہوں تک آسانی اور جلدی کے ساتھ پہنچنے کے لئے بہت سے جہازوں کی ضرورت تھی۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے انگلستان کی تجارت پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی

انجنوں اور مشینوں کی ایجاد کے بعد کوئلہ کی کانوں، لوہے کے کارخانوں اور کپڑے کی فیکٹریوں کی پیداوار حیرت انگیز طریقہ پر بہت زیادہ بڑھ گئی۔ برطانیہ کے لوگ ان تمام چیزوں کو خود نہیں خرید سکتے تھے۔ اس لئے زاید پیداوار کو ٹھکانے لگانے کا سوال بہت اہم ہوگیا اور اس کا برآمد کرنا نہایت ضروری ہوگیا۔

سوتی مال جو برطانیہ عظمیٰ سے برآمد کیا جاتا ہے	
سالانہ اوسط	
سنہ ۱۸۲۰ تا ۱۸۳۱	۸ کروڑ ۸۶ لاکھ ۴۵ ہزار ۲ سو ۳۰
سنہ ۱۸۵۰ تا ۱۸۶۱	۲۴ کروڑ ۱۸ لاکھ ۴۰ ہزار
سنہ ۱۸۸۰ تا ۱۸۹۱	۲۵ کروڑ ۴ لاکھ ۴۷ ہزار ۴۰
سنہ ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۳	۵۹ کروڑ ۵۸ لاکھ ۱۹ ہزار ۶ سو ۴۰
سنہ ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱	ایک ارب ۴۱ کروڑ ۳ لاکھ ۲۷ ہزار

سنہ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کی تمام دنیا سے جو تجارت تھی اس کی کل مقدار صرف دس کروڑ ڈالر تھی لیکن سنہ ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۳ء کے سالوں میں صرف سوتی مال کی برآمد کا سالانہ اوسط ۶۰ کروڑ ڈالر کا تھا۔ ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے کتائی اور بنائی کے کارخانے انگلستان میں پھیل رہے تھے۔ لوگ فیکٹریوں میں خوب محنت سے کام کر رہے تھے اور نئی نئی ایجادیں بہترین مشینیں اور انجن تیزی کے ساتھ بن رہے تھے فیکٹریوں کا کاروبار ان کی بساط سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور کمپنیاں اپنے سرمایہ میں اضافہ کر رہی تھیں۔ سوتی مال کی برآمد بڑھتی رہی یہاں تک کہ برطانیہ نے ایک ارب ڈالر سالانہ کا مال دنیا کو بیچنا شروع کر دیا۔

برطانیہ کی دوسری مصنوعات کی تجارت بھی بڑھتی رہی۔ فولاد کی پٹریوں، مشینوں، اوزاروں اور دوسری لوہے اور فولاد کی چیزیں بنانے میں سنہ ۱۹۱۰ء تک اس کی تجارت سب سے آگے رہی

برطانیہ بصورت مجموعی ایک بڑا کارخانہ بن گیا جس کا کام کچے مال کو مصنوعہ شکل دینا ہو گیا۔ مصنوعہ مال کے معاوضہ میں جو رقم اسے ملتی ہے اس سے وہ غذا، کچا مال اور زندگی کی ضرورت کی دوسری چیزیں خرید تا رہتا ہے۔

برطانیہ کے کوئلہ کے ذخائر کوئلہ کو انگلستان کی ترقی میں بہت زبردست اہمیت حاصل ہے۔ [illegible]ء میں برطانیہ کی کانوں سے اتنا کوئلہ پیدا ہوتا تھا جتنا تمام دوسرے ملکوں میں مجموعی طور پر پیدا ہوتا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک برطانیہ میں دنیا کی سب جگہوں سے زیادہ کوئلہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو انگلستان پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ لیکن پھر بھی ہر سال انگلستان بہت زیادہ کوئلہ اپنی کانوں سے نکالتا رہتا ہے۔ اس تمام کوئلہ کو انگلستان خود استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے تاجر اس کے بیشتر حصہ کو دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس فروخت سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے جزئی طور پر انگلستان والے غذا، روئی، لوہا، ربڑ، عمارتی لکڑی، اون اور دوسری چیزوں کی ان کثیر مقداروں کی قیمت ادا کرتے ہیں جنہیں وہ درآمد کرتے رہتے ہیں۔
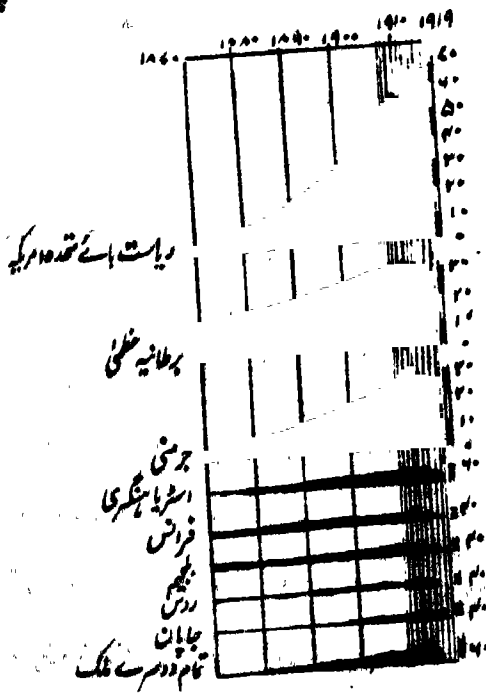
۱۸۶۰ ۱۸۸۰ ۱۸۹۰ ۱۹۰۰ ۱۹۱۰ ۱۹۱۹

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

برطانیہ عظمیٰ

جرمنی

آسٹریا ہنگری

فرانس

بلجیم

روس

جاپان

تمام دوسرے ملک

اس نقشہ میں دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں کی کوئلہ کی پیداوار کو سنہ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۹ء تک دکھایا گیا ہے۔ سیاہ حصہ کی اونچائی سے اس سال کی پیداوار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

کوئلہ کے بغیر انگلستان کے لئے ایک بڑا صنعتی ملک بننا ناممکن ہوتا اس کی آبادی کو [illegible]

اتنے آدمیوں نے کھیتی کا پیشہ چھوڑ کر شہر کی فیکٹریوں میں کام کرنا شروع کیا ہوتا۔ برطانیہ میں کوئلہ کی کثیر رسد کی وجہ سے یہاں کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو بھی ترقی ہوئی کوئلہ کی قوت سے جہاز چلائے گئے۔ کوئلہ کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا کہ انگلستان کے جہاز جاتے وقت اور واپس آتے وقت دونوں موقعوں پر مال سے لدے ہوئے رہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ برطانیہ میں جو مال درآمد کیا جاتا تھا مثلاً لوہا گیہوں عمارتی لکڑی وغیرہ۔ یہ تو حجم میں زیادہ ہوتا تھا اور جگہ زیادہ گھیرتا تھا لیکن برطانیہ سے جو مال جاتا تھا مثلاً کپڑا اور دوسری مصنوعی اشیاء زیادہ جگہ کم گھیرتی تھی۔ جہاز کے مالک چاہتے تھے کہ جاتے وقت اور آتے وقت دونوں موقعوں پر ان کے جہاز مال سے لدے ہوئے رہیں کیونکہ اگر جہاز خالی رہے تو اس سے روپیہ کے نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس لئے برآمد کے وقت جہاز کا جو حصہ خالی رہتا تھا اس میں کوئلہ بھر جاتا تھا۔ ارجنٹائنا اور ہندوستان کوئلہ خریدنا چاہتے تھے برطانیہ کے بحری مرکزوں کے لئے جو جزیروں پر واقع تھے کوئلہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس لئے جاتے وقت جب جہاز کم حجم کا مصنوعہ مال لے جاتا تھا اس میں کوئلہ بھی لادا جا سکتا تھا۔ جاتے وقت ہلکی مصنوعہ چیزیں اور کوئلہ اور آتے وقت بڑا حجم رکھنے والا کچا مال مثلاً لوہا عمارتی لکڑی، روئی اور غلہ۔ غرض دونوں وقت وزن برابر رہتا تھا۔ اور برطانیہ کے لئے جہاز رانی بہت نفع بخش ہوتی تھی۔

۱۸۰۰ء کے بعد سے برطانیہ کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا۔ اس وقت آبادی ایک کروڑ ۵ لاکھ تھی۔ سو سال بعد آبادی ۳ کروڑ ۰۰ لاکھ ہوگئی۔ لیکن صنعتی انقلاب کے شروع ہونے کے بعد سے انگلستان کے لوگوں نے کھیتی کے کام کو چھوڑنا اور شہروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے باوجود اس کے کہ لوگوں کی تعداد
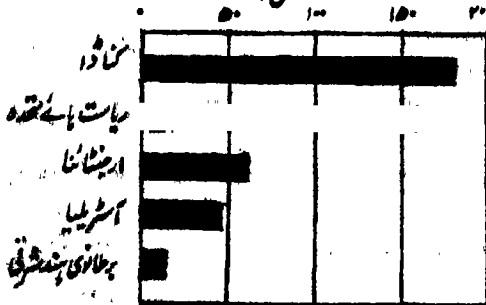
برطانیہ کا صنعتی انقلاب کے بعد غذا کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار

(لاکھ ٹن)
۰ ۵۰ ۱۰۰ ۱۵۰ ۲۰۰
کناڈا
ریاست ہائے متحدہ
ارجنٹائنا
آسٹریلیا
برطانوی ہند شرقی

اس نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ برطانیہ کے شہروں کی آبادی کے لئے غذا کہاں سے کتنی مقدار میں حاصل کی جاتی ہے۔

تیزی سے بڑھ رہی تھی پھر بھی انگلستان میں غذا کی پیداوار برابر کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کا صحیح اندازہ رقبہ زیر کاشت سے کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء تک تو زیر کاشت زمین میں کمی نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے کھیتی کم زمینوں پر کی جانے لگی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں صرف ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ پر کاشت کی جاتی تھی گویا سنہ ۱۸۷۰ء کے مقابلہ میں ۲۲ فی صدی کی کمی ہوگئی تھی۔

گیہوں کی کاشت میں اور بھی حیرت انگیز کمی ہوئی۔ اور حیرت انگیز اس لئے کہا گیا کہ انگلستان کے لوگ زیادہ تر گیہوں کی روٹی کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں ۴۰ لاکھ ایکڑ زمین پر گیہوں بویا جاتا تھا۔ لیکن چالیس سال بعد جتنے رقبہ پر گیہوں بویا جاتا تھا وہ ۵۰ فی صدی گھٹ گیا تھا۔ جو، جئی، آلو اور دوسری خاص خوردنی اجناس کی کاشت میں بھی ایسی ہی کمی واقع ہوگئی تھی۔ ایک طرف تو اجناس خوردنی کی کاشت ۵۰ فی صدی گھٹ گئی تھی اور دوسری طرف آبادی ۵۰ فی صدی بڑھ گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز صورت حال تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک جب کہ جنگ عظیم شروع ہوئی اتنے لوگوں نے کھیتی کے کام کو ترک کر دیا تھا کہ انگلستان کے صرف ۶ فی صدی کام کرنے والے کھیتی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے شہروں کے ہزاروں بھوکے لوگوں کا پیٹ انگلستان کے کسان نہیں بھر سکتے تھے۔ غذا اور دوسرے کچے مال کو انگلستان میں باہر کے ملکوں سے لانے کی ضرورت تھی۔ کھیتی کے کام کو چھوڑنے اور صنعتی ملک بن جانے کی وجہ سے انگلستان اپنے غذا کے ایک بڑے حصے کے لئے باہر کی دنیا پر انحصار کرنے لگا تھا۔

گوشت	۱،۶۴،۱۰،۱۰،۲۴۰ ڈالر	۲۴۳،۳۴۰،۴۰،۱۲۰ ڈالر
انڈے مکھن وغیرہ	۱۰،۵۶،۲۲،۹۲۰ ڈالر	۱۰،۵۰،۴۰،۰۵،۲۸۰ ڈالر
پنیر	۹۰،۶۰،۱۴۰ ڈالر	۲۲۵،۴۲،۶۴۰ ڈالر
پھل	۴۰،۶۶،۵۴۰ ڈالر	۲۴۴،۰۹۴،۶۸۰ ڈالر

سالانہ اوسط: ۱۸۶۰ تا ۱۸۷۰ (سیاہ) — ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۳ (سفید)

گیہوں کے علاوہ اور دوسری خاص غذاؤں کی درآمد انگلستان کو سالانہ درآمد کے اوسط کا اظہار سنہ ۱۸۶۰ تا ۱۸۷۰ اور سنہ ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۳ کے سالوں کے لئے کیا گیا ہے۔

ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے تقریباً ربع صدی قبل غیر ملکوں پر یہ انحصار اور بھی بہت زیادہ تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ میں ۳۵۰ پونڈ گیہوں فی شخص درآمد کیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں

۱۴۰ پونڈ گیہوں فی شخص۔ برطانیہ میں جو گیہوں استعمال کیا جاتا ہے اس کا ۳/۴ حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور ارجنٹائنا سے منگایا جاتا ہے۔ دوسری بنیادی غذاؤں کے لئے بھی برطانیہ کا دارومدار دوسرے ملکوں پر ہے۔ جنگ سے پہلے بھی گوشت کا ۵۰ فی صدی حصہ باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ ہر سال انڈوں اور مکھن پنیر وغیرہ کی بیشتر مقدار دوسرے ملکوں سے حاصل کی جاتی ہے۔

کچے مال مثلاً روئی، خام لوہا، ربڑ وغیرہ کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر دارومدار

۱۸۰۰ء سے پہلے بھی انگلستان کے کاتنے اور بننے والے اونی کپڑے کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑا اپنے گھروں پر بنایا کرتے تھے۔ لیکن برطانیہ کی سرد مرطوب آب و ہوا میں روئی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے انگلستان کے پارچہ بافوں کو دور دراز ملکوں سے روئی حاصل کرنے کے لئے اپنے جہاز روانہ کرنا پڑتے تھے۔ دنیا کے تین اہم روئی کے مرکزوں یعنی ریاست ہائے امریکہ کی جنوبی ریاستوں، ہندوستان اور مصر سے ۱۸۰۰ء کے بعد روئی کی کثیر مقدار لائی جانے لگی۔ سوتی کپڑے کی صنعت نے خوب ترقی پائی۔ دستی بنائی کی جگہ مشین کی بنائی نے رواج پالیا اور انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی کا دارومدار غیر ملکوں سے روئی کے فراہم کرنے پر ہو گیا۔

انگلستان کی فیکٹریوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی تھی کہ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں بھی کاتنے والوں اور بننے والوں کو مصروف رکھنے کے لئے دنیا میں کافی روئی پیدا نہیں کی جا سکتی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ روئی کے پھل کو توڑنے اور صاف کرنے کا کام اتنی تیزی سے نہیں ہوتا تھا جس سے بیکار مزدوروں اور مشینوں کو مصروف رکھا جا سکتا۔ دور کے ملکوں میں سیاہ رنگ کے لوگ گرم سورج کے نیچے ہاتھ سے کپاس کو توڑا کرتے تھے۔ کپاس سے بنولے علیحدہ کرنے کا کام بھی ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ یہ کام اتنا سست اور صبر آزما ہوتا تھا کہ کپاس کے سینکڑوں کھیتوں کے مزدور انگلستان کی بھوکی مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی روئی تیار نہ کر پاتے تھے۔

۱۷۹۳ء میں امریکہ کے ایک اسکول ماسٹر ایلی ہٹنی نے انگلستان کے کاتنے اور بننے والوں

گران کی پریشانی سے نجات دلائی۔ اس نے روئی اوٹنے کی مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے بنولے نکالنے کا کام ہاتھ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ کیا جانے لگا۔ اس اہم ایجاد کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقہ میں انگلستان کی فیکٹریوں کے لئے زیادہ مقدار میں روئی پیدا کی جانے لگی یہاں تک کہ امریکہ سے انگلستان کے استعمال کے لئے ۸۰ فی صدی روئی مہیا کی جانے لگی پچاس سال کے اندر انگلستان کی مشینوں میں اتنی اصلاحیں کی جا چکی تھیں کہ برطانیہ کی فیکٹریوں کے لئے روئی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہندوستان اور مصر یہ تین ملک سب سے زیادہ روئی پیدا کرتے ہیں اور ان ہی تین مقامات سے برطانیہ سب سے زیادہ روئی منگاتا ہے۔ ان دو میں بائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں مختلف ملکوں کے لئے کپاس کی پیداوار کے تناسب کے ملکوں پر سو سال پہلے کی طرح آج فی صدی کو دکھلایا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں دنیا کے مختلف ملکوں بھی انگلستان کے مزدوروں کی زندگی کا کپڑے کا پیداوار کے فی صدی تناسب کو دکھایا گیا ہے۔

کا دارومدار ہے۔ کاتنے اور بننے والی فیکٹریوں کو مصروف رکھنے کے لئے روئی کی رسد بہت ضروری ہے۔ جب کسی وجہ سے ان علاقوں میں روئی کی پیداوار کم ہو جاتی ہے مثلاً روئی میں کیڑا لگ جاتا ہے یا بارش کی کمی اور زیادتی کا فصل پر اثر پڑتا ہے تو انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ان کے لئے روئی کی کثرت کے معنی غذا، کپڑے اور مکانوں کی کثرت کے ہیں۔

خام لوہے کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار | انگلستان میں کچھ خام لوہا تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے انگلستان کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی لوہا موجود تھا۔ اس کی ضرورتیں زیادہ تر .... اوزاروں اور ہتھیاروں کے لئے لوہے کی ضرورت ہوتی

تھی لیکن مشینوں کی ایجاد اور انگلستان کے صنعتی ملک بن جانے کے بعد انگلستان کی ضرورت لوہے اور دوسرے کچے مالوں کے لیے جو فولاد بنانے میں کام آتے ہیں بہت بڑھ گئی۔ بغیر فولاد کے نہ ریلیں بنائی جا سکتی ہیں نہ جہاز، نہ فیکٹریاں کھڑی کی جا سکتی ہیں نہ مشینیں۔ برطانیہ کو اب خام لوہا حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ دوسرے ملکوں خصوصاً سویڈن اور اسپین پر دارومدار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ فولاد کے بنانے کے لیے جن دوسرے کچے مالوں کی ضرورت ہے ان کے لیے بھی اسے اور دوسرے ملکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ فولاد کے بنانے میں دوسری دھاتوں مثلاً کرومیم، ٹن اور نکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ برطانیہ میں یہ چیزیں کافی مقدار میں موجود نہیں ہیں اس لئے برطانیہ کی بندرگاہوں میں نکل کناڈا سے، کرومیم اور لوہا اسپین، ایشیائے کوچک اور ہندوستان سے وینیڈیم جنوبی امریکہ سے اور اس طرح دوسرے سامان دوسرے ملکوں سے آتے رہتے ہیں۔

ربڑ کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار

جدید عہد کی صنعتی دنیا ربڑ پر سفر کر رہی ہے۔ برطانیہ میں بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر ٹھیلے چلتے ہیں۔ اگر ان کے ٹائروں اور دوسرے حصوں کے لئے ربڑ موجود نہ ہوتا تو سفر ناممکن ہو جاتا۔ انگلستان کی ریل گاڑیوں میں جو ہوائی بریک لگائے جاتے ہیں ان میں بھی ربڑ لگایا جاتا ہے۔ نقل وحمل اور خبر رسانی کا دارومدار ربڑ پر ہے۔ جماعتوں کی زندگی ربڑ کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ لیکن برطانیہ میں ایک پونڈ ربڑ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ برطانیہ جتنا ربڑ استعمال کرتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ سیلون، ریاست ہائے ملایا، جاوا، بورنیو اور منطقہ حارہ کے دوسرے جزیروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ انگریزی ربڑ کے ان باغات کے مالک ہیں اور ان میں دنیا کے ربڑ کی مجموعی پیداوار کا ⅔ حصہ پیدا ہوتا ہے۔ ربڑ پیدا کرنے والی بیشتر زمین سلطنت برطانیہ کی حدود میں شامل ہے۔

معدنی تیل کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار

صنعتی قومیں کوئلہ کے بعد جس ایندھن کا بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں وہ معدنی تیل ہے۔ حال کے سالوں میں برطانیہ نے معدنی تیل کا استعمال بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ برطانیہ کے فوجی بحری جہازوں کا ۹۰ فی صدی حصہ اور اس کے تجارتی

جہازوں کی خاصی بڑی تعداد تیل استعمال کرنے والے انجنوں سے چلائی جاتی ہے۔ برطانیہ کی سڑکوں پر بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر بسیں تیل سے چلائے جاتے ہیں۔ اس کی فیکٹریوں کے بہت سے انجن بھی تیل سے چلنے لگے ہیں۔ برطانیہ دنیا کے ان ملکوں میں سے ہے جن میں تیل کا صرف بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انگلستان میں یہ تمام معدنی تیل پیدا نہیں کیا جاتا۔ کچھ تیل تو سینکڑوں سالوں سے انگلستان کے کنوؤں اور چشموں سے نکالا جا رہا ہے لیکن دنیا کے نقشہ میں تیل کے جن اہم کھیتوں کو دکھایا جاتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی برطانیہ میں واقع نہیں ہے۔ تیل کے لئے برطانیہ کو ریاست ہائے امریکہ، میکسیکو، روس، ایران، ڈچ جزائرِ ہند مشرقی، وینی زوایلا، رومانیا اور میسوپوٹامیا پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہی آٹھ علاقے دنیا میں ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ معدنی تیل پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے کچے مالوں کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار

گنجایش کی کمی کی وجہ سے ان تمام اشیاءِ غذا اور کچے مالوں کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے جن کے لئے برطانیہ دوسرے ملکوں پر انحصار کرتا ہے۔ انگلستان کے لوگ چائے اور کافی بہت پیتے ہیں۔ چائے کے لئے انھیں چین، جاپان، سیلون، ہندوستان اور مشرق بعید کے دوسرے مقامات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ان کی کافی برازیل، وسطی امریکہ، میکسیکو اور جزائرِ ہند غربی سے آتی ہے۔ انگلستان کے لوگ شکر کا بھی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور تقریباً تمام شکر یورپ یا جزائرِ ہند غربی یا دوسرے دور دراز مقامات سے لائی جاتی ہے۔

انگلستان کے دسترخوان کو لیگ آف نیشنس کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ انگلستان کے لاکھوں گھروں میں وہ غذائیں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں دنیا کے مختلف ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی زندگی کا معیار بلند ہے۔ ان کو بہت سے ایسے کھانوں کی عادت پڑ گئی ہے جو برطانیہ میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً انھیں انجیر، کھجوریں، لیموں، کیلے، ناریل، کوکو، چاکلیٹ، بادام، چلغوزہ، کاجو، اخروٹ، زیتون اور سینکڑوں دوسری چیزوں کی ضرورت رہتی ہے جو سب دور دراز ملکوں سے درآمد کی جاتی ہے۔

انگلستان کے لوگوں کی آمدنی جتنی انیسویں صدی میں بڑھتی رہی ہے اتنی ہے آرام اور عیش کی چیزوں

کے لئے ان کی طلب میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کے کپڑوں میں بہت تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ دوسرے علاقوں کے نئے نئے سامان استعمال کیے جاتے ہیں۔ گھر کے برتن اور سامان کی تعداد اور تنوع میں بھی اضافہ ہوگیا ہے اور ان میں سے اکثر ایسی چیزوں سے بنائے جاتے ہیں جنھیں ایشیا افریقہ شمالی امریکہ غرضیکہ ہر براعظم سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جتنا برطانیہ کے معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے اتنا ہی اس کا انحصار دوسرے ملکوں پر زیادہ ہوگیا ہے۔

خلاصہ:۔ برطانیہ چار بڑے وجوہ کی بنا پر دنیا کی تجارت کا مرکز بن سکا۔

۱۔ جدید دنیا سے تجارت کرنے کے لئے برطانیہ کا محل وقوع مناسب تھا۔

۲۔ برطانیہ پہلا ملک تھا جس نے بڑے پیمانہ پر مشینوں سے چیزوں کو بنانا شروع کیا

۳۔ برطانیہ نے جہاز رانی کی صنعت کو خوب ترقی دی

۴۔ اپنے جہازوں اور فیکٹریوں کو قوت مہیا کرنے کے لئے اور دوسرے ملکوں کو فروخت کرنے کے لئے اس کے پاس کوئلہ کے بڑے ذخیرے موجود تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر انگلستان دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔

انگلستان پہلے ایک ایسا ملک تھا جو دنیا کے بالکل سرے پر گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اب اس کا محل وقوع دنیا کے لوگوں سے چیزوں کا مبادلہ کرنے کے لئے بہت موزوں ہے۔

پہلے یہ ایک ایسا زراعتی ملک تھا جس میں ابتدائی طرز کی زندگی بسر کی جاتی تھی لیکن اب کوئلہ کی کان کنی اور چیزوں کو مصنوعہ شکل دینے میں اس کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔

پہلے یہ سب سے جدا اور اپنی ضرورتیں خود آپ پوری کرتا تھا لیکن اب دنیا کے بعید ترین ملکوں پر اسے اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے انحصار کرنا پڑتا ہے۔

پہلے یہ منتشر کھیتوں اور چھوٹے قصبوں کا ملک تھا لیکن اب گنجان آباد شہروں کا ملک بن گیا ہے۔

پہلے اس کی آبادی کو زندگی کی محض انتہائی ضروری چیزیں دستیاب ہو سکتی تھیں لیکن اب یہ ایک دولتمند ملک ہوگیا ہے اور اس کے لوگوں کا معیار زندگی امریکہ کو چھوڑ کر باقی سب ملکوں کے مقابلہ میں بہت

زیادہ بلند ہے۔
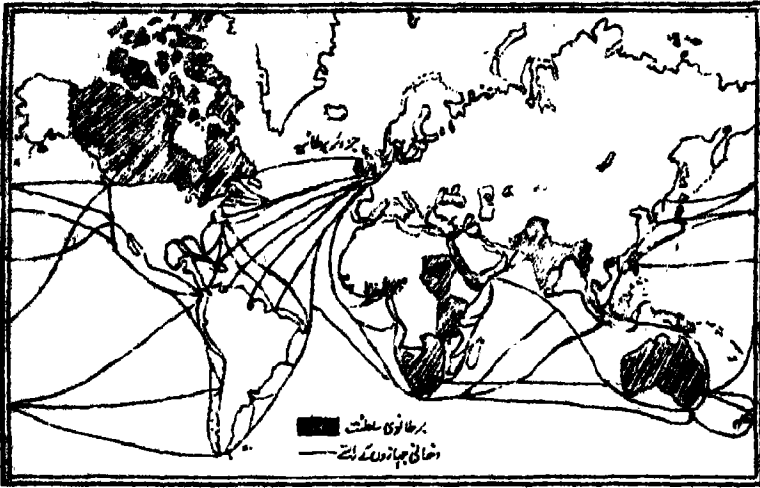
دنیا کے سمندروں میں تجارت کی راہیں

دنیا کی تجارت کا ایک نقشہ بنا کر موجودہ صورت حال کو اچھی طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس نقشہ سے برطانیہ کی مرکزیت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ ہاتھ کی انگلیوں کی طرح تجارت کے بہت سے راستے انگلستان سے نکلتے ہیں اور سمندروں کو عبور کرتے ہوئے دنیا کے بعید ترین ملکوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اپنی ان انگلیوں کے ذریعہ برطانیہ دنیا کی ہر قسم کی پیداوار کو اپنی مٹھی میں بند کرتی رہتی ہے اور اس کے معاوضہ میں اپنے مال کو باہر بھیجتی رہتی ہے۔ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان جو تجارت کا سلسلہ جاری ہے اس کا اظہار موٹی لکیر سے ہوتا ہے۔ دوسرا موٹی لکیر اسپین کا چکر لگاتی بحر روم اور نہر سویز سے ہوتی ایشیا اور افریقہ کے درمیان سے گزرتی مشرق بعید تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے مختلف علاقوں کو جو راستے جاتے ہیں وہ بھی خاصے موٹے ہیں۔

ان راستوں کے ذریعہ برطانیہ کی تجارت جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں اتنی کثیر تھی کہ درآمد اور برآمد کی مجموعی مقدار تقریباً ۸ ارب ڈالر ہوتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آج کل کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی قتل ہوجاتا ہے تو پولس مردے کی لاش کا معائنہ کراتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ موت کس طرح واقع ہوئی اور اس سے قتل کا جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ قاتل پکڑا نہ گیا ہو تو اس ذریعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے، اور اسے گرفتار کرنے کی تدبیریں بھی کی جاسکتی ہیں چیکوسلواکیا کا خاتمہ کوئی تین ہفتے پہلے ہو چکا ہے اور زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے سمجھیے کہ خاصی مدت گذر چکی ہے، لیکن یہ مردہ ابھی تک بے نام ونشان نہیں ہوگیا ہے، اور اس کا معائنہ کرنے سے پہلے اس سیاست کے بڑے بڑے بھید کھولے جاسکتے ہیں جو اس جرم کا اصل سبب ہیں۔

یہ تو نظر ڈالتے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ قتل کی ترکیب انوکھی تھی۔ چیکوسلواکیا کی پہلے تو کھال کھینچی گئی، اور پھر اس بنا پر کہ جس کی کھال کھینچی گئی ہے وہ زندہ نہیں رہ سکتا، مارنے والے نے چیکوسلواکیا کو جان سے مار ڈالا جرم کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی، کہ کھال کھینچنے میں پولیس مجرم کے ساتھ تھی اگرچہ اس نے یہ شرط لگادی تھی کہ ضرورت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اس کے بعد مجرم بھی پولیس کو چیکوسلواکیا کو سلامت رکھنے میں مدد دے، مجرم نے وعدے کے خلاف چیکوسلواکیا کی جان لے لی، جس پر پولس چلا رہی ہے کہ بڑی ہتیا ہوگئی، یورپ کا دھرم نشٹ ہوگیا اخلاق کی جڑ کٹ گئی۔

ہمارے ملک میں ایسا کوئی حادثہ ہوتا تو آپ ضرور کہتے کہ پولس جرم میں شریک تھی، اس لیے اس پر بھی قتل کا الزام لگتا ہے، لیکن قومیں جب ایسا جرم کرتی ہیں تو انہیں سزا دینے والا کوئی

نہیں ہوتا، لوگ خدا کو یاد کرکے رہ جاتے ہیں، اسی وجہ سے ہوشیار قوموں کو چاہیے کہ وہ ایسے حادثوں پر غور کرتی رہیں اور اپنے آپ کو مجرموں سے نہیں بلکہ ہمدردوں سے اور مددگاروں سے بچائے رکھیں، جو پولس کی وردی پہن کر مجرموں کا کام آسان کرنے کو پہنچ جاتی ہیں، اس لحاظ سے دیکھیے تو چیکوسلواکیا پر جو دوسرا وار کیا گیا، وہ اور بھی سبق آموز ہے۔

پچھلے اکتوبر میں جب سوڈیٹن علاقے جرمنی کو دیئے گئے، یعنی چیکوسلواکیا کی کھال کھینچی گئی تو خاص سلواکیا میں آزادی کی ایک تحریک جس کے بانی پادری ہلنکا تھے، اور جس کی فوج ہلنکا گارڈ کہلاتی تھی، خاصی ترقی کر چکی تھی اور اب تو یہ بات پھیل گئی ہے، کہ سلواکیا کی اس تحریک کو جرمنی کا روپیہ چلا رہا تھا، اکتوبر تک باہر کے لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا، کہ جرمنی کو اس تحریک سے ہمدردی ہے، اس ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو سڈٹین علاقے ملے اور ادھر سلواکیا نے سوراج مانگا، چیک حکومت اس مطالبے کو منظور نہ کرتی تو اور کیا کرتی مگر منظور کرنے سے اس کو فائدہ نہ ہوا، سلواکیا میں برابر فساد ہوتا رہا، اور ہر ہٹلر اس فساد کی ذمہ داری چیک حکومت پر ڈالتے رہے، آخر سلواکیا نے چیک حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی وزارت کو بدلے اور قریب قریب اسی وقت سلواکیا کے وزیر اعظم سیو ہر ہٹلر کے پاس مشورہ کرنے پہنچے ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اس کے بعد چیکوسلواکیا کے صدر ڈاکٹر ہاخا سے کہلوایا گیا کہ وہ اپنے وزیر خارجہ فوالونسکی کو لے کر برلن آئیں۔ ڈاکٹر ہاخا کو دعوت قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، ۱۵ مارچ کی شام کو برلن پہنچے ان کا بڑی شان سے استقبال کیا گیا مگر یہ بہت جلد ہر ہٹلر کے پاس پہنچا دیئے گئے، وہ خود ربن ٹروپ اور ڈاکٹر گورنگ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، اور میز پر ایک تحریر رکھی تھی، جو ڈاکٹر ہاخا کو پڑھ کر دستخط کرنے کو دے دی گئی تھی، وہی اعلان تھا جو ۱۶ مارچ کی صبح کو شائع ہوا اور جس میں ڈاکٹر ہاخا کی طرف سے کہا گیا، کہ وہ اپنے ملک کو ہر ہٹلر کے سپرد کرتے ہیں، اور انہیں یقین ہے کہ ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جرمنی میں شامل ہو جائے، پہلے تو کچھ دیر انھوں نے انکار کیا، مگر ہر ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے پہلے ڈاکٹر ہاخا کو سمجھایا، تو پھر ڈرایا دھمکایا اور جب

حیرت کرتے رہے کہ برطانیہ اور فرانس نے اخلاق اور تہذیب کے ٹھیکیدار ہوتے ہوئے اپنے آپ
کو کس طرح ہر ذمہ داری سے بری سمجھ لیا، پچھلے اکتوبر میں ان دونوں اور جرمنی و اٹلی میں طے ہوا تھا کہ
سب چکوسلواکیا کی حفاظت کریں گے، ہم آپ مل کر یا وعدہ کرتے تو ہر شخص دوسرے کو اس کی پابندی
پر مجبور کرتا، اس کا سبب یہ ہوتا کہ ہم وہ داؤں پیچ کر ہی نہیں سکتے، جو برطانوی سیاست کو قدرت
نے سکھائے ہیں، مسٹر چیمبرلین نے چکوسلواکیا کے خاتمہ کی خبر سنتے ہی کہدیا، کہ چونکہ ہر ہٹلر نے اپنے
وعدہ کی پابندی نہیں کی ہے اس لئے ہم پر بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، یعنی چکوسلواکیا، مرگیا، اس کا
افسوس ہے ہم کیا کرتے مارنے والے نے ہم سے صلاح مشورہ کیا نہیں، جو ہم اس کو روکتے، یہ
جواب ایسا تھا کہ جسے سن کر ہر ہٹلر نے شمال میں لیتھونیا کو الٹیمیٹم دے کر میمل کا شہر حاصل کر لیا اور جنوب
میں رومانیہ کو اسی طرح الٹیمیٹم دے کر ایک تجارتی معاہدہ رومانیہ سے کیا جس کی بدولت جرمنی کا، دباؤ
پر تو نہیں مگر اس کی زمین اور تجارت اور سرمایہ پر قبضہ ہو گیا ہے، کہنے کو تو رومانیہ آزاد ہے لیکن جرمنی
نے اسے اب اس طرح پکڑ لیا ہے کہ وہ جرمنی کے پنجے سے نکل نہیں سکتا۔

اب کسی کو اپنی سلامتی کا بھروسا نہیں رہا ہے ایسی حالت میں لوگ اندھا دھند لاٹھی چلاتے
ہیں اور ناحق چوٹ کھاتے ہیں لیکن آپ غور کریں تو، اصل میں یہی سب باتیں تھیں کہ ان ریاستوں کو
جنھوں نے مل کر لیگ کو دنیا میں حیثیت اور عزت بخشی تھی لیکن اب برطانیہ اور فرانس نے اپنے رویہ
سے سب کو بدظن کر دیا ہے اور اس طرح لیگ کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا، مسٹر بولڈون نے پچھلے الکشن کے
وقت کہا تھا، کہ ہمیں ووٹ دو اس لئے کہ ہم اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ یورپ میں ہر قوم کی سلامتی
کا ذمہ، باقی تمام قوموں پر ڈال دیا جائے اور اس طرح لڑائیوں کا خطرہ دور کیا جائے لیکن الیکشن کے
بعد وہ پالیسی اختیار کی گئی کہ جس نے لیگ کو ختم کر دیا اور ہر ریاست کو اب اپنی فکر کرنے پر مجبور کر دیا
ہر ہٹلر نے تو ریاست پر احسان کیا برطانیہ اور فرانس نے غلط فہمیوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اسکو کاٹ
کر پھینک دیا اور اب آئندہ کوئی ریاست چکوسلواکیا کی طرح آخر وقت تک دھوکا نہیں کھائے گی،
فرق صرف اتنا ہے کہ ہر ہٹلر کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے وہ طریقے نہیں آتے جو برطانیہ

کے تجربے نے برطانیہ اور فرانس کو سکھائے ہیں یا اگر انھیں آتے ہیں تو وہ انھیں برتنا نہیں چاہتے
اسے اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں ان کی سیاست اب ڈنکے کی چوٹ پر انھیں ارادوں کا اعلان کر رہی
ہے جو انھوں نے اب سے دس برس پہلے اپنی کتاب میں بیان کئے تھے یعنی یہ کہ یورپ میں جرمن
سامراج قائم ہو جائے گا جو باقی قوموں پر حاوی ہو جائے گا۔ دنیا میں جرمن تہذیب کی رونق پھیلائے گا
لیکن اگر یورپ پر جرمن سامراج چھا بھی گیا، تو کون سا اندھیر ہو جائے گا اس میں یورپ اور دنیا
کے لئے وہ کون خطرہ ہے جو کسی دوسرے سامراج میں نہ تھا، بلکہ غور کیجئے تو زیادہ خطرہ اسی میں ہے
کہ برطانیہ فرانس اپنی موجودہ حیثیت اور طاقت کو قائم رکھنے کی کوشش میں جرمن سیاست کی اور
بے جا مخالفت کریں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دوست بن کر اس طرح ڈبو دیں جیسے چکوسلواکیا کو
مشرقی یورپ میں ڈبو دیا تھا فرانس کی نہ بڑے پیمانہ پر صنعت ہے اور نہ تجارت نہ کوئی سیاسی
اثر جرمنی کو ادھر بڑھنے کا موقعہ ملے تو برطانیہ اور فرانس کا اس میں ذرا نقصان نہیں ادھر کی ریاستوں
کو جرمن کا سہارا مل گیا تو وہ کسی طرح کا دکھ اٹھانے کی بجائے بہتیری مصیبتوں اور دشواریوں سے
نجات پائیں گے۔

برطانیہ نے یہ بہانہ کرکے کہ فیصلہ بہت جلد کرنا ہے کانفرنس میں بہت دیر لگے گی، روس
کی اس تجویز کو کہ امن پسند قوموں کی کانفرنس کی جائے نامنظور کر دیا ہے، اس کی جگہ پولینڈ اور رومانیہ سے علیحدہ
علیحدہ معاہدے کئے جا رہے ہیں برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور روس میں جو
خیال ظاہر کیا گیا ہے وہ بے بنیاد نہیں کہ یہ جرمنی کو ڈانزک اور شمالی پولینڈ کو بغیر لڑے دے دینے کی ترکیب
ہے برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ اور رومانیہ کو جس طرح دھوکے میں ڈالا ہے اور ہر ہٹلر کو للکارا ہے کا نتیجہ
یہ تو ضرور ہو جائے گا کہ مسٹر چمبرلین اگلے الکشن میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس سے یورپ کی
بے چینی بڑھے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ مار پیٹ ہو جائے۔

صحافت کے ذریعے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم

دہلی

زیر ادارت: شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بہ تازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپے (سے، ر) ششماہی تین روپے (سے،)

نمونہ کے پرچے کے لئے ۸ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

مینجر "کلیم" ۱۳ جانتی نواس دریا گنج دہلی

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔ ان کی قیمتیں ۲۵ فی صدی سے ۴۰ فی صدی تک کم کر دی گئی ہیں۔

امید ہے کہ اصحاب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ لاہور اور لکھنؤ سے مکمل فہرست طلب کرکے ممنون فرمائیں گے

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب ایم اے آکسن محبوب المطابع پریس دہلی

نئی کتابیں

گئودان - منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول، اُردو میں پہلی بار منتقل ہوا ہے۔ صفحات ۵۱۰ - قیمت عہ

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب - ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ اور وردھا تعلیمی اسکیم کا مکمل نصاب اردو میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت عمر

ہندستانی - ان چھ بحثوں کا مجموعہ جو آل انڈیا ریڈیو پر ۲۰ سے ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء تک براڈکاسٹ ہوئے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں - ہر ایک کی قیمت ۱۲ر

اجتماعی زندگی کی ابتدا - سیاست، معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔
قیمت ۸ر

محکومیتِ نسواں - مشہور فلسفی مل کی کتاب THE SUBJECTION OF WOMEN کا اردو ترجمہ - قیمت عہ

جوہر اقبال - علامہ اقبال کی زندۂ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے اہل فکر حضرات کے مضامین اور پیغامات کا مجموعہ - قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ
دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱ | جون سنہ ۱۹۳۹ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

بچہ اور تعلیم

(جناب عبدالغفور صاحب استادوں کا مدرسہ جامعہ)

گذشتہ مضامین میں ہم نے اس بات کے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ تعلیمی عمل نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؛ اور انسان کے اندر سیکھنے یا تطابق حاصل کرنے کے لئے کون سی بنیادی محرکات اور جبلتیں پائی جاتی ہیں؛ اور پھر ان کی صحیح تربیت اور نشو و نما پر ہماری تعلیم کا کس قدر دار و مدار ہے؛ اس مضمون میں ہم بچہ کی انفرادی شخصیت کو اس نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیوں کر سیکھتا ہے؛ یعنی وہ سماج کے علمی سرمایہ اور طبعی ماحول کے اثرات کو کس طرح اپنی زندگی کا تار و پود بناتا ہے؛ اس کے ذہنی نشو و نما کے قوانین کیا ہیں؛ اور اس کی روشنی میں ہم بچہ کی خام صلاحیتوں اور چھوٹے موٹے تجربات زندگی کی توسیع و ترتیب کیونکہ کر سکتے ہیں؛ یہ بات ہم اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کی نفسیاتی بنیادوں کے ضمن میں ہم نے دیکھا کہ بچہ کی زندگی کا ارتقار منفی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے اپنے اندر ایجابی قوتیں رکھتا ہے، جس کے صحیح اظہار پر اس کی زندگی کی صحیح تشکیل کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم تعلیم میں بچہ کو ایک ایسے نامی وجود کی حیثیت سے دیکھیں گے جو نہ صرف دوسروں کے سہارے پر جیتا ہے بلکہ خود بھی اپنی زندگی کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ معلم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عملی تشکیل میں بچہ کی مدد کرے کیونکہ بچہ عمر کی ہر ایک منزل میں نیا برگ و بار لاتا ہے، پرانی عادتیں چھوڑتا جاتا ہے اور نئی عادتیں اپنے نئے تجربوں کی بنا پر اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کی جڑیں جن کو ہم جبلت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ہمہ وقت ماحول سے اپنی خوراک حاصل کرتی رہتی ہیں۔ ان جڑوں کی صحیح کارکردگی سے زندگی میں تر و تازگی رہتی ہے، اس لئے زندگی کو مختلف تجربات سے قوت پہنچتی رہتی ہے۔ زندگی کا یہ اصول ایک بنیادی تعلیمی

مسئلہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف وہ چیزیں بچہ کی بڑھتی ہوئی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں جو اس کی کسی ضرورت کو پورا کرتی ہیں اس لئے پڑھاتے وقت ہمیں بچہ کے ماحول اس کی ضروریات اور اس کی کیفیات نفسی کا مطالعہ کرانا چاہیئے۔ تاکہ بچے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ جو معلومات ہم بچہ کو دیتے رہتے ہیں' وہ اس کی زندگی سے جوڑ کھاتے ہیں یا نہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بچہ کا ماحول بہت محدود ہوتا ہے۔ شروع میں اس کی سماجی واقفیت خاندان اور آس پاس کے رہنے والے چند پڑوسیوں تک محدود رہتی ہے اسی طرح مکان کے اعتبار سے گھر' مدرسہ' بازار اور زیادہ سے زیادہ گاؤں یا محلہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ غرض شروع میں اس کا ماحول بہت تنگ ہوتا ہے۔ پھر اس کی نفسی زندگی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف ان چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے جو اس کی زندگی کی ضروریات سے بالکل قریب ہوں۔ اس لحاظ سے اس کا ذہنی افق بہت تنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ جہاں بے تعلق اور دور کی باتیں شروع ہوئیں اس کی توجہ اور یکسوئی غایب ہوئی۔

اس لئے بچہ کی محدود زندگی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اس کی تعلیم کا آغاز اس کی روزمرہ کی ضروریات سے کیا جائے۔ اس لئے اگر ہم بچوں کو ان کی خوراک' پوشاک' رہنے سہنے' خاندان اور دوسرے جانے پہچانے لوگوں کے حالات سے شروع کریں۔ تو یہ طریقہ بچے کے لئے زیادہ دلچسپ اور مناسب ہے۔ اس طرح بچے کو جو معلومات ملتی ہیں' ان کو وہ خوشی سے جذب کر لیتا ہے اور ان کو سمجھ بوجھ کر روزمرہ کی زندگی میں برت کر سکتا ہے۔ ابھی تک تعلیم کو بچے کے مطابق کرنے اور آسان بنانے کے سلسلے میں جو کوشش ہوتی رہی ہے' وہ یہ ہے۔ کہ بالغوں کے تجربوں اور ان کے علمی ذخیرہ کو سادہ سے سادہ شکل میں بچوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تاکہ بچوں کو بڑوں کا علم اخذ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ چنانچہ مختلف درجوں کے بچوں کے لئے مجرد معلومات کا ایک سادہ خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چند سالوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے

کہ ہر ایک بچہ مقررہ حصہ کو اچھی طرح سے پختہ کرکے اگلی جماعت میں ترقی پانے کا مستحق ہو جائے گا۔

جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے، نئی تعلیم والے بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کو گذشتہ تمدنی سرمائے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے" کیوں کہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر آگے چلنا مشکل ہے۔ مگر ان کو اس طریقہ پر ایک بنیادی اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں "کہ علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھانا بچے کی نمو پذیر زندگی سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس قسم کی بے جان منطقی ترتیب کو ایک معمار تو برت سکتا ہے۔ کہ عمارت بناتے وقت ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھتا چلا جائے اور اس طرح الگ الگ اینٹوں کی مرتب تعمیر سے ایک عالی شان عمارت تیار کرے۔ مگر معلم تو کیا کسی مالی کے لئے بھی اس طرح کا میکانکی طریقہ برتنا مناسب نہیں ہے کیونکہ مالی کو بھی پودے کی نامی ضروریات، مثلاً ہوا، پانی، روشنی، دھوپ وغیرہ کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مالی اگر پودے کو وقت سے پہلے پانی دے۔ تو اس سے پودے کے نشو و نما پر یقیناً برا اثر پڑے گا۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ پانی دے تو پھر اس پودے کے گلنے سڑنے کا خطرہ ہے خوراک کسی نامی وجود کے لئے، اس وقت فائدہ مند ہوتی ہے جب اسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی خوراک پھر جسم کے ریشے ریشے میں رس بس کر اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تعلیم کی بھی یہی حالت ہے۔ کیونکہ علم تمدنی زندگی کے لئے دایہ کا کام کرتا ہے۔ اس کے دامنِ تربیت میں مستقبل کا شہری اور انسانی تمدن کا وارث پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے وہ زندگی کے رموز سمجھتا ہے اس لئے تعلیم میں بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھنا ہر معلم کا فرض ہے۔ تعلیم کا معاملہ بچے کا معاملہ ہے بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مدرس کیا پڑھاتا ہے اور کتنی مقدار میں پڑھاتا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بچہ کتنا جذب کر سکتا ہے۔ اور کن حالات میں جذب کرتا ہے۔ اگر معلم بچے کی اس نامی ضرورت کو سمجھے۔ تو پھر تعلیم و تربیت کا مسئلہ صحیح بنیادوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔

ابھی تک تعلیم کے سلسلے میں یہ جو مختلف مضامین کے پڑھانے کا دستور رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت عرصے تک تعلیم کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر ایسا کیا گیا ہے۔ بچے کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے

وہ سماجی ضرورت سے پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ بالغ اپنی سمجھ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کو آئندہ نسل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے۔

کیونکہ ہر ایک نسل گزرے ہوئے لوگوں کے تجربات کو ایک قیمتی امانت کے طور پر محفوظ رکھ کر کسی قدر نئے اضافہ اور تصرف کے ساتھ نئی نسل کے سپرد کر دیتی ہے اور اس طرح انسان کی زندگی میں تسلسل رہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہر ایک نسل جو دنیا میں آتی ہے وہ اس امانت کو جوں کا توں نہیں حاصل کر سکتی۔ کیونکہ اس میں پیدائش کے ساتھ یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ فوراً ہی امانت کے اس بوجھ کو سنبھال سکے۔ اس لئے ہر ایک نسل کے لئے یہ عملی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کس طرح نسلی تجربات کو نئی پود تک منتقل کیا جائے۔ ہر ایک زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس کا حل سوچا ہے۔ شروع میں جب علوم و فنون کا ذخیرہ اس قدر بڑھا نہیں تھا اور لوگ سادہ زندگی گذارتے تھے تو یہ بات آسان تھی کہ سماج کے کاموں میں عملی شرکت سے نئی نسل پرانی نسل کے ہنروں کو سیکھے۔ مختلف پیشہ وروں کی برادریوں کے ادارے تعلیم و تربیت کے بڑے کارآمد ادارے تھے۔ مگر چونکہ موجودہ زمانہ میں تمدنی زندگی کا معیار اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ بچہ اس طرح سماجی مشاغل میں براہ راست شرکت کرنے سے وہ مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ جو ہر ایک شہری کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کی تیاری کے لئے خاص قسم کا انتظام کرنا پڑا۔ شہری زندگی کی تیاری مدرسہ کے سپرد کی گئی۔ مدرسہ نے سماجی تجربات کا نچوڑ لے کر اس کو مختلف مضامین کے نام سے مدرسہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ چونکہ بچہ میں اس قدر صلاحیت تو تھی نہیں۔ کہ سماجی علم کو اس کی اصلی شکل میں قبول کر سکے۔ اس لئے اس کے آسان سے آسان اجزا کئے گئے۔ تاکہ وہ بچے کی سمجھ میں آسانی سے آسکیں۔ اگرچہ علم میں اس طرح کے اختصار اور سادگی سے بچوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر اس سے علم اور زندگی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اس اختصار کے عمل میں زندگی کے ان سماجی اثرات کو نظر انداز کرنا پڑا جس کی وجہ سے علم وجود میں آیا تھا۔ اس لئے علم سے روح نکال کر اس کی بے جان لاش کو مدرسہ میں جگہ دی گئی جس کا نتیجہ تعلیم

و تدریس کی بے لطفی اور بے حسی کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرنا اس غلط فہمی کی بنا پر تھا۔ کہ بچہ بھی چھوٹے پیمانے پر آدمی ہوتا ہے، اس لئے علم کو اس کے مطابق کرنا گویا اس کو مختصر کر دینا ہے۔ یہ بات بچے کی نفسیاتی کیفیت کے بالکل منافی ہے۔ بچے کے تجربات کی دنیا نہ صرف مختصر ہوتی ہے۔ بلکہ بالغ اور بچے کی نفسی کیفیات میں بھی بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بالغ چیزوں کو منطقی ترتیب سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ ماہر خصوصی کی حیثیت سے برسوں کسی مسئلہ کی جزویات پر سوچ سکتا ہے وہ تمدنی اور طبعی علوم کے کسی مخصوص مسئلہ پر تحقیق کر سکتا ہے۔ اور اس کو اپنا مقصد زندگی بنا سکتا ہے مگر بچے کی دنیا جذبات و احساسات کی دنیا ہوتی ہے صرف شخصی تعلقات اور عملی مشاغل اس کی زندگی کو مربوط رکھ سکتے ہیں۔ وہ عملی مشاغل ہی کے ذریعے زندگی کے مربوط حقائق کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ کسی مضمون کو مضمون کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ اس لئے جہاں اسباق کو اس کی زندگی سے الگ کر دیا۔ وہاں بچے کے لئے اس کے اندر کوئی معنی نہیں رہ جاتے اس لئے اس کی علم سے وابستگی ٹوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ معلومات کے اس قسم کے اختصار اور منطقی ترتیب سے لازمی طور پر وہ مجرد شکل اختیار کرتی ہیں اور اس طرح کے اصطلاحی علم کا حاصل کرنا بچے کی زندگی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ طلبہ کو بالکل اصطلاحی علم پڑھایا نہ جائے۔ کیونکہ سبھی لوگ جانتے ہیں۔ کہ ہر ایک طالب علم کے ضروری نہیں ہے کہ ان لمبے چوڑے تجربات سے خود بھی گذرے جن سے گذر کر ہمارے بزرگوں نے ہم تک یہ تمدنی سرمایہ پہنچایا ہے اور نہ افراد کی تھوڑی سی عمر میں یہ بات ممکن ہے چھوٹی عمر میں عملی مشاغل کے ذریعے سیکھنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچہ اپنے تجربے کی روشنی میں علم کی ان کنجیوں کو پا سکے۔ جن کی مدد سے وہ علوم فنون کے دروازے کھول سکے غرضیکہ بچے کے لئے اصطلاحی علم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مگر اس وقت جب کہ بچے کے پاس اتنے ذاتی تجربات ہو جائیں، جس کی بنا پر وہ اس مدون اور مرتب اصطلاحی

علم کو سمجھ سکے۔ جو یونیورسٹیوں کے کتب خانوں اور معملوں میں محفوظ رکھا گیا ہے۔

اگر ہم بچے کی شخصیت کو ایک بڑھتا ہوا نامی وجود سمجھنے لگیں۔ تو پھر ہم بچے کی تعلیم و تربیت میں ایسی بنیادی غلطی نہیں کر سکتے۔ بچے کے اندر تمدنی سرمایہ سے استفادہ کرنے کی ہر قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ بسا اوقات اپنے چھوٹے موٹے مشاغل میں وہی کچھ کرتا ہے جسے بڑے اچھے اور ترقی یافتہ پیمانے پر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جس سماجی فضا میں پرورش پاتا ہے وہ خود بھی اس کے لیے تعلیمی اثرات سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقہ پہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ بچے کے ان چھوٹے موٹے مشاغل کو صحیح طور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان میں تعلیم و ترقی کے لیے کون کون سی ایسی قوتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کو فروغ دے کر ہم بچے کو آہستہ آہستہ تمدن کی بلند تر سطح پر پہنچا سکتے ہیں۔ جس طرح نصاب کے مختلف مضامین کو پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں مقصود بالذات نہیں ہے۔ اسی طرح صرف بچے کے لیے عملی مشاغل کا انتظام کرنا بھی کسی بڑے مقصد کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل وہ ذرائع ہیں، جن کے بل بوتے پر ہم بچوں کو تعلیم و تمدن کی وسیع تر دنیا میں لے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کی عملی دلچسپیاں بچے کے لیے ایسا موافق ماحول پیدا کرتی ہیں۔ جس میں بچہ نفسیاتی طور پر سیکھنے کے لیے بالکل تیار نظر آتا ہے۔ اس لئے معلم کی نظر ایک طرف نصاب یا بڑوں کے مرتب تجربات پر رہنی چاہیئے، اور دوسری طرف خود بچے کی زندگی میں سے ایسے عناصر کو چنتے رہنا چاہیئے، جن کو فروغ دے کر بچے کو نہایت سہولت اور قدرتی طریقہ پر بڑوں کے تجربات سے آشنا کیا جا سکے۔ یعنی بڑوں کے علم اور تجربے سے وہ حصہ بچے کے سامنے پیش کر دے۔ جو اس وقت بچے کی ذات کے لیے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔ کیونکہ صرف اسی طریقہ سے بچوں کے سادہ تجربات کے ساتھ بڑوں کے مرتب اور ترقی یافتہ تجربات کا آہستہ آہستہ پیوند لگایا جا سکتا ہے۔

نامی ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کی زندگی مربوط ہوتی ہے۔ وہ مجموعی حیثیت سے کام کرتی ہے یعنی اس میں اتنی پختگی نہیں ہوتی۔ کہ وہ مختلف شاخوں میں پھیل جائے اور اس کی زندگی کی یہ شکلیں

صاف طور پر نظر آئیں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے ان کو بہت مستعدی اور انہماک سے کرتا ہے۔ اس لیے عملی مشاغل کے سلسلہ میں بچے کو جو کچھ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں وہی اس کے علم اور واقفیت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سرمایہ اس کے چھوٹے موٹے تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ معلومات اگرچہ بے ترتیب اور خام شکل میں ہوتی ہیں۔ مگر اس میں بچے کے بڑوں کے پیش کردہ مرتب معلومات سے معنی کہیں زیادہ پنہاں ہوتے ہیں۔ اگر وہ بڑوں کی دی ہوئی معلومات کو سمجھ سکتا ہے۔ تو صرف ان چھوٹے موٹے تجربوں کی بنیاد پر سمجھ سکتا ہے وہ زندگی کی مجرد معلومات مختلف مضامین کی شکل میں الگ الگ طور پر تجزیہ نہیں کرسکتا۔ اگر معلومات بچے کی عملی زندگی سے الگ کر کے مختلف مضامین کی حیثیت میں پڑھائی جائیں۔ تو بچہ اپنے مخصوص نفسی حالات کی بنا پر ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ سمجھنے کو ہم یہاں وسیع معنوں میں لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے بہت چھوٹی عمر میں بھی ہزار ہزار تک گنتی لکھ سکتے ہیں۔ مگر سمجھنے سے مراد رٹنا نہیں ہے بلکہ اخذ کی ہوئی اشیا کو اپنی زندگی کا جزو بنانا ہے یعنی یہ کہ حاصل کردہ معلومات کو آدمی بوقت ضرورت صحیح طور پر برت سکے اور معلومات کو آدمی اس وقت صحیح موقعہ پر کام لا سکتا ہے جب کہ عملی طور پر آدمی کو اس کا تجربہ ہو جائے چونکہ بالکل چھوٹے بچوں کی زندگی میں اس قسم کے مواقع کم آتے ہیں جس میں وہ بڑے اعداد کا استعمال کرسکیں، اس لئے بچوں کے ذہن میں اس کا تصور مشکل سے آسکتا ہے لہذا معلم کا فرض ہے کہ وہ بچے کی زندگی پر بحیثیت مجموعی نظر رکھے۔ ایسے تعلیمی مواقع پیدا کرے، جن میں کچھ خوشی کے ساتھ شرکت کرسکے۔ اس صورت میں وہ جہاں موقع دیکھے مختلف مضامین کے اعتبار سے معلومات دیتا جائے۔ تاکہ وہ اس کی مجموعی تجربی زندگی کے اجزا کا کام دیں۔ اس لئے بچے کو مختلف مضامین پڑھانے کے لئے سب سے پہلے صحیح ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ صحیح ماحول عملی کاموں میں براہ راست شرکت کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کے لئے ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جن میں معلم تمام درسی مضامین کو نہایت عمدگی کے ساتھ کھپا سکتا ہے

نئی تعلیم کا یہ نظریہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی سچائی پرکھنے کے لئے ہمیں کسی خاص اہتمام اور تحقیق کی ضرورت پڑے یا بہت سے نفسیاتی اصولوں کی چھان بین کرنی پڑے۔ اگر ہم بچے کے روزمرہ مشاغل کا مشاہدہ کریں۔ ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔ کہ جس طرح عموماً ہم بچے کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح وہ نہیں سیکھتا۔ مختلف مضامین کے اسباق محض اسباق کی حیثیت سے سیکھنا بچے کی زندگی کا خاصہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پچھلی سطروں میں بتایا گیا کہ بچہ مختلف عملی مشاغل کے ذریعے اپنی معلومات فراہم کرتا ہے اور یہ تجربے یا مشاغل بچے کی مربوط معلومات کو بامعنی بنا دیتے ہیں۔ بچہ اپنے مشغلوں اور کھیلوں میں حساب سیکھتا ہے، اس طرح کہ ان میں اسے گننے، ناپنے اور تولنے کے مواقع پیش آتے ہیں۔ سائنس سیکھتا ہے، اس طرح کہ وہ اپنے طبعی اور سماجی ماحول میں موسموں کی تبدیلیوں کا اثر محسوس کرتا ہے اور خود بھی اپنے مشاغل کے دوران میں وہ دنیا کی سرد و گرم، اونچ نیچ اور سخت و گرم سے براہ راست تجربہ کرتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ دنیا کے سرد و گرم سے بچانے کے لئے کن کن اشیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کون کون ان کو فراہم کرتے ہیں۔ کس طرح سے وہ ان کو فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ ان مواقع پر بچے کے لئے سماج کا سبق سیکھتا ہے پھر اگر بچہ کو یہ سمجھایا جائے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے اپنے بچاؤ کے لئے کون کون سے طریقے اختیار کئے ہیں تو پھر ہم بچوں کو انسانی زندگی کے ارتقا یا تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ کسی ایک ہی مشغلہ کے دوران میں زندگی کے ان تمام تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بچہ کہیں پر حساب سیکھتا ہے۔ کہیں ڈرائنگ سیکھتا ہے کہیں جغرافیہ اور تاریخ کا سبق لیتا ہے۔ کیونکہ بچے کے اندر اتنی ذہنی پختگی نہیں پائی جاتی کہ وہ زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر الگ الگ طور پر سوچ سکے۔ البتہ صحیح موقعہ پر ان مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور ان کو تعلیمی اغراض کے لئے استعمال کرنا معلم کا کام ہے۔ کیونکہ بچہ خود بخود ان تعلیمی حقیقتوں کا تجزیہ کرکے ان پر نہیں سوچ سکتا اور نہ اس طرح کا سوچنا سادہ زندگی کا شیوہ ہے۔ بچے تو کیا بڑے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے دور میں یہ تقسیم

نہیں کرپاتے ہیں۔ یہ دراصل متمدن اور ترقی یافتہ زندگی کی ایک ضرورت ہے کہ زندگی کے گوناگون تجربات کو چند موٹے موٹے اصول اور کلیات کی روشنی میں سمجھا جائے۔ چنانچہ تمدنی سلسلے کی بدولت جب انسان کے پاس تجربوں کا ذخیرہ ہونے لگا۔ اس وقت کاٹ چھانٹ ترتیب وتدوین کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس وقت اصولی ضابطوں کے بغیر زندگی کے مختلف مظاہر کا سمجھنا مشکل تھا۔ اس لئے جہاں زندگی کے مختلف تجربے مختلف طبعی اور تمدنی علوم میں بٹ گئے، وہاں پر بھی ہر ایک علم کے اصول اور قواعد مرتب کرنے پڑے۔ غرض بچہ بڑوں کے برخلاف اپنی زندگی میں مضامین کو اس طرح الگ الگ کرکے نہیں سیکھتا البتہ جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھتی جائے، اور اس کا تجربہ وسیع ہوتا جائے، معلومات کو پھر منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس وقت بھی الگ الگ مضامین کے سماجی پہلو کو نظرانداز کرنا ان کو تقریباً پھیکا اور بے معنی بنا سکتا ہے، کیونکہ معلومات بذات خود علم اور تجربات کی توسیع کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنا کہ ان کو سیکھنے کی ضرورت کا احساس ہوتا۔ تاکہ ایک تو طلبہ اس کے حاصل کرنے میں پوری توجہ مرکوز کرسکیں اور دوسرے اس بات کو سمجھیں کہ سماجی زندگی میں کسی علم وہنر کی قدر ومنزلت کیا ہے اور اس نے سماج کے بدلنے میں کیا مدد دی ہے اس طرح سے بچہ صحیح معنوں میں تمدنی ارتقا سے واقف ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ سہولت کے ساتھ موجودہ زندگی کے مسائل کو ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھنے کی اہلیت پیدا کرے گا۔

غرض بچے کی مخصوص نفسیاتی کیفیت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ کس طرح اس کے تجربات کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے؛ کس طرح وہ شروع میں بالکل اپنی شخصی تعلقات کی چھوٹی سی دنیا میں رہتا ہے اور کس طرح علم کی روشنی اس کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ پہنچتی ہے؟ اس لئے معلم کا کام یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کی ضروریات کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑوں کے تجربات کو سادہ کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ اصطلاحی شکل میں ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرے

اس طرح کی جلد بازی سے بچے کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بے مقصد طریقہ پر پڑھانے سے اس کو مدرسہ کی پڑھائی اور استاد سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بچے کی زندگی کی نازک جڑیں خود بھی سماجی زندگی سے خوراک حاصل کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس کام میں تدریجی طور پر بچے کی مدد کریں اور سماج کی منتخب اچھائیوں اور ہنرمندیوں سے بچوں کو اس طرح سے روشناس کرائیں کہ جو کچھ بچوں کو پڑھایا جائے وہ ان کے روزمرہ کے تجربات اور مشاہدات سے تعلق رکھے۔ اس لئے علم اور بچے کی زندگی کو دو متضاد چیزیں نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ سیکھنے کو بچے کی زندگی کی قدرتی نشو نما کا ایک لازمی عمل سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی کے دوران میں تمدنی زندگی کے مختلف تجربات میں سے کسی نہ کسی صورت سے گزرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا موجودہ تمدن جس معیار پر پہنچا ہے اور جس تیزی کے ساتھ آگے کو بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر زندگی سے تطابق حاصل کرنے کے لئے بچے کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ سیکھنے پر نہیں چھوڑا جا سکتا اور اس لئے پڑھائی کے سلسلہ میں ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضرور کسی نہ کسی طرح اصطلاحی علم اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ لیکن بالکل ابتدائی تعلیم میں بچے کی مربوط زندگی کو جہاں پر وہ مجرد حقیقتوں کے ذہنی تجربے کرنے کے قابل نہیں ہوتا، الگ الگ مجرد معلومات میں بانٹ دینا اس کی ایک اہم ضرورت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ استاد اپنے کام میں مختلف معلومات کا کوئی واضح تصور نہ رکھے۔ بلکہ استاد کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک تعلیمی مشغلہ کی تعلیمی قدروں کی صحیح پڑتال کرے دیکھے کہ اس میں بچوں کے سیکھنے کے لئے کون کون سے اہم مواقع نکل سکتے ہیں اور کون مواقع کن کن تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ اگر ہم کتاب کی بجائے بچے کو مرکز بنائیں اور صرف خاموشی سے سننے والے بچے کی بجائے چلتے پھرتے اور کام میں مشغول بچے کا تصور کریں جو کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور کرنے سے سیکھنا چاہتا ہے۔ تو پھر ہم کو اپنے تعلیمی نقطہ نظر میں بہت بنیادی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ پھر ہم

صحیح معنوں میں بچے کے مشاغل کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں گے۔ جان ڈوئی نے جو تعلیم میں سب سے
پہلے اس خیال کے علمبردار ہیں اپنی کتاب The school and the child
میں استادوں کو جو مشورہ دیا ہے۔ اس کو ہم یہاں پر اپنی راہ نمائی کے لئے درج کرتے ہیں۔ "اس
بات کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ کہ نصاب کے مضامین بذات خود کوئی مقررہ اور بنی بنائی
چیز ہیں۔ جو بچے کی زندگی سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ بھی نہ سمجھو کہ بچے کے تجربات
بالکل اٹل اور جامد ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ بچے کی ان سادہ شغلوں میں لوچ، نمو پذیری
اور زندگی پائی جاتی ہے اور یہی خیال کرنا چاہیئے کہ بچہ' اور نصاب' تعلیم کے دو ایسے نشان ہیں
جو ایک ہی عمل کے دو سروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس طرح علم ہندسہ میں دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ
ایک خط کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح تعلیم بچے کی موجودہ زندگی اور درسی علوم کے باہمی رشتہ سے عبارت
ہے تعلیم ایک مسلسل تعمیر نو کا نام ہے۔ جو بچے کے موجودہ تجربات سے شروع ہو کر سماج کی ان
منظم حقیقتوں کے مجموعے تک پہنچ جاتی ہے جن کو ہم علوم و فنون کہتے ہیں۔"

بچے کو مرکز ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ پھر ہم مختلف مضامین کو کس طرح بچے کی
مشغول زندگی میں کھپا سکتے ہیں کیونکہ نئی تعلیم اور پرانی تعلیم میں بنیادی فرق یہیں سے شروع ہوتا ہے
یعنی پرانی تعلیم میں درسی معلومات تعلیم کا مرکز ہوتی ہیں اور نئی تعلیم میں بچے کی زندگی۔ پرانی تعلیم
میں مجرد معلومات کو آسان کر کے بچوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور نئی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا
ہے کہ ان معلومات کو بچے کے سامنے پیش کرنے کے سماجی مشاغل کو بطور ذریعہ استعمال کرنا چاہئے
یعنی یہ کہ سماج میں طرح طرح کے مشاغل پائے جاتے ہیں۔ بعض مشاغل خام اشیاء کے کام سے تعلق رکھتے
ہیں۔ جیسے زراعت، باغ بانی، ماہی گیری اور کان کنی وغیرہ اور بعض کام صنعت و دستکاری سے
تعلق رکھتے ہیں یعنی پھر لوگ اس خاص پیداوار میں تصرف کر کے اس کو سماج کی ضروریات کے
قابل بنا دیتے ہیں اور کچھ کام لین دین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی چیزیں لوگوں تک مختلف تاجروں
کے ذریعے سے پہنچتی ہیں اور پھر خریدار ان کو خود بھی اپنی ضروریات کو دیکھتے ہوئے مختلف

چیزوں کی خریداری کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ کون سی چیز پائیداری اور خوبصورتی کے اعتبار سے زیادہ مفید ہے اور کون سی کم۔ اس لئے ان تمام مشاغل کے سلسلے میں بعض ایسی ہنرمندیوں کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے جن کے بغیر ان ضرورتوں کو پورا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے لازماً ہر مشغلہ کے ضمن میں ہمیں تھوڑا تھوڑا کرکے ان کو کسی نہ کسی طرح سیکھنا پڑتا ہے۔ نئی تعلیم والوں کا مقصد یہ ہے کہ پڑھانے والوں کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ سیکھنے کا بالکل قدرتی طریقہ ہے۔ سماجی مشاغل کے ذریعہ آدمی نے نتیجے کے طور پر یہ سارا علم سیکھا ہے اور نئی نسل بھی اسی طرح سے اس کو سیکھ سکتی ہے۔ چنانچہ پراجکٹ متھیڈ اور حرفہ کے ذریعہ پڑھانے والوں کا بنیادی خیال یہی ہے۔ بنیادی تعلیم والے بھی حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں اسی مقصد کے پیش نظر شامل کرتے ہیں۔

بچے کو مرکز مان کر نئی تعلیم والے درسی مضامین کی حیثیت کو گرانا نہیں چاہتے۔ البتہ اس کو بچے کی ہم آہنگ اور مجموعی تعلیم و تربیت کے لئے وسائل کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں پر نئی تعلیم کے مقاصد کے پیش نظر تعلیم دی جارہی ہے، وہاں پر بھی مقررہ نصاب کو پورا کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر یہاں پر بچے کی عملی دلچسپی مقدم ہوتی ہے اور مضامین کو عملی مشاغل کے دوران میں جو سیکھنے کے مختلف مواقع آتے ہیں، ثانوی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔ اس طرح کی پڑھائی کو نئی تعلیم میں ربط مضامین کہتے ہیں۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں بھی جہاں پر استاد حرفہ کے ذریعہ تعلیم دیتا ہے اپنے پروگرام کے تختے پر الگ الگ مضامین مثلاً زبان حساب، سماجی مطالعہ اور عام سائنس کے خانے قائم کرتا ہے یہ مضامین مختلف عملی مشاغل اور بچوں کے ماحول کی مناسبت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس تقسیم کا فائدہ یہ ہے کہ استاد کے ذہن میں اس بات کا تصور واضح ہو جائے کہ بچہ اپنے عملی مشاغل کے دوران میں کون کون سی ایسی منزلوں میں سے گزرتا ہے جہاں پر اس کو ان مضامین کے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا کم از کم وہ اس موقع پر خاص باتیں سیکھنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ مواقع بعض مرتبہ صاف طور پر نظر نہیں آتے مگر دیکھنے والے ان مواقع کی دھندلی سی جھلک بچے کے معمولی مشاغل، ان کے ماحول اور خود ان کی گفتگو میں دیکھ

سکتے ہیں۔ وہ اکثر ایسی چیزوں سے وابستہ نظر آئیں گے، جہاں پر ان کی دلچسپیوں کو تعلیمی کاموں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کی معلومات کو مختلف مضامین کے عنوانات کے نام سے تقسیم کرنا اس لئے ضروری ہے کہ استاد ان کی روشنی میں بچے کے تعلیمی مشاغل کی حیثیت کو جانچ سکے اور ان کی مدد سے بچے کی بالکل سادہ اور ابتدائی زندگی میں بھی ان صحیح قدروں کی آبیاری کر سکے جن پر متمدن زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم شروع ہی سے بچوں کے مشاغل میں تعلیمی اور ترقی پذیر رجحانات کا اندازہ کر سکیں، تو ہم زیادہ یقین کے ساتھ ترقی پذیر اور تسلی بخش زندگی کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

بچوں کی دلچسپیاں کئی طرح کی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن سے بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد لی جا سکتی ہے اور ایسی بھی جن میں شرکت کرنے سے کوئی تعلیمی اور تربیتی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے استاد کو اس معاملہ میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کو چاہیئے کہ مختلف مشاغل کے دوران میں وہ ایسے مواقع یا ضمنی مشاغل کی کھوج میں لگا رہے۔ جہاں سے وہ بچے کی تعلیمی زندگی کو ٹھیک راستے پر لگا سکے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ بچے ایسے مشاغل میں لگ جائیں جو ان کے لئے بذات خود تو دل چسپ ہوں مگر ان سے کوئی تعلیمی فائدہ مترتب نہ ہو سکے۔ اس لئے جس طرح کسی خاص مضمون کو مقصود بالذات سمجھ کر پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی بڑا حصہ نہیں لیتا۔ اسی طرح کسی دلچسپی کو محض دلچسپی کی غرض سے پورا کرنا ہمارے تعلیمی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دلچسپی یا مشغلہ میں بچے کی مجموعی (جسمانی اور ذہنی) نشو و نما کے لئے کون کون سے جان دار عناصر موجود ہیں جن کو کام میں لا کر ہم بچے کو چند قدم آگے بڑھا سکیں۔ یہ بات ہم اس لئے صاف کرنا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے نئی تعلیم کی نسبت جس میں کہ بچوں کی دلچسپی کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، پڑھانے والوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ بچے کی دلچسپیوں کو پورا کرنا ہی سب کچھ ہے۔ بچے تو کیا بڑوں کی دلچسپیوں میں سے بھی ہم ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جو تعلیمی ترقی کے اعتبار سے ہرگز بار آور نہیں کہی جا سکتیں اور جن کی حیثیت دماغی عیاشی یا اوقات گزاری سے زیادہ

نہیں ہے۔ مثال کے طور پر شطرنج کو لیجئے، شطرنج کھیلنے والا صرف شطرنج ہی کھیل کر اپنی زندگی کو تمدنی قدروں سے مالا مال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شطرنج کھیلنے والا اس اعتبار سے کولھو کے بیل کی طرح ساری عمر ایک ہی محدود دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے اور جب آنکھوں سے پٹی اترتی ہے تو اپنے آپ کو وہیں کا وہیں کھڑا پاتا ہے۔ اس لئے تعلیمی مشاغل کے انتخاب میں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بنیادی تعلیم میں حرفوں کو متعین کر کے اس خطرے کو بہت کچھ کم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں جتنے حرفے منتخب کئے گئے ہیں، ایک تو ان کی اجتماعی قدر وقیمت اس قدر ہے کہ اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے ان میں درسی مضامین کو کھپانے کی لوچ اور وسعت موجود ہے۔ ہر ایک حرفہ ہماری تمدنی زندگی کی کسی اہم سے اہم ضرورت کی کفالت کرتا ہے۔ اس لئے ہر حرفے کے سلسلے میں ایسے ضمنی مشاغل اور دلچسپیاں نکل سکتی ہیں جو ہماری پوری درسی تعلیم کی مہارتوں کو اپنے اندر سمیٹ سکیں۔

حرفے کے ذریعے تعلیم دینے کے سلسلے میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ معلم اس کی صحیح تعلیمی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بنیادی تعلیم والوں نے حرفوں کا تعین کر کے اس بات میں معلم کی ضرور مدد کی ہے کہ وہ صرف بچوں کی دلچسپی کو مرکز مان کر ایسے غیر تعلیمی مشاغل میں نہ الجھ جائیں جن سے بچے کو کوئی تعلیمی فائدہ نہ پہنچے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان حرفوں ہی کو مقصد مان کر دستی مہارت میں خصوصیت پیدا کرنے کی خاطر بچے کی عام تعلیم سے بے اعتنائی کی جائے۔ نصاب کے دئے ہوئے حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں مرکزی حیثیت ضرور دینی چاہیئے مگر بنیادی حرفے کے سلسلے میں جو ضمنی مشاغل نکلتے ہیں اور جن کو بچے خوشی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف سے معلم کو چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو کام میں تنوع کی وجہ سے نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور حرفے کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بچے کی عام واقفیت بڑھتی جاتی ہے اور کام کی نوعیت زیادہ تخلیقی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی آزادی کر بچہ اس تنگ نظری اور یک طرفہ تربیت سے بچ جاتا جس کا معمولی دستکاری سے پیدا ہونے

کا اندیشہ ہے اور دوسری طرف ضمنی مشاغل کے دوران میں کثرت سے ایسے مواقع نکل سکتے ہیں
جن کے ذریعہ درسی مشاغل کی وجہ سے طالب علم کو کام کرنے کے لئے اور درسی مضامین کو سیکھنے
کے لئے ایک بہت بڑا میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ اس لئے بنیادی حرفے کو وسیع نقطہ نظر سے
دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر حرفے کے میدان کو تنگ کر دیا جائے اور صرف براہ راست
اسی کے ذریعہ ہم تعلیم دینا چاہیں، تو اس طرح سے ہم اپنے تعلیمی میدان عمل کو تنگ کریں گے اور
ان متنوع تجربات سے تعلیمی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جو مرکزی حرفہ کے دوران میں نکلتے
رہیں گے۔

یہ ضرور ہے کہ استاد کو اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ کسی عمر میں بچوں کی دلچسپیوں
اور تجربوں کو کہاں تک بڑھایا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ کسی خاص موقع سے مدد لے کر ہم کتنا تعلیمی
مواد بچے کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں استاد کو لازمی طور پر بچوں کی استعداد
کا لحاظ رکھنا ہوگا اور نصاب کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کے تعلیمی حدود متعین کرنے
میں استاد کی راہ نمائی کرے۔ اس لئے نصاب کا متعین ہونا بھی استاد کو اس حق سے محروم نہیں
کرتا کہ وہ مقررہ معلومات زندگی کے مختلف مشاغل کی صورت میں موقع موقع پر بچوں کو دیتا رہے
البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ استاد کے دیئے ہوئے نصاب کی ترتیب کی ہو بہو پابندی بھی کر سکے
کیونکہ مختلف مشاغل کے دوران میں جو جو مواقع نکلتے رہتے ہیں، ان کو پہلے ہی سے کسی مقررہ
ترتیب کے ساتھ بھانپ لینا ناممکن ہے اس لئے کہ بچوں کے مشاغل میں اس قدر لچک اور تغیر
پذیری ہوتی ہے کہ ہر قدم پر نصاب کی مقررہ ترتیب کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم استاد کے
ذہن میں نصاب کی نوعیت اور تعلیمی حدود کا تصور واضح ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر موقع پر نصاب
کے جزویات کو بہترین تعلیمی موقعوں پر برت سکے۔ اس لئے جن مدرسوں میں حکومت کی طرف
سے مقررہ نصاب کی پابندی لازم بھی قرار دی گئی ہے وہاں بھی بچوں کو حرفوں کے ذریعہ بہت
حد تک پڑھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر نصاب میں ایسی معلومات کا پڑھانا رکھا گیا ہے جو بچوں کی

زندگی سے دور ہیں تو یہ نصاب کی کمی ہے اور اس کو پورا کرنا چاہیئے۔

بات یہ ہے کہ ہم نے علم کو زندگی سے سیکھا ہے اور ہم زندگی ہی کے ذریعہ پھر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے۔ کہ یہ زندگی سے الگ ہو گئی ہے۔ اس نے نظری اور کتابی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے اس کی نامی خصوصیت کی جگہ میکانکی طرز تعلیم نے لے لی ہے اور میکانکی ہونے کی وجہ سے جو خرابیاں لازم آتی ہیں وہ سب اس میں آ گئی ہیں تعلیم کے متعلق بچوں کا رویہ تجربی ہونے کی بجائے بالکل روایتی ہو گیا ہے۔ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ رٹنے کی توقع کی جاتی ہے۔ جو کچھ انھیں پڑھایا جاتا ہے اس کی وہ ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے موجودہ تعلیم طوطے کی تعلیم کہلاتی ہے۔ درجہ میں استاد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ طالب علم کی ہستی نفی کے برابر ہوتی ہے تعلیمی پروگرام میں بچے کی ذاتی اپج اور سیکھنے کی قدرتی صلاحیتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ پروفیسر جان ڈوئی نے اس قسم کی رسمی تعلیم کی جو بڑی بڑی خامیاں ظاہر کی ہیں۔ ہم ان کو مختصر طور پر یہاں ذکر کرتے ہیں۔

"پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ بچے کو پڑھایا جاتا ہے اور جو کچھ بچہ دیکھتا، پسند کرتا، اور محسوس کرتا ہے۔ ان میں کوئی زندہ رشتہ نہیں پایا جاتا۔ یہ چیز بچے کی معلومات کو بالکل رسمی بنا دیتی ہے۔ البتہ جب یہ رسمی علم حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ جس کی مدد سے انسان کسی نئی حقیقت کا کھوج لگا سکے۔ تو اس وقت یہ علامات بھی اصلیت رکھتی ہیں۔ علم کی رسمی علامتیں جو باہر سے بچے پر تھوپ دی جاتی ہیں اور جن کو بچے نے اپنے ابتدائی تجربات میں ٹھوس طریقے پر محسوس نہیں کیا ہے، وہ صرف علامت ہی علامت ہے۔ اس کا سیکھنا بچے کے لئے بالکل بے روح اور غیر دلچسپ ہے"۔

"دوسری خرابی جو اس طرح کی بیرونی طور پر عائد کردہ تعلیم سے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے۔ کہ اس میں سیکھنے کے لئے بچے کے اندر کوئی آمادگی نہیں پائی جاتی۔ اس میں نہ صرف گزشتہ محسوس کی ہوئی حقیقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ نئی صداقتوں کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہاں تو سرے سے سیکھنے کے لئے خواہش، ضرورت اور بے چینی نہیں پائی جاتی۔ جب مضامین کو

نفسیاتی رنگ دیا جاتا ہے یعنی ان کو مجوزہ رجحانات اور مشاغل کی ترقی یافتہ صورت سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ موجودہ مشاغل کے دوران میں بعض عملی، ذہنی اور اخلاقی مشکلات کا اندازہ کر کے ان کو کسی متعلقہ صداقت کو سیکھنے کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اس ضرورت سے آدمی سیکھنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ بچے کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تو پھر وہ اپنی تکمیل کے لئے بچے کو وسائل ڈھونڈنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن جب درسی معلومات بچے کے سامنے براہ راست اسباق کی صورت میں اس لئے پیش کی جاتی ہیں۔ کہ بچہ انہی کو مقصد سمجھ کر سیکھے۔ تو پھر مقصد اور ضرورت کے ملانے والے رشتے کا غائب ہو جانا صاف صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ جب ہم تدریس کے سلسلے میں میکانکی اور مردہ طریقہ تعلیم کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس سے ہمارا مطلب اسی تعلیمی محرک کی کمی ہوتا ہے۔ نامی اور زندہ تعلیم نام ہے باہمی ردعمل کا جو ذہنی طلب اور اس کی تسکین کے لئے مادی ذرائع کی رسد سے پورا ہوتا ہے۔"

تیسری خرابی یہ ہے۔ کہ نہایت مستند معلومات کو بھی اگر بہت عمدہ منطقی ترتیب کے ساتھ بیرونی طور پر بچے کے سامنے بنی بنائی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ تو اس وقت بھی بچے کے لئے اس میں کوئی منطقی ترتیب نہیں رہتی۔ ضرور اس میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔

کیونکہ کہیں مشکل حصوں کو نکالنا پڑتا ہے۔ کہیں ان کو ہموار کر کے آسان کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے خود بچے کے ذہن میں جو معلومات کی ترتیب ہوتی ہے اور جس کو بچے کی زندگی کی ضروریات مقرر کر دیتی ہے۔ وہ قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے جب معلومات کو بیرونی طور پر بچے کی موجودہ ضروریات سے قطع تعلق کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ تو ان میں وہ ترتیب اور قوت نہیں رہتی۔ جو ایک طرف بچے کی گزشتہ معلومات کے ساتھ جوڑ کھائے اور دوسری طرف اس کو آگے سوچنے پر ابھارے۔

برطانیہ کی عالمگیر سلطنت

برطانوی سلطنت کیا ہے؟ دنیا کا تقریباً ایک چوتھائی رقبہ برطانیہ کی سلطنت میں شامل ہے۔ اسی طرح دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی یعنی ۴۰ کروڑ سے زیادہ نفوس برطانیہ کے ماتحت ہیں[1]۔ برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کے جو حصے شامل ہیں انہیں سامنے کے صفحہ پر نقشہ کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے بڑے بڑے علاقے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جزائر برطانیہ   ۴۔ کناڈا

۲۔ ہندوستان   ۵۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ

۳۔ جنوبی افریقہ کا اتحاد اور افریقہ کے دوسرے علاقے   ۶۔ ریاست ہائے ملایا

اس کے علاوہ برطانیہ کی سلطنت میں بہت سے چھوٹے جزیرے شامل ہیں جو دنیا کے ساتوں سمندروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور بہت سی عمدہ بندرگاہیں برطانیہ نے غیر ملکوں میں حاصل کر رکھی ہیں۔

بعض ملکوں کو جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنس نے یورپ کے دول کی حفاظت میں دے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں عراق (میسوپوٹامیا) اور افریقہ کے بہت سے ایسے علاقے جو پہلے جرمنی کے قبضہ میں تھے برطانیہ کی نگرانی میں آگئے ہیں۔ مصر کو بھی بعض وقت برطانوی سلطنت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] یہ ماتحتی مکمل نہیں ہے۔ سلطنت کے بہت سے حصے خود مختار ہو گئے ہیں اور اب انہیں نوآبادی کی جگہ ڈومینین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برطانوی سلطنت کا سرکاری نام بھی ۱۹۲۱ء سے "برٹش کامن ویلتھ آف نیشنس" (قوموں کی برطانوی دولت مشترکہ) رکھ دیا گیا ہے۔ تمام سلطنت کا سردار بادشاہ کو سمجھا جاتا ہے لیکن جملہ سیاسی معاملات میں وزیر اعظم اور اس کے ساتھی بادشاہ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور یہ لوگ برطانوی پارلیمنٹ

دنیا کے تمام بر اعظموں کی زمینیں برطانوی سلطنت میں شامل ہیں ان میں سے خاص خاص کو ان تاریخوں کے ساتھ جب وہ برطانوی سلطنت میں شامل ہوئیں نقشہ میں دکھایا گیا۔

برطانیہ عظمیٰ کا برطانیہ کی وسیع سلطنت سے مقابلہ برطانیہ کے قبضہ میں جو خاص خاص علاقے ہیں ان میں سے کوئی علاقہ بھی برطانیہ عظمیٰ کے برابر مختصر نہیں ہے۔ کناڈا، آسٹریلیا، افریقہ کے برطانوی مقبوضات اور ہندوستان ــــ ان ملکوں کے صرف صوبوں کا مقابلہ جب برطانیہ سے کیا جاتا ہے تو ان میں سے ہر ایک کا رقبہ انفرادی طور پر جزائر برطانیہ کے رقبہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس وسیع سلطنت میں ہندوستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جزائر برطانیہ کی آبادی چار کروڑ تیس لاکھ ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ہے۔ ہندوستان کے صوبہ بنگال اور صوبہ جات متحدہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی آبادی برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے پنجاب، صوبہ جات متحدہ اور صوبہ جات متوسط ان میں سے ہر ایک برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ بڑا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ کرکے دکھلایا گیا ہے۔ اسی طرح کا مقابلہ دنیا کے نقشہ کو دیکھ کر برطانیہ کی سلطنت کے دوسرے حصوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔
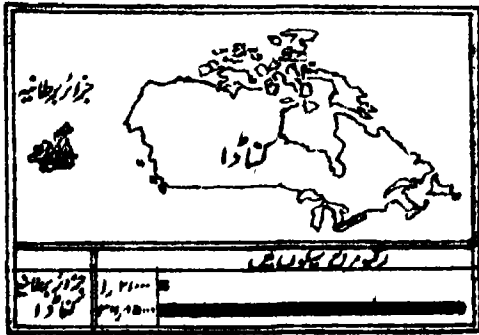
جزائر برطانیہ

کناڈا

برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ۔ کناڈا برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے

برطانیہ کیوں زمین کے اس قدر بڑے حصہ پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتا ہے اس سلطنت کو بنانے کے لئے برطانیہ کے بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں جنگ کے میدانوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں قربان کی ہیں۔ انھوں نے سردی، گرمی،

(بقیہ نوٹ صفحہ) کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کے لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان علاقوں کا مجموعی طور پر جب ذکر کیا جاتا ہے تو انھیں "سلطنت متحدہ برطانیہ و شمالی آئرلینڈ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نام میں پہلے بہت سالوں تک پورا آئرلینڈ شامل تھا لیکن ۱۹۲۲ء سے آئرلینڈ کے جنوبی حصہ کو آئرش فری اسٹیٹ کے نام سے خود مختار ڈومینین بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کناڈا اور آسٹریلیا بھی برطانیہ کی نگرانی سے تقریباً بالکل آزاد ہیں۔

بھوک اور بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کیا ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ بہت سے وجوہ کی بنا پر کیا ہے کچھ لوگوں نے تو اپنے وطن کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہوکر اور سلطنت برطانیہ پر ناز کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ کچھ لوگ اتنے من چلے اور مہم پسند تھے کہ ان سے گھر پر چین سے نہیں بیٹھا جاتا تھا اس لئے خطرات برداشت کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ ہندوستان، آسٹریلیا یا کناڈا کو اس وجہ سے روانہ ہوئے کہ انگلستان میں آبادی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور کھیتی کے لئے وہاں زمین موجود نہیں تھی۔ کچھ لوگ سونے کی تلاش میں روانہ ہوئے اور کچھ ریلیں بنانے کے لئے۔

لیکن سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ انگریز اپنی زندگی کو بہتر طریقے پر گزارنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے ماتحت ہزاروں انگریز بحر اٹلانٹک کو عبور کر کے شمالی امریکہ پہنچ گئے اور ہزاروں جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے دور دراز علاقوں میں جاکر بس گئے۔ غرضکہ برطانوی سلطنت کی تعمیر میں زیادہ اچھی اور زیادہ آزاد زندگی کی خواہش کا حصہ بہت اہم ہے۔

پھر سلطنت کے ترقی پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزوں کو تجارت کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ہم پچھلی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ جتنی برطانیہ کی تجارت بڑھتی گئی اتنی ہی اس کی سلطنت بھی زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ ان دونوں کی ترقی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ جیسے جیسے مینیروں کا انگلستان جدید صنعتی برطانیہ عظمیٰ بنتا رہا ویسے ویسے برطانوی سلطنت بھی وسیع ہوتی رہی۔ اس تبدیلی کی کہانی تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ انگلستان ہی وہ پہلا ملک تھا جس میں مشینوں اور انجنوں کا استعمال شروع ہوا اور بڑے پیمانہ پر مشینوں کے ذریعہ چیزیں بنائی جانے لگیں۔ انگریزوں کی آبادی نے اپنے کھیتوں کو چھوڑ دیا اور شہروں میں کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ اس جزیرے کی آبادی بڑھتی رہی غذا کی پیداوار کم ہوتی گئی اور مصنوعہ چیزیں زیادہ تعداد میں بنائی جانے لگیں۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ تجارت کو برطانوی سلطنت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سلطنت اس لئے بنائی گئی ہے تاکہ مال کے خریدنے

اور فروخت کرنے سے نفع کمایا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جس علاقہ کی برطانیہ نے نگرانی شروع کی ہے وہاں اس نے تجارت کو بھی ضرور شروع کیا ہے۔

اتنی بڑی سلطنت برطانیہ کے قبضہ میں کس طرح آئی؟

لیکن اس بات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ جیسے چھوٹے سے ملک نے کس طرح زمین کے اتنے وسیع رقبوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بارے میں بہت سی کتابیں انگریز مصنفوں نے لکھی ہیں جس میں انگریزوں کی جرأت ہمت اور خطرات پسندی کی بڑی تعریفیں کی گئی ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح خشکی اور سمندر میں لڑائیاں لڑ کر اور مصیبتیں جھیل کر انگریزوں نے اپنی سلطنت کو پھیلایا۔ یہاں اس کا حال صرف مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ہندوستان کی مثال کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے کہ برطانیہ کی سلطنت کو کس طرح وسعت حاصل ہوئی۔

ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ کس طرح ہوا

انگریز یہ چاہتے تھے کہ کسی خوب آباد ملک کے ساتھ تجارت کریں۔ تین سو سال گذرے انھوں نے نہایت حقیر پیمانہ پر اپنی تجارت کو شروع کیا۔ جو انگریز تاجر مشرقی ملکوں کو ڈھونڈنے نکلے تھے انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان سے اگر گرم مسالہ دھات کی چیزیں اور کپڑے خرید کر برطانیہ میں لے جائے جائیں اور وہاں فروخت کئے جائیں تو اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے بڑی مشکلوں سے ہندوستان تک جانے والے اور وہاں سے قیمتی سامان لاد کر لانے والے جہاز حاصل کئے۔ بہت سے انگریزوں کا عقیدہ تھا کہ اس کام سے بہت نفع حاصل کیا جا سکتا ہے اس لئے انھوں نے کمپنی کے کاروبار میں اپنی پوری دولت لگا دی۔

ابتدا میں کمپنی کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں اسے خوب نفع حاصل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ کمپنی اور برطانوی حکومت نے ہندوستان میں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے متفرق جگہوں پر حاصل کرنا شروع کئے۔ لیکن پھر دونوں کی حکومت مسلسل طریقہ پر ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد پر قائم ہونے لگی۔ ہندوستانی رئیسوں اور حکمرانوں کو شکست دی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی

نے اپنی حکومت خود قائم کرلی۔ ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا اس کی ماتحتی میں بہت سے افسر اور برطانوی اور ہندوستانی فوج رکھی گئی اور ان کے ذریعہ سے ملک میں امن قائم کیا گیا۔

تجارت بڑھتی رہی خصوصاً اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں انگریز ہندوستان کے گیہوں اور کپاس اور دوسری غذاؤں اور کچے مال پر بہت زیادہ دارومدار کرنے لگے اپنا مصنوعہ مال فروخت کرنے کے لئے بھی انگریزوں کو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور انگلستان کی مصنوعہ چیزوں کے لئے ہندوستان ایک نفع بخش منڈی بن گیا۔

لیکن ہندوستان کے لوگوں کے رسم و رواج اور مذہب انگریزوں جیسے نہیں تھے بلکہ ان سے مختلف تھے۔ بعض صورتوں میں انگریز حکمرانوں نے کوشش کی کہ ہندوستانی یورپ کے لوگوں جیسا طرز زندگی اختیار کرلیں لیکن ہندوستانیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ غرضکہ آخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں پر حکومت نہ کرسکی تو برطانوی حکومت نے سرکاری طور پر اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا۔

کروڑ ڈالر

۰ ۱۰ ۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰

برطانوی ہندوستان
ریاسہائے متحدہ امریکہ
جرمنی
آسٹریلیا
فرانس
کناڈا
ارجنٹائنا
نیدرلینڈ

اس نقشہ میں برطانیہ کے بہترین گاہکوں کو اور جتنی مقدار میں وہ چیزیں خریدتے ہیں انہیں دکھایا گیا ہے یہ بات دیکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستان دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ برطانیہ کا مال خریدتا ہے۔
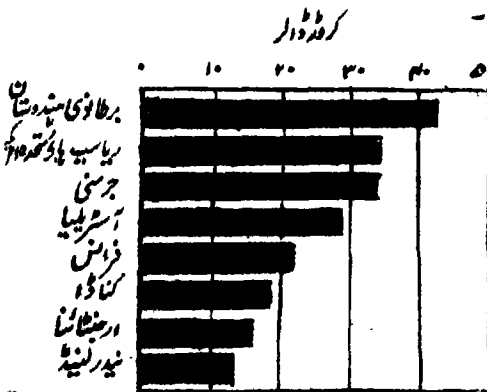
برطانیہ کے تاجر ہندوستان کے ساتھ بہت زبردست تجارت کرتے ہیں۔ اس تجارت کی سالانہ قیمت ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہوتی ہے۔ برطانیہ اتنا زیادہ مال دنیا کے کسی دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا۔ نہ امریکہ کے ہاتھ نہ جرمنی کے نہ فرانس کے کناڈا کو جتنا مال برآمد کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں یہ تین گنا ہے۔ ہندوستان کے لوگ بہت غریب ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے (برطانیہ سے تقریباً ۹ گنا) اس لئے اگرچہ ہر گاؤں انفرادی طور پر بہت کم مال خریدتا ہے لیکن بصورت

مجموعی میزان بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں برطانیہ کی مشینیں، ویگنیں، موٹریں، لاریاں اور بھاپ کے انجن بڑی مقدار میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ پھر شہروں اور بڑے قصبوں میں چند بہت زیادہ امیر لوگ بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ٹھاٹھ اور عیش کے ساتھ رہتے ہیں انھوں نے یورپ کی زندگی کے معیاروں کو اختیار کر لیا ہے اور برطانیہ کا بنا ہوا بہت سا مال خریدتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل رکھنا اور اس کی تجارت پر نگرانی رکھنا چاہتا ہے۔

پھر ہندوستان سے برطانیہ غذا اور کچا مال بھی جو اس کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں بہت بڑی مقدار میں خریدتا رہتا ہے۔ ہندوستان سے ہر سال انگلستان کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے لیے روئی سے لدے ہوئے بہت سے جہاز روانہ کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گیہوں چائے اور چاول سن اون اور چمڑا بھی بڑی مقداروں میں روانہ کیا جاتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوا کہ انگریز تاجروں کو ہندوستان سے بہت فائدہ پہنچا ہے اور انگلستان کے کارخانے اور ان کے مزدوروں کو ہندوستان کی پیداواروں اور ہندوستان کی منڈیوں پر بہت زیادہ دارومدار کرنا پڑتا ہے برطانوی سلطنت میں جتنے علاقے شامل ہیں ان سب میں تجارت کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان سب سے زیادہ بیش قیمت حصہ ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ
آبادی = ۱۲ کروڑ
ہندوستان
آبادی = ۵۰ کروڑ

ہندوستان کا رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبے کے نصف سے زیادہ ہے لیکن اس کی آبادی امریکہ سے تین گنا زیادہ ہے۔

کناڈا اور آسٹریلیا برطانوی سلطنت کے تمام علاقوں میں ہندوستان کی آبادی سب سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی ہندوستان برطانوی سلطنت کا ایک مختصر

حصہ ہے۔ اس سلطنت کے جو دوسرے اجزا ہیں ان کے رقبہ بہت زیادہ وسیع ہیں۔ کناڈا'
آسٹریلیا اور افریقہ کے مقبوضات سے ہندوستان کا مقابلہ کرنے سے یہ چیز سمجھ میں آسکتی ہے۔
سلطنت کے ساتھ ان دوسری نوآبادیوں کا الحاق مختلف طریقوں پر ہوا۔ ہندوستان
میں تو انگلستان کو ایک پرانی اور خوب ترقی یافتہ تہذیب کو فتح کرنا پڑا اس کے بعد وہ اس کی
سلطنت کا جزو بنا۔ لیکن کناڈا کا بیشتر حصہ اور آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کا پورا حصہ بالکل ویران تھا۔
جب انگریز پہلے پہل ان علاقوں میں گئے تو یورپ والوں کو ان کا علم نہیں تھا اور ان میں نیم
مہذب اور قدیم ترین وضع کے دیسی لوگ آباد تھے۔ ان علاقوں کی زمین کو آباد ہونے کے بعد
مفید بنایا جا سکا۔

برطانیہ کے ایسے باہمت لوگ جو گھر' دولت اور مہم کے آرزومند تھے وہ ان علاقوں
میں ہر جگہ پہنچے۔ اپنے ساتھ اپنی انگریزی زبان' انگریزی لباس انگریزی قوانین' مراسم اور طرز
خیال لے گئے اور اپنے ان نئے گھروں میں انھوں نے ویسے ہی زندگی بسر کرنے کی کوشش
کی جیسی کہ وہ برطانیہ میں بسر کرتے تھے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یہ کام انھوں نے شمالی امریکہ میں جاری رکھا اور اپنی
تیرہ نوآبادیاں بسائیں جو بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی شکل میں برطانیہ سے آزاد ہوکر
ایک الگ ریاست بن گئیں۔ اسی زمانے میں یہ لوگ کناڈا کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں بھی آباد
ہوتے رہے۔ یہاں انھوں نے جنگلوں کو صاف کیا' زمین کو جوتا اور اپنے لئے مکانات تعمیر
کئے کچھ بڑے قصبے اور شہر بھی بننا شروع ہو گئے چنانچہ آج کناڈا میں ۵۰ لاکھ آدمی آباد نظر
آتے ہیں۔

اس کے بہت سال بعد اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ
سے دوسرے لوگ دنیا کے کرہ کا نصف چکر کاٹ کر آسٹریلیا اور نیوزلینڈ کے ساحلوں پر پہنچے
اور وہاں اپنی نوآبادیاں بسانے لگے۔ اس کے اور بعد انیسویں صدی میں برطانیہ کے بعض لوگ

جنوبی افریقہ کے اندرونی حصے نیں بھی داخل ہونے لگے اور یہ تمام زمینیں آہستہ آہستہ بڑی خوش حال نوآبادیاں بن گئیں۔

برطانیہ کے لوگوں نے ان نوآبادیوں میں اپنے لئے جو گھر بنائے وہ برطانیہ کے گھروں سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ جو لوگ سب سے پہلے ان نوآبادیوں میں جاکر بسے انھوں نے اپنے پرانے رواجوں، زبان، لباس اور طرزخیال کو قائم رکھا اور آج بھی مادر وطن سے بہت سالوں تک جدا رہنے اور شاید برطانیہ کو کبھی نہ دیکھنے کے باوجود کناڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور دوسری برطانوی نوآبادیوں کے لوگوں کو برطانیہ کے لوگوں اور اپنے آبائی وطن کے ساتھ بہت گہری وابستگی ہے اور جذبہ اور تنظیم کی اس یکجہتی کی بنا پر سلطنت کو "برطانوی نسل رکھنے والی قوموں کا خاندان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جب ان نئے براعظموں میں انگریز پہنچے تو انھوں نے بہت نئے اور عجیب عجیب قسم کے زندگی کے طریقوں کا مشاہدہ کیا اور اپنے نئے ماحول سے جس طرح انھوں نے مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد کی اس کو پڑھ کر بہت جوش پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جگہ انھیں مخالف دیسیوں جنگلی درندوں اور فطرت کی پیدا کی ہوئی دشواریوں کے ساتھ جنگ کرنا اور ان کو قابو میں لانا پڑا۔ برطانوی سلطنت کے دوسرے خاص خاص حصوں کو جس طرح حاصل کیا گیا اس کا یہاں محض ایک خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہر نوآبادی کی کہانی ہندوستان سے مختلف ہے لیکن اس کا عام انداز تقریباً یکساں ہے۔ برطانوی سلطنت کے تمام حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تو ممکن نہیں ہے اس لئے یہاں صرف بحرروم اور افریقہ کے مقبوضات کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی جائیں گی۔

بحرروم اور افریقہ میں برطانوی مقبوضات

دوسو سال سے برابر برطانیہ بحرروم کے اندر اور اس کے آس پاس زمین حاصل کرتی رہی ہے۔ ایک ایک کرکے اس نے مندرجہ ذیل کو اپنی سلطنت میں شامل کیا ہے:۔

۱۷۱۳ء بحرروم کے مغربی دروازہ پر جبرالٹر کا قلعہ

۱۸۱۴ء مالٹا کا جزیرہ

۱۸۳۹ء عدن جو بحر احمر سے نکلتے وقت شمالی ساحل پر واقع ہے۔

۱۸۷۵ء نہر سویز کی نگرانی کا خاص حق

۱۸۷۸ء سائپرس کا جزیرہ

۱۸۸۲ء مصر پر قبضہ (لیکن اب مصر آزاد ہو گیا ہے البتہ اینگلو مصری سوڈان پر برطانیہ کا قبضہ ہے)

۱۸۸۴ء بحر احمر میں عدن کے بالمقابل برٹش شمالی لینڈ

ان زمینوں کو حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کو بہت جد و جہد کرنا پڑی۔ یہ مقامات رقبہ کے لحاظ سے تو غیر اہم ہیں لیکن ان پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لئے بہت ضروری تھا۔ اول تو اس لئے تاکہ بحر روم کے زرخیز علاقہ کی تجارت پر قبضہ کرنے میں مدد ملے اور دوسرے اس لئے تاکہ ہندوستان کو اس کے جو جہاز جاتے ہیں ان کا تحفظ کیا جا سکے۔ غالباً دوسری وجہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

بحر روم کے آس پاس جو زمینیں واقع ہیں انھیں ہزاروں سال سے برابر تجارتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان علاقوں میں قدیم زمانہ میں مصر، فنشیا، کریٹ، یونان اور روم کے جہاز قیمتی مال لایا لے جایا کرتے تھے۔ پھر ایک ہزار سال بعد وینس، جنوآ اور برگس کے جہاز اسکندریہ میں اپنا مال ایشیا کے تاجروں سے تبادلہ کرنے کے لئے لایا کرتے تھے۔ بحر روم کے ساحلوں پر ہی مصریوں یونانیوں، رومیوں اور مسلم ترکوں کی وسیع سلطنتوں نے ترقی پائی۔

پھر جب صلیبی جنگیں ہو چکیں اور یورپ والوں نے مشرقی ایشیا کے ملکوں سے واقفیت حاصل کر لی تو مشرق و مغرب کی تجارت کے لئے بحر روم کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی بحر روم کے پورے علاقہ میں تجارت کی بہت زیادہ گرم بازاری پائی جاتی ہے۔ اس کے ارد گرد تقریباً ہر طرف لوگ آباد ہیں اور ان کا گذر اس طرح چلتا ہے کہ یہ باہر کی دنیا سے تجارت کرنے کے لئے جہاز وں میں مال لادے لے جاتے رہتے ہیں۔ اس کے ساحل پر فرانس، اسپین، اٹلی (ان تینوں کی افریقہ میں نو آبادیاں

ہیں، یونان، یوگوسلاویا، ترکی، شام، فلسطین اور مصر آباد ہیں۔ ان ملکوں سے دور یورپ کی اور دوسری ایسی قومیں ہیں جن کی تجارت کا دارومدار بھی بحر روم پر ہی ہے۔ مثلاً روس کی مثال کو لیجئے کہ وہ باہر کی دنیا کو بحر روم کے راستے سے مال روانہ کرنے کے لئے بہت زیادہ مجبور ہے۔ شمالی یورپ کے تمام دوسرے ملک بھی بحر روم کی تجارت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

اس لئے بحر روم میں زمین حاصل کرنے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ برطانیہ بحر روم میں جو قومیں آباد ہیں ان کے ساتھ تجارت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دوسری زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے سمندری راستہ کا تحفظ کرنا چاہتا تھا۔

نقشہ میں بحر روم کی شکل ایک بڑی جھیل جیسی معلوم ہوتی ہے جس کی لمبائی دو ہزار میل ہے اور چوڑائی تین سو سے پانسو میل تک۔ اس کے چاروں طرف زمین ہے۔ اگر دو چھوٹے راستوں کے ذریعہ اس کا تعلق باہر کے سمندروں سے نہ ہوتا تو یہ پورے طور پر جھیل بن جاتی۔ ایک راستہ تو مغرب میں ہے جس سے بحر روم کا پانی بحر اٹلانٹک سے مل جاتا ہے۔ اس جگہ پر اسپین کے جنوبی سرے پر ایک بڑی چٹان واقع ہے جس کا نام جبرالٹر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس تنگ راستے کی محافظت کے لئے فطرت نے اس چوکیدار کو مقرر کر دیا ہے۔ غالباً دنیا میں جبرالٹر سے زیادہ مضبوط کوئی دوسرا قلعہ نہیں ہے۔ اس کی توپیں تمام جہازوں کو بحر روم کے اندر آنے اور باہر جانے سے روک سکتی ہیں۔

برطانیہ نے جبرالٹر کو ۱۷۰۴ء میں حاصل کیا اس پر قلعہ تعمیر کیا اور آج تک یہ برطانیہ کے قبضہ میں ہے۔ اس قلعہ اور برطانیہ کے بحری بیڑے کی وجہ سے برطانیہ کو جبرالٹر کی آبنائے کے راستے پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا اور اس ذریعہ سے بحر روم کے علاقہ میں اس کی تمام تجارت محفوظ ہو گئی اور آج ہندوستان جانے کا جو سیدھا راستہ ہے اس کا تحفظ بھی اسی مقام سے کیا جاتا ہے۔

بحر روم کے سب سے زیادہ جنوبی کنارے پر جہازوں کا ایک دوسرا دروازہ ہے یعنی نہر سویز
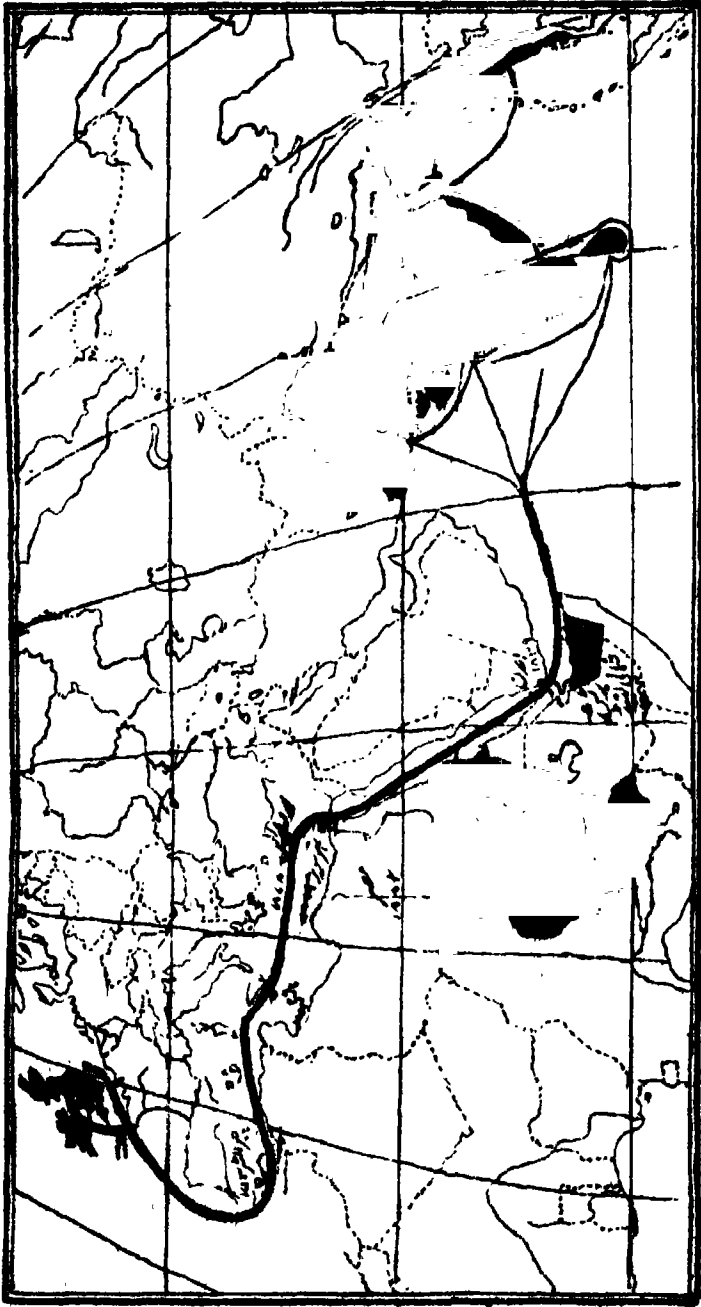
انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی راستے میں برطانوی مقبوضات

اس کے ذریعہ بحر احمر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہاں سے بحر ہند میں۔ جب تک نہر سویز نہیں بنی تھی یورپ کے جہازوں کو جنوبی افریقہ کا پورا چکر لگا کر بحر ہند میں پہنچنا پڑتا تھا۔ یہ راستہ بہت لانبا اور خطرناک تھا لیکن بہت سالوں تک اسی راستہ کو برطانیہ کے جہازوں کے لئے بہترین راستہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن برطانیہ کے تاجروں کو امید تھی کہ کسی زیادہ آسان راستہ کا پتہ لگ جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ایک فرانسیسی کمپنی نے سویز کی خاکنائے میں ایک نہر بنا کر تیار کر دی۔ یہ خیال تو نیا نہ تھا۔ تاجر مدت سے اس کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن ۱۸۶۹ء تک کوئی قوم اس خواب کو سچ کر کے نہ دکھلا سکی تھی۔

اس نئی نہر نے زمین کے اس تنگ ٹکڑے کو جو ایشیا اور افریقہ کو ملاتا تھا کاٹ کر دو جدا براعظموں میں تقسیم کر دیا۔ اس راستہ کے نکلنے کی وجہ سے مشرق بعید کے راستے میں ۵ ہزار میل کی مسافت کی کفایت ہو گئی۔ اس لئے برطانیہ کے لئے نہر سویز پر قبضہ حاصل کرنا نہایت زیادہ اہم ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء میں برطانیہ کی حکومت نے اس کمپنی سے اس کے حصے خرید لیے جس نے اس نہر کو بنایا تھا اور اس طرح برطانیہ کا بحر روم کے دونوں دروازوں پر قبضہ ہو گیا مغرب میں جبرالٹر کا قلعہ اور مشرق میں نہر سویز۔

یورپ کی دوسری تجارتی کمپنیوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ دوسری قوموں کے جہازوں کے لئے بھی نہر سویز کو کھلا رکھا جائے۔ اس لئے ۱۸۸۸ء میں کئی ملکوں نے اس معاہدہ پر دستخط کیے کہ نہر کو "جنگ اور امن دونوں زمانوں میں ہر قسم کے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے چاہے وہ تجارتی ہوں یا جنگی بلا قومی جھنڈوں کے امتیاز کے کھلا ہوا اور آزاد رکھا جائے گا" لیکن برطانیہ کو چونکہ نہر سویز کا قبضہ مل گیا تھا اس لئے اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ کوئی دوسرا ملک ہندوستان کو اس آسان راستے کو اس کے لئے بند نہ کر سکے گا۔

۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے سوچا کہ اگر نہر سویز پر اسے قبضہ رکھنا ہے تو اسے مصر پر بھی قبضہ

کرنا چاہیے اس لئے کہ نہر اس زمین میں کھودی گئی تھی جس کی مالک مصر کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ممکن ہے کوئی دوسری طاقتور قوم مصر پر قبضہ کرے اور ہندوستان کے اس مختصر راستے میں رکاوٹ ڈال دے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں برطانوی فوج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ مصریوں نے حملہ کا مقابلہ کیا لیکن وہ کمزور تھے اور برطانیہ مضبوط تھی اس لئے آخر میں مصر والوں نے اطاعت قبول کر لی۔

مصر کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن مصر کی تاریخ کی ایک ذرا سی جھلک دکھانا ضروری ہے۔ جب ہندوستان میں تہذیب کی ابتدا ہو رہی تھی اور یورپ میں آوارہ گرد وحشی قبائل گھومتے پھرتے تھے اس زمانہ میں مصر میں ایک نہایت طاقتور تہذیب نیل کی وادی میں موجود تھی۔ لیکن بہت صدیوں سے دنیا میں مصر کی اہمیت زائل ہو چکی تھی۔ یہ ایسے کسانوں کی سرزمین بن گئی تھی جو دریائے نیل کے کنارے بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس ملک میں لاکھوں آدمی آباد ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ گیہوں اور کپاس پیدا کرتے ہیں۔

گو مصر کوئی دولت مند ملک نہیں تھا لیکن برطانیہ نے اس پر قبضہ کرنے کے فوائد کو سمجھ لیا تھا۔ نہر سویز رکھنے کے علاوہ مصر گیہوں اور کپاس کی بڑی مقدار دوں کو بھی پیدا کرتا تھا جس کی برطانیہ کے لوگوں کو بڑی ضرورت تھی۔ پھر تیسری بات یہ تھی کہ مصر کے لوگ برطانوی مال کے خاصے اچھے گاہک تھے۔ آخر میں برطانیہ کے کاروباری لوگوں نے یہ سوچا کہ مصر میں روپیہ لگانے کا اچھا موقع ہے۔ ان چار وجوہ کی بنا پر بہت سے برطانیہ کے لوگ مصر کو برطانیہ کی سلطنت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی قبضہ کے زمانے میں (۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۲ء) مصر برطانیہ کے تجارتی مفاد کے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ریلوں، بنکوں اور فیکٹریوں کے سلسلہ میں برطانیہ کا ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ روپیہ مصر میں لگا ہوا ہے۔

۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ مگر یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے

کہ وہ برطانیہ کے ہندوستان یا سوڈان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ آج انگلستان کا قبضہ مصر پر نہیں ہے لیکن جس زمانہ میں چالیس سال تک برطانیہ کا قبضہ رہا اس نے اپنی تجارت کو خوب ترقی دے لی۔ چنانچہ آج بھی مصر برطانیہ سے تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں دوگنی اشیا خریدتا اور تین گنی اشیا فروخت کرتا ہے۔

وسطی اور جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے وسیع مقبوضات

برطانیہ کے جن مقبوضات کا ابھی تک ہم نے ذکر کیا ان کا رقبہ اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ابھی برطانیہ کے تمام مقبوضات کا بیان ختم نہیں ہوا ایک اور وسیع علاقہ ایسا ہے جو برطانوی سلطنت میں اٹھارویں صدی کے آخر میں شامل ہوا یعنی وسطی اور جنوبی افریقہ۔

افریقہ میں برطانوی سلطنت

یورپ کے ملکوں میں تنہا برطانیہ ہی ایسا ملک نہیں ہے جس کے قبضہ میں افریقہ کی زمین ہے۔ فرانس کے قبضہ میں اس براعظم کا ایک تہائی حصہ ہے۔ اٹلی اور پرتگال کی نوآبادیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کی بڑی بڑی نوآبادیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ تقریباً تمام ملک کو یورپ کے ملکوں نے آپس میں تقسیم کرلیا ہے۔

رسالہ جامعہ کی آئندہ اشاعتوں میں ہم تبلائیں گے کہ کس طرح اس براعظم کی زمین کو باہم تقسیم کیا گیا اور کن کن قوموں نے یہ کام انجام دیا۔

افریقہ کی سرزمین میں حیرت انگیز قدرتی وسائل دولت

افریقہ کو ایک عرصہ تک "تاریک براعظم" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یہ نام اس لحاظ سے صحیح تھا کہ اٹھارویں صدی تک اس براعظم کے اندرونی حالات سے لوگ ناواقف تھے۔ گھنے جنگل، وحشی درندے، ریگستان، اور سیاہ وحشی انسان۔ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے سفید نسل کے لوگ افریقہ کے اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہ ایک لامعلوم ملک تھا جس میں یورپ کے بہت سے لوگ جب کبھی گئے انھیں بیماری اور موت کا شکار بننا پڑا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں چند سفید نسل کے لوگ افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنے میں آخر کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی قیمتی چیزیں لے کر واپس آئے۔ ہاتھی دانت، قیمتی لکڑیاں، جواہرات اور ربڑ۔ انھوں نے تانبے، ٹین سونے اور چاندی کی بڑی معدنوں کا بھی پتہ دیا۔

۱۸۸۰ء کے بعد سے سفید نسل کے بہت زیادہ آدمیوں نے افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنا شروع کر دیا اور ان میں سے بہت سے دولت مند ہو گئے۔ انگریز، بلجیم کے رہنے والے، فرانسیسی اور جرمن سب افریقہ کے اندر گئے اور وہاں جا کر یا تو انھوں نے فارموں اور معدنوں کے قائم کرنے میں اپنے سرمایہ کو لگایا یا پھر ربڑ کے باغات کو تنظیم دی۔ ۱۸۸۰ء سے پہلے یورپ کے لوگ افریقہ کی گرم آب و ہوا میں کافی، کپاس، تاڑ کے درخت، گنے کی شکر کیلئے

اور تمباکو پیدا کرتے تھے، اور دوسرے براعظموں کو فروخت کرنے کے لیے جہازوں پر لاد کر روانہ کرتے رہتے تھے۔

سفید نسل کے آدمیوں میں برطانیہ کے لوگوں نے سب سے پہلے افریقہ کے اندرونی حالات کا پتہ لگایا اور اس ملک کے ساتھ تجارت کو ترقی دی۔ ہمت والے انگریزوں نے اپنی زندگی کا مطمح نظر سلطنت کو تعمیر کرنا قرار دے لیا تھا اور افریقہ کے تاریک ملک میں ان کے لئے بے انتہا جاذبیت تھی۔ وہ مصر میں اور اینگلو مصری سوڈان میں داخل ہو گئے تھے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مصر آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن اینگلو مصری سوڈان ابھی تک برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔ اس میں چراگاہیں اور کاشت کی زمینیں بہت اچھی پائی جاتی ہیں۔ دیسیوں کی سیاہ فام آبادی اونٹوں، گایوں بھیڑوں اور بکریوں کو پالتی ہے ۵۰ لاکھ سے زاید کسان اور گلہ بان دس لاکھ مربع میل میں بکھرے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ آب پاشی کے ذریعہ سے اینگلو مصری سوڈان برطانیہ کے لئے روز بروز زیادہ کپاس پیدا کرنے لگا ہے۔ مصر کے ساتھ اس علاقہ پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لیے بہت مفید تھا کیونکہ اس سے برطانیہ کے لئے ہندوستان کا راستہ محفوظ ہو جاتا تھا اور برطانیہ کو غذائی اشیا بھی فراہم کی جا سکتی تھیں۔ ۱۸۸۰ء کے بعد کچھ پچاس سالوں میں برطانیہ نے براعظم افریقہ کے تقریباً ایک تہائی حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

آج افریقہ میں برطانیہ کے رقبہ کی میزان ۴۰ لاکھ مربع میل ہوتی ہے۔ یہ رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبہ سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس کی وجہ سے برطانوی حکومت کو ایک مسلسل علاقہ تقریباً چار ہزار میل لانبا مصر کی جنوبی سرحد سے کیپ آف گڈ ہوپ تک مل جاتا ہے۔

نقشہ میں کیپ ٹاؤن کو ڈھونڈیے۔ جنوبی افریقہ کے اس جنوبی سرے پر برطانیہ کے تاجروں نے ۱۸۱۵ء میں ایک نوآبادی بسائی تھی یہاں ہالینڈ کے لوگوں کی ایک نوآبادی

۱۶۵۲ء سے تھی۔ ۱۸۲۰ء تک انگریز مہاجرین کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچ گئی تھی اور کیپ ٹاؤن کے مشرق میں آباد ہو گئی تھی۔

۱۸۳۶ء میں ہالینڈ کے لوگ شمال کی طرف آرینج اور وال دریاؤں کے قریب منتقل ہو گئے۔ ہالینڈ کے یہ لوگ جنھیں "بوئر" کہا جاتا ہے کسان تھے۔ جب برطانیہ کے لوگ براعظم کے جنوبی سرے پر بسنے لگے تو بوئر لوگ اور زیادہ شمال کی طرف بہتر زمینوں کی تلاش میں منتقل ہو گئے۔ غرضکہ اس طرح ۱۸۹۰ء میں اس علاقہ میں ہزاروں بوئر کسان آباد ہو گئے اور انھوں نے اپنی دو آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ ایک آرینج فری اسٹیٹ اور دوسری جمہوریت ٹرانسوال۔
۱۸۸۰ء میں برطانیہ کے تاجر جمہوریت ٹرانسوال کے شمال کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ایک سیسل روڈس بھی تھا جو نوآبادی بسانے اور نئے ملکوں کا حال دریافت کرنے میں بہت جری اور دلیر تھا۔ ۱۸۸۹ء میں روڈس نے ایک بڑی تجارتی کمپنی برٹش جنوبی افریقہ کمپنی کے نام سے بنائی۔ بہت سے انگریزوں نے اس کمپنی کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگایا جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں ملک تھا اور وہ اس پر حکومت کرتی تھی اسی طرح روڈس کی کمپنی نے بھی "روڈیشیا" کے علاقہ کو جس کا نام روڈس کے نام پر رکھا گیا تھا فتح کیا اور اس پر حکومت شروع کر دی۔ اب اس ملک میں ایک بڑا رقبہ شامل ہے جس کی وسعت تقریباً چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل ہے اور اس میں تقریباً بیس لاکھ دیسی لوگ اور ۴۴ ہزار سفید نسل کے آدمی آباد ہیں۔

جب برطانیہ کے لوگ پہلے پہل اس علاقہ میں گئے تو انھوں نے دیسی حکمراں لوبنگولا کو راضی کر لیا کہ وہ اس دستاویز پر دستخط کر دے جس کے ذریعہ اس ملک میں کانیں کھود نے کا پورا حق کمپنی کو مل جائے۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی کانیں کھودیں اور نوآبادیاں اور قلعے تعمیر کیے۔

جب لوبنگولا کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی رعایا کے حقوق غیروں کو حوالے کر دیے ہیں تو اس نے انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ اس کی رعایا کی زمین واپس دلانے میں ملکہ اس کی مدد کریں۔ اس کے جواب میں ایک خط آیا کہ روڈیشیا کے انگریزوں پر "بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ

سردار کے علاقہ میں صرف سونے کی کانیں کھودیں گے اور رعایا کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے نہ ان کے گاؤں اور مزروعہ کھیتوں اور مویشیوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعرض کریں گے۔"

لیکن ملکہ کے اس خط کے باوجود حالات کی نوعیت خراب ہوتی گئی۔ برطانیہ کے کان کے مالکوں نے دیسی آبادی کو اپنی کانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دیسیوں نے بغاوت کی اور معاہدہ کے دو سال بعد انگریزوں کی فوج روڈیشیا پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کے لئے روانہ کی گئی۔

اس جنگ میں بہت سے دیسی لوگ مارے گئے اور لوبنگولا کو مجبوراً اطاعت کرنا پڑی۔ اس کی رعایا نے مایوس ہو کر کہا "ہمارا ملک ہم سے چھن گیا ہماری مویشی چھن گئی ہماری آبادی منتشر ہو گئی۔ ہمارے پاس زندہ رہنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا .... ہم سفید آدمیوں کے غلام ہو گئے۔ ہماری حیثیت کچھ بھی باقی نہیں رہی اور ہمیں کسی قسم کے کوئی حقوق حاصل نہیں رہے۔"

سونے کی کانوں کا کھودنا جاری رہا پچیس سال میں یعنی ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۵ء تک روڈیشیا سے ۸۰ لاکھ آؤنس سونا نکالا گیا۔ اس ملک سے برطانوی تاجروں کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔

اسی زمانے میں ہالینڈ کے لوگوں کے علاقہ میں سونے اور ہیرے کی کانیں دریافت ہوئیں نقشہ میں کمبرلے کو ڈھونڈیے۔ بہت سالوں تک برطانیہ کے نوآبادی بسانے والے اور بوئر لوگ ساتھ ساتھ رہ رہے تھے لیکن ان کے تعلقات دوستانہ اور خوشگوار نہیں تھی جوں جوں زمانہ گذرتا گیا برطانیہ کے لوگوں اور بوئروں کی لڑائی بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۹۹ء میں کھلی جنگ شروع ہو گئی۔ برطانوی فوج بھیجی گئی اور تین سال کی طویل مدت گذرنے کے بعد بوئروں کو فتح کیا جا سکا۔ برطانوی حکومت نے تو اپنے تاجروں اور نوآبادی بسانے والوں کی حمایت کی لیکن برطانیہ کی رعایا نے بوئروں کی جنگ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو برطانیہ کے رہنماؤں اور بوئروں کے رہنماؤں نے مل کر ایک

نئی حکومت بنائی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ کا اتحاد قائم ہوا۔ اس میں برطانیہ اور ہالینڈ دونوں کی
نوآبادیاں شامل کی گئیں یعنی کیپ آف گڈ ہوپ، نٹال، دریائے آرنج کی نوآبادی اور ٹرانسوال
ایک بوئر جنرل اس نئی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنایا گیا اور تمام بڑے افسر بوئر بنائے گئے
اس وقت سے اس ملک کی آبادی اپنی مجلس قانون ساز تو خود منتخب کرتی ہے لیکن برطانیہ
اس کی حکومت پر ایک عام نگرانی کرتی رہتی ہے۔

جب جنوبی افریقہ میں یہ واقعات ہو رہے تھے برطانیہ وسطی افریقہ اور سوڈان کے
جنوب میں اور علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر رہی تھی۔ سنہ ۱۸۸۸ء میں کینیا کی نوآبادی کو برطانیہ
کے علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں اگونڈا کی نوآبادی کو۔ اس طرح برطانیہ کو شمال میں
مصر سے لے کر جنوب میں راس امید تک ایک علاقہ کو چھوڑ کر مسلسل رقبہ مل گیا۔ یہ چھوٹا ہوا علاقہ
خاصا بڑا تھا اور ٹانگا نائکا کے علاقے کے نام سے موسوم تھا (پہلے اس علاقہ کا نام جرمن مشرقی
افریقہ تھا) اس کو جرمنی کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور یہ جرمنی کی سلطنت میں شامل تھا لیکن جب
جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تو یہ علاقہ بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں سلطنت کی تعمیر کے جس کام کو سو سال تک جاری رکھا گیا تھا وہ آخر ختم ہوا
اور برطانیہ کو مصر سے راس امید تک مسلسل رقبہ مل گیا۔ اس کے علاقہ کے بہت سے حصوں میں
برطانیہ کے انجینیروں نے سونے، لوہے، تانبے، ٹین اور دوسری دھاتوں اور ہیروں کو کانوں
سے نکالنا شروع کر دیا۔ اونچی زمینوں پر برطانیہ کے گلہ بانوں نے بھیڑوں کو پالنا شروع کر دیا۔
نیچی زمینوں پر برطانیہ کے کسانوں نے گیہوں اور دوسری کھانے کی پیداواروں کو انگلستان
کے لاکھوں بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لئے پیدا کرنا شروع کر دیا۔ شمال میں یعنی مصر اور سوڈان میں
برطانیہ نے دریائے نیل پر آبپاشی کے لئے بند بنانا شروع کیا اور لاکھوں ایکڑ زرخیز زمین پر
کپاس کی کاشت شروع کر دی۔ کینیا اور اینگلو مصری سوڈان میں ہاتھی دانت کے لئے ہاتھیوں کا
شکار کیا گیا۔ نئے نئے گاؤں بلکہ بڑے بڑے قصبے افریقہ کے بہت سے مقامات میں پیدا

ہو گئے۔

اس وسیع علاقہ کی پیداواروں کو ساحل تک لانے کے لئے، اور ان کو جہازوں پر لادکر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو روانہ کرنے کے لئے نوآبادیاں بسانے والے انگریزوں نے ریل کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بڑی اسکیم بنائی یعنی یہ کہ افریقہ کے شمالی اور جنوبی حصہ کو قاہرہ سے لے کر راس امید تک ریل کے ذریعہ سے ملادیں۔ انھوں نے صرف اسکیم ہی نہیں بنائی بلکہ ریل کی تعمیر کے کام کو شروع بھی کردیا اور یہ کام اس قدر تیزی سے کیا جارہا ہے کہ ہزاروں میل لانبا ریل کا راستہ بن کر تیار ہوگیا ہے اور اس کا استعمال بھی شروع کردیا گیا ہے۔

ریل کے بنانے کا یہ کام بڑی زبردست ہمت اور ارادہ کا کام ہے۔ بعض جگہوں پر ریل کو ریگستان صحرا کی ناقابل اعتماد زمین کے مشرقی حصہ سے ہو کر گذرنا پڑا۔ بعض جگہوں میں مرکزی افریقہ کے نہایت گھنے جنگلوں میں جہاں خونخوار درندے اور وحشی سیاہ نسل کے لوگ آباد ہیں ریلیں بنانا پڑیں۔

غرضکہ یہ مختصر خاکہ ہے کہ کس طرح برطانیہ نے افریقہ کے ایک تہائی حصہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس وسیع علاقہ میں بہت مختلف قسم کی زمینیں مختلف قسم کی آب وہوائیں اور مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر ان سب کے حالات کو لکھا جائے تو اس کام کے لئے کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔

خلاصہ ـ ہم نے مختصر طور پر برطانیہ کی سلطنت کے خاص علاقوں یعنی ہندوستان، بحر روم کی زمینوں اور افریقہ کے مقبوضات کا مطالعہ کیا۔ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوتی تو ہم اور بھی دوسرے چھوٹے چھوٹے مقبوضات کا مطالعہ کرتے مثلاً ریاست ہائے ملایا کا وفاق، بورنیو کے حصے اور سمندروں میں بکھرے ہوئے، اور بہت سے جزیروں کا۔ چین میں بھی برطانیہ کے قبضہ میں بہت سی بندرگاہیں اور زمین کے حصے ہیں۔ جزائر غربی ہند میں بھی اس کے مقبوضات

ہیں۔ جزائر بہاما اور برمدا بھی اس کے قبضہ میں ہیں۔ وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بھی کچھ زمین اس کی نگرانی میں ہے۔

برطانوی سلطنت کے نقشہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جزائر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ برطانیہ نے ان پر اس لئے قبضہ کر رکھا ہے کہ ان پر برطانیہ کے لڑائی اور تجارت کے جہاز مرمت کوئلہ کھانے اور دوسری رسد حاصل کرنے کے لئے ٹھیر سکتے ہیں۔

برطانیہ کی سلطنت کو جس طرح تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی ہے اس کا اظہار حاشیہ کے نقشے سے کیا گیا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے پاس صرف پندرہ لاکھ مربع میل علاقہ تھا لیکن جنگ عظیم کے اختتام کے وقت برطانیہ کے پاس ایک کروڑ تیس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ تھا۔ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کا صرف دو فی صدی حصہ تھا لیکن ۱۹۱۹ء میں یہ رقبہ بڑھ کر ۲۵ فی صدی ہوگیا تھا۔ دنیا کے علاقہ کا ایک چوتھائی اور دنیا کی آبادی کا بھی تقریبًا ایک چوتھائی حصہ برطانیہ کے قبضہ اور نگرانی میں ہے۔
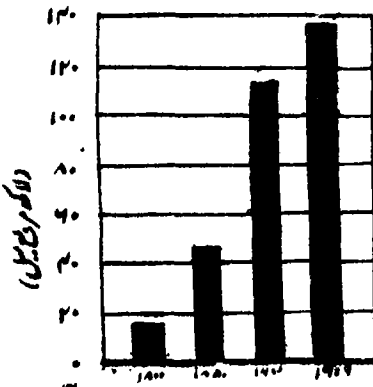
برطانوی سلطنت کی ۱۸۰۰ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان ترقی

اس کے بعد برطانیہ کی تجارت اور برطانیہ کی سلطنت میں جو قریبی تعلق ہے اسے آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر برطانیہ کی تجارت کی ترقی کے اعداد کا برطانیہ کی سلطنت کی ترقی کے اعداد سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانیہ کی تجارت اور سلطنت میں ساتھ ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ جن سالوں میں برطانیہ نئی نئی نوآبادیوں کو حاصل کر رہی تھی اور تمام دنیا میں اپنی سلطنت کو وسیع کر رہی تھی انہی سالوں میں خارجی دنیا کے ساتھ اس کی تجارت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد اس بات کا سمجھنا بھی سہل ہو جاتا ہے کہ برطانیہ نے اتنی بڑی سلطنت کو

کیوں تعبیر کیا۔ جب صنعتی انقلاب پھیلنا شروع ہوا اور مشینیں ایجاد کی گئیں روز بروز زیادہ تعداد میں فیکٹریاں کھڑی کی گئیں اور لوگوں نے روز بروز زیادہ کثیر تعداد میں مشینوں کی صنعت میں کام کرنا شروع کر دیا۔ فیکٹریوں اور کانوں، ریل کی لائنوں اور گوداموں کے مالک روز بروز زیادہ روپیہ پیدا کرنے لگے۔ اس روپیہ کا کیا کیا جائے۔ اس مسئلہ نے بھی اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس کا کچھ حصہ تو انگلستان میں نئی فیکٹریاں بنانے نئی مشین لگانے، نئے مزدوروں کو ملازم رکھنے، نئی ریلوں اور نئے بجلی کے پاور اسٹیشنوں کے بنانے پر صرف کیا گیا۔ اس کا بہت کچھ حصہ تعیشات پر بھی صرف کیا گیا۔

مگر پھر بھی بہت فاضل روپیہ بچ گیا۔ پھر اس کے علاوہ برطانیہ کے لوگوں کے پاس فیکٹریوں میں جتنا مال بنایا جاتا تھا اس سب کے خریدنے کے لئے روپیہ موجود نہیں تھا اس لئے فیکٹری کے مالکوں کو برطانیہ سے باہر اپنے مال کے بیچنے اور اپنے روپیہ کو کاروبار میں لگانے کے لئے نئی جگہوں کو ڈھونڈنا پڑا۔ وہ ہندوستان، کناڈا، مصر اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں، چین میں اور دور دراز آسٹریلیا میں گئے انھوں نے اپنے مال کے لئے تمام دنیا میں منڈیاں تلاش کیں۔

ان انگریزوں نے جن کے پاس فاضل روپیہ تھا فیصلہ کیا کہ دنیا کے بعید ترین حصوں میں فیکٹریاں بنائی جائیں کانیں کھودی جائیں اور تیل کے چشمے نکالے جائیں۔ انھوں نے سونے، ہیرے، تانبے اور ٹین کو کانوں سے نکالا۔ بھیڑوں، کپاس اور گیہوں کو پیدا کیا۔ کناڈا، آسٹریلیا اور ملایا کے علاقہ میں غرضکہ دنیا کے ہر حصہ میں انھوں نے اسی طرح کے کام کیے۔ چنانچہ اسی بنا پر جنگ عظیم سے پہلے سلطنت برطانیہ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور نوآبادیوں اور برطانیہ کے درمیان تجارت کو بڑا فروغ حاصل تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر ایڈی اسیروادم، ریڈر سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

(بہ سلسلہ سابق)

اشتراکی روس | روس کو اس مفہوم کے ساتھ تو قوم نہیں کہا جا سکتا جس مفہوم کے ساتھ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک قوم کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا اتحاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے روس میں کم سے کم دس علاقے ایسے تھے جو ایک دوسرے سے واضح طور پر نمایاں تھے اور جن میں کوئی قریبی تعلق نہیں پایا جاتا تھا اور ان میں مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں کے لوگ آباد تھے۔ آج ان کی جگہ ایک متحدہ حکومت (یونین) ہے اور سات ایسی جمہوریتیں ہیں جنھیں ایک حد تک خود مختاری ملی ہوئی ہے لیکن یہ سب کی سب ایک ہی پارٹی کی نگرانی میں ہیں۔

"قوموں کی کونسل" میں یونین کی سپریم کونسلوں، خود مختار جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں کی سوویٹ کے نمایندے شامل ہوتے ہیں۔ اس میں دس نمایندے تو یونین کی جمہوریت کے ہوتے ہیں اور پانچ پانچ خود مختار علاقوں کے۔

حق انتخاب بلا امتیاز مذہب، قومیت، قیام یا جنس کے تمام شہریوں کو جن کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے اور جو دولت آفریں محنت کے ذریعہ اپنی روزی کماتے ہیں یا سرخ فوج یا سرخ بیڑہ کے سپاہی اور ملاح یا ان کے کمانڈر ہیں ملا ہوا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ | ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد مختلف قوموں کے لوگوں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے مطابق امریکہ میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ ۶۴ ہزار ۲۰۷ سفید نسل کے لوگ تھے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۹۱ ہزار ۱۴۳ حبشی تھے

اور ۲۰ لاکھ [illegible] ہزار ۷۹۶ دوسری نسل کے لوگ۔ اس ملک میں حبشیوں کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کی پالیسیاں اختیار کی جا چکی ہیں کچھ دنوں تک حبشیوں کو ایک علیحدہ علاقہ میں رکھنے کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا پھر ان پر ہر جگہ دھونس جمانے کی پالیسی کو اختیار کیا گیا۔ لیکن یہ دونوں پالیسیاں ناکامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ البتہ جذب کرنے کی پالیسی کسی سے کم جہاں تک تمدنی طور پر جذب کرنے کا تعلق ہے ــــ آہستہ آہستہ کامیاب ہو رہی ہے۔ معاشرتی حیثیت سے دونوں گروہ بالکل جدا ہیں اگرچہ سفید نسل کے بعض لائق اعتبار مشاہدہ کرنے والوں کی یہ رائے ہے کہ حبشی لوگ آخر میں سفید نسل کے لوگوں میں بالکل جذب ہو جائیں گے۔ حبشیوں کو ووٹ کا حق تو دے دیا گیا ہے لیکن جنوب کی بہت سی ریاستوں نے ایسے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن سے حبشی اپنے ووٹ دینے کے حق سے عملاً محروم ہو گئے ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں معاشرتی زندگی میں حبشیوں سے علیحدہ رہنے کا رواج اب بھی زوروں پر ہے۔ حبشیوں کے مدرسے، یونیورسٹیاں، گرجا گھر علیحدہ ہوتے ہیں۔ ریلوے ٹرین، ٹریم کار، تھیٹر اور سینما میں ان کی جگہیں علیحدہ رکھی جاتی ہیں۔ معاشی میدان میں بھی حبشیوں کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا شخص نہیں ملتا تب آخر میں حبشی کو ملازم رکھا جاتا ہے اور سب سے پہلے اسے ہی برطرف کیا جاتا ہے غرضیکہ حبشیوں کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے اور جب تک اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نہ کیا جائے گا امریکہ کی قومیت کی بنیادیں بہت غیر استوار ثابت ہوں گی۔ دونوں نسلوں کے درمیان اتحادِ عمل اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں بڑے پیمانہ پر اختیاری طور پر کی جا رہی ہیں لیکن نہایت طویل زمانہ کے تعصبات کو آہستہ آہستہ ہی ختم کیا جا سکے گا۔

<u>یورپ میں قومی اقلیتیں</u> | یورپ میں صدیوں سے جہاں کہیں نام نہاد ملکی لوگوں کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد غیر قومیں آباد ہیں وہاں ان کی وجہ سے جنگیں برپا ہوتی ہیں۔ ان اقلیتوں کو "قومی گروہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پڑوس کی کسی نہ کسی ریاست کے ساتھ ان کی نسلی، تمدنی یا لسانی وابستگیاں ہوتی ہیں اور ان اقلیتوں کے آبائی ملک سیاسی حیثیت سے جس قدر طاقتور ہوتے ہیں

اسی حد تک یہ اقلیتیں بھی اپنا زور دکھاتی ہیں ۔ ان اقلیتوں کے پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں ۔ کہیں تو یہ ماضی بعید میں نقل سکونت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور بعد کی انفرادی نقل سکونت یا ملکی الحاق یا علاقوں کی دوسری تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ان میں سے بعض اقلیتیں تو اکثریت میں آہستہ آہستہ بالکل جذب ہو گئی ہیں لیکن بعض نے اپنی غیریت اور علیحدگی کو قائم اور برقرار رکھا ہے ۔ ان میں سے اکثر کا تعلق مخالف سیاسی گروہ سے رہا ہے یعنی ایسے گروہ سے جو کسی نہ کسی زمانہ میں مستبد حکمراں کی حیثیت سے برسر اقتدار رہ چکا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ عموماً دولتمند بھی ہوتی ہیں ۔ ان دو آخر الذکر اسباب کی بنا پر ان اقلیتوں کو ستانے اور لوٹنے کو جائز سمجھا جانے لگتا ہے اور قوم کی تمام محرومیوں اور مصیبتوں کی ذمہ داری ان کے سر منڈھ دی جاتی ہے ۔ یورپ میں جس قسم کا ریاستی نظام آج کل چل رہا ہے یعنی پارلیمنٹری جمہوری نظام اس میں ان اقلیتوں کو اپنی اکثریت بنانے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہے ۔

تمام یورپ میں قومی اقلیتوں کی تعداد تقریباً ۴ کروڑ ہے اور اس میں جرمن اقلیتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ میونخ کے معاہدہ سے پہلے چیکوسلوکیا کی آبادی میں جرمنوں کی تعداد ۲۵ فی صدی تھی ۔ دوسری خاص اقلیتیں یوکرنیوں، یہودیوں، کٹیالینیوں (اسپین میں) گمیار روئی ترکوں اور تاتاروں، بلغاریوں اور مقدونیوں، سفید روسیوں، پولوں، روسیوں، البانیوں، رومانیوں، سلووینوں، یونانیوں، کردوں، سلوووکوں، چیکوں اور مرادیوں، سرویوں، لیتھونینوں، اور ارمینیوں کی ہیں۔ جن ملکوں میں اقلیتیں خاص طور پر پائی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

پولینڈ (۳۲ فی صدی) چیکوسلوکیا (۱۹۳۸ء تک، ۲ فی صدی)، رومانیا (۳۰ فی صدی) لیتھونیا (۲۶ فی صدی) یوگوسلاویا اور البانیا (دونوں میں بائیس بائیس فی صدی) اسپین (۲۰،۵ فی صدی) ہنگری اور یونان (دونوں میں پندرہ پندرہ فی صدی) اور بلغاریا (۱۲ فی صدی) ۔

یورپ کی اقلیتوں کے مسائل زیادہ تر تمدنی، نسلی اور لسانی ہیں ۔ اقلیتوں کو اپنی زبان، تمدن، رواج اور روایات کے تحفظ کا بہت زیادہ خیال ہے ۔ سرکاری ملازمتوں میں اپنے حصہ کے تحفظ

کرنے کی کوشش ان ملکوں میں افلاس زدہ ہندوستان کی طرح نہیں کی جاتی۔ یورپ کے ملکوں کی اقلیتوں کی طرح ہندوستان کی اقلیتوں کا ربط و تعلق غیر ملکوں کی اقلیتوں کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔

اقلیتوں کے ساتھ سلوک کرنے میں یورپ کی ریاستوں نے ذیل میں درج کئے ہوئے طریقوں میں سے کسی نہ کسی کی پیروی کی ہے جو ریاستیں روشن خیال ہیں انھوں نے شروع کے طریقوں کو اختیار کیا ہے اور دوسری ریاستوں نے علی الترتیب بعد کے طریقوں کو:۔

(۱) اپنی نسلی، تمدنی اور اجتماعی زندگی کا انتظام کرنے کے لئے اقلیتوں کو خود مختار بنا دیا گیا ہے اور اس میں اسکولوں کے جداگانہ انتظام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۲) ریاست کی طرف سے اقلیتوں کے نسلی اور تمدنی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے خاص سرکاری ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر ڈنمارک کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے جاتے ہیں اس میں اقلیتوں کے بچوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینے کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ استادوں کا تعلق اس گروہ سے ہو جس گروہ سے کہ شاگردوں کا تعلق ہے۔

(۳) قوم کے تمام افراد کو ایک ہی طرح کے قوانین کا ماتحت بنایا جاتا ہے اور اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی کوئی خاص رعایت نہیں کی جاتی چنانچہ یوگوسلاویا میں نجی مدرسوں کا قائم کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اٹلی میں سرکاری مدرسوں کی حاضری کو لازمی قرار دیا گیا ہے ان دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے لئے مدرسوں کے جس نظام کو ایک زمانہ میں فروغ حاصل تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔

(۴) اقلیتوں کے مقابلہ میں دوسرے شہریوں کے ساتھ قانونی طور پر امتیازی سلوک کرنا۔ چنانچہ ہنگری میں ڈراما کے "ہیرو" ایسے ہی اشخاص کو بنایا جاتا ہے جن کے نام مگیاری ہوتے ہیں رومانیا میں جب کوئی ڈراما رومانیا کی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں دکھایا جاتا ہے تو اس پر ایک خاص ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ لیتھویا میں جہاں ابھی تک اقلیتوں کے ساتھ روشن خیالی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اب ایسے نئے قوانین بنائے گئے ہیں جن کا اثر اقلیتوں پر برا پڑتا ہے۔ اس قسم کے قوانین

دوسرے ملکوں میں بھی منظور کئے گئے ہیں اور ان سے جرمن لوگوں کو خاص طور پر نقصان پہنچا ہے۔

یورپ میں ایسی کئی اقلیتیں ہیں جن کے حقوق کا تحفظ بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدے یورپ کی ریاستوں مثلاً پولینڈ وغیرہ نے جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ابتدا میں اتحادی حکومتوں کے ساتھ انفرادی طور پر کیے تھے اور بعد میں یہی معاہدے انجمن اقوام کے ساتھ کئے گئے تھے یہ معاہدے زیادہ تر ان نئی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے تھے جو جنگ کے خاتمہ پر وجود میں آئی تھیں اس کے علاوہ ان چھوٹی ریاستوں کے ساتھ بھی یہ معاہدے کئے گئے تھے جن کے رقبے کو روس اور دوسری شکست خوردہ دول کا علاقہ چھین کر بڑھا دیا گیا تھا۔ نیز شکست خوردہ ریاستوں کے ساتھ بھی (جرمنی کو علیحدہ کرنے کے بعد) اسی طرح کے معاہدے کئے گئے تھے۔ اس وقت سترہ ایسے معاہدے اعلانات اور معاہدوں کے خاص ابواب موجود ہیں جن کے ذریعہ بین الاقوامی تحفظ کی ضمانت کی گئی ہے۔ اتحادی دول مثلاً فرانس اور اٹلی اور وہ ریاستیں جنھوں نے جنگ عظیم میں حصہ نہیں لیا تھا مثلاً ڈنمارک ان بین الاقوامی معاہدوں کے پابند نہیں ہیں۔ جن ملکوں میں ان معاہدوں پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ عموماً چھوٹی ریاستیں ہیں۔ بڑی ریاستیں بالکل مطلق العنان اور خود مختار ہیں۔ عام طور پر شمالی ریاستوں نے معاہدے کی شرائط کو جنوبی ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ایمان داری کے ساتھ پورا کیا ہے۔

ان تمام معاہدوں کے ذریعہ سے قومی اقلیتوں کو ایسے حقوق مل گئے ہیں جو ریاست کے اقتدار مطلق کے منافی نہیں ہیں یہ حقوق حسب ذیل ہیں:- (۱) قومیت کا حق یا تو ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا بعض شرائط کے ماتحت مستقل سکونت کی بنا پر مکمل تحفظ کے لئے اس حق کا حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ (۲) قانون کی نگاہ میں مساوات اور سول اور سیاسی حقوق میں بلا امتیاز نسل، زبان اور مذہب مساوات (۳) جان کا مکمل تحفظ اور ہر طرح کے مذہب یا اعتقاد کی پیروی کرنے کی مکمل آزادی بشرطیکہ اس آزادی سے انتظام عامہ اور اخلاق عامہ میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ (۴) نجی تبادلہ خیال، تجارت، مذہب، صحافت، یا کسی چیز کے طبع کرنے یا عام جلسوں اور عدالتوں کے سامنے جس زبان کو چاہیں اس کے بولنے کا حق (۵) سرکاری ملازمتوں تقرریوں اور اعزازات

یا پیشوں کو چلانے کے سلسلے میں کسی امتیازی سلوک کا نہ ہونا۔ (۶) اقلیتوں کی ایسی زبانوں میں جو سرکاری زبانیں نہیں ہیں تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں دینا (۷) خیراتی، مذہبی، معاشرتی ادارے، مدرسے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے، ان کے انتظام کرنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا حق اور اس کے ساتھ ان کے اندر اپنی زبان اور اپنے مذہب کو آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کا حق۔ (۸) ان ضلعوں میں جہاں اقلیتیں مجتمع ہوں ریاست کی آمدنی کا ایک مناسب حصہ تعلیمی مذہبی اور خیراتی اغراض کے لئے دینا۔

سیاسی اور معاشرتی اقلیتوں کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا ہے۔

ان حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار لیگ آف نیشنز کی کونسل بنائی گئی ہے۔ جب ان معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا ان کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہوتا ہے تو صرف کونسل کا ممبر کونسل کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔ کونسل کے ممبروں کے علاوہ دوسرے لوگ جن میں اقلیتیں بھی شامل ہیں عرضی کے ذریعہ کونسل تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں لیکن ان عرضیوں کی حیثیت محض ذرائع معلومات جیسی ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عرضیاں معقول طریقہ پر لکھی جائیں ان کے لکھنے والے ذمہ دار لوگ ہوں اور ان کا موضوع ایسا مسئلہ ہو جس کے بارے میں کوئی تازہ فیصلہ نہ سنایا جا چکا ہو اور جس ملک سے اقلیت کا تعلق ہے اس سے علیحدگی کا مطالبہ ان عرضیوں میں موجود نہ ہو لیگ کا سکریٹری جنرل ان شرائط کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ درخواست قابل غور ہے یا نہیں۔

جب اس سوال کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو درخواست کونسل کے پریسیڈنٹ کے پاس بھیجی جاتی ہے اور وہ معمولی معاملات میں کونسل کے دو ممبروں کے ساتھ اور استثنائی صورتوں میں کونسل کے چار ممبروں کے ساتھ جنھیں وہ خود نامزد کرتا ہے اس پر کارروائی شروع کرتا ہے۔ یہ کمیٹی یہ فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے یا متعلقہ ریاست سے غیر رسمی طور پر معاملہ طے کر سکتی ہے یا پوری کونسل کو اسی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ غیر رسمی طور پر معاملہ کو اقلیتوں

کے شعبہ کے سکریٹریٹ کے ذریعہ سے طے کرنا ایسا طریقہ ہے جس کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس سے بدنامی اور تشہیر نہیں ہوتی اور حکومت متعلقہ کے ساتھ تعلقات خراب نہیں ہوتے۔

جب عملی کارروائی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اس وقت پہلا کام یہ کیا جاتا ہے کہ شکایت کی نقل حکومت متعلقہ کو کیفیت لکھنے کے لئے روانہ کر دی جاتی ہے۔ حکومت متعلقہ یہ اعتراض کر سکتی ہے کہ یہ درخواست قابل غور نہیں ہے جب یہ صورت ہوتی ہے تو معاملہ جیسی ضرورت ہوتی ہے اسی کے مطابق کونسل کی تین یا پانچ کی کمیٹی کے فیصلہ کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ حکومت متعلقہ کو تین ہفتے اس بات کا جواب دینے کے لئے دیے جاتے ہیں کہ آیا وہ الزام کا کوئی جواب دے گی یا نہیں اور دو مہینے کی مہلت اصل جواب کے لئے دی جاتی ہے۔ عرضی گذاروں کو جواب کے دیکھنے یا جواب کا جواب الجواب دینے کا موقع نہیں دیا جاتا کیونکہ ایسا کرنے سے قومی اقتدار مطلق کے اصول کی نفی ہوتی ہے جھگڑا لیگ کونسل اور حکومت کے درمیان سمجھا جاتا ہے حکومت اور عرضی گذاروں کے درمیان نہیں۔

جن معاملات کے بارے میں قانونی مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے انھیں بین الاقوامی عدالت کے مستقل کورٹ کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور معاہدہ کے حدود کے اندر قانون اور واقعہ کے بارے میں عدالت کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے معاملات میں اس کے فیصلہ کی نوعیت محض مشورہ جیسی ہوتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ بہت کچھ اخلاقی اور قانونی وزن بھی شامل ہوتا ہے۔

کونسل کا کوئی ممبر اگر چاہے تو کونسل کے اس طریقہ کار کے علاوہ مستقل عدالت سے اس قسم کا فیصلہ بھی حاصل کر سکتا ہے جس کی پابندی اس ریاست کے لئے جس نے اقلیتوں کے معاہدہ پر دستخط کئے ہیں لازمی ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال کی ایک مثال وہ ہے جب جرمنی نے مستقل عدالت کے سامنے جنوری ۱۹۳۲ء میں پولینڈ کے معاملہ کو پیش کیا تھا جس میں بالائی سلیشیا کی اقلیتوں کے حدود کا مسئلہ زیر بحث تھا۔

کونسل کی اکثریت کی منظوری کے بغیر اقلیتوں کے کسی معاہدہ میں کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ

موجودہ طریقہ اس پرانے طریقہ سے بہتر ہے جس میں ایک طاقتور ریاست ایک شاکی اقلیت کی طرف داری کے سلسلہ میں مداخلت کیا کرتی تھی لیکن پھر بھی اس سے مسئلہ کا کوئی قابل اطمینان حل نہیں ہوتا لیگ کی اس کارروائی کی حیثیت ایک سیاسی پنچایتی فیصلہ کی سی ہوتی ہے اس لئے کونسل کا کوئی ممبر ریاست کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ریاست طاقتور ہوتی ہے آمادہ نہیں ہوتا۔ کونسل کے سامنے جو سینکڑوں درخواستیں پیش کی جاچکی ہیں ان میں سے صرف چند کے بارے میں قابل اطمینان فیصلہ دیا گیا ہے۔ اکثر کو محض ضابطہ کی عدم تکمیل کی بنا پر خارج کردیا گیا اور بہت سوں پر کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ لیگ کونسل چونکہ ایک سیاسی جماعت ہے اس لئے سیاسی مصلحتوں کا اسے بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معاملہ کا فیصلہ قانونی ماہروں اور جغرافیہ دانوں اور معاشیات کے ماہروں کے مشورے کے مطابق کیا جائے پھر لیگ کی کونسل مقامی زیادتیوں کا تدارک کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں بھی نہیں ہے۔ اس کی مشین بہت بھاری ہے اور مشکل سے حرکت میں آتی ہے۔ جب شکایت کرنے والی اقلیت مضبوط ہوتی ہے اس وقت تو کام کا یہ طریقہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن بعض ایسے معاملوں میں جہاں صورت حال بہت خراب تھی اور جن میں انفرادی طور پر ظلم و زیادتی کی گئی تھی ان کے تدارک کرنے میں لیگ ناکامیاب ثابت ہوئی۔ جن جگہوں میں فسادات اکثر اور سخت قسم کے ہوتے رہتے ہیں وہاں لیگ کے مقیم نمائندے کچھ عرصے کے لئے مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوگا کہ مخالف فریقوں کے نزدیک رہیں اور ان میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں ایک مستقل کمیشن مثلاً ابتدائی کمیشن بھی مقرر کیا جاسکتا ہے جو اقلیتوں کے ساتھ جو زیادتیاں کی جاتی ہیں ان سب پر غور کرے اور معاہدے کے ماتحت جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انھیں پورا کرے اس کام کے لئے ایک قانونی جماعت کے کامیاب ہونے کا امکان ایک سیاسی جماعت کے مقابلہ میں زیادہ ہے[۱]۔ اس لئے مستقل عدالت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ایک تنازع ای

---

[۱] یہ تجاویز سر گلبرٹ مرے کی ہیں

کیشن" بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جس میں ریاست اور اقلیت کے مساوی نمایندے متنازعہ فیہ مسائل پر اولین ٹریبونل کی حیثیت سے فیصلہ صادر کریں۔

اقلیتوں کو اپنی جگہ پر اپنے اس فرض کو محسوس کرنا چاہیے کہ ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ وفادار ہم قوم ہونے کی حیثیت سے جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہیں اور ان کو یہ ہرگز نہ چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو قومی اقلیتوں کی ان انجمنوں سے وابستہ کرلیں جو تمام یورپ کی خاص خاص اقلیتوں کو باہم منسلک کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں اور جن کی وجہ سے فرقہ وارانہ ذہنیت کا شعلہ ہمیشہ بھڑکتا رہتا ہے مثلاً ایسی انجمنیں جیسی کہ یورپ میں جرمنی نسل رکھنے والے گروہوں کی انجمن یا پولینڈ کے ان لوگوں کے لیے جو باہر رہ رہے ہیں وارسا کانگریس آف پولس یا ریگا کی اتحاد روسی کی کانگریس کیونکہ جیسا کہ آلوٹنگھن نے کہا ہے "کسی ریاست کے بنیادی مفادات کو اقلیتوں کے مسئلہ کے حل کرنے کے طریقہ سے نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔"

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ اپنی خراب ترین شکل میں موجود ہے اور اس کا کوئی پائدار حل ازروئے سیاست پر نظر نہیں آتا ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷۷۸ ہے۔ اس آبادی میں ۲۳ کروڑ ۹۱ لاکھ ۹۵ ہزار ۱۴۰ یعنی ۶۸ فی صدی ہندو ہیں ۷ کروڑ ۷۶ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۴۵ یعنی ۲۲ فی صدی مسلمان ہیں ۶۲ لاکھ ۹۶ ہزار ۷۶۳ یعنی ۱.۷۷ فی صدی عیسائی ہیں اور ۴۳ لاکھ ۳۵ ہزار ۷۷۱ سکھ ہیں۔ ۷۷ فی صدی آبادی خودمختار ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور ۲۳ فی صدی ہندوستانی ریاستوں میں۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ ہندو مذہب کیونکہ فی الاصل تبلیغی مذہب نہیں ہے اس لیے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی وجہ سے اسے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سکھ چونکہ صرف پنجاب تک محدود ہیں اس لیے ان کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے ہندوستانی عیسائیوں کی وجہ سے بھی کسی ناقابل حل شکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ان میں ہندو اور مسلمان دونوں اصل کے لوگ شامل ہیں اور ان کے سیاسی نقطہ نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے

خاص اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے جو تمام ہندوستان میں مختلف تناسب کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص خاص صوبوں میں مختلف مذہبوں کے پیروؤں کا جو تناسب پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جا سکے گا۔

صوبہ	مذہب	تعداد	فی صدی
بنگال	ہندو	۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۴۰۷	۴۳ فی صدی
	مسلم	۲ کروڑ ۷۴ لاکھ ۹۷ ہزار ۶۲۴	۵۵ "
مدراس	ہندو	۴ کروڑ ۱۲ لاکھ ۷۷ ہزار ۳۷۰	۸۹ "
	مسلم	۳۳ لاکھ ۵ ہزار ۹۳۷	۷ "
	عیسائی	۱۷ لاکھ ۷۴ ہزار ۲۷۶	۳ "
بمبئی	ہندو		۷۶ "
	مسلم		۲۰ "
پنجاب	ہندو	۶۳ لاکھ ۲۸ ہزار ۵۸۸	۲۷ "
	مسلم	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار ۴۶۰	۵۷ "
	سکھ	۴۰ لاکھ ۷۲ ہزار	۱۳ "
سرحدی صوبہ	ہندو	ایک لاکھ ۴۲ ہزار ۹۷۷	
	مسلم	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار ۳۰۳	
سی۔ پی		زیادہ تر ہندو	
سندھ	مسلم		۷۳ "

ہندو زیادہ تر جنوب اور وسط ہند میں چھائے ہوئے ہیں۔ مدراس کے صوبہ میں یہ ۸۸ فی صدی سے کم نہیں ہیں آسام، بہار اور اڑیسہ، یو پی، وسط ہند کے علاقوں راجپوتانہ اور بمبئی میں ان کی اکثریت ہے۔ سرحدی صوبہ بلوچستان اور کشمیر پر مسلمانوں کا اجارہ ہے اور پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں ان کی خاصی بڑی اکثریت ہے آسام میں ان کی تعداد ۳۲ فی صدی یو۔ پی میں ۱۵ فی صدی

اور حیدر آباد میں ۱۱ فی صدی ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے بھی ہندوستان بہت زیادہ منقسم ہے بولی کی زبانوں کو چھوڑنے کے بعد بھی ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں پائی جاتی ہیں لیکن ہندوستانی جو ہندی سے علیحدہ ایک چیز ہے ہندوستان کی مشترک زبان بنتی جارہی ہے۔

معاشرتی رواجات۔ مراسم اور طریقہ ہائے زندگی کے لحاظ سے بھی بہت گہرے فرق پائے جاتے ہیں۔ مسلمان گوشت کھاتے ہیں ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نباتی غذا کھاتی ہے۔ مسلمانوں میں خاصی بڑی حد تک مساوات پائی جاتی ہے لیکن ہندو ذاتوں میں منقسم ہیں۔ ذات اس حد تک تو ختم ہوگئی ہے کہ مختلف بڑی ذاتوں کے درمیان معاشرتی تعلقات میں رواداری پیدا ہوگئی ہے لیکن ابھی تک باہم مل کر کھانا کھانے کا رواج عام نہیں ہوا ہے اور باہمی شادی تو ضمنی ذاتوں کے درمیان بھی نہیں ہوتی۔ ہندوؤں میں کم سے کم جنوب کے ہندوؤں میں پردے کا رواج نہیں ہے لیکن مسلمان ملک کے بڑے حصہ میں پردے کے پابند ہیں۔ لباس اور بالوں کے کتروانے کے سلسلہ میں بھی ہندوؤں کا اور مسلمانوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا روحانی وطن مکہ ہے اور اس حد تک ان کی وابستگی ہندوستان کے ساتھ زیادہ گہری نہیں ہے ایسے مسلمان کثرت سے ملتے ہیں جو افریقہ' مصر عرب یا ایران کے مسلمانوں کے ساتھ تو بہت جلد گھل مل جاتے ہیں لیکن اپنے ہم قوم غیر مسلم ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ اتحاد اسلام کی تحریک بھی مسلمانوں کے لئے ایک خاصی کشش رکھتی ہے۔

مذہبی معتقدات اور مراسم کا جہاں تک تعلق ہے مسلمان توحید پرست ہیں اور ایک خدا اور ایک پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے برعکس ہندو مذہب میں جہاں ایک طرف ادنیٰ ترین حیوان پرستی اور معبودوں کی کثرت کی گنجائش ہے وہاں دوسری طرف ہمہ اوست کا فلسفہ بھی موجود ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کو اگر ایک نقطہ نگاہ سے اس کی قوت سمجھا جا سکتا ہے تو دوسرے

نقطہ نگاہ سے یہ اس کی بڑی کمزوری بھی ہے۔ چونکہ ہندو مذہب میں مختلف بلکہ متضاد مذہبی خیالات و مراسم رکھنے والے لوگوں کی گنجائش ہے اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف اور تحدید کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ہمہ گیری نے اس کی شکل کو غیر متعین کر دیا ہے۔ بہر صورت یہ اسلام کے برابر صاف اور واضح نہیں ہے۔ چونکہ ہندو ایک ہمہ گیر مذہب کے ماننے والے ہیں اس لئے ان کے واسطے مذہبی رواداری آسان ہے اگرچہ بعض موقعوں پر یہ رواداری مذہبی بیگانگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ہندوؤں میں مذہب کے ماننے والے جو بہترین لوگ ہیں وہ غور و فکر میں منہمک رہتے ہیں اور ایثار اور خود گذاری کی ان منزلوں پر پہنچے ہوئے ہیں جن تک دوسرے مذہب کے پیروؤں کی مشکل سے رسائی ہو سکتی ہے۔ عام طور پر ہندو نرم اور منکسر المزاج صابر اور غیر تشدد پسند ہوتے ہیں اور ناانصافی کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتے ہیں اور بعض وقت ان کا رویہ جارحانہ اور بے صبری پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تبلیغ کا جذبہ مسلمانوں میں ہندوؤں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہندو مسلمانوں سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک عرصہ تک اپنے آپ کو مغربی اثر اور تعلیم سے علیحدہ رکھا۔ پردہ کے رواج کی وجہ سے مسلم عورتوں میں بھی تعلیم کم پھیل سکی ہے۔ کتابی علم میں ہندوؤں نے اپنے آپ کو زیادہ موزوں ثابت کیا ہے۔

معاشی مفاد میں ہندو مسلمانوں میں زیادہ واضح فرق نہیں پایا جاتا۔ ہندو بھی کسان کاشتکار زمیندار مزدور اور تاجر ہیں اور مسلمان بھی۔ شہروں میں مسلمانوں کا خاصا بڑا تناسب تجارت میں مصروف ہے۔ مہارت کے کاموں میں مثلاً صنعت اور دستکاری میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دیہی علاقوں میں دونوں فرقوں کے لوگ غریب ہیں۔ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی معمولی اکثریت ہے وہاں بیان کیا جاتا ہے کہ دولت کے نقطہ نگاہ سے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے ہیں کیونکہ بہت سے زمیندار اور ساہوکار ہندو ہیں۔

مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پورے طور پر باہمی یگانگت پیدا نہیں ہوئی۔ خود غرض سیاسی لیڈران اختلافات کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ ایک مشہور سیاسی لیڈر نے ابھی حال میں کہا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق اس جماعت سے نہیں ہے جس سے دوسرے ہندوستانیوں کا تعلق ہے۔ ان کی بالکل ایک جداگانہ قوم ہے اور انھیں فرقہ کی جگہ قوم کے نام سے موسوم کرنا چاہیئے اور انھیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ملنا چاہیئے"۔ ایک اور مسلمان نے یہ کہا ہے کہ حیدرآباد کے لوگ بجائے خود ایک قوم ہیں ان کا بادشاہ اور ان کا قومی جھنڈا بالکل الگ ہے۔ یہ بیانات نہ صرف واقعہ کے اعتبار سے غلط ہیں بلکہ ان سے نہایت خراب اثر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

پھر ہندوؤں کے درمیان بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ۶ کروڑ اشخاص کم از کم جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے باقاعدہ طور پر ہندوؤں کے زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔ سورن ہندوؤں میں بھی برہمنوں اور غیر برہمنوں، مرہٹوں اور غیر مرہٹوں کے اختلافات پایا جاتا ہے۔

علاج ہمارے سامنے جو حل طلب مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح ان متصادم مفادوں اور گروہوں کو متحد کیا جائے اور ان میں قومی اتحاد اور ایک جہتی کی روح پھونکی جائے۔ ہندوستان نے ابھی تک یہ سبق نہیں سیکھا ہے کہ "اتحاد میں ہی طاقت ہے" جب تک ہندوستان میں خانہ جنگی جاری رہے گی اس وقت تک باہر کے لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ پہلا سبق جسے ہندوستان کو پڑھنا چاہیئے وہ باہمی ہمدردی، باہمی احترام اور ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کے سمجھنے کا سبق ہے۔ اس رواداری کے ساتھ قلب کی اس وسعت کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے جو دوسروں کی اچھائی کو دیکھ سکتی اور اس کی قدر کر سکتی ہے۔ اختلافات کے معنی لازمی طور پر کم تری یا برتری کے نہیں ہوتے۔ ہر مخلص ہندوستانی محب وطن کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے "ضروری باتوں میں اتحاد، مشتبہ باتوں میں آزادی اور سب باتوں میں فیاضی"۔

جب اس مناسب روح اور رویہ کا عام طور پر رواج ہو جائے گا تو پھر مجالس قانون ساز اور

ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی کے سوال کی اہمیت زائل ہو جائے گی۔ اگر فرقوں کے تعلقات میں پوری دوستی اور صاف دلی ہو تو چند نشستوں یا عہدوں کی کمی یا زیادتی کی طرف کوئی شخص بھی کبھی متوجہ نہیں ہوگا۔

علیحدگی اور متوازی اداروں کے قائم کرنے کی پالیسی بہت ناپسندیدہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف فرقے اس قدر ملے جلے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان کو معاشرتی، تمدنی یا جغرافی طور پر علیحدہ کرنا نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔ ہم کو اپنی تمام کوششوں کو اس عقیدہ کے ساتھ شروع کرنا چاہیے کہ ہم باہمی سمجھوتہ اور رواداری ہم آہنگی اور اتحاد کے ساتھ ضرور رہ سکتے ہیں۔ ہم کو اپنا نصب العین یہ بنانا چاہیے کہ "ہر فرقہ کو معقول حدود کے اندر رہتے ہوئے معاشرتی تمدنی اور مذہبی آزادی اور تمام فرقوں کے لئے ایک واحد ریاست۔" ہم نہ ہندو راج چاہتے ہیں نہ مسلم راج نہ برطانوی راج نہ ان کا کسی قسم کا ایک مشترکہ راج بلکہ ہم ہندوستانی راج چاہتے ہیں۔ اگر اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور انھیں اپنا طرفدار بنانا منظور ہے تو پہلی بات جو ہمیں کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ان کے دل میں اکثریت کے خلوص اور نیک نیتی کی طرف سے اعتماد کی کیفیت پیدا کی جائے خوف، شبہ اور بے اعتمادی کے تمام اسباب کو دور کرنا چاہیے۔ دستور میں بنیادی حقوق کو رکھنے اور عدالتوں کی طرف سے ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرانے سے یقیناً صحیح سمت میں قدم اٹھایا جاسکتا ہے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس وقت بنیادی حقوق کا مسئلہ موجود ہے۔ حال میں بنیادی حقوق کے بارے میں جو قرارداد اس نے منظور کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

"مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم خط کا تحفظ کیا جائے گا

"کسی شخص کو اس کے مذہب، ذات عقیدہ یا جنس کی وجہ سے، سرکاری ملازمت یا قوت داعزاز کے کسی عہدہ کے حاصل کرنے یا کسی تجارت اور پیشہ کو اختیار کرنے کے لئے نااہل نہیں سمجھا جائے گا۔

"تمام مذاہب کے بارے میں ریاست غیر جانبدار رہے گی۔

رائے دینے کا حق تمام بالغ آبادی کو ملا ہوا ہوگا۔

"ہر شہری کو آزادی ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں جہاں چاہے نقل و حرکت کرے، جس حصہ میں چاہے سکونت اختیار کرے، جائداد پیدا کرے جس تجارت اور پیشہ کو چاہے اختیار کرے ہندوستان کے ہر حصہ میں تحفظ یا قانونی کارروائی کے وقت اس کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔"

ان میں سے بہت سے حقوق وہ ہیں جو یورپ کی اقلیتوں کے معاہدوں میں موجود ہیں ان سے مذہبی اعتقاد و مراسم کی آزادی کی ضمانت، تمدن، زبان اور رسم الخط کا تحفظ، سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے مساوی مواقع، سرکاری مذہب کا عدم قیام، سب بالغوں کو حق رائے دہی اور تمام ہندوستان میں نقل و حرکت اور سکونت کی آزادی مل جاتی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان بنیادی حقوق میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے حق کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ مفاہمت کے پیش نظر تبدیل مذہب کی ناجائز کوششوں کو بند کرنا بہت ضروری ہے ———————

———————

——————— تبدیل

مذہب کی ان کوششوں کو نہ اخلاقی وجوہ کی بنا پر جائز سمجھا جا سکتا ہے نہ روحانی وجوہ کی بنا پر لیکن جو لوگ سچے دل سے مذہب کو بدلنا چاہیں ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ تبدیل مذہب کی جائز اور ناجائز صورتوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔[1] ہم میں جو بہترین

———————

[1] اس مضمون میں جن خیالات کا اب تک اظہار کیا گیا ہے یا جن کا آئندہ اظہار کیا جائے گا ان سے مدیر کا اتفاق خیال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں اور ان کے لئے مضمون نگار خود جواب دہ ہیں (مدیر)

لوگ ہیں ان کے کاموں میں بھی بعض اوقات اچھے اور برے دونوں قسم کے محرکات عمل موجود ہوتے ہیں۔ جب صورت یہ ہے تو جو لوگ مختلف محرکوں اور مصلحتوں کے پیش نظر اپنا مذہب بدلتے ہیں ان کی حالت پر بھی ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ بہرحال جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب پر قانون کی کوئی نگرانی قائم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ رائے عامہ اور مذہبوں کے باہمی سمجھوتہ سے اس کام کو کیا جاسکتا ہے۔ ہر مذہبی فرقہ کو ذاتی طور پر خود اپنے اوپر یہ پابندی عاید کر لینا چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کو جو محض خودغرضی کی بنا پر ان کے حلقہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں اپنے مذہب میں داخل نہ کریں گے۔ غرضکہ اس طرح ایک مناسب رائے عامہ کو پیدا کرنا چاہیئے جو ہر قسم کی ناجایز تبدیلی مذہب کا تدارک کر سکے۔ مہاتما گاندھی کا وہ رویہ صحیح نہیں تھا جب انھوں نے جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب میں فرق کرنے سے انکار کر کے یہ کہا تھا کہ میں برسر اقتدار آگیا اور عیسائیوں نے اپنے آپ کو صرف معاشرتی اور انسانی ہمدردی کے کاموں تک محدود نہیں رکھا تو میں ان کا بوریا بدھنا بند کرا کر انھیں ہندوستان سے نکال دوں گا۔

تبدیلی مذہب کے کام میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے بھی جو ہندوستان کی سیاسی نظام میں نہایت مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکے ہیں بہت تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ جب دو سال ہوئے ڈاکٹر امبیدکر نے ہندو مذہب کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا تھا اور دبی ہوئی ذاتوں کے لوگوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ من حیثیت الجماعت کسی دوسرے مذہب کو قبول کر لیں تو ملک میں یہ مکروہ منظر دکھائی دیا تھا کہ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے رہنماؤں نے اپنی مال کو منڈی میں بیچنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر امبیدکر عقلمند آدمی تھے انھوں نے اظہار تعلق تو سب کے ساتھ کیا لیکن کسی کے ساتھ مستقل رشتہ قبول نہیں کیا۔ جب تک ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی باقی رہے گی تبدیلی مذہب کی کوششیں بھی جاری رہیں گی۔ مسلم لیگ کے جوش سے ہندو مہاسبھا کا جوش بھی بڑھا اور آریہ سماج کا تبدیلی مذہب کا جذبہ تو بھڑک اٹھا۔ ہندو مذہب کی مشکلات سے عیسائیوں، سکھوں یا مسلمانوں کو کبھی ناجایز فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔

بنیادی حقوق کے اس کانگریسی رزولیوشن میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ایک دفعہ صوبہ پرستی کے خلاف بھی موجود ہے لیکن اس سے مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ جو لوگ سکونت اختیار کر چکے ہیں انھیں سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا حق بھی دے دیا جائے۔ صوبہ پرستی کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی سے بھی زیادہ ہندوستان کے اتحاد کی دشمن ثابت ہوگی۔ اگر اس کا تدارک جلد نہیں کیا گیا تو اس سے بے انتہا نقصان پہنچے گا۔ "بہار بہاریوں کے لئے ہے" "اندھرا دیش اندھرا والوں کے لئے ہے"۔ ایک خاص حد تک تو یہ نعرے جائز سمجھے جا سکتے ہیں لیکن اگر اس حد سے آگے بھی ان کو بڑھایا گیا تو اس سے ہندوستانی قومیت کا تخیل کمزور ہو جائے گا۔

بنیادی حقوق اس میں شک نہیں بہت قیمتی چیز ہیں لیکن ان کے اثر اور فایدے کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھیں کس قدر ایمانداری اور پابندی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یورپ کی قومی اقلیتوں کے بارے میں ایک مصنف نے حال میں بالکل ٹھیک لکھا ہے "ہو سکتا ہے کہ جہاں قانونی مساوات موجود ہو وہاں حقیقتہً عدم مساوات پائی جائے" اسی مصنف کا قول ہے کہ یوگوسلاویا نے ڈکٹیٹر شپ کے قائم ہو جانے کے بعد سے اپنے معاہدے کی پابندیوں کو نہایت کھلے بندوں پامال کیا ہے اس نے اقلیتوں کے نجی مدرسوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور اقلیتوں کے پریس پر نہایت سخت سنسر شپ قائم کر دی ہے۔ اجتماع کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اقلیتوں کے خود مختار ادارے بند کر دئے گئے ہیں۔

مجالس قانون ساز اور سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کی نمایندگی کا مسئلہ پچھلے کچھ دنوں سے بہت نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا انتظام سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو رفارم کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کو وسیع اور گہرا کر دیا گیا ہے اور ان کے چھوڑے جانے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لارڈ منٹو نے تو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اقلیتوں کے حق کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا لیکن ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے ذریعے نہ صرف قانونی اقلیتیں بنائی گئی ہیں بلکہ قانونی اکثریتیں بھی بنا دی گئی ہیں سرکاری ملازمتوں میں بھی فرقہ پرستی کو داخل کر دیا گیا

اس حقیقت کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ملک بہت سے بند گروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے تنگ گروہ بندیوں کو ترقی حاصل ہوتی ہے پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بحث طلب رہے گی کہ آیا اس سے خود اقلیتوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ میرے ایک طالب علم نے فرقوں کے حساب سے پنجاب کی آبادی کی تقسیم پر جو گلی تحقیقات کی ہے اس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے بغیر بھی اتنی ہی نشستیں مل سکتی ہیں جتنی اب انہیں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی صورت میں مل رہی ہیں اور اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب سے چنے جائیں گے انہیں سب فرقوں کا اعتماد حاصل ہوگا۔ مختلف فرقوں کی نشستیں آج کل جس طرح مقرر کی جاتی ہیں اس میں صوبہ وار مختلف مذہبی فرقوں کی مجموعی تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ان مختلف انتخابی اضلاع کا ہوشیاری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جہاں سے مختلف فرقوں کے نمائندوں کے منتخب ہونے کی معقول وجوہ کی بنا پر امید کی جاسکتی ہے اگر اس مطالعہ سے یہ ظاہر ہو کہ اقلیتیں بغیر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اختیار کیے ہوئے اپنے تناسب کو قائم رکھ سکیں گی تو اس سے مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی تحریک کو بہت تقویت پہنچے گی یا کم سے کم تحفظ نشست کے ساتھ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے قائم ہونے کا امکان پیدا ہو سکے گا۔

کیمونل اوارڈ ہندوؤں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہندوؤں کو ووٹ دیں اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو ووٹ دیں۔ اس سے ان فرقوں کے ترقی پسند لوگوں کے ساتھ جو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قومی اور جمہوری اصول کے خلاف سمجھتے ہیں اور جو ایک عام حلقہ انتخاب میں ووٹ دینا چاہتے ہیں۔ سخت ناانصافی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی ترقی میں ارکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہ راستے کا ایک بڑا روڑا ہیں اور اگر ہندوستان کو آزاد متحد اور جمہوریت پسند خودمختار

قوم بننا ہے تو ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔

اگر امیدواروں کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر جاری رکھا جائے تب بھی مجلس قانون ساز میں پہنچنے کے بعد انھیں اس بات کی آزادی حاصل ہونا چاہیئے کہ جس پارٹی کے ذریعہ وہ اپنی رائے میں سمجھیں کہ ملک کے بہترین مفاد کو ترقی حاصل ہو سکتی ہے اس میں وہ شامل ہو سکیں عیسائیوں کے تمام ان نمایندوں سے جن کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوا ہے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ہر مسئلہ پر متحدہ طور پر ووٹ دیا کریں غیر ضروری ہے۔ تمام دوسرے فرقوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ترقی پسند، اعتدال پسند، قدامت پسند، کمیونسٹ، سوشلسٹ اور انفرادیت پسند لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو طبعی طور پر دوسرے فرقوں کے ان لوگوں کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ تمام مسلمانوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر پارٹی کے نظام کو جو جمہوریت کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے صحیح طریقہ پر ترقی کرنا ہے تو اسے سیاسی اور معاشی پروگرام پالیسی اور طریقہ کار کی بنیاد پر ترقی کرنا چاہیئے نہ کہ پیدائش اور مذہبی وابستگی کے اتفاقی حالات کی بنیاد پر۔

یہ بات بہت خوش آیند ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ پر پوری توجہ کر رہی ہے۔ کانگریسی صوبوں کے وزیروں کے لئے ایک کانگریسی ہدایت نامہ تیار کیا جا رہا ہے اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وزرا کو اس کے ذریعہ یہ ہدایت کی جائے گی کہ وہ اقلیتوں کو ملازمتوں میں مناسب نمایندگی دیں ان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیمی سہولتوں کو وسیع کریں اور اقلیتوں کے تمدن زبان اور مذہب کی حفاظت کریں۔ گاؤکشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کے سوال پر رواج کا احترام کیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے ابھی حال میں یہ اعلان کیا ہے کہ اتفاق رائے نہ ہونے کی صورت میں وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کسی عمارت پر ترنگا جھنڈا نصب کیا جائے۔ جہاں تک بندے ماترم کا تعلق ہے ابھی حال میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف ابتدائی دو بندوں کو جو بے ضرر معلوم ہوتے ہیں اور جن میں کسی ہندو دیوی یا دیوتا کو مخاطب نہیں کیا

گیا ہے قائم رکھا جائے۔

اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ہمارا خیال ہے کہ کانگریسی حلقوں میں موجودہ رجحان مصالحت اور مفاہمت کی طرف ہے۔ اقلیتیں بھی اگر اس کا جواب ایسا ہی دیں گی تو بہت اچھا ہوگا۔ اگر اکثریت نے بہت سی صورتوں میں سرکاری ملازمتوں پر اجارہ قائم کر کے اور اقلیتوں پر نازیبا پابندیاں عاید کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو اقلیتوں نے بھی موقع ملنے پر کچھ ان سے زیادہ بہتر کام نہیں کیا ہے۔

ہندوستان کے مختلف فرقوں میں سرکاری ملازمتوں میں اپنا تناسب بڑھانے کے لئے اکثر جھگڑا ہوتا رہا ہے کچھ سالوں سے حکومت ہند اس پالیسی پر عمل کر رہی ہے کہ جو ملازمتیں اس کی نگرانی میں ہیں ان میں سے ۲۵ فی صدی مسلمانوں کو دی جائیں اور ۳/۲ ۸ فی صدی دوسری اقلیتوں کو۔ ملازمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ سے بلاشبہ خود غرض نمائندوں اور پارٹیوں کو ترقی پانے کا موقع مل رہا ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ سرکاری عہدوں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور بھتوں کو کم کر دیا جائے۔ مالی مشکل کی وجہ سے یہ کام اس وقت بھی شروع ہو گیا ہے اور یہ بات نہ صرف محصول گذار کے لئے ایک برکت ثابت ہوگی بلکہ قومی تحریک کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اہلیت کے کم ترین معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب فرقوں کو مختلف سرکاری ملازمتوں میں خدمت کرنے کا مساوی موقع دینا چاہیے۔ ابتدا میں تقرر کرتے وقت فرقہ وارانہ تفریق کا خیال رکھا جا سکتا ہے لیکن ترقی میں صرف اہلیت کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ نااہل افسروں سے محفوظ کیے جانے کا حق ہر شہری کو ملنا چاہیے وہ چند آدمیوں کے اس حق سے زیادہ وقیع ہے کہ انھیں اپنی ملازمت کے زینہ کی آخری سیڑھی پر صرف اس لئے پہنچنے دیا جائے کہ ان کا تعلق اس فرقہ یا اس فرقہ سے ہے۔ فرقہ داری کی جو برائیاں ہیں انھیں رشوت ستانی، بد اطواری اور سرپرستی کے مواقع کو ختم کر کے بھی کم کیا جا سکتا ہے۔

فرقہ وارانہ تعلقات کے بہتر بنانے کی دوسری تجویزوں کو بھی ذیل میں مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) صوبہ کی حکومتوں اور مقامی حکومتوں کو جہاں تک ممکن ہے مناسب انتظامی کارروائیوں اور پالیسیوں کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیئے کیونکہ اقلیتوں کے تحفظ جیسے معاملہ میں انتظامی کارروائیاں، قانون سازی اور عدالتوں کے فیصلے کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ بہترین قوانین کو بھی طریقہ انتظام میں بے ایمانی سے کام لے کر ناکام بنایا جاسکتا ہے محاصل کے بار کو مساوی طور پر تقسیم کرنا چاہیئے۔ مختلف قسم کے ٹیکس کو لگاتے وقت اس بات کی طرف سے احتیاط برتنا چاہیئے کہ کسی خاص تجارت یا پیشہ کو جس میں کسی ایک فرقہ کے لوگوں کی اکثریت ہو کوئی امتیازی نقصان نہ پہنچ جائے۔ کانگریس گاؤں کی پنچایتوں کو زندہ کرکے اور انہیں مقامی کاموں کے لئے ایسے محاصل کو حوالہ کرکے جو مقامی طور پر اکھٹے کئے جاتے ہیں ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی ختم ہو جائے گی جب ایک ہی گاؤں کے وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اپنے اوپر آپ حکومت کرنے لگیں گے اور حکومت کے کام کے لئے کل جماعت میں سے بہترین آدمیوں کو منتخب کریں گے اور اس انتخاب کے وقت اس بات کو نہیں دیکھیں گے کہ انتخاب کے امیدوار کی ذات یا مذہب کیا ہے۔

(۲) قانونی نظائر اور مجلس قانون ساز کے مستقل احکامات کو اس طرح پیدا کرنا اور ترقی دینا چاہئیے کہ جس سے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور ان کے اعتماد کو حاصل کیا جاسکے۔

(۳) اجازتی قاعدوں اور کارروائیوں کے ذریعہ اونچے ذات والوں کی نگرانی کرنی چاہئے کیونکہ ہم ایک طرف تو فرقہ پرستی کی مذمت اور دوسری طرف ذات کی حمایت نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ذات کا نظام اگر فرقہ پرستی کی جڑ نہیں ہے تو ایک طرح کی فرقہ پرستی ضرور ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذات کے نظام کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جاسکتا جب تک ہندوؤں کے طرز زندگی کو بنیادی طور پر نہ بدلا جائے۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندو مذہب میں ذات کے بغیر بھی اتنی سچائی اور زندگی موجود ہے کہ ذات کے ختم ہو جانے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ذات کے نظام کے بارے میں مسلسل عمل اور پروپیگنڈے سے نقطہ نگاہ اور ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے

ہمیں اس ذہنیت سے نجات حاصل کرنا چاہیے کہ میری ذات یا گوت کا آدمی میرے ہم قوم ہندوستانی کے مقابلہ میں مجھ سے زیادہ قریب ہے جب تک ہندوستان کی تمام سوسائٹی میں باہمی شادیوں کا رواج نہیں ہوگا فرقہ پرستی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گی ہندوستان کو تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ انسانی برادری اور خدا کی الوہیت کا درس دیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ مدراس کی وزارت نے چھوت چھات کو تمام سرکاری جگہوں سے ختم کرنے کے لئے کارروائی کو شروع کر دیا ہے۔ ملابار کے داخلہ مندر کے قانون کو اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے دوسرے قوانین صوبہ اور ملک کے دوسرے حصوں کے لئے بھی بنائے جائیں۔

(۴) ہمیں اس قسم کے امکانات کی بھی تلاش کرنا چاہیے کہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے لوگ کس طرح ایک ہی گھر میں رکھے جا سکتے ہیں چین اور جاپان میں تو یہ چیز بہت عام ہے لیکن ہندوستان میں ذات کے نظام اور غذا، لباس اور معاشرتی مراسم کے اختلاف کی وجہ سے یہ چیز مشکل معلوم ہوتی ہے بہرحال اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۵) فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ترقی دینے کے لئے، ایسے آدمیوں کی مستقل کمیٹیاں بنا دینی چاہئیں۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی کرتے ہوں اور جن کا کام یہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے گروہوں کے لئے وکیل کا کام کریں بلکہ جن کا کام یہ ہوگا کہ وہ مخالف جماعتوں کے تعلقات کو خوشگوار رکھیں۔ ان کمیٹیوں کے کام میں یکجہتی پیدا کرنے کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک صوبہ جاتی ڈپارٹمنٹ بنا دینا چاہیے۔ ان کمیٹیوں کے ممبر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی ہمدردیاں وسیع ہوں جو تعصب سے خالی ہوں اور جنھیں پڑوس کے ہر شخص کا اعتماد حاصل ہو۔

جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کی ابتدا ہمیشہ غیر مصدقہ رپورٹوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ کوئی شخص یہ خبر مشہور کر دیتا ہے کہ ایک ہندو لڑکی کو ایک

مسلمان بھگا لے گیا یا کسی ہندو نے ایک مسلمان کے چھرا بھونک دیا اور جب فساد ایک دفعہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اس کو روکنے کے لئے تیزی کے ساتھ با اثر عاملانہ کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مدراس کی حکومت نے اپنے ضلع کے مجسٹریٹوں کو فرقہ وارانہ فسادات کو دبانے کے لئے پورے اختیارات دے رکھے ہیں اور ان کے ان اختیارات کی اپیل عدالت میں نہیں بلکہ حکومت سے کی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کو جو فرقہ وارانہ فساد شروع کرتے ہیں عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ ایسے لوگوں کو آسانی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں کے غنڈوں کی جتھہ بندی کو توڑنے کی ضرورت ہے۔

(۴) گاؤ کشی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کے سلسلہ میں معقول نظائر کے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اچھے شہری ہونے کے نقطہ نگاہ سے فرائض کو حقوق سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر گاؤ کشی مسلمان چھوڑ دیں تو یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف سے نہایت زبردست ایثار ہوگا۔ اس سے ہندوؤں کی دائمی دوستی کو نہایت یقینی طور پر حاصل کیا جا سکے گا۔ حیدرآباد کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں گاؤ کشی بہت سالوں سے منع کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر گاؤ کشی کو جاری رکھنا ضروری ہو تو اس کام کو جتنی انسانیت کے ساتھ عام پبلک کی نگاہ سے دور رہ کر کیا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی طرح اگر ہندو مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں کے قریب اپنے گھنٹے اور ناقوس بجانا چھوڑ دیں تو اس سے فرقوں میں باہمی ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت مدد ملے گی لیکن اگر گانا اور بجانا ضروری ہو تو اس کو ایسے وقت ہونا چاہیئے جو مسلمانوں کی عبادت کا وقت نہیں ہے اور ان اوقات کا تعین کر دینا چاہیئے۔

(۵) روشن خیال پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں کے پیدا کرنے کے کام میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ پجاری اور ملا ہندوستان کے مذہبوں کی ایک بڑی لعنت ہیں۔ اکثر

صورتوں میں ناہنی کی وجہ سے مذہبی دیوانگی اور تعصب پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے مذہبی رہنماؤں کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہوں کہ انصاف، رحم اور پاکبازی خدا کی نگاہ میں مراسم مذہب کی پابندی سے زیادہ پسندیدہ چیزیں ہیں۔ خدا ظاہری رضا جوئی نہیں چاہتا بلکہ وہ دل کی حضوری نیاز اور تسلیم چاہتا ہے۔

(۸) فرقہ وارانہ مدرسوں کی جگہ قومی مدرسے قائم کرنے چاہئیں۔

(۹) بچوں کو بہترین اخلاقی تعلیم دینے کے لئے اگر ہندوستان کی مختلف مذہبی کتابوں اور ان کی دعاؤں اور مناجاتوں اور مختلف مذہبوں کے عظیم المرتبت مردوں اور عورتوں کی زندگی کے حالات سے مدد لی جائے تو اچھا ہے۔

(۱۰) قومی لباس، قومی رواجات اور قومی تہواروں کے بارے میں بھی تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے مسلمان بھائی ہمارے ترنگے جھنڈے میں ہلال کو بھی شامل کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کسی مذہب کے پیرؤں کے لئے کسی خاص قسم کے لباس یا ذات کے نشان یا کسی اور ظاہری علامت سے اس بات کا اعلان کرتے رہنا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہیں فضول سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہر ہندوستانی بچے کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی مقامی زبان کے ساتھ ساتھ قومی زبان (ہندوستانی) کو بھی سکھنا چاہیئے۔

(۱۱) ہندوستان کی غریبی کے کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس سے فرقہ وارانہ ذہنیت کے رفع کرنے میں بہت مدد ملے گی کیونکہ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نہایت خراب معاشی حالات کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کو باعزت روزی کمانے کا موقع نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ رقابتیں اور سرکاری ملازمتوں کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت بڑی خوشی ہے کہ اس وقت بھی معاشی تقسیموں نے فرقہ وارانہ تقسیموں کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں فرقہ پروری کا جذبہ بہت مضبوط تھا مسلمانوں کے

غریبوں سے امیروں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے غریبوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔
کانپور میں جو ابھی مزدوروں کا اسٹرائک ہوا تھا اس میں مسلم مزدوروں کو ہندو مزدوروں کے ساتھ
لڑانے کی خود غرضانہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔

(۱۲) ہمیں مختلف فرقوں کے صاحب فکر مردوں اور عورتوں کے حلقے ملک کے طول و عرض
میں بنانا چاہییں تاکہ ہم آہنگی اور ایک جہتی کو ترقی ہو اور تمام فرقوں کے نوجوانوں کی خدمات حاصل کی
جا سکیں اور پھر یہ لوگ مختلف فرقوں میں مفاہمت اور مصالحت پیدا کرانے کے کام کو تبلیغی جوش
و خروش کے ساتھ شروع کر سکیں۔

انقلاب ایران

(جناب احمد خاں صاحب)

مثل مشہور ہے کہ ہر کمالے را زوالے۔ ہر سلطنت کے لئے ترقی اور تنزل لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ جب تک خاندان کو حکومت کرتے کرتے کچھ زمانہ گذر جاتا ہے تو اس کے جانشینوں میں مختلف قسم کے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ عیش و آرام میں پڑ کر مفاد عامہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امرا اور وزرا بھی جو صحیح معنوں میں حکومت کے کل پرزے ہوتے ہیں ان ہی کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور اس عام لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے ملک میں ایک عام بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ حکومت کا یہ رنگ ڈھنگ رعایا کو بالکل نہیں بھاتا اور حکمراں طبقے کے خلاف بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس بغاوت سے اکثر ان لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو بہتر قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں اور سلطنت ان کے قدم چومتی ہے۔ اس کا نام انقلاب ہے۔

یورپ کی صنعتی ترقی کے بعد وہاں کے ممالک کو دو چیزوں کی ضرورت ہوئی۔ ایک تو خام اشیا کی اور دوسرے مصنوعہ مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی ہندوستان میں ان کی یہ دونوں ضرورتیں پورا کرنے کی اہلیت شاید زیادہ تھی۔ اس لئے اس پر تقریباً ہر سلطنت کی نظریں پڑتی ہیں اور آخرکار انگریز اس پر قابض ہوئے۔ ہندوستان کا مقام ایسا ہے کہ اس پر خشکی کی طرف سے صرف مغرب ہی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے ہندوستان کی مغرب میں ایران اور افغانستان ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں سے حدود انگلستان کی ایک ہم سر سلطنت یعنی روس سے ملتے ہیں لہٰذا سلطنت برطانیہ کے لئے ضروری ہوگیا کہ اگر وہ ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہتی ہے تو ان دونوں ممالک پر اثر رکھے۔ اس اثر کو قائم رکھنے کی کوششوں نے جو کشمکش پیدا کی وہ انقلاب ایران کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب ایران میں ناصر الدین شاہ تخت نشین تھا۔ یورپ کے سب سے بڑے مدبر اور سپہ سالار نپولین کو عروج ہوا۔ یورپ میں خاصا غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کی نظر ایشیا اور افریقہ پر پڑی۔ ایشیا میں ہندوستان اور افریقہ میں مصر چنا گیا۔ اور قرب کی وجہ سے اس نے پہلے مصر پر حملہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کا راستہ بھی صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس رستے کی صفائی میں ایران بھی آگیا۔ فرانس سے فوجی مشن ایران بھیجے جانے لگے۔ تاکہ ایرانی فرانسیسیوں کی فوجی صلاحیتوں سے مرعوب ہو جائیں۔ مگر ان مشنوں کا زور کم کرنے کے لئے روسی اور انگریزی مشن بھی ان کے تعاقب میں آئے۔ اسی اثنا میں نپولین کو شکست ہوئی اور فرانسیسی مشن آنے بند ہو گئے۔ اور ایران میں روس اور برطانیہ مقابلے پر آ گئے۔ اس طرح ایران یورپی سیاست کے بھنور میں آگیا۔

خاندانِ قاچار ایران پر تقریباً ایک صدی حکومت کر چکا تھا اور اب ناصر الدین کے رنگ ڈھنگ سے اس خاندان پر زوال آتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ملک میں اس بے جا غیر ملکی مداخلت نے حکومت کی غفلت کو دور نہ کیا۔ اور حکومت کی بے پرواہی دیکھ کر ملک میں ایک عام بے چینی اور بدنظمی پھیل گئی اس بدنظمی سے بابی تحریک نے جو اس زمانے میں زور پکڑ رہی تھی اثر لیا۔ اور حکومت کو اس کی لاپرواہی کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ مگر ناصر الدین شاہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ خود اس کی رعایا اس پر نکتہ چینی کرے۔ چنانچہ اس نے بابی تحریک کے خلاف نہایت ہی سخت کاروائی کی اور اس تحریک کو تقریباً مٹا دیا۔ بابی تحریک بادشاہ کے رستے میں آخری رکاوٹ تھی۔ اب راستہ صاف پا کر بادشاہ تیزی کے ساتھ عیش و آرام کی طرف بڑھا۔ اور وزراء بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ جو کہ خاص رعایا کا مال ہوتا ہے۔ گنتی کے چند لوگوں پر صرف ہونے لگا۔ تعیش کی زندگی میں جتنی دولت ہو کم ہوتی ہے۔ چنانچہ عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار ہوئی۔ جس کے بوجھ سے عوام بالکل دب گئے اسی زمانے میں بادشاہ کو یورپ جانے کی سوجھی۔ روپے کی قلت کی وجہ سے غیر ملکیوں سے قرضہ لینا پڑا جس کے بدلے میں ان پر تجارتی رعایتوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس طرح ایرانی تجار

مغربی ممالک کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہاں جو غیر ملکی آئے انھوں نے یہاں کی بدنظمی کو دیکھ کر آہستہ آہستہ حکومت کے مختلف شعبوں کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا اور اب ایرانیوں کے لئے سوائے زراعت کے پیٹ پالنے کا کوئی اور ذریعہ نہ رہ گیا۔

اس دور میں سید جمال الدین افغانی اور ملکم خان کی شخصیتوں کو ایران کے لئے غیبی مدد سمجھنا چاہیے یہی دو حضرات ہیں جنھوں نے ایرانی قوم میں انقلاب کی روح پھونکی اس موقعہ پر بہتر ہے کہ ان اصحاب کے متعلق بھی کچھ بتا دیا جائے۔

سید جمال الدین افغانی، افغانستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پہلے تعلیمات اسلامیہ کا درس حاصل کیا اور اس کے بعد اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ مصریوں کو بیدار کرنے میں آپ نے نہایت ہی نمایاں حصہ لیا۔ اور خاص طور پر نوجوانوں کو تو آپ ہی نے جگایا۔ ۱۸۸۶ء میں ناصرالدین شاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی۔ آپ ایران تشریف لے گئے۔ وہاں کی قابل رحم حالت دیکھ کر مولانا سے نہ رہا گیا اور آپ نے وہاں اصلاحات کا سلسلہ جاری کیا ایران میں آپ نے دو سال تک قیام فرمایا اور اس عرصہ میں ایک بہت بڑا گروہ شاگردوں کا اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ آپ نے رعایا کی حالت بہتر کرنے کے لئے بادشاہ سے چند مطالبات کئے جس کے سبب سے بادشاہ کے اور آپ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی اور آخرکار آپ کو ایران چھوڑنا پڑا۔ آپکے ایران چھوڑ دینے سے آپ کے اثر میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ اب آپ کے شاگرد مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک نئی پود تیار کی جو آزادی کو اپنا نصب العین سمجھتی تھی اور شاہی حکومت سے نفرت کرتی تھی۔

اس دور کی دوسری شخصیت ملکم خان کی ذات تھی۔ آپ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ طہران میں ایک معمولی استاد کی حیثیت سے آئے تھے۔ مگر اپنی قابلیت اور ہمت کی وجہ سے حکومت ایران کی طرف سے سفیر مقرر ہوئے اور لندن بھیجے گئے۔ یہاں سے آپ نے ایران کی حالت کے متعلق بادشاہ سے خط وکتابت کی۔ اور چند اصلاحات کی تجویز بادشاہ کو بھیجی۔ جب آپ کی طرف

کوئی توجہ نہیں کی گئی تو آپ نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور ایک اخبار نکالنا شروع کیا جس میں حکومت ایران کے اس نامنصفانہ رویے کے خلاف مضامین شائع ہوئے۔ آپ نے اس اخبار کے ذریعہ ایران میں اصلاحات کے لئے زمین تیار کی۔

عوام میں اب عام بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنا لیڈر مولویوں کو بنایا۔ یہ مولوی اکثر وہی تھے جو سید جمال الدین صاحب سے استفادہ حاصل کر چکے تھے۔ ان لوگوں نے استبدادی حکومت سے چھٹکارا پانے کے لئے بے حد قربانیاں کیں اور آزادی کی راہ میں بے دریغ جانیں تک قربان کر دیں۔

ناصرالدین شاہ کے ظلم و ستم کی جب کوئی حد نہ رہی تو ایک ایرانی نوجوان نے اسے قتل کر دیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ سید جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھا۔ اس پر ان کے دوسرے شاگردوں کو بھی تلاش کیا گیا۔ مگر صرف تین اشخاص ہی مل سکے اور وہ قتل کرا دئے گئے۔ اسی طرح ناصرالدین شاہ کا خاتمہ ہوا۔ اس نے اپنی عمر میں ایران کے لئے صرف ایک کام کیا اور وہ کاسک بریگیڈ کا قیام تھا۔ اس فوج نے آئندہ چل کر ایران کی سیاست میں بہت بڑا کام کیا۔ ناصرالدین شاہ کے قتل کے بعد جو بدلہ سید جمال الدین صاحب کے شاگردوں سے لیا گیا اس نے عوام میں ایک بے چینی پیدا کر دی اور وہ حکومت سے بدلہ لینے پر تل گئے۔

ناصرالدین کے بعد مظفرالدین تخت نشین ہوا۔ یہ آدمی نرم دل اور طبیعت کا بہت کمزور تھا اس کمزوری سے غیر ملکیوں نے کافی فائدہ اٹھایا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی اس کمزوری سے قومیت پسند طبقے کو بھی بہت تقویت پہنچی۔ مظفرالدین کا زمانہ صحیح معنوں میں قومیت پسندوں کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی روس اور برطانیہ دونوں بادشاہ کو اپنے اثر میں لانے کے لئے زور لگانے لگے۔ مگر بادشاہ نے ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں بگاڑی بلکہ دونوں کو خوش رکھنے کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔

عوام میں بھی اب کافی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ قومی لیڈروں نے بھی بادشاہ کی اس کمزوری

کو سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف اصلاحات اور دستور اساسی کا مطالبہ کیا
پہلے پہل کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس پر عوام نے طہران کو چھوڑ دیا۔ اور وہ قریب کے شہروں میں چلے
گئے۔ تب بادشاہ کو جھکنا پڑا۔ اور ان کے مطالبات پورے کئے گئے۔ بڑے مطالبات دو تھے
ایک تو یہ کہ عین الدولہ وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔ دوسرے ایک
مجلس (پارلیمنٹ) قائم ہو۔ جس میں عوام کے نمائندے ہوں اور بادشاہ ان کے مشورے سے
حکومت کرے۔ چنانچہ ۵ اگست ۱۹۰۶ء میں مجلس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور ۷ اکتوبر
۱۹۰۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ مجلس میں اراکین کی کل تعداد ۱۵۶ تھی جن میں سے ۶۰ نمائندے
امراء کے تھے۔ اور باقی عوام کے جو مختلف صوبوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ اس طرح بادشاہ عوام
کے نمایندوں کے مشوروں کا پابند ہو گیا۔ شاہی مسند کے لئے یہ تمام پابندیاں پیدا کر کے مظفر الدین
راہی ملک عدم ہوا۔ اور اس کا بیٹا محمد علی بادشاہ ہوا۔

محمد علی شاہ کے زمانے میں ملک میں بہت بدامنی رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ آدمی
ذرا غیور تھا کسی کا پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے آپ کو مختلف
قسم کی پابندیوں میں جکڑا پایا۔ اس نے ان پابندیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کیں۔
مثلاً اس نے سب سے پہلے مجلس میں شاہی حقوق کا مسئلہ پیش کیا۔ وہ کہتا تھا کہ بادشاہ کو مجلس کے
مشورے کا بالکل پابند نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو کم از کم اتنی آزادی ضرور ملنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی موقعہ
پر کسی وجہ سے مجلس کے مشورے پر عمل کرنا نہ چاہے یا اس مشورے کو برا سمجھے تو وہ اپنے اختیارات
سے کام لے سکے۔ جب مجلس میں اس کے ان مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تو اس نے عوام میں اپنا اثر
قائم کرنا چاہا۔ مگر عوام مجلس کے اثر کو قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ لے دے کے
صرف عدالتی پارٹی نے اس کا ساتھ دیا۔ یہ پارٹی بہت مختصر تھی جس سے اس کا کام چلتا نظر نہ آتا تھا
چنانچہ اس کو کسی اور رفیق کی تلاش ہوئی۔ اور جب ہر طرف سے ناامیدی ہو گئی تو اس کی نظر روس اور
برطانیہ پر پڑی۔ یہ دونوں تو چاہتے ہی تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہم ایران کی سیاست پر حاوی ہو جائیں

چنانچہ دونوں طرف سے بادشاہ کو بس میں کرنے کی کوشش ہوئی اور روس کامیاب ہوا۔ بادشاہ کو روس ایک ایسا رفیق ملا جیسا وہ چاہتا تھا۔ اور روس نے بھی یہ دوستی آخری وقت تک نباہی۔

بادشاہ مجلس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یہ سوچا کہ مجلس کی عمارت کو گرا دیا جائے اور اراکین کو منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے عدالتی پارٹی کا جلسہ عام کیا جس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عدالتی پارٹی کے لیڈر روس نے مجمع میں اپنی تقریر کے ذریعے بہت جوش پیدا کر دیا۔ اور انھوں نے چند روسی سپاہیوں کے ساتھ مجلس کو بہت نقصان پہنچایا مگر عمارت کو گرا نہ سکے۔ مجلس کے اراکین نے شہر کی جامع مسجد میں عام جلسہ کیا جس میں بادشاہ کی اس حرکت پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور بادشاہ کو یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ مجلس کا مطیع ہو کر رہے گا مگر اس واقعہ سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگی اور اسی ہفتے کے اندر اندر اس نے طہران چھوڑ دیا اور شہر کے باہر روسی حفاظت میں ایک باغ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے ایران پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کی۔ ایک دن تار وغیرہ کٹوا دیے گئے تاکہ طہران کی خبریں دوسرے صوبوں تک نہ پہنچ سکیں اور روسی مدد سے طہران کا محاصرہ کر لیا۔ اراکین مجلس نے اپنے آپ کو بالکل بے بس پاکر صلح کا پیغام بھیجا اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ دوسری صبح کو تڑکے شاہی فوج کے ایک ہزار سپاہی شہر میں داخل ہوئے اور مجلس کی عمارت کو آگ لگا دی اور اراکین مجلس کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ بعض کو قید خانہ نصیب ہوا اور بعض پوشیدہ طریقے سے قتل بھی کرائے گئے۔ اس طرح پھر ایک دفعہ استبدادی حکومت قائم ہو گئی اور اس کا سلسلہ تقریباً ایک مہینے تک رہا۔ مختلف صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کو روسی مدد سے فرو کرنے کی کوشش کی گئی۔ کاسک بریگیڈ اس زمانے میں بادشاہ کی طرف تھا۔ اس سے بہت کام لیا گیا۔ اول اول تو قومیت پسند اپنے اپنے صوبوں میں لڑتے رہے پھر ان کی فوجیں مل گئیں اور انھوں نے طہران پر حملہ کیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۰۹ء کو بختیاری اور قومی فوج طہران میں داخل ہو گئی اور کاسک بریگیڈ نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان تمام واقعات کے بعد بھی بادشاہ نے ہمت نہ ہاری وہ روسی پناہ میں چلا گیا اور کوشش کرتا رہا کہ ایران کو فتح کرے چنانچہ روسی مدد سے اس نے پھر حملہ کیا۔ اول اول تو کاسک بریگیڈ جواب قوم کے ساتھ تھا پیچھے ہٹتا چلا آیا۔ مگر ایک مقام پر اس نے جان لڑا کر مقابلہ کیا اور بادشاہ کو شکست دی۔ یہ بادشاہ کی آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد وہ معزول کر دیا گیا اور اس کے لڑکے احمد شاہ کو جس کی عمر ۱۲ سال کی تھی بادشاہ بنا یا گیا اور حکومت صحیح معنوں میں مجلس کے ہاتھ میں آگئی۔

ابھی تک خانہ جنگی کی وجہ سے مجلس پورے طور پر اصلاحات عمل میں نہ لا سکی تھی۔ اب اس کو بالکل آزادانہ موقع ملا اور اس نے ملک کی بہتری کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہی فضول خرچیوں کی وجہ سے عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ مجلس نے مالیات کے محکمے کو چلانے کے لئے امریکہ سے مدد لی اور وہاں سے شسٹر چند مددگاروں کے ساتھ اسی کام کے لئے آئے۔ مسٹر شسٹر بہت ہی مخلص آدمی تھے۔ آپ نے آتے ہی عوام پر سے بے جا ٹیکسوں کو ہٹایا اور امراء پر جائز ٹیکس لگائے۔ امرا کا طبقہ ایسا تھا جس نے قریباً ایک صدی سے کبھی ٹیکس کا نام بھی نہ سنا تھا یکایک یہ حالت دیکھ کر وہ بدکا۔ دوسری طرف مسٹر شسٹر نے غیر ملکی تاجروں پر ٹیکس لگائے تاکہ ایرانی تجارت کو فروغ ہو۔ مگر روس اور برطانیہ یہ ٹیکس گوارا نہ کر سکے اور ان ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مسٹر شسٹر کو ایران سے نکالا جائے اور یہ کام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک مجلس میں اکثریت نہ حاصل کی جاتی۔ چنانچہ مجلس کے دوسرے سیشن میں ان دونوں بیرونی حکومتوں اور ایران کے امراء نے مل کر مجلس میں اکثریت حاصل کر لی شسٹر کو نکال باہر کیا۔ اور پھر جو قانون جی میں آیا پاس کر دیا۔ ملک کی حالت پھر بدتر ہو گئی اور عوام مجلس سے بھی بدظن ہو گئے۔

اسی اثنا میں روس میں انقلاب ہوا جس کی وجہ سے ایران میں روسی زور کم ہو گیا۔ مگر اس انقلاب سے ایران نے بہت اثر لیا۔ خاص طور سے شمالی ایران میں اشتراکیت کا بہت زور شور سے پروپیگنڈا

کیا گیا۔ کاسک بریگیڈ میں بھی انقلاب ہوا جس کی وجہ سے کچھ بدامنی کا اندیشہ ہوا۔ اور رضا خاں کاسک بریگیڈ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ اس طرح ایک ایسی شخصیت کو عروج کا موقعہ ملا جس نے بعد میں آکر ایران کو ترقی کے موجودہ معراج پر پہنچا دیا۔

اس زمانے میں مجلس نے تیل کے چشموں کا اجارہ برطانیہ کی ایک کمپنی کو دے دیا جس سے ایران کو بہت سخت اقتصادی نقصان پہنچا اور عوام میں مجلس کا اعتبار جاتا رہا۔ ایران پر برطانیہ کا اثر غالب تھا۔ طہران میں ایک برطانوی فوج تھی اور ہر طرح کے تجارتی مراعات برطانیہ کو حاصل تھے۔

رضا خان بیدار مغز آدمی تھا۔ وہ ایران کو کسی غیر قوم کے اثر میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مجلس سے بھی خفا تھا اور رعایا سے بھی۔ مجلس سے اس لئے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے مشکلوں کے ساتھ اور تکلیفیں برداشت کرکے جو اختیارات حاصل کئے تھے اب ان کو استعمال میں نہیں لاتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان اراکین میں سب لوگ مخلص ہیں اور رعایا کا دل سے بھلا چاہنے والے ہیں۔ مگر لیڈر کی کمی ہے جو ان کو کام بتائے کہ اب یوں کرو اور اب یوں۔ وہ عوام سے اس لئے خفا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مجلس کو پورے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ جو چاہے کرسکتی ہے۔ مگر وہ اسے کچھ کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی بنا پر اس نے ۲۵ فروری ۱۹۲۱ء کو کاسک بریگیڈ کے ۲½ ہزار جوانوں کے ساتھ طہران پر حملہ کیا برطانوی فوج کے کمانڈر نے شہر سے باہر رضا خاں سے ملاقات کی اور بغیر کسی کشت و خون کے رضا خاں کی فوج شہر میں داخل ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجلس کی طرف سے رضا خاں وزیر جنگ مقرر ہوئے۔

وزیر جنگ ہوتے ہی رضا خان نے ایران کی فوجی قوت بڑھانا شروع کی اور آذربائیجان کی ۱۹۲۳ء کی شورش میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایران کے پاس ۴۰ ہزار مسلح اور تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ لیکن ایران کا وزیر اعظم سید ضیاء الدین، رضا خاں کی اس ترقی کو دیکھ کر بہت کڑھتا تھا اس نے کئی مرتبہ رضا خاں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کوئی موقعہ نہ ملا۔ اور آخرکار ایک

دن وہ خود ہی طہران چھوڑ کر چلا گیا جس سے اس کا منتخب شدہ کابینہ ٹوٹ گیا۔

اب رضا خان نے اپنا کابینہ مرتب کیا۔ مگر خود وزیر جنگ کا عہدہ ہی لیا۔ لیکن وہ عہدے وغیرہ حاصل کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔ وہ ایران کی ترقی چاہتا تھا اور اپنا سب کچھ اسی ایک مقصد میں صرف کر دینا چاہتا تھا۔ اسی سال ایک مشن امریکہ سے اس مقصد کے لئے بلایا گیا کہ وہ یہاں کی اقتصادی اور مالی حالت میں اصلاح کرے۔ اس کابینہ میں جو رضا خان نے مرتب کیا تھا جب وزیر اعظم کا کام کسی سے نہ سنبھالا جا سکا پھر اس نے خود ہی یہ عہدہ لے لیا۔ اسی سال احمد شاہ قاچار ایران سے چلا گیا اور اس نے پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اس طرح قاچار خاندان کا ایران میں بالکل خاتمہ ہو گیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مجلس نے اعلان کیا کہ رضا خان کو ان کی خدمات کے صلے میں بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء کو آپ کی تاج پوشی کا جشن منایا گیا۔ اس طرح رضا خان، رضا شاہ پہلوی بن گئے۔

بادشاہ ہوتے ہی رضا شاہ نے قوم کو آزادی کا وہ میٹھا پھل چکھانا شروع کیا۔ جو بہت ہی مصیبتوں اور دقتوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ یعنی عوام کی ترقی کے لئے مختلف قسم کی اصلاحات کیں مثلاً تعلیم عام کر دی، ملک والوں میں دو بڑے مذہبی فرقے شیعہ اور سنی تھے۔ جن میں ہمیشہ لڑائیاں جھگڑے رہتے تھے۔ ان کو ختم کر دیا اور آمد و رفت کے لئے ریلوں کا انتظام کیا۔ ان سب کاموں سے بڑا کام یہ کیا کہ انھوں نے برطانوی اور روسی اثر کو ملک سے دور کیا اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران بھی ایک ایسا ملک ہے جو آزاد ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

نازیت کا پس منظر

(خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے)

پچھلے زمانہ کا ایک قصہ مشہور ہے کہ سرد ملک کا ایک بڈھا برف گاڑی[1] میں بیٹھا ہوا، اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ جنگل میں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بھیڑیا ان کا پیچھا کرنے لگا بڈھے نے گھوڑے کے ہنٹر پر ہنٹر رسید کئے۔ اور آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن بھیڑیا نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا۔ بالآخر بڈھے نے کچھ کھانے کا سامان اس کے آگے ڈالا لیکن اس سے بھوکے بھیڑیے کی نیت نہیں بھری وہ اور بھی تیزی کے ساتھ پیچھا کرتا رہا اتنے میں گھوڑا ہانپنے لگا اور تھکن کی وجہ سے اس کی وہ تیز رفتاری بھی نہیں رہی۔ آخرکار وہ بھیڑیا، برف گاڑی کے اتنا قریب آگیا کہ بیوی اور بچے اس کی خونی آنکھوں کو دیکھ کر لرزنے لگے۔ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ بس اب ایک لمحہ کے اندر وہ موت کے منہ میں ہوں گے۔ بڈھے نے یہ دیکھ کر کہ اب گھر والوں کے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ایک جست کی اور اپنے آپ کو بھیڑیے کے سپرد کر دیا۔ بھیڑیا اس کے کھانے میں مصروف ہوگیا اور بچے محفوظ جگہ پہنچ گئے۔ اس بڈھے کو گذرے ہوئے زمانہ ہوگیا لیکن اس کے ایثار و قربانی کی مثال آج بھی روشن ہے۔ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہیں کی اور گھر والوں کو حملہ کی زد سے بچا لیا۔

لیکن آج ہمیں تہذیب اور جمہوریت سرنگون نظر آتی ہے جب ہم یورپ کے میدان سیاست میں اس مثال کی صریح خلاف ورزی دیکھتے ہیں۔ اس وقت وہ ضعیف العمر اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہے اور اپنی مدافعت کے لئے اس نے گھر والوں کو ایک ایک کرکے بھیڑیے کے سپرد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج برطانیہ امن عالم کا الوالا با سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نازیت کی تسکین اشتہا

---

[1] بغیر پہیوں کی گاڑی جس پر سوار ہو کر برف پر سفر کرتے ہیں۔

کے لئے مختلف دول یورپ کی قربانیاں پیش کیں لیکن ہٹلر کے جوع البقر میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی بھوک بالکل اس خونخوار بھیڑیے کی طرح ہے جس کی معمولی قربانیوں سے سیری نہیں ہوتی بلکہ اسی طرح اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور اس کے حملہ کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ رائن، اسٹریا، زیکوسلوویکیا اور میمل ایک ایک کرکے اس قربان گاہ پر چڑھا دئے گئے۔ لوکارنو، ویلز اور میونک کے مواثیق و معاہدات کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اڑا دی گئیں لیکن پھر بھی امن عالم کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ایک جمہوریت پسند مفکر نے سیاسیات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے بڑے مزہ کا فقرہ کہا تھا:-

"اگر میرا بس چلے تو میں تمام نیلگوں آسمان پر جلی اور خونی حروف میں صرف ایک لفظ ـــــ نازیت ـــــ لکھ دوں"

اس میں شک نہیں کہ آج نازیت نے یورپ کے توازن ملکی کو برباد کرنے اور امن عالم کو معرض خطر میں ڈالنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کی کتاب سیاست میں ایفائے وعدہ کوئی چیز نہیں۔ وہاں طریقہ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے لیکن آخر یہ نازیت ہے کیا؟ جس کے طنطنہ اور ہمہمہ کے آگے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں نے سر عجز خم کر دیا ہے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شکست خوردہ قوم اپنی ہار کے چودہ یا پندرہ سال کے زمانہ میں بہت زیادہ وطن پرست ہو جاتی ہے اور اسی بنا پر جرمنی میں بھی اشتراکیت قومی کا قیام ہوا۔ عام انگریزوں کے نزدیک ہٹلر کی ہتم بالشان کامیابی کا راز صرف اس میں پوشیدہ ہے کہ اس نے جرمنی کی ان حسیات کو بیدار کرنا چاہا جو جنگ عظیم میں بری طرح پامال ہو چکی تھیں۔ اور جن کی تباہی اور بربادی کو آئین ورسیلز نے مکمل کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ نازیت اس احساس کمتری کی پیداوار ہے جو تمام جرمن قوم پر ایک اعصابی مرض کی طرح مسلط تھا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہٹلرازم کجروی کا ایک دوسرا نام ہے جو محض ایک عارضی اور ہنگامی چیز ہے۔

اس بحث میں اگر کچھ سچائی ہے تو صرف اتنی کہ اس سے ہمیں ہٹلر کی انتقامانہ ذہنیت اور معاندانہ انداز تقریر کا تھوڑا بہت نفسیاتی جواز مل جاتا ہے لیکن یہ تمام کی تمام حقیقت نہیں ہے ہٹلر کے مسلک اور تحریک کو ہنگامی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی تمام تاریخی کڑیوں سے ناواقف ہیں بہت سے لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر ازم ہاؤسٹن اسٹورٹ[1] (Houston Stewart) اور گابنیو[2] (Gobineau) کی تحریروں کا ملخص ہے اور بس لیکن یہ صحیح نہیں ہے جرمنی میں ان خیالات کو اس وقت نشوونما حاصل ہوئی جب فتح مندی و کامرانی بسمارک کی فوجوں کے قدم چوم رہی تھی۔ اور اسے ڈنمارک، آسٹریا، اور فرانس پر پورا تصرف حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نازی مسلک کسی شکست خوردگی یا کمتری کے احساس کی ہنگامی پیداوار نہیں ہے بلکہ اگر اس کے پس منظر کا صحیح مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جرمنی کی تاریخی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ہنرش واں ٹرٹشک (Heinrich Von-Treitschke) کے نظریۂ ریاست اور مین کیمف (Mein Kampf) کے خاص خاص اصولوں کو سامنے رکھیے اور دیکھئے کہ ان میں کس قدر حیرت انگیز تطابق اور مماثلت ہے۔ ہٹلر کی جہاد فرمائی یہود دشمنی، مطالبہ مستعمرات، اور پان جرمن ازم غرض اس کے تمام بڑے بڑے اصول سب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی جرمن پروفیسر سے مستعار ہیں۔ اس کے بعد آپ ہٹلر اور جرمن شہنشاہوں کی تقریروں کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ان میں خیال کی کس قدر یکسانیت ہے۔ اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ نازیت ماضی کی تفسیر حال ہے۔

ٹرٹشک (Treitschke) ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۶ء میں انتقال کر گیا۔

---

(۱) و (۲) دو مصنفوں کے نام ہیں جن میں سے پہلا انگریز اور دوسرا فرانسیسی۔ یہ دونوں اپنے خیالات کی "مجنونیت" کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ (خ۔ا۔ف)

اس نے آرنٹ اور ڈلمان (Dahlmann) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور ۱۸۵۹ء میں اپنی مشہور کتاب "ریاست" تصنیف کی جس کو اس نے بعد میں اور بڑھایا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کی وجہ سے اس نے مستقل شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۷۴ء میں وہ برلن میں شعبہ تاریخ جدید کا صدر مقرر ہو گیا اور مرتے وقت تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں سروش غیبی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور مرنے کے بعد تو اس کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے۔ جنگ عظیم کے قبل تک لوگ اس "ارسطوئے ثانی" کے نام کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔

ٹرٹشک نے اپنا نظریۂ ریاست حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"ریاست، طاقت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کا اولین فرض جنگ کرنا ہے بغیر جنگ کے کسی ریاست کا تصور ناممکن ہے .... فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسے اپنی خودی کو ایک بڑے کل میں جذب کر دینا چاہیئے۔ خیر عمومی کے آگے خیر انفرادی بالکل بے معنی شے ہے۔ اگر اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو پھر جنگ کی عظمت بھی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی .... جنگ سیاسی تصوریت کا اقتضا ہے۔ مادیت اسی سے برسرِ پیکار رہی لیکن سب سے زیادہ قابل ملامت اخلاق کی وہ کجروی اور کمزوری ہے جو انسانیت سے شجاعت ہی ختم کر دینا چاہتی ہے۔"

اس کے مقابلہ پر ہٹلر کہتا ہے، "کسی حکومت کو اپنے ارادہ اور منشا کو دوسری حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں کر دینا چاہیئے۔ اس کا جب جی چاہے لڑائی کرے اور جب جی چاہے پچھلے معاہدوں کو منسوخ کر دے"

صلح نامۂ ورسلیز کے متعلق ہٹلر کے یہ الفاظ بہت مشہور ہیں کہ "اس کی حیثیت "لوح مزار" سے زیادہ نہیں ہے" اسی طریقہ سے وہ دوسری حکومتوں کے مابین کسی ایسے معاہدہ کو "جس کا مقصد لڑائی کرنا نہیں ہے" کوئی وقعت نہیں دیتا۔ جمہوریت پرستوں کو وہ "پارلیمانی دوا فروشوں"

سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اگر ان کے اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ ہوگا تو وہ صرف حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہوگا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں"

ہٹلر طاقت اور قوت پر پورا بھروسہ رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آفرینش آدم سے لے کر اس وقت تک قوت ہی نے حکومت کی ہے اور یہی چیز "نئے زمین و آسمان کی تخلیق" میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اسی طرح وہ قوت اور طاقت کے ساتھ ساتھ تعصب اور تشدد کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

ہٹلر امتیاز نسل کے معاملہ میں بھی ٹرٹشک سے بالکل متفق ہے۔ موخر الذکر اپنی مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ آریہ قوم بڑی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ تمام نسلوں سے زیادہ بہادر اور شجاع ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کی تلوار سے حفاظت کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے جس کو وہ اپنی روحانی جد وجہد سے حاصل کرتی ہے۔ ہٹلر کے نزدیک نسل کی بقا ذاتی آزادی کے تحفظ سے زیادہ ضروری اور اس کی یہود دشمنی کا بھی ایک بڑا سبب یہی آریہ پرستی ہے۔

ٹرٹشک نے ایک مرتبہ سامی نسل کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا:

"اب آریہ لوگ روپیہ پیسے کا انتظام کرنے کے اہل ہوگئے ہیں اس لئے یہودیوں کی کوئی ضرورت نہیں...... اس کے علاوہ اس سامی نسل کی تمام خرابیاں منصہ شہود پر آرہی ہیں اور اس طرح وہ ہمارے لئے روز بروز خطرہ کا سبب بن رہی ہے"

ہٹلر نے یہودیوں کی "ضرورت" قطعاً بھی تسلیم نہیں کی ہے، نازی جرمنی نے ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک برتا ہے اور جس طرح ان کی زندگیوں کو یکسر آہ اور کراہ بنا دیا ہے، وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ہٹلر عورتوں کے باب میں بھی ٹرٹشک کا بالکل ہمنوا معلوم ہوتا ہے۔ برلن کے اس حکیم فاضل کے نزدیک بھی عورت کی زندگی صرف گھر اور بچہ سے متعلق ہونا چاہیے اور ہٹلر بھی یہی سمجھتا ہے کہ عورت کا اہم ترین فریضہ تدبیر منزل سے باخبر ہونا ہے ٹرٹشک اور ہٹلر دونوں اسی بات کے خواہاں ہیں کہ عورتوں کو ایک مضبوط قوم پیدا کرنا چاہیئے۔ آمر جرمنی کے نزدیک شادی کا مقصد نصف

انسان اور نصف بوزینہ قسم کے جانور" پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی تندرست و توانا قوم پیدا کرنا ہے جو اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے لحاظ سے اقوام عالم کو زیر و زبر کر سکتی ہو، وہ ایسی عورتیں نہیں چاہتا "جو نہ صحیح معنوں میں عورت ہیں اور نہ مرد بلکہ ایک تیسری جنس ہیں جس کو خود مرد کے اعمال نے پیدا کیا ہے"

ٹرٹشک نے ہٹلر پر جو احسان کیے ہیں اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ فوج کی شدید تابعداری کے معاملہ میں بھی جرمنی کا آمر ٹرٹشک کا خوشہ چین نظر آتا ہے۔ موخر الذکر کا خیال ہے کہ فوج اپنی کوئی منشا اور رائے نہیں رکھ سکتی۔ اس کو ریاست کے حاکم اعلیٰ کا اسی قدر فرمانبردار ہونا چاہیئے جس طرح ایک غلام آقا کا ہوتا ہے۔ ٹرٹشک نے ان خیالات کا اظہار ۱۸۹۲ء میں ایک لکچر کے سلسلہ میں کیا تھا۔ ہٹلر نے غالباً اسی اصول کے ماتحت جون ۱۹۳۴ء میں ان تمام لشکریوں کو نکال باہر کیا جو اختیارات کے طلب گار تھے۔ جنرل وان شلیشر (Von Schleicher) کا قتل اور بہت سے خاکی پوشوں کا ختم کیا جانا اسی قبیل کی چیز ہے۔

نازی جرمنی کا مطالبہ مستعمرات بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مطالبہ محض خام پیداوار کے حصول کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ٹرٹشک کہتا ہے کہ اس مطالبہ کی نوعیت تاریخی، نفسیاتی، سیاسی، اور معاشیاتی ہے اور جس طرح بھی ہو" اس ضرورت کو پورا کرنا چاہیئے۔ ہٹلر کا بھی راسخ عقیدہ ہے کہ "ہماری کھوئی ہوئی نو آبادیاں پارلیمانی الفاظ سے نہیں بلکہ صرف چمکدار تلوار اور خوں ریز جنگ سے حاصل ہو سکتی ہیں"

ٹرٹشک نے لکھا ہے کہ آئندہ جرمنی کے بلند مرتبہ کا انحصار ان لوگوں کی تعداد کثیر پر ہوگا جو جرمن بولتے ہوں گے۔ نازی جرمنی بھی اس بات کا خواہش مند ہے کہ جرمن کلچر کو فروغ اور وسعت دی جائے۔ اور جہاں جہاں اس کے اثرات موجود ہوں، انھیں باقی رکھا جائے۔ وہ اسی بنا پر خود قراری (Self Determination) کے اصول کا بڑا علمبردار ہے برازیل (Brazil) میں جرمن زبان، جرمن اخبارات، اور جرمن اسکولوں کو قائم رکھنے

کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی ہے۔ اور یہی عمل سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ میں کیا گیا ہے لیکن اس کوشش کی سب سے زیادہ عملی صورت سوڈیٹن، موریویا، بوہیمیا، سائیلیشیا، ڈینزگ اور میمل میں نظر آتی ہے اس لئے کہ ان میں سے بہت سے علاقے آج جرمن ریشتاغ میں شامل ہو چکے ہیں۔

جرمنی کی موجودہ سیاست کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اس کے ماضی سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے۔ نازیت سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کے ماضی کی عملی تفسیر۔ جو لوگ اس کی بنیادیں حال اور صرف حال ہی کی ہنگامی فضا میں تلاش کرتے ہیں وہ حقیقتاً ایک بڑی تاریخی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمیں نازیت کی صحیح تشریح کے لئے جرمنی کی پرشین پالیسی، بسمارک کی تمناؤں اور جرمن شہنشاہوں کی ۱۸۷۰ء، ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۲ء کی حکمت عملیوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور سب سے زیادہ توجہ ہمیں ان ذہنی پیشواؤں کی طرف مبذول کرنا چاہیئے جن کے خیالات نے جرمنی کو موجودہ قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی روشنی میں نازیت کی جو شکل مرتب ہوگی وہ بہت زیادہ کریہہ النظر اور ہیبتناک معلوم ہوگی لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ آج اس نے جرمنی کو یورپ کی سب سے بڑی قوت بنا دیا ہے اور اتنے وسیع[1] رقبہ پر حکومت عطا کی ہے جو اسے ولیم ثانی کے زمانہ میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ آج اس کی عسکری قوت روس سے بھی زیادہ ہے اور ہوائی طاقت فرانس اور انگلستان دونوں سے بہتر ہے، تجارت کے میدان میں بھی جرمن مسابقت بڑی اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے اور اس کے معاشی وسائل میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے۔

---

[1] قیصر ولیم ثانی کے زمانہ میں جرمنی کا رقبہ ۲۰۸۰۰۰ مربع میل تھا اور آج زیکوسلواکیا شامل ہوجانے کے بعد اس کا رقبہ ۲۹۵۳۴۴ مربع میل ہے۔ (خ۔ا۔ف)

پریوں کی کہانیاں

(۱)

"اگلے زمانے میں" میں نے کہنا شروع کیا "بہت پرانے زمانے میں جب زندگی بالکل اَنگھڑ اور ناتراشیدہ تھی، جب تمدن کی بنا نہیں پڑی تھی اور کہیں کسی قسم کے کارخانے کا کسی کو بعید ی خیال بھی نہ ہوا تھا، لوگ خوش اور مطمئن تھے! کیونکہ حق و صداقت پر جستجو و تلاش کی گمراہیوں کے اتنے پردے نہ پڑ گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ بصیر تھے فطرت عالم کو دیکھتے اور خدا کو پہچانتے تھے! ان کو یقین تھا کہ خدا اسی عالم ایجاد کے اندر ہے! آج کی طرح وہ اسے عرش نشین و کرسی مقام نہ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ہواؤں کے اندر چلتا ہے، پانی کے اندر بہتا ہے، اور زندگی کا ہر مظہر، قطع نظر اس سے کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے، خدا کا مظہر ہے، خدا ہے! انھیں کامل یقین تھا کہ یہ عالم آب و گل ہی اس کی جلوہ گاہِ ناز ہے، کہ وہ بس ایک جلوہ ہی تو ہے، وہی تو جلوۂ حیات ہے! تمہاری، میری اور سب کی روحیں اسی کے جلوۂ نور کا ایک جزو ہیں۔

"میں کیا کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ کس طرح گر انھوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا اور اس کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کی باتیں سادہ تھیں اور ان کے خیالات غیر ملوث تھے! انھوں نے بتا دیا کہ چاند اور سورج کی چمک ان کی روح ہے، ہواؤں اور پانیوں کی قوت روانی ان کی روح ہے! یہ ان کا بس انداز بیان تھا؛ مطلب یہ تھا کہ کائنات میں کوئی شے روح سے خالی نہیں! انھوں نے ہر چیز میں زندگی کا احساس کیا تھا، کیونکہ یہ ایک صداقت تھی! ان کی کہانیاں اسی صداقت کے بیان اور تمثیلیں ہیں!"

حیرت زدہ دردانہ مجھے تکتی رہی۔

"تم اس کا احساس و یقین نہیں کرتیں؟" میں نے پوچھا: "اس تمام منظر نور و رنگینی کو دیکھو کہ وہ کس طرح ندی کے گیت کی سنگت بنا ہوا ہے! کیا تم اس سب کو مردہ کہہ سکتی ہو جو صفات وجود کی تکمیل میں لگا ہوا اس ذات کو نمایاں کر رہا ہے؟"

"نہیں میں محسوس کر رہی ہوں!" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"ان لوگوں کے بعد ان سے بھی بڑے لوگ آئے، انھوں نے وحدتِ وجودی کو سمجھا" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا: "اور انھوں نے بتایا کہ ہر شے میں روح ہے مگر وہ روحیں جداگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی روح ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے! وہ جو روشنی کے اندر ہے، جو ہواؤں کے اندر ہے، جو سبزہ و برگ کے اندر ہے، اور جو حیوان و انسان کے اندر ہے، ایک ہی شے ہے! ہر چند مظاہر لاتعداد ہیں مگر مظہر ایک ہی ہے: وہ آئینہ خانہ کی شمع ہے کہ ہر چھوٹے بڑے صاف اور دھندلے شیشوں میں ضو انداز ہوتی ہے! اور وہ ذات واحد، وہ روحِ عالم، جس نے کائنات بنائی، اپنی اسی کائنات کے اندر سکونت رکھتا ہے، جس طرح تمہاری روح تمہارے اندر رہتی ہے!"

میں سانس لینے کو رکا تو وردانہ نے کہا۔

"کہے جاؤ!"

"یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ روح، یہ خدا محبت ہے ——— محبت جو لازوال ہے! محبت کا وہ شمہ بھی جسے انسان محسوس کرے خدا ہے اور باقی ہے! اور وہ اپنے لباس کو اپنے لئے موزوں و خوب صورت بناتا رہتا ہے! ہماری روحیں نورِ الٰہی کا جزو ہیں اور یہ سب کائنات بھی اسی نور کا جلوہ ہے ——— اور اس لئے کہ اس کا جلوہ فنا نہیں ہو سکتا یہ دنیا ہمیشہ کے لئے ہے اور ہماری دنیا ہے!"

"تو پھر دنیا نے اتنی حسین اور حیرت ناک حقیقت کو کیوں نظر انداز کر دیا؟" وردانہ نے سمجھا اور سوال کیا۔

"فطرت کے پیامبروں نے اسی صداقت واحدہ کو دنیا پر ظاہر کیا تھا۔ مگر ان کے بعد مذہب ذریعہ معاش بن گیا اور ان پیشہ ور مذہبوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈالا تاکہ ان کا اپنا تفوق قائم رہے: انھوں نے اس کی حقیقت کو نہ سمجھا، نہ مانا، اور مٹایا۔"

"تو کیا صداقت مٹائی بھی جا سکتی ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"نہیں۔ صداقت باوجود اپنے مخالفوں کے مٹائی نہیں جا سکتی: وہ ہر ایسی کوشش کے بعد تازہ دم اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ رونما ہوتی رہی ہے! جب اور جہاں اس پر خاک ڈالی گئی ہے، تب اور وہیں شدید قوت و تجلی کے ساتھ جلوہ فگن ہوئی ہے! وہ مٹتی نہیں۔ ایک قلیل وقفے کے لیے دھندلی کر دی جائے۔ سلا دی جائے، مگر وہ پھر تابندہ و بیدار ہو جاتی ہے!"

"میرے صاحب! میں اس روشنی کے لیے بہت ممنون ہوں! مگر میرا دماغ اب بالکل تھک گیا ہے!" یہ کہہ کر دردانہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ اس کے دل کی تڑپ کو میں نے اپنے دل کے اندر محسوس کیا اور اس کی تابش میرے اندر سرایت کر گئی!

میں نہیں سویا: میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ اس صداقت کے خیالات کا جو اتنی عیاں اور اتنی سادہ ہے! انسان کی حماقت آمیوں کے خیالات کا! مذہبی پیشوا اس کو مستور و مدفون کرتے ہیں کہ ان کی العنی خدا کی کرسی ان کو مل جائے! اس بے ایمانی کے خیالات مجھے حیرت میں ڈال رہے تھے!

میں سوچ رہا تھا کہ سائنس داں بھی اسی کوشش میں رہے ہیں۔ اس کا سبب! میں نہیں جانتا۔ شاید بے بصیرت ہونے کے باعث! لیکن وہ اگر اپنے علم کی واقعیت کا احساس کر سکتے ہیں تو ان پر اس حقیقت کو بھی ضرور منکشف ہونا چاہیے۔ ورنہ ان کے نظریے غور و فکر کا نتیجہ نہیں محض اتفاقی امور ہیں؟ عالم کے ارتقا کا ایک نظام مرتب کیا جاتا ہے جو اپنی تفصیلات میں کم و بیش درست ہے۔ لیکن اس کے ماننے اور منوانے والے نہیں دیکھتے کہ اثبات

ارتقائے عالم کے لئے جو استدلال وہ پیش کرتے ہیں وہی دلائل دیرا ہین اس بات کو بھی ثابت کر رہے ہیں کہ اشیائے عالم کے اندر ایک اور تنہا روح جاری وساری ہے"؛ ایک مقصد کی تکمیل کی طرف حرکت پیہم" اس کا نام ارتقا ہے! کیا یہ کام محض توانائی کا انجام دے سکتی ہے؟ توانائی کا عمل اور رد عمل تو مساوی و یکساں ہے : توانائی کا قانون بس یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پھیلائے اور منتشر کرے، تاکہ جہاں نہ حرارت ہے نہ برودت نہ نور ہے نہ ظلمت، جہاں کچھ بھی نہیں، وہاں اعتدال پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ قوت جو اس بات کی جانچ پڑتال کرتی ہے جو ترازو کا پاسنگ دیکھتی ہے، اور توانائی کی مکرر ترکیز کرتی ہے، وہ حیات ہے! یہ کام حیات کے سوا کوئی دوسری قوت انجام نہیں دے سکتی۔ پھر اگر ناقابل شمار قرنوں کے بعد بھی آفتاب روشن ہے، پانی بہ رہا ہے، ہوائیں چل رہی ہیں، تو اس کی علت غائی کیا ہے؟ وہ حیات ہے! چنانچہ اس سے بڑی صداقت کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی نامعلوم طریق پر حیات اشیائے عالم میں جاری وساری ہے، ان کے اندر مکین ہے : اسی سے کائنات کی تخلیق ہوئی اور وہی ان کو قائم رکھتی ہے۔

یہ علمائے سائنس اتنے خفاش چشم کیوں ہیں کہ وہ خود اپنے نظریوں کے ناقابل ابطال نتائج کو نہیں دیکھ سکتے؛ وہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ پرانے قصے، پریوں کی کہانیاں ہفوات نہیں بلکہ صداقتوں کی صداقت ہیں؛

پیشوایان مذہب اور سائنسداں اس بارے میں دونوں برابر ہیں۔ وہ سامنے کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے؛ اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی جرأت اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ چوندھیا جائے گی! مذہبی پیشوا تو خدا کو غائب کر دیتے ہیں، اور علمائے سائنس اس کا انکار کر دیتے ہیں؛ لیکن خدا اسی عالم میں ہے، وہ کائنات کی روح ہے اور اشیا اس کا جسم ہیں جو موت کے گل سے ہمیشہ درست یا جوان رہتا ہے ــــ یہاں تک کہ تکمیل بعید کا خواب پورا ہو یعنی کامل دنیا میں زندگی خدا ہے اور خدا غیر متغیر محبت!

دوسری قوموں کی طرح قدیم یونانیوں نے بھی اس سے قبل کہ وہ بصیرت سے محروم ہوں اس حقیقت کی جھلک دیکھی تھی اور اسے بڑی خوبی سے بیان بھی کر گئے ہیں۔ مگر آج ان کے اساطیر کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ خود ہم میں سے وہ صداقت مفقود ہے جو ان اساطیر کے اندر چھپی ہوئی صداقت کی گونج ہو سکے! با ایں ہمہ یہ تمثیل غور طلب ہے:-

ٹیٹینس (Titans) اوشینس (Oceanus) اور ٹی تھیز (Tithys) یعنی خالص عنصری قوتیں سمندر پر حکمراں تھیں مگر اولمپیئن نیپچون (Neptune) اور اہلیہ البحر ایمفی ٹرائٹ (Amphitrite) نے ان کو فتح کیا تو سمندر میں ایک روح دوڑ گئی۔

تحت بحر میں دیکھنے والا آج بھی دیکھ سکتا ہے، جس کی آنکھوں میں نور ہے اور کان گنگ نہیں، اب بھی دیکھ اور سن سکتا ہے کہ:۔

"اے خدائے بزرگ و برتر! میں کسی فرسودہ مذہب کی پیروی میں ریاکارانہ و بے خلوص نماز یا پوجا نہ کروں گا! میں منکر کہلایا جا کر بالائے کوہ اور سر ساحل تیرے وہ جلوے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں جو مجھے اس وسیع کائنات میں اپنی بے بسی بھلا دیتے ہیں!"

من خدا را دیدم آنجا بے حجاب   کوہ و دریا و غروب آفتاب

(۲)

"موت فی الواقع ہولناک ہے!" میں نے تائید اً کہا: "یہ خیال کہ آگے پیچھے یہ سب خوبصورت پرند کسی نہ کسی طریق پر فنا ہو جائیں گے، سخت دلدوز خیال ہے! اور ہر چیز — ہم سب بھی باقی نہ رہیں گے!"

"ہاں، ہم —— ہم سب بھی!" درواند نے دہرایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے: "ہر چیز فنا ہو جاتی ہے! موت کا وجود کیوں ہے؟ ہم سب کیوں نہیں جیتے؟"

ایسا معلوم ہوا کہ آفتاب کی پرمسرت تجلیوں میں یک بیک تاریکی داخل ہو گئی ہے،

اس کی زندگی تاب حرارت میں دعنا شہر شامل ہوگئی ہے۔ ایک خوف سے نے دن کی شان تجلی کو ناقص کر دیا ہے۔

"تم اس کی کیا توجیہ کرتے ہو؟" اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "اس کی تفریح میں کوئی پریوں کی کہانی نہیں!"

"پریوں کی کہانی!" میں نے متحیرانہ دہرایا۔

"جی ہاں، یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی تمام گتھیاں، اب سے مدتوں پہلے، پریوں کی کہانیوں میں سلجھا دی گئی ہیں۔" دردانہ نے بتایا۔ "اور دنیا اب اگر پھر ان معموں میں الجھی ہوئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس لئے نہ تو وہ ان کہانیوں کی تاویلوں کو سمجھ سکتی ہے اور نہ ان کے حل کو نئی تمثیلات کے اندر بیان کر سکتی ہے۔"

میں نے جمالی کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن کے اشارے سے اعتراف کیا۔

"اس راز کی بھی کرامت کیا ہے اور کیوں ہے توجیہہ کی جا چکی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" جمالی نے جواب دیا۔

"تو وہ کہانی ضرور سناؤ!" میں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جمالی کچھ پس و پیش کرتا نظر آیا۔

"اپنے شوہر سے کہو کہ وہ کہانی ضرور سنائیں۔" میں نے دردانہ سے ہنس کر کہا۔

اس نے جمالی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ وہ بھی جواب میں ہنسا۔

"بہت اچھا۔ مگر شرط یہ ہے کہ دخل نہ دینا!" جمالی نے کہا۔

جمالی کے حکم کی تعمیل میں ملاح نے شکاری کو سایہ دار کنارے پر کھڑا کر دیا جہاں شاخیں ہمارا منہ چوم رہی تھیں اور ہوا خاموش تھی۔

"مجھے امید ہے کہ کہانی غم انجام نہ ہوگی۔" میں نے اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

"پریوں کی کہانیاں کبھی المناک نہیں ہوتیں، کیونکہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔" جمالی نے جواب میں کہا "وہ حقیقت جو غیر مبتدل ہے۔ مگر متغیر شکلوں کے اندر مستور رہتی ہے ہمیشہ حسین و پُسرت ہے!"

"موت کی حقیقت بھی!" میں نے سوال کیا۔

"جی، موت کی حقیقت خاص طور پر ہے!" جمالی نے جواب دیا۔

"ٹھتونس (Tithonus) کو معبودۂ سحر (Dawn) کے ساتھ محبت تھی۔" جمالی نے کہنا شروع کیا۔ اس کے چہرے سے کمال مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ٹھتونس کون تھا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"ہر انسان ٹھتونس تھا، ہے، اور ہوگا ——— سب مرد عورت، اور عورتیں، تم اور میں ٹھتونس ہیں!"

"اسے نمودِ سحر (Dawn) سے محبت کیوں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں نمودِ سحر سے عشق نہیں؟ صبح استعارہ ہے اشیاء کے اٹھان سے، اس کے ریان سے جب ہر چیز کمال دلکش ہوتی ہے۔ ہمارا عنفوان بھی نمودِ سحر ہے کہ اس وقت کائنات زیادہ حیرت ناک اور امید و آرزو کی ترقی پذیر روشنی سے منور ہوتی ہے! صبح کی روشنی میں ہم ہر کو دیکھ لیتے ہیں؛ وہ صبح حیات ہے، گلزار بہاراں ہے، کلیوں کی لب کشائی ہے۔ بیدار طائروں کی پہلی الاپ ہے! نمودِ سحر کی انگلیاں گلاب رنگ ہیں، وہ جس کو چھو لیتی ہیں جوانی کے رنگ سے رنگ جاتا ہے!" وہ چپ ہو گیا۔ اس کے الفاظ سے پیدا شدہ خیالات نے میرے دل اور روح کو چھا لیا۔ "ٹھتونس موت سے ڈرتا تھا ——— تم اور میں ٹھتونس ہیں!" پھر خموش ہو گیا اور سکوت و خوف کو جو اس کے الفاظ سے پیدا ہو گئے تھے اپنی کہانی کہنے کے لیے چھوڑ دیا۔

پانی کی ہلکی لہریں جو کشتی پر آ جانا چاہتی تھیں خموش ہو گئیں۔ گہرے اور سنہرے سکوت میں

کوئی آواز مخل نہ تھی جاکی کے الفاظ یا ان کا اثر اس سکوت پر چھا گیا۔

"ٹیتھونس نے نمودِ سحر سے آرزو کی کہ اس کو غیر فانی بنا دے ٹیتھونس تم ہو یا میں ہوں اس نے جو مانگا وہ مل گیا، اب وہ مر نہ سکتا تھا۔ مگر بوڑھا ہوتا جا رہا تھا —— اسی طرح ہم سب بوڑھے ہو جائیں گے۔ مگر نمودِ سحر ہمیشہ نوجوان ہے ظلمات موت کے غسل سے ہر صبح تازہ وشاداب جلوہ گر ہوتی تھی؛ نمودِ سحر کو موت کا خطرہ نہیں، موت کو علم ہے کہ سحر غروب آفتاب اور رات کی تاریکی کے اندر سے ہر روز نیا ریعان لے کر نمودار ہوتی ہے —— کہ اصل میں موت وحیات ایک ہی ہیں!"

ٹیتھونس کا کیا حشر ہوا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"وہ اتنا ضعیف ہو گیا کہ موت کی آرزو کرنے لگا۔ اگرچہ وہ امر ہو چکا تھا مگر اب زندگی سے عاجز تھا۔ اس نے سحر سے پھر التجا کی کہ اسے موت یعنی دائمی شباب مل جائے، کیونکہ اس کا غیر فانی ہونا اب اجیرن ہو رہا تھا؛ اگر ہم تم غیر فانی بنا دیئے جائیں تو یہی حالت ہوگی —— نمودِ سحر ایک غیر فانی مخلوق کو موت نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس نے ٹیتھونس کو ٹڈے کا چولا دے دیا۔ اب وہ صبح کے وقت سحر کے گیت گاتا رہتا ہے؛ وہ اب بقائے دوام کی آواز ہے جو سحر کے حضور مناجات گاتی رہتی ہے موت باب الحیات ہے تنہا دروازہ ہے! اور یہی مناجاتِ سحری ہے"

"اور موت کی مناجات کیا ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"موت کی مناجات بھی وہی ہے —— یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں!" اس نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی تھی سو ہو چکی! اب آپ اور کیا سننا چاہتی ہیں؟" وہ کہنے لگا۔

"کچھ نہیں!" میں نے جواب دیا۔

شام ہوتے ہم لوگ واپس ہوئے، سورج اپنی شانوں کے ساتھ غروب ہو چکا اور دن کا بادشاہی دربار ختم تھا۔

جمالی اور وردانہ صبح ہوتے رخصت ہوئے اور اپنی ناؤ پہ چلے گئے، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ ہمارے مہمان ہوئے، ان سے مکرر ملنے کا اشتیاق ہے۔ تاکہ ان کی شادی کا انجام معلوم کرسکوں میرا خیال ہے کہ نتیجہ اگر اچھا ہوا تو بہت اچھا ہوگا اور برا ہوا تو نہایت برا؛ یہ دونوں اتنے توانا اتنے جذباتی اور اتنے فطری ہیں کہ دونوں میں ایک بھی ادھوری شادی کو منظور نہ کرے گا — اور نیم شادی منجملہ اور رواجوں کے ایک عام رواج ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود کل کا طالب ہوگا یا پھر بالکل کچھ نہ لے گا؛ یا تو دونوں کو ایک روحی وحدت ہونا چاہیے یا پھر وہ جدا ہوجائیں گے؛ یہ مجھ پہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے؛ مگر دونوں میں کون سی صورت وقوع پذیر ہوتی ہے، مجھے اس کی تلاش ہے؟

صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

(اقبال)

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آدمی پر طاقت اور جثے کا خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے چونکہ پہلوان سمجھے جانے کا اتنے ہی فائدے ہیں
جتنے پہلوان ہونے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کشتی لڑنے والے پہلوان ہوتے ہیں وہاں ایک قسم ایسے
ہلوانوں کی بھی ہوتی ہے جو دنگل سے بچتے ہیں گھر گھی شکر دودھ میدہ کھا کھا کر ایسی صورت شکل بنا لیتے ہیں
لہ انھیں چیلنج دینے کی کسی کو ہمت ہی نہیں ہوتی اور مصلحت انھیں ایسے گر سکھا دیتی ہے کہ وہ داؤں پیچ کریں یا
نہ کریں جیت انھیں کی رہتی ہے۔

یورپ والوں کی نظر میں امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ اسی قسم کے پہلوانوں کی حیثیت رکھتی ہے فرق صرف
یہ ہے کہ یورپ کی جمہوری ریاستیں امریکہ کی ہمدردی اور مدد کو اپنا خاص حق سمجھتے ہیں اور یورپی سیاست میں
جو فرقہ بندیاں ہوتی ہیں ان میں یہ چاہتی ہیں کہ امریکہ والے ان کے ساتھ مل کر اس کا پلہ بھاری کر دیں امریکہ
والے یہ نہیں مانتے کہ وہ دنیا میں اس لئے پیدا کئے ہیں کہ یورپی سیاست کی ترازو میں وزن بڑھانے کی ضرورت
پیدا کر دیں اور جب یورپ کی جمہوری ریاستیں ان سے ملاقات بڑھانے کی کوشش کریں تو انھیں فوراً شبہ
ہوتا ہے کہ انھیں دھوکا دے کر ان سے کوئی کام نکالا جائے گا یہ شبہ سچا نہیں ہے اسی وجہ سے اسے دور کرنا بہت
مشکل ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ کی سیاست امریکہ میں نصب کرنے کا شوق اور امریکی سیاست پر بڑی
ناجھنجلاہٹ پیدا کر دیتا ہے لیکن سیاست میں مزاج کو غرض کا غلام بن کر رہنا پڑتا ہے اس لئے جب کبھی امریکہ
والے اپنی کسی غرض سے یا خالی اخلاقی جوش میں یورپ اور ایشیا کے جھگڑوں میں حصہ لینے پر آمادہ نظر آتے
ہیں تو یورپ کی جمہوری ریاستوں میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور مشورے کی ہر مجلس میں امریکہ کے نمائندے
کے لئے صدارت کی کرسی خالی کر دی جاتی ہے پچھلی جنگ عظیم میں پریذیڈنٹ ولسن کی جو عزت بڑھائی اور

فرانس میں کیا کچھ ہوا اس کا حال آپ جانتے ہیں لیکن اس وقت مزدوری کا نتیجہ جو ہوا وہ شاید آپ بھول گئے ہوں مگر امریکہ والوں کو وہ سبق [illegible] یاد ہے اور اسی سبب سے وہ اب یورپی سیاست کی چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتے ہیں۔

پچھلے چار پانچ برس کے واقعات کچھ ایسے تھے کہ امریکہ والے چپ نہ رہ سکے تھے نیویارک کے Mayor اور ہارورڈیا نے کبھی مسٹر کورڈل ہل اور کبھی خود پریذیڈنٹ روزولٹ نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے یورپ میں کوئی خفا ہوا کسی کو امید ہوئی کہ امریکہ میں عام رائے یا حکومت کرنے والوں کو اپنی مصلحت امریکہ کو یورپ کے قریب لے آئے گی اور جمہوری حکومتوں کو ایک بڑا سہارا ملے گا لیکن سچ پوچھئے تو امریکہ کے لیڈروں نے پچھلے چار پانچ سال میں جو کچھ کہا اس کا تعلق یورپ کی سیاست سے نہیں تھا بلکہ امریکہ کے اندرونی معاملات سے تھا اور یورپ کی سیاست میں تو امریکہ والوں نے قسم کھائی ہے کہ کبھی دخل نہیں دیں گے ان کے لئے مناسب بھی یہی ہے جرمنی ترقی کرلے اور آدھے یورپ پر قبضہ کر بھی لے تو اس میں ان کا کوئی نقصان نہیں وہ اپنے الگ اور محفوظ بیٹھے رہیں گے تجارت کو دیکھئے کہ اس میں اب تک اس کا اصل مقابلہ جرمنی سے نہیں بلکہ انگلستان سے ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک طرف برطانیہ یورپی سیاست میں ان کا سہارا چاہتا ہے اس بنا پر کہ وہ آزادی اور جمہوری حکومت کا علمبردار ہے تو دوسری طرف جنوبی امریکہ کی تجارت میں وہ ان کی جڑ کاٹتا رہتا ہے، اس لئے کہ امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار ملک وہی ہے سیاست اور تجارت پر اخلاق اور مذہب کا رنگ چڑھانے میں خود امریکہ اتنا ہوشیار نہیں ہے جتنا کہ انگلستان والے ہیں اور اب جو وہ ایک بار بڑی دھوم دھام سے بے وقوف بنائے جا چکے ہیں تو وہ اور بھی چوکنا ہو گئے ہیں انہیں اپنی آزادی بہت عزیز ہے لیکن وہ دوسروں کو اپنی طرح آزاد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے وہ جمہوریت کو حکومت کا سب سے اچھا طریقہ مانتے ہیں لیکن کہیں اگر یہ طریقہ چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے تو انہیں دکھ بھی نہیں ہوتا وہ اطمینان سے رہنا اور اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہیں ہیں کہ فسطائی حکومتوں کے تیور دیکھ کر گھبرا جائیں اس لئے کہ ان کے اپنے ہاں ان حرکتوں کا خاصا رواج ہے جس کا الزام فسطائی حکومتوں پر لگایا جاتا ہے یعنی [illegible] کھلی بات خراب تو امریکہ والے افسوس کریں گے وعظ کہیں گے [illegible]

بیٹھ رہیں گے اور اگر تہذیب کی خدمت ملائی پھر گئی تو دنیا یورپ والوں کو خود ہی فیصلہ کر لینے دیں گے۔

۱۴ر اپریل کو پریذیڈنٹ روز ولٹ کا ڈکٹیٹروں کے نام جو پیغام پہنچا اور ۲۸ر کو ہر ہٹلر نے اس کا جواب دیا اسے سمجھنے کے لیے ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے آپ کو پریذیڈنٹ روز ولٹ کا پیغام پڑھ کر یہ خیال ہوا ہوگا کہ انھوں نے ایک ایسے بزرگ کی زبان اور انداز میں گفتگو کی ہے جنھیں نصیحت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، جو تفصیلی معاملات میں الجھنا نہیں چاہتے بس اخلاق اور تہذیب کا نام روشن رکھنا چاہتے ہیں یہ انداز پریذیڈنٹ روز ولٹ اس لئے اختیار کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی قوم کا انداز ہے لیکن ہر ہٹلر کی طرف سے نہیں بلکہ ایک غیر جانب دار کی طرف سے اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی، اٹلی نے تہذیب کی جو خدمت کی ہے اس کا امریکہ والے بھی مدتوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے اور اگر آپ خوبیوں کے گننے کی جگہ عیبوں پر نظر کر کے انصاف کرنا مناسب سمجھتے ہوں تو اس لحاظ سے بھی آپ امریکہ والوں کو دوسروں سے بہتر نہ پائیں گے پریذیڈنٹ روز ولٹ نصیحت صرف اس لئے کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں کہ ان کے ملک میں سرمایہ افراط سے ہے اور اسے کسی دشمن کا خوف نہیں۔ لیکن دنیا کی حالت ایسی ہے کہ خطرہ اچانک پیدا ہو جائے تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ اس لیے امریکہ کے رہبر چاہتے ہیں کہ قوم کو بیدار رکھیں اور سامان جنگ میں روپیہ لگانے پر تیار کریں۔ یورپ میں اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ کہنا پڑتا ہے امریکہ میں پریذیڈنٹ یا اس کے کسی سکریٹری کی تقریر ہو جاتی ہے۔

پریذیڈنٹ روز ولٹ نے ڈکٹیٹروں کو کہا ہے کہ آپ حضرات تین چار آزاد قوموں کا خون کر چکے ہیں اور چند ایسی ہیں کہ اسی طرح ڈر رہے ہیں کہ ان کی جان نکلی جا رہی ہے، یورپ کی جمہوری ریاستوں میں یہی بات کل تک سے کبھی جا رہی ہے، مسٹر روز ولٹ بہت پہلے ڈکٹیٹروں کو اس کی دعوت دے چکے ہیں کہ جھگڑے اور سمجھوتے کے ذریعے کام لو اسلحہ [illegible] جنگ میں دشمنانہ [illegible] کا استعمال [illegible] کریں [illegible]

ہر ہٹلر نے ۲۸ر اپریل کو پریذیڈنٹ روز ولٹ کے جواب میں کہا کہ انھیں پریذیڈنٹ روز ولٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ ہر جنگ دنیا کی تباہی کا سبب ہوگی۔ ہر لڑائی کا عالمگیر ہونا لازمی نہیں [illegible] [illegible] [illegible] ایک دوسرے سے [illegible]

پیلائے سب کی سلامتی کا ذمہ اپنے اوپر لے لیں۔ یہاں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر ہٹلر برطانیہ سے باتیں کر رہے ہیں اگرچہ منہ اس کا امریکہ کی طرف ہے اور یہ بھی آپ سمجھ جائیں گے کہ برطانیہ سے یہ باتیں کیوں کی جارہی ہیں۔ ہر ہٹلر جواب دینے میں بڑے تیز ہیں اور اگر آپ جمہوری اخباروں سے اثر لے کر پہلے ہی سے ان کی ہر بات کو غلط اور برا نہ سمجھ لیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے ہر معاملہ میں اگر اپنی صفائی نہیں کی ہے تو دوسروں پر اتنے الزام لگا دئے ہیں کہ کوئی برا کہنے یا برا بن کر نصیحت کرنے کا حقدار نہیں رہتا۔ لیکن ان کی تقریر کا یہ حصہ اگرچہ بحث کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ نئی بات انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانیہ کا سامراج پھیلا ہوا ہے ویسے ہی جرمنی کو سامراج پھیلانے کا موقع دینا چاہیے۔ انگریزوں کا سامراج ایک کارنامہ ہے اور ہر ہٹلر نے صاف کہا ہے کہ یہ سامراج اس بات کا ثبوت ہے کہ اینگلو سیکس قوم میں دنیا کو آباد کرنے اور تہذیب کی روشنی کو پھیلانے کی بڑی صلاحیت ہے' جس کی وہ دل سے قدر کرتے ہیں' لیکن ایک زمانہ تھا کہ جرمن سامراج دریائے رومانی سے بحر اسود Black Sea تک اور بحر شمالی سے بحر روم تک پھیلا ہوا تھا' یہ سامراج اپنی کمزوری کے سبب سے قائم نہ رہ سکا' اسی دوران میں جبکہ جرمنی اندرونی فساد میں مبتلا تھا انگریز دنیا بھر میں پھیل گئے مگر اب جو جرمنی متحد اور طاقت ور ہو گیا ہے تو اسے اپنے پرانے سامراج کو اسی شان کے ساتھ قائم کرنے کا حق پھر سے ہو گیا ہے اور ہر ہٹلر کے نزدیک یہ بڑی بے انصافی ہو گی کہ اسے اپنا حوصلہ پورا کرنے سے روکا جائے' یعنی جب ہر ہٹلر دل پر ہاتھ مار کر برطانیہ سے کہتے ہیں کہ آپ کو دولت عزت اور سامراج مبارک ہو تو برطانیہ کو بھی ان سے کہنا چاہیے' کہ آپ کو بھی آپ کی حکومت استبداد اور طاقت مبارک ہو اور خدا کرے اب ہمارا جیسا سامراج قائم کر کے ہماری طرح نام پیدا کریں اور دنیا میں تہذیب کی رونق پھیلائیں' ہر ہٹلر کو بڑا دکھ ہے کہ برطانیہ جنی خوشی سے مبارک باد دینے کی جگہ پولینڈ رومانیہ' اور روس سے معاہدہ کر رہا ہے اور اسی فکر میں ہے کہ جرمنی کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کے پڑوسیوں کے حوالے کر دے اسی دکھ میں انھوں نے اس معاہدہ کو جو ۱۹۳۵ء میں برطانیہ سے کیا تھا چاک کر ڈالا ہے' مگر وہ اب بھی برطانیہ سے دوستی اور اتحاد عمل کرنے پر تیار ہیں اور برطانیہ کو انھوں نے

یقین دلا دیا ہے کہ وہ اس سے لڑنا نہیں چاہتے، برطانیہ سے ان کا کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے سوائے نزاع کے معاملے کے لیکن وہ بھی ایسا نہیں ہے کہ دور نہ کیا جاسکے۔ تو سمجھئے ہر ہٹلر نے برطانیہ سے کہا ہے کہ ہم آپ سے کسی حالت میں لڑنا نہیں چاہتے اور اگر آپ رشک یا حسد یا ضد سے کام نہ لیں اور اپنے اخباروں کو تاکید کردیں کہ وہ بدتمیزی نہ کریں تو انشاء اللہ کبھی بھی لڑائی کی نوبت نہ آئے گی۔ ہمارا میدان عمل مشرقی یورپ ہے جس سے ان کی تجارت اور سیاست کو بھی ذرا واسطہ نہیں، ادھر کی جو حکومتیں ہیں اگر آپ نے ان سے معاہدہ کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہمارا مقابلہ کریں، تو پھر جو فساد ہوگا اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی، آپ یہ ذمہ داری خواہ مخواہ اپنے سر نہ لیجئے، ہم نے جیسے آسٹریا اور چکوسلواکیا پر بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے قبضہ کرلیا ویسے ہی ہم پولینڈ اور رومانیہ پر بھی قبضہ کریں گے ہمارے حوصلے پورے ہوجائیں اور پھر آپ دیکھئے گا کہ ہم دنیا بھر کے ساتھ کس نرمی سے پیش آتے ہیں اور خاص طور سے آپ کے ساتھ کیسا محبت کا برتاؤ کریں گے۔

معلوم نہیں گفتگو کے اس انداز کا برطانیہ کی سیاست پر کیا اثر پڑا، بہرحال ہر ہٹلر نے اس کا بھی انتظام کرلیا ہے کہ اس کا کام رکنے نہ پائے، اپنی تقریر میں پولینڈ سے انہوں نے جو معاہدہ کیا تھا وہ توڑ ڈالا ہے، پولینڈ کی سرحد کے پاس جرمن فوجیں جمع ہورہی ہیں اور خیال یہ ہے کہ جون تک اتنی جمع ہوجائیں گی، کہ سیاست کے ماہر ان کو آگے بڑھانے میں وہ بے زور نہ ہوں، ادھر برطانیہ اور فرانس معاہدوں کا جو مورچہ بنا رہے ہیں وہ جرمن گرد، ایک طرف سے دوسری طرف گراتے جاتے ہیں وہ اس کا جو حصہ قائم اور مضبوط ہے وہ شاید زمین کی سطح کے نیچے ہے، اس لئے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا، اس سلسلے میں جو آخری حادثہ ہوا ہے، وہ روسی سفیر کا استعفیٰ ہے، اگر اس کا سبب یہ ہے کہ اسٹالین کو برطانیہ سے اور فرانس سے معاہدہ کرنا منظور نہیں، تو پھر پولینڈ کا خدا ہی حافظ ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

قائم شدہ [illegible]ء جو زائرین بیت اللہ کو فریضہ حج ادا کرانے کے لئے اولیں اور معتمد ترین لائن ہے

مغل لائن سے حج کیجئے!

کمپنی کی ایک خاص حج سروس ہے جس کے جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ جہاز عازمانِ حج کو بمبئی، کراچی اور کلکتہ سے عدن پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں۔

جہازوں کے نام

ایس ایس "اکبر"...... ۴۰۴۳ ٹن — ایس ایس "جہانگیر"...... ۲۵۶۶ ٹن — ایس ایس
ایس ایس "علوی"...... ۲۵۶۶ ٹن — ایس ایس "خسرو"...... ۴۰۴۳ ٹن — "رضوانی"
ایس ایس "اسلامی"...... ۵۰۰۹ ٹن — ایس ایس "رحمانی"...... ۵۲۹۱ ٹن — ۵۲۰۷ ٹن

مال اور مسافروں کو لیجانے کے لئے دوسری سروسیں حسب ذیل ہیں

بمبئی اور کراچی سے شہر مکلا، عدن، بربرہ، جبوتی، مسووا، بندر سودان۔ اور جدہ کو ہر پندرہویں دن۔

بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی ماریشش کو ہر دوسرے مہینے۔

تمام جہازوں سے کیبن اور ڈک درجہ کے مسافروں کے لئے جگہ کا انتظام۔

تمام جہاز میں ہر مذہب و ملت کے لئے بہترین اقسام کے کھانوں کا لاجواب انتظام ہے۔

تفصیلات حسب ذیل پتہ سے معلوم کیجئے

ٹرنر مارسین اینڈ کو لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس:- ۱۶- بینک اسٹریٹ بمبئی "تار کا پتہ" "مغل" بمبئی

طاقت اور جوانی قائم رہنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا
اوکاسا
OKASA

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں نئے طلبا کا داخلہ ۱۵ جولائی ۱۹۳۹ء سے ۲۵ جولائی ۱۹۳۹ء تک ہوگا۔ درخواست داخلہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۹ء تک پرنسپل صاحب طبیہ کالج کے دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے اور دفتر کی جانب سے مقرر کی ہوئی تاریخ پر امیدوار کو کالج میں حاضر ہونا چاہیئے۔

تعداد مقررہ کے پورا ہونے کے بعد کسی طالب علم کا داخلہ نہ کیا جائے گا۔ قواعد داخلہ مفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔

عطاء اللہ بٹ

پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

اعلان

کلیم کے دفتر کو چونکہ ملیح آباد تبدیل کر دیا گیا ہے اور ڈکلریشن وغیرہ کے سلسلے میں ابھی کاروائی مکمل نہیں ہو سکی ہے اس لئے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ پرچہ مشترکہ مئی جون ۱۹۳۹ء کا شائع کیا جائے گا۔

قارئین کرام آئندہ سے مندرجہ ذیل پتے پر مراسلت فرمائیں۔

مدیر کلیم۔ دفتر کلیم۔ ملیح آباد۔ لکھنؤ

ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں

روحِ غالب۔ غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ صفحات (۲۴۰) مع تصاویر قیمت ۱۲/

نظام الملک آصف جاہ اول۔ اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھا جائے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر) قیمت صرف ۴/

من کی بیتا۔ صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکۃ الآرا مشورے۔ اس دلچسپ ادبی کتاب میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں۔ گھر۔ سواری، آرائش، خرید و فروش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں، نذر و نیاز، چندے مختلف رسومات، سینما، فیشن وغیرہ۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ مصنفہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے صفحات (۸۰) قیمت صرف ۸/

نذرِ دکن۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں۔ مجلد با تصویر یکا جائزہ صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۲/

عاصمہ (ناول) ایک دلچسپ اور مفید معاشرتی ناول جس میں ہندوستانی لڑکی کا ایک کیرکٹر کے صفات زندگی ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنفہ مولوی عبد اللطیف صاحب صفحات (۲۰۰) مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۱۲/

من کی دُنیا۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ اور پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ رعنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت مجلد عہ

مرقع دکن۔ اس میں قدیم عہد سے کر موجودہ دور تک کی دکن کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اکثر تصاویر نادر اور نایاب ہیں جو پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہیں۔ مضامین نظم و نثر بلند پایہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اس کی تیاری پر ہزاروں روپیہ کی لاگت آئی ہے اس سے بہتر دکن کی تاریخی معلومات کا ذخیرہ ایک کتاب میں شائع نہیں ہوا۔ صفحات (۱۹۰) تصاویر (۸۰) قیمت صرف دو روپے

مدراس میں اُردو۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور مدراس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ قیمت مجلد عمر

محرم نامہ۔ سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ۔ آج تک ایسا محرم نامہ شائع نہیں ہوا۔ مرثیہ گو شعرا اور مجالس کی نایاب تصویریں شامل ہیں۔ قیمت مجلد عہ

سرگذشت غالب۔ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ غالب کی تصویر بھی شائع کی گئی ہے۔ قیمت عمہ

تعلیمی صندوق (مکمل) قیمت دس روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ جامعہ دہلی

اخبار اتحاد پٹنہ کیلئے زبردست اپیل

انجمن ترقی اردوئے ہند کی جو مجلس انتظامیہ ۲۹-۳۰ اگست کو پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی، اس نے ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل اپیل شائع کی ہے۔

اتحاد صوبہ بہار میں زبان اردو کا پرانا اخبار ہے جو عرصے سے قومی اور ملی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ وہ اتنی مدت کی مستقل اشاعت کے باوجود اس وقت تک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکا ہے اگرچہ خیالات کے اعتبار سے ممکن ہے وقتاً فوقتاً طبقہ وخیال کی نمائندگی باحسن وجوہ پوری نہ کر سکا ہو لیکن زبان کی خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اردو زبان کا یہ ترجمان قائم و جاری رہے اس لئے ہماری خواہش ہے کہ بہار کے تمام اردو خواں بلا کسی لحاظ و خیال کے محض زبان اردو کی بقا و ترقی کیلئے اخبار اتحاد کے قائم و جاری رکھنے میں کوشاں ہوں جسکی سب سے آسان صورت یہی ہے کہ اسکی توسیع اشاعت میں جہانتک ممکن ہو ہاتھ بٹایا جائے۔

مرثیۂ اقبال

از

جناب اسد ملتانی

حضرت علامہ اقبال کی وفات پر جس قدر نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں اس مرثیہ کو اہل نظر نے بہترین قرار دیا ہے یہ دردانگیز نظم محض مرثیہ نہیں بلکہ اس میں حضرت علامہ کی شخصیت اور تعلیم کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے خاص پیغام کی طرف بہت موثر طریقے سے توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کا مطالعہ علامہ اقبال مرحوم کی یاد تازہ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہوگا۔

عمدہ کاغذ۔ اعلیٰ کتابت و چھپائی۔ قیمت ۳ر تین آنے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:- دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر

مطبوعاتِ امیریہ دار التصنیف والتالیف لکھنؤ

دیوانِ ثاقب یہ دیوان میرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اس کو طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے۔ تصاویر رنگین ہیں۔ حجم پانچسو پچاس صفحات قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible] (علاوہ محصول ڈاک)

انیس الاخلاق میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس صاحب رضوی ایم۔ اے۔ رکن امیریہ دار التصنیف والتالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت [illegible] علاوہ محصول

گیس کا دفاع آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت پر نظر کر کے یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت [illegible] (علاوہ محصول ڈاک)

مفتاح البیان حصہ اول و دوم۔ مؤلفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابو البیان، مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جعفری مؤلف جواہر البیان وغیرہ

مجلس ذاکری اور وعظ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت [illegible] (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ: دفتر امیریہ دار التصنیف والتالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

سودیشی پارچہ جات کے مشہور تاجر

ہمارے یہاں ہر قسم کے دستی کرگہ کے تیار کردہ سودیشی کپڑے قمیض۔ شروانی سوٹ کے لئے جدید ڈیزائن کے مطابق نہایت ارزاں قیمت پر تیار رہتے ہیں اور اسٹاک بھی رہتا ہے علاوہ ازیں ٹانڈہ کے ہمہ اقسام کے ڈوریے۔ جادانی۔ تہمد۔ لنگی۔ ریشمی وسوتی عمدہ ساڑیاں ململ اور رومال بھی تیار رہتے ہیں۔ ہمارا مال تمام ہندوستان میں فروخت ہوتا ہے خصوصیت سے گورنمنٹ ہینڈلوم امپوریم، لکھنؤ مسلم دیسی اسٹور لمیٹیڈ لکھنؤ اور کرگہ اسٹور گورکھپور کو سپلائی کرتے ہیں۔ تھوک فروشوں اور دوکانداروں کیساتھ خاص رعایت۔

حافظ حبیب اللہ عبدالستار ٹانڈہ ضلع فیض آباد

مُصفّی کبیر

مصفی کبیر صفائی خون کے لئے بے نظیر دوا ہے۔ خارش یعنی کُھجلی، درد، برص، گنج، چھاجن (اگزما)، چھائیں، کیل، مہاسے، گرمی دانہ، پھوڑے پھنسی، آنکھیں دُکھنا، پوشیدہ امراض، گٹھیا، جذام (کوڑھ) عرق النساء، بواسیر ایڑی کا درد وغیرہ کے لئے اکسیری دوا ہے۔ اس کے علاوہ ملیریا بخار، مرض پایوریا وغیرہ میں بیحد نافع ہے۔ شریفی دواخانہ دہلی کو ناز ہے کہ اس نے ایسی بے بہا قابل قدر ایجاد کی ہے جس کا جواب کم از کم ایشیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا۔

قیمت فی شیشی بارہ خوراک آٹھ آنے — کم از کم آٹھ شیشیاں استعمال کرنی چاہئیں

شریفی دواخانہ یونانی بازار بلیماران پوسٹ بکس نمبر ۳ دہلی

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں اُن میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور اُن کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔ اُن کی قیمتیں ۲۵ فی صدی سے ۴۰ فی صدی تک کم کر دی گئی ہیں۔

اُمید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ لاہور اور لکھنؤ سے مکمل فہرست طلب کر کے ممنون فرمائیں گے

مکتبہ جامعہ

دلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن محبوب مطابع برقی پریس دہلی